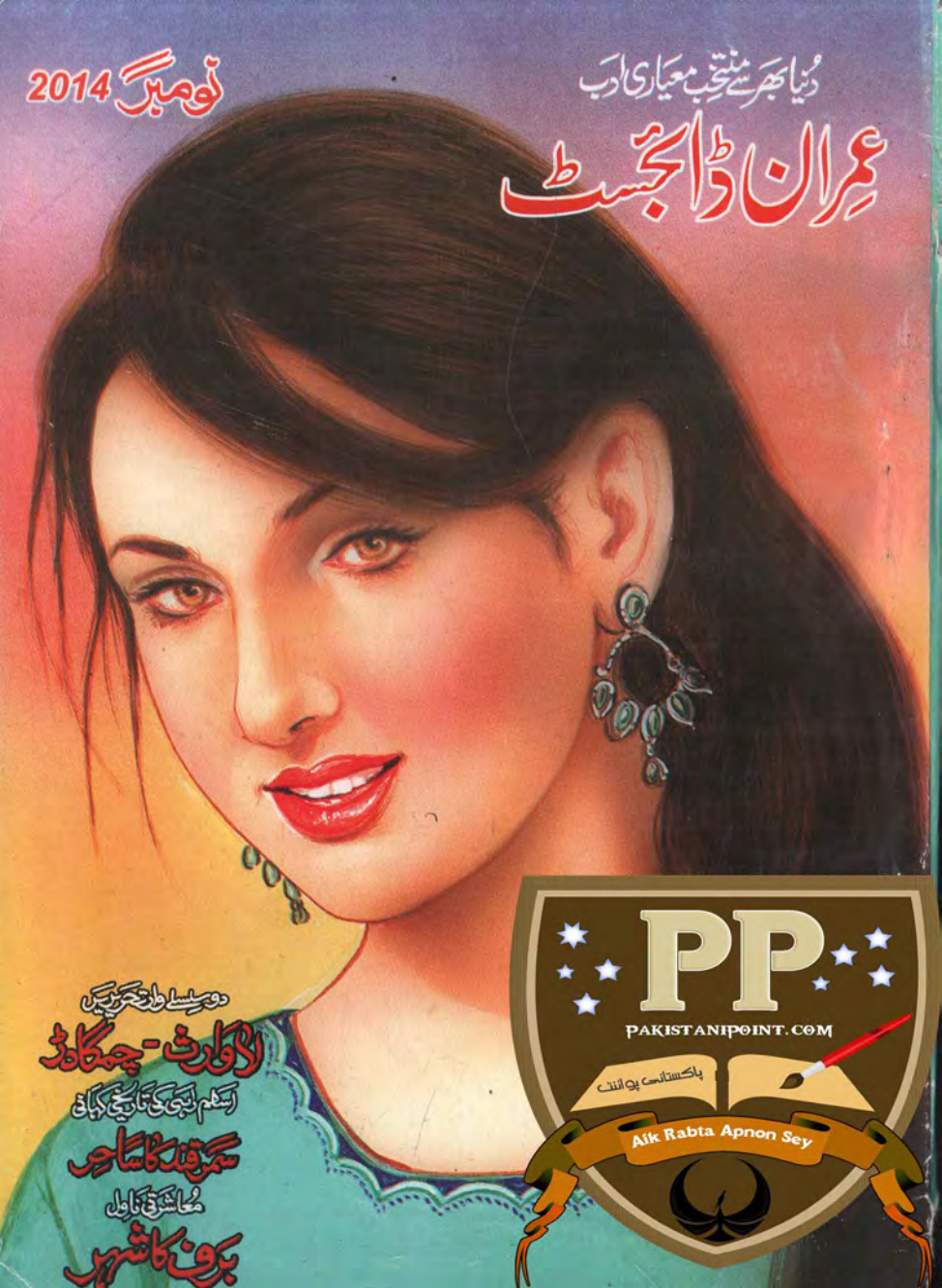

دُنیا بھر سے منتخب معیاری ادب

عمران ڈائجسٹ

نومبر 2014

دو سلسلے وار تحریریں

لاوارث - چمگادڑ

اسلم راہی کی تاریخی کہانی

سمرقند کا ساحر

مُعاشرتی ناول

برف کا شہر

PP
PAKISTANIPOINT.COM
پاکستانی پوائنٹ
Aik Rabta Apnon Sey

دُنیا بھر سے منتخب معیاری ادب

MEMBER APNS رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی

CPNE رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

عمران ڈائجسٹ

بانی: محمود ریاض

مدیر اعلیٰ: عامر محمود

منتظم: محمد شفیع

سمرقند کا ساحر
اسلم راہی — 8

تاریخ گواہ ہے کہ سمرقند کے حکمرانوں کے ادوار میں سب سے زیادہ سازشیں ہوئی ہیں۔ اس کا اہم سبب جہاں اختیارات، اقتدار اور دولت رہی ہے، وہیں عورت بھی ہے جو اس معاملے میں اہم حیثیت کی حامل ہے۔

وحشت کدہ
احمد صغیر صدیقی — 30

شیطانی قوتوں کے سلسلے کی ایک حیرت ناک کتھا۔۔۔

مونسٹر
سید احتشام — 46

قدم قدم پر خطروں کا سامنا کرنے والی پانچ لڑکیوں کی داستان

چمگادڑ
ایم اے راحت — 88

زندگی کے نشیب و فراز اور عروج و زوال کی ایک انوکھی داستان جو لمحہ بہ لمحہ آپ کو تجسس کے سحر میں جکڑے گی

پنچ پرمیسر
رنگیا راگھوا — 112

وہ تحریریں جو صرف مشرق ہی میں لکھی جا سکتی ہیں انہی میں سے ایک تحریر ہندی زبان سے۔

تقدیر کا فیصلہ
آر۔ کے۔ شاکر — 123

اپنوں کی بے حسی پر مشتمل ایک معاشرتی کہانی

لاوارث
غزالہ جلیل راؤ — 132

ایک ایسے نوجوان کا قصہ جس کے باپ کا پتا نہیں تھا۔۔۔ لیکن اس کو ایک نیک فطرت شخص کا سایہ میسر آ گیا تھا

آئینہ
زبیر احمد — 156

ایک اسٹیج ڈرامہ جو کئی لوگوں کے لیے آئینہ ثابت ہوا جس نے کئی سماجی شخصیات کے سوئے ہوئے ضمیروں کو جھنجوڑ ڈالا۔

چشم تر
اسرار احمد — 162

تاریخ کے جھروکوں سے ایک فن کار کا احوال، وہ برامکہ کے احسان کا اسیر تھا

نومبر 2014ء — قیمت 40 روپے — جلد 44 — شمارہ 7

ضمیر کا مسئلہ
166
انور
ایک باضمیر سرکاری ملازم کی کہانی اُس کی اپنی زبانی

کالے لوگ
171
محمد سلیم اختر
منہ بولے رشتے تو حقیقی رشتوں سے بھی زیادہ نازک اور حساس ہوتے ہیں۔ لیکن اُس نے سچ اور خلوص سے جوڑے گئے رشتہ کی قدر ہی نہیں کی۔۔۔۔

ڈبل کراس
178
روشن آراء
نہلے پہ دہلا اور سیر کو سوا سیر ضرور ٹکراتا ہے۔ ایسے ہی دو بیوپار کرنے والوں کی کہانی جس میں سے ایک سیر تھا تو دوسرا سوا سیر۔

محبت
191
عارف شیخ
پیار، عشق اور محبت جیسے احساسات اگر کسی کی زندگی میں شامل ہو جائے تو زندگی مکمل لگنے لگتی ہے لیکن جب یکتا پیار دور جانے لگے تو۔۔۔۔۔۔۔۔۔

انجمن
197
لائبہ شاہ
سماج سدھارنے کا جذبہ رکھنے والے ایک نوجوان کی داستان

دکھ
204
توقیر حیدر شاہ
اس داستان نے اولیا کی سرزمین ملتان میں جنم لیا، جہاں کی گرمی پورے پاکستان میں مشہور ہے۔

ہڈی کی چوری
210
اقبال کاظمی
مشہور اور مقبول چور نک ویلوٹ کا تازہ ترین کارنامہ، اس بار نک کو بدنام زمانہ تنظیم مارفیا کے ایک اہم رکن کے لیے انسانی بازو کی ایک بے وقعت ہڈی چرانا پڑی۔

برف کا شہر
234
سیدہ عطیہ زاہرہ
وہ اُس سے ملنے کے لیے بے چین تھی، بے تاب تھی، اُس نے اُسے ہر جگہ ڈھونڈا لیکن جب وہ ملا تو۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پیار اور دھوکے کے رنگوں سے لکھی داستان

کرنیں

آذر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام اشاعت: 37 اردو بازار کراچی

تاریخی کہانیوں کے شائقین کے لیے بطور خاص

سمرقند کا ساحر

اسلم راہی

PakistaniPoint
Waqar Azeem

تاریخ گواہ ہے کہ مسلمان حکمرانوں کے دور میں سب سے زیادہ سازشیں ہوئی ہیں، اس کا اہم سبب جہاں اختیارات، اقتدار اور دولت رہی ہے، وہیں عورت بھی ہے جو اس معاملے میں اہم حیثیت کی حامل ہے۔ اچھے برے ہر قوم، ہر مذہب اور ہر دور میں موجود رہے ہیں۔ اسلامی مملکتوں کے استحکام کے لیے مذہب پر کاربند سپہ سالاروں اور جنگ جو سپاہیوں نے اہم کردار ادا کیا۔ زیر نظر طویل تاریخی کہانی میں آپ کو جہاں جنگوں کا احوال ملے گا، وہیں محبت کی لازوال داستان بھی نظر آئے گی۔ مسلمان حکمرانوں نے اپنی مملکت کو مضبوط کرنے کے لیے کن کن امور پر توجہ دی اور راستے کمزور کرنے کے لیے سازشی عناصر نے کیا کیا جتن کیے۔

مسلمان حکمرانوں کا احوال، تاریخی حقائق، طویل داستان

سلطان مودود نے اپنے سالار طغرل کو بڑی تیزی سے پیش قدمی کرتے ہوئے سلجوقیوں کی طرف روانہ کیا تھا۔ سلجوقی بہت بڑا اور جنگجو گروہ تھا جو ان دنوں شمال سے جنوب کی طرف پیش قدمی کرنے میں مصروف تھا گو ان کا کوئی بڑا سردار یا ان کا کوئی حاکم ان کے اندر نہیں تھا یہ سلجوقیوں کے چھوٹے چھوٹے گروہ تھے جنہوں نے شروع شروع میں شمال سے جنوب کی طرف پیش قدمی شروع کی تھی چنانچہ بقول مورخین پہلے یہ بست کے میدانوں میں نمودار ہوئے اس کے بعد انہوں نے آگے پیش قدمی شروع کی تھی ان کو روکنے اور ان کی سرکوبی کے لیے سلطان مودود نے طغرل کو روانہ کیا تھا۔

جہاں تک طغرل کا تعلق ہے تو یہ ایک عرصہ سے علی بن ربیع اور عبدالرزاق کے ساتھ ان کے نائب کی حیثیت سے کام کرتا رہا تھا۔ جنگ کا وسیع تجربہ بھی رکھتا تھا اسی بنا پر علی بن ربیع نے اسی کی سفارش بھی کی تھی چنانچہ یہی طغرل بست میدانوں کی طرف بڑھا۔

مورخین لکھتے ہیں کہ طغرل اپنے لشکر کے ساتھ ابھی بست سے کافی دور تھا کہ اسے اطلاع ملی کہ سلجوقی بست تک آئے تھے لیکن واپس چلے گئے ہیں یہ اطلاع یقیناً طغرل کے لیے خوش قسمتی کا باعث تھی ورنہ طغرل جنگ کا علی بن ربیع یا عبدالرزاق کی طرح کوئی بڑا تجربہ نہیں رکھتا تھا اور اگر سلجوقی جنگجو اس کے مقابل آتے تو یقیناً طغرل کے لیے نقصان کا باعث بنتے بہرحال مورخین کہتے ہیں کہ جب سلجوقی بست سے آگے نہ بڑھے تب ان کی جگہ ترکمانوں نے لے لی اور ترکمانوں کا سردار بہرام نہال فوائد حاصل کرنے کے لیے اپنے لشکر کے ساتھ آگے بڑھا چنانچہ جس وقت ترکمانوں کا بڑا سردار بہرام نہال گرم سیر کے علاقے میں پہنچا یہ جنوب مغربی افغانستان میں قندھار کے نواح میں ایک مقام تھا۔ یہاں طغرل ان کی راہ روک کھڑا ہوا۔

مورخین لکھتے ہیں کہ ترکمانوں اور طغرل کے لشکر میں گھمسان کا رن پڑا اور اس جنگ اور ٹکراؤ میں طغرل کامیاب رہا جبکہ ترکمانوں کا حاکم اور سپہ سالار بہرام نہال پیچھے ہٹ گیا۔

طغرل نے ان کا تعاقب نہیں کیا اس لیے کہ طغرل کو یہ خبریں پہنچ چکی تھیں کہ بہرام نہال کے پیچھے بھی ترکمانوں کے بہت سے گروہ ہیں وہ کسی بھی وقت اس کے لیے مصیبت کا باعث بن سکتے ہیں۔

دوسری طرف ماضی میں ان ترکمانوں کو کئی مواقع پر علی بن ربیع اور عبدالرزاق کے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا لہٰذا طغرل کے معاملے میں بہرام نے سیاست کرنے کا فیصلہ کیا۔

طغرل سے پسپا ہونے کے بعد بہرام نے اپنے لشکر کے ساتھ ایک جگہ پڑاؤ کیا پھر اپنے سارے سالاروں کو اس نے ایک جگہ جمع کیا۔ یہ رات کا وقت تھا بہرام نہال نے اپنے لشکر کی حفاظت کے لیے چاروں طرف اپنے مخبر اور مسلح جوان پھیلا دیے تھے چنانچہ جب سارے سالار اس کے گرد جمع ہوگئے تب بہرام نے انہیں مخاطب کیا اور کہنے لگا۔

''میرے عزیز ساتھیو! ماضی میں ایک دو چار نہیں ان گنت مواقع پر ہمیں پسپائی اور شکست کا سامنا کرنا پڑا اور یہ شکستیں زیادہ تر ہمیں علی بن ربیع اور عبدالرزاق کے ہاتھوں ہی کھانا پڑیں یہ دونوں سالار جنگ کا بڑا وسیع اور نایاب قسم کا تجربہ رکھتے ہیں لہٰذا انہیں شکست دینا یا انہیں اپنے سامنے زیر کرنا ہمارے لیے اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا اب غزنی کی حکومت نے ہمارے مقابلے میں طغرل کو بھیجا ہے طغرل گو علی بن ربیع اور عبدالرزاق کا ہی تربیت یافتہ ہے لیکن میں سمجھتا ہوں یہ ان جیسا وفا شعار اور شجاع اور جان نثار نہیں ہوگا میں چاہتا ہوں نہ ہم جنگ کر کے اپنے ساتھی گنوائیں اور نہ وہ جنگ کر کے اپنے لشکر میں کمی کا باعث بنے۔ میں چاہتا ہوں اس سے ایک مسئلہ طے کر لیں اس کی طرف قاصد بھیجتے ہیں اور اسے یہ کہتے ہیں کہ جن علاقوں میں وہ قیام کیے ہوئے ہے ان علاقوں کا وہ حاکم ہونے کا اعلان کر دے۔ سلطان مودود کی اطاعت ترک کر

دے اگر وہ سلطان مودود کے خلاف سرکشی کرتا ہے اور سلطان اس کے مقابلے پر کوئی لشکر بھیجتا ہے تو اس لشکر کا مقابلہ کرنے کے لیے ہم طغرل کی مدد کریں گے۔

جواب میں طغرل ہمیں یہ مراعت دے گا کہ ہم شمال کے علاقوں سے نکل کر جنوب کی طرف حملہ آور ہوتے ہوئے اپنے لیے مراعات اور اپنی ضروریات پورا کرنے کے لیے سامان جمع اور اکٹھا کرتے رہیں مجھے امید ہے کہ اگر یہ معاملہ ہم طغرل کے سامنے پیش کریں تو طغرل مان جائے گا۔''

ترکمانوں کے سارے سالاروں نے اپنے حاکم بہرام نہال کی اس تجویز سے مکمل اتفاق کیا چنانچہ بہرام نے اپنے لشکر میں سے دو بہترین چرب زبان اور باتونی قسم کے امرا کا انتخاب کیا اور انہیں کافی قیمتی تحائف دے کر اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے طغرل کی طرف روانہ کیا۔

دوسری طرف طغرل کیونکہ اکیلا لشکر لے کر آیا تھا یہ پہلا موقع تھا کہ وہ ایک بڑے لشکر کی کمانداری کر رہا تھا اور اس کی مزید خوش قسمتی کہ اس نے ترکمانوں کو شکست دے کر پیچھے ہٹنے پر بھی مجبور کر دیا تھا لہٰذا اسے اپنی اس فتح مندی پر فخر بھی تھا اپنے لشکر کے ساتھ اس نے ایک محفوظ جگہ قیام کر رکھا تھا اور حالات کا جائزہ لے رہا تھا کہ ایک سالار نے اسے ترکمانوں کے حاکم بہرام نہال کے قاصدوں کے آنے کی اطلاع دی چنانچہ ترکمانوں کے ان قاصدوں کو طغرل نے اپنے خیمے میں طلب کر لیا۔

جب دونوں قاصد طغرل کے خیمے میں آئے تب اپنی جگہ سے اٹھ کر طغرل نے ان کا استقبال کیا پرجوش انداز میں ان سے مصافحہ کیا پھر اپنے سامنے بیٹھنے کے لیے کہا۔

جب دونوں بیٹھ گئے تب گفتگو کا آغاز طغرل نے کیا اور آنے والوں کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''مجھے بتایا گیا ہے کہ تم ترکمانوں کے سالار اور حاکم بہرام نہال کے قاصد ہو، کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟'' اس پر پہلے تو ان قاصدوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا نگاہوں ہی نگاہوں میں کوئی اشارہ ہوا پھر ان میں سے ایک طغرل کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''محترم طغرل! پہلے تو ہم آپ کو مبارک باد دیتے ہیں کہ آپ ایک آزاد سالار کی حیثیت سے پہلی بار ایک لشکر لے کر ان علاقوں کی طرف آئے ہیں ورنہ اس سے پہلے آپ ہمیشہ علی بن ربیع اور کبھی عبدالرزاق کی ماتحتی اور نیابت ہی میں کام کرتے رہے ہیں ہم اس بات پر بھی آپ کو مبارک باد دیتے ہیں کہ ہمارے ساتھ آپ کا پہلا ٹکراؤ آپ کے حق میں رہا لیکن اس خوش گمانی میں نہ رہیے گا کہ ہماری ان شکستوں کا سلسلہ زیادہ دیر تک جاری رہے گا اس لیے کہ شمال کی طرف سے ہمیں کمک اس طرح ملتی رہے گی جس طرح کسی ندی کو چشموں کا پانی ملتا رہتا ہے ہمارے حاکم بہرام نہال نے ہمیں آپ کی طرف ایک خاص پیغام دے کر بھیجا ہے۔''

یہاں تک کہنے کے بعد قاصد کا اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری اس کے بعد وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتا ہوا کہہ رہا تھا۔

''ہم چاہتے ہیں کہ آنے والے دور میں نہ آپ کا نقصان ہو نہ ہمارا اور آپ کو ان علاقوں میں ایک ایسا مقام مل جائے جو مقام اس سے پہلے نہ کبھی غزنی کے لشکریوں کے سالار اعلا علی بن ربیع اور عبدالرزاق کو بھی حاصل ہوا ہوگا۔''

قاصد نے کچھ سوچا پھر دوبارہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔

''محترم طغرل! ہر نفس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی آزادی سے اپنی خواہشوں اور اپنے ارادوں کے مطابق جی سکے۔ ہمارا حاکم بہرام نہال چاہتا ہے کہ آپ ہمارے سامنے ان علاقوں کے حاکم بن کر رہیں اگر آپ سلطان مودود کے لشکر میں رہتے ہیں تو آپ کو کیا ملے گا چھوٹے سالار ہی بن کر زندگی گزار دیں گے جب تک علی بن ربیع ہے جب تک

عبدالرزاق ہے اس وقت تک آپ کو لشکریوں کی کمانداری تو مل نہیں سکتی۔ یہ پہلا موقع ہے کہ آپ ایک لشکر کی کمانداری کر رہے ہیں اور شاید اس کے بعد کبھی ایسا موقع ملے ہی نہیں، اس لیے کہ جہاں کہیں بھی بڑی مہم اٹھتی ہے غزنی کے سلطان یقیناً علی بن ربیع اور عبدالرزاق ہی کو ترجیح دیتے ہیں اب ہم چاہتے ہیں کہ یہ جس قدر علاقے میں جن کے اندر ان دنوں شورش برپا ہے ہم آپ کو ان علاقوں کا حاکم تسلیم کر لیتے ہیں آپ سے مکمل تعاون کریں گے اس طرح آپ کی حیثیت ایک چھوٹے سالار سے ایک بہترین اور ایک اعلا درجے کا حاکم ہو کر جائے گی۔''

قاصد کا بات کو پھر آگے بڑھاتا ہوا کہنے لگا۔

''محترم طغرل! ایک چھوٹے سالار اور کسی علاقے کے حاکم کے منصب میں بڑا فرق ہے۔ ساتھ ہی ہمارا حاکم بہرام نہال آپ کو یہ بھی ضمانت دیتا ہے کہ جب آپ ان علاقوں میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیں گے ان علاقوں میں اپنے نام کا خطبہ جاری کریں گے اور اپنے نام ہی کے سکے جاری کریں گے تو ظاہر ہے سلطان مودود آپ کو زیر کرنے کے لیے کوئی لشکر آپ کی طرف روانہ کرے گا چنانچہ بہرام نہال آپ کو ضمانت دیتا ہے کہ ایسا لشکر جب کبھی بھی آپ کو زیر کرنے کے لیے آیا ہم آپ کی پوری مدد کریں گے اور غزنی کے لشکریوں کے سامنے آپ کو زیر اور مفتوح نہیں ہونے دیں گے اب بولیں آپ کیا کہتے ہیں۔''

طغرل کوئی پختہ کار انسان نہیں تھا اب تک وہ علی بن ربیع اور عبدالرزاق کے تحت ہی کام کرتا رہا تھا بہرام نہال نے جب اسے ایک حاکم اور حکمران کی حیثیت دینا چاہی تب طغرل اپنا آپ چھوڑ گیا اس کا ظرف خواہشوں اور امیدوں سے بھر کر چھلکنے لگا چنانچہ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً بہرام نہال کی اس پیش کش کو قبول کر لیا اس کے قاصدوں کو دو دن مہمان کی حیثیت سے اپنے پاس رکھا پھر بہرام کو پیغام بھیجا کہ میں ان علاقوں میں ایک خود مختار حکمران کی حیثیت سے اس کی تجویز سے اتفاق کرتا ہوں چنانچہ وہ قاصد جب چلے گئے تب مورخین لکھتے ہیں کہ ان علاقوں میں طغرل نے اپنی حاکمیت اور خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ سلطان کو ابھی اس کی خبر ہو گئی تھی

☆☆☆

سلطان مودود طغرل پر سختی نہیں کرنا چاہتا تھا اس کے خلاف کوئی لشکر بھیجنے سے پہلے اس نے اپنے دو نمائندوں کا انتخاب کیا ایک غزنی کا کوتوال ابوعلی اور دوسرا ایک سالار میرک حسین تھے چنانچہ یہ دونوں نمائندے اپنے کچھ محافظ دستوں کے ساتھ طغرل کی طرف روانہ ہوئے۔

جب یہ طغرل کے لشکر میں داخل ہوئے تو طغرل نے انہیں اپنے خیمے میں بلایا لیکن ان کا کوئی خاص استقبال نہ کیا دونوں جب طغرل کے سامنے بیٹھ گئے تب گفتگو کا آغاز غزنی کے کوتوال ابوعلی نے کیا اس لیے کہ میرک حسین خاموش رہا کیونکہ وہ طغرل کا بہترین دوست تھا اور وہ طغرل کے مفاد ہی کی بات کرنے والا تھا۔

اس بنا پر غزنی کا کوتوال بولا اور طغرل کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''طغرل میرے بھائی! سلطان مودود نے ہم دونوں کا انتخاب اس لیے کیا ہے کہ ہم تم سے گفتگو کریں اور تمہیں سمجھائیں کہ یہ سرکشی اور خود مختاری ترک کر دو۔ میرے بھائی! ہمارا انتخاب اس لیے بھی ہوا ہے کہ اب تک میرے اور تمہارے تعلق یقیناً برادرانہ رہے ہیں جہاں تک میرک حسین کا تعلق ہے تو اس کے ساتھ صرف تمہارے تعلقات ہی نہیں بلکہ یہ تمہارا عزیز بھی ہے۔ میرے بھائی! ہمارے پاس تمہارے نام سلطان کا یہی پیغام ہے کہ جو تم نے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا ہے اسے واپس لے لو سلطان خوش ہے کہ تم نے ترکمانوں کو شکست دی ہے اور میں تمہیں یہ بھی یقین دلاتا ہوں کہ تمہاری اس کارگزاری کے صلے میں سلطان تمہارے منصب میں اضافہ بھی کرے گا اور تمہارا شمار علی بن ربیع اور عبدالرزاق جیسے

بڑے سالاروں میں ہونے لگے گا۔''

اس موقع پر میرک حسین نے مخصوص اشارہ طغرل کی طرف کیا تھا جسے طغرل سمجھ گیا اور اس کے چہرے پر ایک طنزیہ اور مکروہ قسم کی مسکراہٹ بھی نمودار ہوئی تھی۔

اپنی بات کو آگے بڑھاتا ہوا ابوعلی پھر کہنے لگا۔

''طغرل میرے بھائی! اگر تم یہ سرکشی چھوڑ دیتے ہو تو میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا اپنے ساتھ تمہیں سلطان کے سامنے پیش کروں گا۔''

یہاں تک کہتے کہتے ابوعلی کو رک جانا پڑا اس لیے کہ طنزیہ سے انداز میں طغرل کہنے لگا۔

''تم پکڑ کر مجھے سلطان کے پاس اس لیے لے کر جاؤ گے تاکہ سلطان میری گردن کاٹ دے ایسا ہی چاہتے ہو نہ تم؟''

ابوعلی نے نفی میں گردن ہلائی۔ کہنے لگا۔

''طغرل میرے بھائی! اللہ نہ کرے ایسا ہو۔ ہم تمہاری سلامتی تمہاری خیریت چاہتے ہیں۔ اگر تمہیں یہ ڈر ہے کہ تمہاری اس حرکت کی وجہ سے سلطان تمہارے خلاف کوئی تادیبی کاروائی کرے گا تو غزنی پہنچ کر میں تمہیں سب سے پہلے علی بن ربیع کے پاس لے کر جاؤں گا۔ علی بن ربیع اور عبدالرزاق دونوں کو ساتھ لے کر میں تم اور وہ دونوں سلطان کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور جب میرے ساتھ علی بن ربیع اور عبدالرزاق بھی تمہارے حق میں بولیں گے تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں سلطان تمہیں معاف کر دے گا اور اگر سلطان تمہیں معاف کر دیتا ہے تو میرے عزیز بھائی یہ تمہاری خوش بختی ہوگی اس لیے کہ میں تو ایک کوتوال کی حیثیت سے تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ میرے بھائی یہ خودمختاری اچھی نہیں اس میں خون خرابہ بھی ہوگا ٹکراؤ بھی ہوگا اور ان گنت لوگ مارے بھی جائیں گے۔''

ابوعلی جب خاموش ہوا تب طغرل چھاتی تانتے ہوئے کہنے لگا۔

''ایسی کوئی بات نہیں۔ میں بہت کچھ سوچ سمجھ کر یہ راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہوا ہوں اگر سلطان کا یہ خیال ہے کہ ان علاقوں میں وہ میری حکمرانی ختم کر دے گا اور مجھے اپنے سامنے زیر کرے گا تو یہ اس کی غلط فہمی ہے میرے پیچھے شمال میں ترکمانوں کا ایک طویل سلسلہ ہے وہ سب میرے ساتھ ہیں اگر سلطان میری سرکوبی کے لیے کوئی لشکر بھیجتا ہے تو واپس جا کر سلطان کے کان میں یہ بات ڈال دینا کہ مجھے زیر کرنے کے لیے اسے شمال کے سارے ترکمانوں سے ٹکرانا ہوگا۔ ابوعلی! جو گفتگو تم نے کی اس کے لیے میں تمہارا شکر گزار ہوں اب مزید گفتگو میں تمہارے ساتھ نہیں کروں گا اگر تم میرے ہاں قیام کرنا چاہو تو بہتر ورنہ واپس جا سکتے ہو۔'' اس پر ابوعلی اور میرک حسین دونوں طغرل کے خیمے سے نکل گئے تھے۔

راستے میں اچانک ابوعلی کی طرف دیکھتے ہوئے میرک حسین کہنے لگا۔

''ابوعلی! تم نے سلطان کے قاصد کی حیثیت سے اس کی صحیح نمائندگی نہیں کی اگر تم طغرل سے نرمی عاجزی اور انکساری کے ساتھ گفتگو کرتے تو یقیناً وہ مان جاتا اپنی سرکشی اور بغاوت ترک کر دیتا اب تو نے اپنی گفتگو سے مملکت کے خلاف ایک بہت بڑا طوفان کھڑا کر دیا ہے۔ طغرل اب باغی اور سرکش ہو چکا ہے اور اس نے ترکمانوں کو بھی اپنے ساتھ ملا کر ایک طرح سے ناقابل تسخیر ہونے کا روپ دھار لیا ہے۔''

یہاں تک کہنے کے بعد میرک حسین جب خاموش ہوا تب کھا جانے والے انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے ابوعلی کہنے لگا۔

''میں نے تو چلو جس طرح کی بھی گفتگو کی لیکن تو نے تو اس کے سامنے اپنے ہونٹ سی لیے تھے کیا تم سلطان کی طرف سے میری طرح قاصد مقرر نہیں کیے گئے تھے کیا تم نے قاصد کی حیثیت سے اپنی نمائندگی کے فرائض انجام دیے؟ یا صرف طغرل کو خوش کرنے کے لیے تو نے اپنے اوپر زبان بندی طاری کر لی تھی۔ میں جانتا ہوں طغرل تیرا عزیز ہے

پر یاد رکھنا سلطان سے بڑھ کر تو عزیز نہیں ہے مجھے تو طعنہ دیتا ہے کہ میں نے قاصد کی حیثیت سے صحیح نمائندگی نہیں کی تو میں تجھ پر یہ الزام لگاتا ہوں کہ تو نے کچھ بھی نہیں کیا اور ایک طرح سے تو نے سلطان کی نہیں طغرل کی نمائندگی کی ہے یاد رکھنا میرک حسین میں تمہارے مزاج سے واقف ہوں تم قتل و غارت گری کے بھی بڑے شیدائی ہو۔ سازشوں اور الزام تراشیوں کے بھی بڑے ماہر ہو۔'' یہاں تک کہنے کے بعد ابوعلی خاموش رہا اس نے میرک حسین کی طرف دیکھا ہی نہیں اس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اس کی رفتار تیز کر دی تھی اس طرح دونوں اپنے اندر ایک ناچاقی پیدا کرتے ہوئے غزنی کا رخ کر رہے تھے۔

علی بن ربیع کی حویلی میں ایک روز علی بن ربیع اور عبدالرزاق دونوں دیوان خانے میں بیٹھے کسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے کہ حویلی میں راحیل کا ماموں داخل ہوا جب دیوان خانے میں آیا تو علی بن ربیع اور عبدالرزاق دونوں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس سے پرجوش مصافحہ کیا۔ علی بن ربیع نے اسے اپنے سامنے بیٹھنے کے لیے کہا جب وہ بیٹھ گیا تب کچھ دیر تو خاموشی رہی اس کے بعد راحیل کا ماموں علی بن ربیع کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

'' علی بن ربیع مجھے پتا چلا ہے کہ میری بھانجی اور میرا بھانجا دونوں ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے ہیں آپ سے ہمیں یہ شکوہ ہے کہ جس وقت آپ نے راحیل سے شادی کی اس کی ہمیں کوئی اطلاع نہیں کی جب روبیل کی شادی کا اہتمام کیا گیا تب بھی ہمیں نہیں پوچھا گیا اور جب وہ دونوں بہن بھائی مارے گئے تب بھی ان کے مرنے کی بھی ہمیں کسی نے کوئی اطلاع نہیں دی۔''

یہاں تک کہنے کے بعد جب وہ خاموش ہوا تب غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے علی بن ربیع کہنے لگا۔

''راحیل کے ماموں کی حیثیت سے تمہارے یہ شکوے یقیناً تمہاری طرف سے درست ہی ہوں گے لیکن میں انہیں درست تسلیم نہیں کرتا جو کچھ میں کہنے لگا ہوں غور سے سننا اول بات یہ کہ تم ایک بار اپنی ماں کے ساتھ آئے تھے اور اپنے بیٹے کے لیے تم نے راحیل کا رشتہ مانگا تھا راحیل نے انکار کر دیا تھا اور اس کے بعد راحیل نے تم لوگوں سے بالکل قطع تعلقی کر لی تھی اس قطعہ تعلقی میں اس کا بھائی روبیل بھی شامل تھا۔

دوئم یہ کہ جس وقت میری اور راحیل اور روبیل اور حبہ کی شادی کا اہتمام کیا جانے لگا تو میں نے تو نہیں لیکن ہمارے محترم سامیارس نے راحیل اور روبیل دونوں سے کہا کہ کیا تم اپنے ماموں کو اس کی اطلاع دینا پسند نہیں کرو گے۔

اس پر ان دونوں بہن بھائی کا متفقہ فیصلہ اور اعلان تھا کہ ماموں اور ان کے اہل خانہ سے اب ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے کہ وہ یہودی ہیں اور ہم اسلام قبول کر چکے ہیں لہٰذا ہم ان سے ایک دائمی اور مستقل قطع تعلقی کر چکے ہیں ان حالات میں کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہیں ان کی شادی اور ان کے مرنے پر اطلاع دی جانی چاہیے تھی۔ علی بن ربیع یہاں تک کہنے پایا تھا کہ باہر کسی کے چیخنے اور رونے کی آوازیں سنائی دی تھیں لہٰذا علی بن ربیع اور عبدالرزاق فوراً دیوان خانے سے نکل کر صدر دروازے کی طرف بھاگے اور روبیل کا ماموں بھی ان کے پیچھے تھا۔ علی بن ربیع اور عبدالرزاق دونوں جب گلی میں آئے تو انہوں نے دیکھا عبدالرزاق کی بیوی عمیمہ چیخیں مار رہی تھی جبکہ راجکماری پوار بری طرح ہچکیاں اور سسکیاں لے کر رو رہی تھی یہ صورت حال دیکھتے ہوئے علی بن ربیع اور عبدالرزاق بھاگتے ہوئے ان کی طرف بڑھے۔ آگے عمیمہ تھی لہٰذا سب سے پہلے علی بن ربیع نے عمیمہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

'' عمیمہ میری بہن! کیا بات ہے تم رو کیوں رہی ہو کیا کسی نے تم پر ہاتھ اٹھایا ہے اگر ایسا ہے تو کہو

وہ ہاتھ کٹ جائے گا۔'' عمیمہ بے چاری چیخیں مارتے ہوئے روبیل کی حویلی کی طرف اشارہ کرنے لگی تھی اتنی دیر تک علی بن ربیع پوار کے پاس آیا اس کے سر پر بھی اس نے ہاتھ رکھا پھر بڑی محبت میں اسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''پوار! کیا بات ہے تم رو کیوں رہی ہو تمہارا رونا بتاتا ہے کہ کوئی بہت بڑا حادثہ ہوا ہے۔ بتاؤ ڈرو نہیں کسی نے اگر تم دونوں کی دل شکنی کی ہے تو یاد رکھنا وہ بہت بڑی اور کڑی سزا سے گزریں گے۔''

عمیمہ کی طرح پوار نے بھی حویلی کی طرف اشارہ کیا تھا پھر علی بن ربیع کے تسلی دینے پر دونوں سنبھل گئیں پھر پوار نے علی بن ربیع کو مخاطب کیا اور کہنے لگی۔

''میں اور عمیمہ دونوں بہنیں حویلی کی صفائی کر رہی تھیں کہ دو نوجوان اندر آئے انہوں نے ہم سے بدتمیزی کرنے کی کوشش کی۔ ہمیں گالیاں دیں ہمیں ڈانٹا اور حویلی سے نکل جانے کے لیے کہا۔''

پوار کے یہ الفاظ سن کر علی بن ربیع کی حالت زیست کے جبر و جتن کو روندتے آتشی احساس راستوں پر جنم سجاتے دھوپ کے جلتے الاؤ کی سی ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے اندر غضب کے بھنور وحشت کے موسم اور موت کے مناظر رقص کرنے لگے تھے۔ پوار کے الفاظ سن کر مجموعی طور پر اس کی حالت سے لگتا تھا جیسے فطرت کے خواب نگر میں کروٹیں لیتے عذابوں کڑواہٹوں کے موسموں اور زہر گھولتی فضا نے اپنے رنگ جمانے کی ابتدا کر دی ہو۔

اتنی دیر تک اس محلے کے وہ جوان جو لشکر میں شامل تھے وہ بھاگتے ہوئے باہر نکل آئے تھے اس موقع پر دھاڑتی ہوئی آواز میں علی بن ربیع بولا اور کہنے لگا۔

''حویلی کے اندر جاؤ اور دیکھو حویلی میں کون آیا ہے اور جو بھی ہے اسے پکڑ کر باہر لاؤ۔''

اس پر چار پانچ جوان بھاگتے ہوئے حویلی میں داخل ہوئے تھوڑی دیر بعد وہ دو جوانوں کو پکڑ کر لائے اور انہیں علی بن ربیع کے سامنے لا کھڑا کیا۔ علی بن ربیع پہلے تو کچھ دیر تک انہیں کھا جانے والے انداز میں دیکھتا رہا پھر کھولتے لہجے میں اس نے انہیں مخاطب کیا۔

''تم کون ہو؟'' قبل اس کے کہ ان دونوں میں سے کوئی جواب دیتا علی بن ربیع کے قریب ہی کھڑا راحیل کا ماموں بولا اور کہنے لگا۔

''یہ دونوں میرے بیٹے ہیں میرے ساتھ ہی آئے ہیں۔''

علی بن ربیع کی حالت یہ الفاظ سن کر پہلے سے بھی زیادہ بھیانک ہو گئی تھی۔ آگے بڑھا اور دونوں جوانوں کے چہروں پر ایک ایک ایسا طمانچہ مارا کہ وہ زمین پر گر گئے تھے۔ اس کے بعد اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ان دونوں پر اس نے گھونسوں اور لاتوں کی بارش کر دی تھی۔ وہ مار کھاتے ہوئے چیخنے چلانے لگے تھے یہاں تک کہ ان کے گریبانوں سے پکڑ کر علی بن ربیع نے انہیں اٹھایا اور انہیں ایک دیوار کے ساتھ کھڑا کرتے ہوئے بڑے بھیانک لہجے میں انہیں مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''تم دونوں کو کیسے جرات اور جسارت ہوئی کہ تم بغیر اجازت کے کسی کی حویلی میں داخل ہو جاؤ۔ تم نے کیا جرات اور کیا جسارت کر کے ان دونوں لڑکیوں سے بدتمیزی کرنے کی کوشش کی۔'' جب وہ چپ رہے تب راحیل کے ماموں نے علی بن ربیع کو مخاطب کر کے کچھ کہنا چاہا لیکن علی بن ربیع نے ایک بار پھر ان دونوں پر مکوں کی بارش کر دی تھی یہاں تک کہ وہ دیوار کے پاس گر گئے۔ علی بن ربیع نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی تلوار بے نیام کی راحیل کا ماموں یہ سمجھا کہ وہ اس کے دونوں بیٹوں کی گردنیں کاٹ دے گا لہٰذا وہ سامنے آن کھڑا ہوا۔ بائیں ہاتھ سے راحیل کے ماموں کا بازو پکڑ کر علی بن ربیع نے ایک طرف کر دیا پھر ان دونوں کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''تم نے جو انتہائی فحش اور بدتمیزی پر مبنی حرکت کی ہے اس کی معافی نہیں ہے تمہارا باپ

یہاں سے چلا جائے گا لیکن تم دونوں کی قبریں یہاں بنیں گی۔''

اس کے ساتھ ہی علی بن ربیع نے مڑ کر اپنے لشکر کے جوانوں کی طرف دیکھا۔ ان کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''روبیل کی حویلی کے اندر ہی دو قبریں کھودو جب قبریں کھد جائیں گی تو ان دونوں کی گردنیں کاٹ کے ان دونوں قبروں کے اندر دفن کر دی جائیں گی۔''

اس موقع پر راحیل کا ماموں ہاتھ جوڑ کر عبدالرزاق سے معافی دینے کے لیے منتیں کرنے لگا تھا۔ چنانچہ عبدالرزاق نے آگے بڑھ کر پہلے علی بن ربیع کے دونوں شانے دبانے شروع کیے پھر اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''میرے بھائی! بس میں سمجھتا ہوں ان کے ساتھ اس قدر سختی کافی ہوگئی ہے۔ انسان کے بچے ہوئے تو آئندہ ایسی حرکت نہیں کریں گے۔''

علی بن ربیع نے مڑ کر ایک نگاہ جس میں ہلکا سا احتجاج تھا عبدالرزاق کی طرف دیکھا پھر اس نے اپنی تلوار نیام میں ڈال لی اور ان دونوں کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''اپنی جگہ پر اٹھو۔''

وہ اس ڈر سے کہ کہیں ان کی گردن نہ کٹ جائے فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ علی بن ربیع نے پھر کھا جانے والے انداز میں انہیں مخاطب کیا۔

''دونوں آگے بڑھو اور جن لڑکیوں سے تم نے بدتمیزی کی ہے دونوں ان کے پاؤں پر سر رکھ کر معافی مانگو۔''

وہ دونوں فوراً حرکت میں آئے عمیمہ اور پوار کے پاؤں کے قریب سر رکھ کر دونوں نے ان سے معافی مانگی یہاں تک کہ علی بن ربیع نے عمیمہ اور پوار کی طرف دیکھا اور ان دونوں کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''تم دونوں حویلی کے اندر چلی جاؤ۔''

اس پر عمیمہ اور پوار دونوں حرکت میں آئیں اور علی بن ربیع کی حویلی کے اندر چلی گئی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد علی بن ربیع راحیل کے ماموں کی طرف متوجہ اور اسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''تم نے اور تمہارے ان دونوں بیٹوں نے آج جو حرکت کی ہے اس کی سزا یہی تھی کہ ان دونوں کی گردنیں کاٹ دی جائیں اگر ان دونوں کی گردنیں کٹتی تو کوئی مجھ سے باز پرس اور احتساب کرنے والا نہیں تھا لیکن میں اپنے بھائی عبدالرزاق کے کہنے پر انہیں معاف کر چکا ہوں۔ ابھی اسی وقت غزنی سے نکل جانا یہ میرے پیچھے جوان کھڑے ہیں یہ سب میرے لشکری ہیں آئندہ اگر تم تینوں میں سے کسی نے بھی غزنی کی طرف آنے کی کوشش کی یا ان حویلیوں کا رخ کیا تو میں اپنے ساتھیوں سے کہہ دوں گا کہ تم تینوں میں سے کوئی بھی دکھائی دے اس کی گردن کاٹ کر رکھ دیں۔ تمہارے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے اگر تم یہ سمجھ کر آئے تھے کہ راحیل کی حویلی پر تمہارا کوئی حق بنتا ہے تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ دونوں بہن بھائی تم سے قطع تعلق کر چکے تھے لہٰذا ان کی حویلی یا ان کی جائیداد کے کسی صفحے سے بھی تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اب میں تم سے مزید کوئی گفتگو نہیں کروں گا یہاں سے بھاگنے والی بات کرو۔''

اس کے ساتھ ہی وہ تینوں باپ بیٹا اپنے گھوڑوں پر بیٹھے اور انہیں ایڑ لگاتے ہوئے وہاں سے چلے گئے تھے۔

ان کے جانے کے بعد وہاں کھڑے سارے جوانوں کو علی بن ربیع نے اپنے گھروں میں جانے کے لیے کہا۔ جب وہ وہاں سے ہٹنے لگے تب علی بن ربیع اور عبدالرزاق حرکت میں آئے اتنی دیر تک سامیارس اور ام عمیم بھی ان کے قریب آ چکے تھے پھر چاروں علی بن ربیع کی حویلی میں داخل ہوئے دیوان خانے میں اس وقت عمیمہ اور پوار دونوں پریشان اور فکرمند بیٹھی ہوئی تھیں۔

وہ چاروں بھی دیوان خانے میں داخل ہوئے نشستوں پر بیٹھنے کے بعد کچھ دیر خاموشی رہی یہاں تک کہ علی بن ربیع نے پوار کی طرف دیکھا اور اسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''پوار! میں انتہا درجے کا شرمندہ ہوں کہ غزنی میں تمہارے ساتھ ایسا سلوک ہوا تم غزنی میں بہت اعلا اور ارفع مقصد کے لیے آئی تھیں اور تمہارے ساتھ ایسا سلوک ہونا میں سمجھتا ہوں انتہائی درجہ کی بے تمیزی اور بری حرکت ہے۔ یہ دونوں جنہوں نے بدتمیزی کی یقیناً میں ان دونوں کی گردنیں کاٹ دیتا لیکن عبدالرزاق نے ایسا کرنے سے روک دیا۔ وہ دونوں میری بیوی راحیل کے ماموں زاد تھے ان دونوں کے ساتھ ان دونوں کا باپ بھی تھا میرا اپنا اندازہ ہے کہ وہ راحیل کے مرنے کی خبر سن کر اس کی حویلی یا اس کے باغات کے لالچ میں یہاں آئے لیکن راحیل اور روبیل دونوں بہن بھائی بہت عرصہ پہلے ان سے قطع تعلق کر چکے تھے اس لیے میں نے انہیں بھگا دیا ہے۔

تمہارے ساتھ جو زیادتی ہوئی ہے اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔''

علی بن ربیع کے ان الفاظ پر پوار چونک سی اٹھی تھی بے چینی اور بے تابی کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگی۔

''امیر! یہ آپ کس قسم کی گفتگو کر رہے ہیں آپ مجھ سے کیوں معذرت مانگ رہے ہیں۔ آپ کا اس میں کیا قصور اور دوش۔ آپ نے تو میرے پاؤں میں انہیں ڈال کر میری عزت میرے وقار میں اضافہ کیا ہے۔ بجائے اس کے کہ میں آپ کے اس رویے پر آپ کی ممنون ہوتی آپ کا شکریہ ادا کرتی الٹا آپ مجھ سے معذرت کر رہے ہیں۔''

پوار جب خاموش ہوئی تب علی بن ربیع پر بولا اور عیمہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''عیمہ! تیرا میرا بہن بھائی کا رشتہ ہے تو بھی ان سرزمینوں میں نئی ہے میری بہن اس رویے پر میں تم سے بھی معذرت خواہ ہوں۔''

عیمہ نے گھورنے کے انداز میں علی بن ربیع کی طرف دیکھا پھر کہنے لگی۔

''بھائی! آج آپ نے یہ الفاظ استعمال کر لیے آئندہ اپنی بہن کے لیے یہ الفاظ نہ کہیے گا۔ ایک بہن کی حیثیت سے آپ جیسے بھائی پر میں زندگی بھر فخر کرتی رہوں گی۔ آپ نے مجھے جہنم کی دلدل سے نکالا اور ایسا نکالا کہ مجھے جنت جیسے ماحول میں لا کھڑا کیا۔'' عیمہ کے ان الفاظ کے جواب میں علی بن ربیع کچھ کہنے ہی والا تھا کہ حویلی کے دروازے پر دستک ہوئی تھی علی بن ربیع اٹھنے لگا تو عبدالرزاق فوراً اٹھ کھڑا ہوا علی بن ربیع کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اس نے اسے بٹھا دیا پھر وہ دیوان خانے سے نکل کر حویلی کے صدر دروازے کی طرف چلا گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد لوٹا جب وہ دیوان خانے میں داخل ہوا تو علی بن ربیع نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

''میرے بھائی! خیریت تو ہے؟'' اس پر عبدالرزاق بولا اور کہنے لگا۔

''میرے خیال میں میرے بھائی! اٹھو، دونوں چلیں، سلطان کا ہرکارہ آیا تھا سلطان نے ہم دونوں کو بلایا ہے۔'' عبدالرزاق کے یہ الفاظ سن کر علی بن ربیع نے ایک گہری نگاہ باری باری سامیارس، ام عیمہ پوار اور عیمہ پر ڈالی پھر انہیں مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''میرے خیال میں آپ چاروں یہیں بیٹھیں میں اور عبدالرزاق جاتے ہیں، میں سمجھتا ہوں سلطان نے کسی خاص مقصد کے تحت ہی ہمیں بلایا ہوگا۔ ہو سکتا ہے معاملہ سرکشی اور بغاوت کرنے والے طغرل سے متعلق ہو یا کوئی اور نئی پرانی مہم اٹھ کھڑی ہو۔''

باہر جانے کے لیے علی بن ربیع اپنی جگہ اٹھا تو پوار دیوی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور علی بن ربیع کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

''امیر! اگر آپ برا نہ مانیں تو میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔''

علی بن ربیع رک گیا مڑ کر پوار کی طرف دیکھا کہنے لگا۔

''تم بلا جھجک کہو جو کہنا چاہتی ہو کچھ کہنے کے لیے تمہیں مجھ سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔''

جواب میں پوار مسکرائی کچھ سوچا اس کے بعد کہنے لگی۔

''امیر! بات یہ ہے کہ میں چاہتی ہوں یا یوں سمجھ لیں کہ یہ میری خواہش ہے کہ آپ مستقر میں شب بسری نہ کیا کریں اس طرح حویلی کی رونق اور آب وتاب جاتی رہے گی آپ کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ حویلی آباد نہیں ہے کوئی کھانے پکانے والا نہیں ہے آپ کا دوسرا مسئلہ راحیل کا دکھ بھی ہے اس کا کسی کے پاس مداوا تو نہیں ہے لیکن جہاں تک کھانے کا تعلق ہے تو اس موضوع پر پہلے تفصیل کے ساتھ میری بابا سامیارس اور اماں ام تمیم سے گفتگو ہو چکی ہے اور ہم تینوں کی خواہش یہ ہے کہ ہر روز شام کا کھانا آپ کی حویلی میں سب مل کر کھائیں گے اس میں بھائی عبدالرزاق اور میری بہن عمیمہ محترم سامیارس ام تمیم میں اور آپ بھی شامل ہوں گے۔ صبح کا کھانا میں آپ کے لیے لے آیا کروں گی اور دوپہر کا کھانا میں اور عمیمہ دونوں مل کر تیار کیا کریں گی مجھے امید ہے کہ آپ کو اس سلسلے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

علی بن ربیع سوچ کر کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ عبدالرزاق بولا اور کہنے لگا۔

''یقیناً کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

ابھی تک علی بن ربیع نے اپنے تاثرات کا کوئی اظہار نہیں دیا تھا کہ سامیارس بھی بول اٹھا۔ ''علی بن ربیع میرے بیٹے! یہ ہم سب کی خواہش ہے مجھے امید ہے کہ آپ ہماری خواہش کو رد نہیں کریں گے۔ بیٹے! بات یہ ہے کہ آپ کی اور راحیل اور روبیل دونوں کی حویلی سے ہماری بہت سی یادیں وابستہ ہیں بیٹے قسم اللہ پاک کی، مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ عمیمہ کی وجہ سے عبدالرزاق کی حویلی آباد ہو چکی ہے لیکن جب میں روبیل اور آپ کی حویلی کو دیکھتا ہوں تو مجھے دکھ ہوتا ہے لہٰذا ہم سب نے مل کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہر روز رات کا کھانا سب مل کر آپ کی حویلی میں کھایا کریں گے صبح اور دن کا اس لیے نہیں ہوسکتا کہ دن کو آپ لوگ مستقر میں مصروف رہتے ہیں آپ شب بسری بھی اپنی حویلی میں کیا کریں گے اس طرح حویلیوں میں رونق بھی ہوگی جو یقیناً ہمارے ذہنی اور دلی سکون کا باعث ہوگی۔''

یہاں تک کہنے کے بعد سامیارس جب خاموش ہوا تب علی بن ربیع نے کچھ سوچا اس کے بعد سامیارس اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ کہنے لگا۔

''محترم سامیارس! اگر یہ فیصلہ آپ سب لوگوں نے مل کر کیا ہے تو میں اس فیصلے سے بغاوت نہیں کروں گا اسے قبول کرتا ہوں لیکن اس کے لیے میں آپ کا پہلے سے شکریہ ادا کر دیتا ہوں کہ آپ لوگ اس قدر اہتمام کر رہے ہیں یہ یقیناً آپ لوگوں کے لیے تکلیف اور۔۔۔''

علی بن ربیع اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا اس لیے کہ پوار اس کی بات کاٹتے ہوئے بول اٹھی تھی۔

''امیر! آپ کو اس سلسلے میں ہم میں سے کسی کا شکریہ ادا نہیں کرنا چاہیے بلکہ ہمیں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ آپ نے ہماری بات مان لی ہے۔''

جواب میں علی بن ربیع نے کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا اس کے چہرے پر ہلکا سا تبسم نمودار ہوا تھا پھر وہ عبدالرزاق کے ساتھ حویلی سے نکل گیا تھا۔

علی بن ربیع اور عبدالرزاق کے جانے کے بعد تھوڑی دیر تک خاموشی رہی یہاں تک کہ سامیارس پوار کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''پوار میری بیٹی! علی بن ربیع کہہ کر گئے ہیں کہ ان دونوں کے آنے تک ہم یہیں بیٹھیں۔ میری بیٹی جو کچھ تم نے استاد خوارزمی سے سیکھا ہے اس سے متعلق ہمیں بھی بتاؤ اس سے نہ صرف یہ کہ ہمارے علم میں اضافہ ہوگا بلکہ علی بن ربیع اور عبدالرزاق کے

آنے تک ہمارا وقت بھی اچھا گزر جائے گا۔

میری بیٹی تو جانتی ہے کہ پہلے ہم یہودی تھے لیکن یہودیوں اور مسلمانوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے اس لیے کہ دونوں وحدانیت کے قائل ہیں اب تم کیونکہ پہلے ہندو تھی ہمیں یہ بتاؤ کہ ہندوازم کا خداوند قدوس سے متعلق کیا عقیدہ ہے اور یہاں قیام کے دوران استاد خوارزمی سے سیکھنے کے بعد اب اسلام میں تحقیق کرنے کے بعد تمہارا کیا عقیدہ ہے۔''

پوار تھوڑی دیر سوچتی رہی پھر کہنے لگی۔

''میں نے یہاں آ کر بہت کچھ حاصل کیا ہے دراصل خدا سے متعلق ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں جو عقیدہ ہے وہ مبہم اور قابل اعتراض ہے اس پر ایک نہیں کئی اعتراض کیے جا سکتے ہیں۔ خدا سے متعلق ہندوؤں کی قدیم کتابیں کہتی ہیں۔

اس وقت عدم تھا اور نہ وجود نہ عالم اور نہ آسمان جو اس سے پرے ہے۔ کیا چیز سب کو محیط تھی اور وہ سب کچھ کہاں قائم تھا کیا وہ پانی اور عمیق بے پایاں تھا۔

اس وقت فنا اور بقا کا کوئی وجود نہ تھا اور نہ دن رات کا کوئی فرق تھا ایک ہستی اپنے آپ میں بغیر سانس کے سانس لے رہی تھی اور اس کے سوا کوئی دوسری شے نہ تھی۔

ابتدا میں تاریکی پر تاریکی چڑھی ہوئی تھی سب کچھ کائنات میں غیر مہمیز صورت میں پانی ہی پانی تھا اور وہ جو ایک خلا میں عدم کا جامہ پہنے ہوئے تھا حرارت نے اسے اپنی طاقت سے پیدا کیا اس میں خواہش کی ابتدا نمودار ہوئی۔ یہ خواہش عقل یا روح کا ابتدائی تخم تھا جس کو رشیوں نے اپنے دل دماغ کی کاوش سے معلوم کیا کہ وہ تخم عدم وجود میں اتصال کا واسطہ ہے۔

وہ شعاع نور جو عالموں میں پھیلی کیا وہ عالم پستی سے نمودار ہوئی یا عالم بالا سے پھر بیج بوئے گئے اور قوتیں پیدا ہوئیں کارخانہ قدرت عالم پستی میں اور اقتدار عالم بالا میں۔

حقیقت کی کس کو خبر ہے یا اس کا اعلان کون کر سکتا ہے کائنات کی پیدائش کہاں سے اور کس سے ہوئی کیا دیوتا بھی اس کے ظہور میں آئے یا دیوتا بھی بعد کی پیدائش ہیں تو پھر کون جانتا ہے کہ وہ کہاں سے نمودار ہوئی ہے یہ عالم مخلوقات کہاں سے نمودار ہوا یہ کہ وہ خلق بھی ہوا ہے کہ نہیں وہ جو بالاترین آسمان سے سب کچھ دیکھتا ہے اس حقیقت کا علم صرف اس کو ہے یا شاید وہ بھی نہیں جانتا۔

یہ خدا سے متعلق قدیم ہندوؤں کا عقیدہ تھا اس عقیدے میں یہ کہا گیا ہے کہ نعوذ باللہ خدا ایک جگہ سانس لے رہا تھا اور حرارت نے ایک طرح سے اسے بے دار کیا۔ اس میں خواہش پیدا ہوئی اور اس خواہش سے عقل یا روح نے جنم لیا اور اس طرح روح کے تخم کی ابتدا ہوئی۔ یہ ساری باتیں قابل اعتراض ہیں۔ اگر خدا اس طرح اپنے آپ میں پڑا ہوا تھا۔ سانس لے رہا تھا تو یہاں انسان کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتے ہیں کہ آخر اسے کس نے پیدا کیا؟ کس کے کہنے پر وہ ایک جگہ عدم کا جامہ پہنے ہوئے خاموش تھا۔ پر کیسے حرارت سے اس کے اندر توانائی اور خواہش پیدا ہوئی اور حرارت کو پیدا کرنے والا کون تھا جس نے نعوذ باللہ خدا کو متحرک کیا اور پھر خدا کے متعلق ہندوؤں کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ یہ کائنات اس نے پیدا کی بھی ہے کہ نہیں اس طرح ایک ابہام ہے ایک شک ہے کہ یہ کائنات کیسے وجود میں آ گئی؟

دوسری طرف اسلام میں خداوند قدوس سے متعلق عقیدہ بڑا صاف اور واضح ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ وہی ذات ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو خوش بنایا آسمان کو ایک عمارت کی صورت میں قیام کیا اس کے علاوہ اسلام کے مطابق انسان کی فطرت میں اللہ تعالیٰ کی ہستی کے احساس کی ایک دلیل بھی ہے کہ جب کوئی انسان مصائب اور آلام کے گرداب میں پھنس جاتا ہے اور اس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں پاتا ہر طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آتی ہے تو اس کا

احساس پیدا ہو جاتا ہے اور وہ آپ سے آپ خداوند قدوس کے آستانہ پر گر جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے اس گرداب سے نکلنے کے لیے دعا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اسلام میں اللہ تعالیٰ کے وجود پر سب سے روشن اور واضع دلیل وحی الٰہی ہے جس سے یقین کے افق سے شک شبے کے تمام بادل چھٹ جاتے ہیں اور حقیقت پر وہ غائب سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ وحی ایک عالم گیر تجربہ ہے تمام اقوام عالم کی طرف انبیا آئے جنہوں نے وحی کے ذریعے اللہ کے وجود کا اقرار کیا۔ پھر اس صداقت پر اس مضبوطی کے ساتھ کھڑے ہوئے کہ مصائب اور تکلیف کے سخت طوفان میں بھی ان کے پاؤں میں لغزش پیدا نہ ہو سکی وحی الٰہی میں تین ایسی خوبیاں ہیں جو خداوند قدوس کے مالک کائنات ہونے پر دلالت کرتی ہیں ایک ظاہری خوبی دوسری باطنی خوبی اور تیسری پیش گوئیاں۔

وحی الٰہی کی ظاہری خوبی اس کی عبادت میں فصاحت و بلاغت نزاکت لطافت ملائمت شرینی اور حسن ترتیب پائی جاتی ہے اس کی مثل کوئی دوسرا آدمی بنانے کی قدرت نہیں رکھتا۔

باطنی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس میں ایسی روحانی تاثیر ہوتی ہے جو ہر سننے والے کو اپنی طرف کھینچتی ہے گناہوں کی آگ کو سرد کرتی ہے ساتھ ہی نیکی کرنے کا زبردست قوت پیدا کرتی ہے۔

تیسری خوبی کلام الٰہی کی یہ ہوتی ہے کہ اس میں دن سے زیادہ روشن پیش گوئیاں ہوتی ہیں۔ یہ خوبیاں اسلام کی مقدس کتاب قرآن مجید میں بادرجہ اتم موجود ہیں۔ یہ کتاب روحانی تاثیرات کے لحاظ سے بے مثل اور اس میں لامحدود پیش گوئیاں موجود ہیں جو ہر دور میں پوری ہوتی رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔''

یہاں تک کہنے کے بعد پوار جب دم لینے کے لیے رکی تب توصیفی انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے سامیارس کہنے لگا۔

''بیٹی آریاؤں کے خدا سے متعلق قدیم عقائد اور پھر اسلام سے متعلق جو تم نے روشنی ڈالی ہے میری بیٹی تو نے ہمارا دل خوش کر دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں غزنی میں آ کر تو نے استاد خوارزمی سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔''

مسکراتے ہوئے پوار بولی اور کہنے لگی۔

'' اگر بہت کچھ حاصل نہ کیا ہوتا تو آج میں اسلام قبول کر کے آپ لوگوں کے اندر نہ بیٹھی ہوتی۔''

پوار کے خاموش ہونے کے بعد سامیارس پھر بولا اور کہنے لگا۔

''بیٹی! جب تک علی بن ربیع اور عبدالرزاق نہیں آتے میرے خیال میں ہم اس موضوع پر گفتگو کرتے ہیں۔ اس سے تمہاری طرف سے ہمارے علم میں یقیناً اضافہ ہوگا اب تم ہمیں یہ بتاؤ کہ یہاں قیام کے دوران استاد خوارزمی سے حاصل کرتے ہوئے تم نے انسان کی پیدائش اور تخلیق کائنات میں کیا فرق محسوس کیا ہے؟''

جواب میں پوار بولی اور کہنے لگی۔

'' اسلام میں تخلیق کائنات اور انسان کی تخلیق بالکل واضح ہے اس میں کوئی شبہ اس میں کوئی ابہام تک نہیں ہے۔ سب جانتے ہیں خداوند قدوس نے سب سے پہلے آدم کو پیدا کیا اور سارے انسان آدم کی اولاد ہیں لیکن وہ آریہ جن کا دھرم ہندوستان میں رائج ہے ان کا عقیدہ اس سے بالکل مختلف رہا ہے اگر آپ کہیں تو اس کی تفصیل آپ سے کہوں؟''

سامیارس مسکرایا اور کہنے لگا۔

''بیٹی! تفصیل بتانے کے لیے ہی تم سے گفتگو کی ہے تاکہ علی بن ربیع اور عبدالرزاق کے آنے تک ہمارا وقت اچھا گزر جائے۔'' جواب میں پوار مسکرائی پھر وہ کہہ رہی تھی۔

''آریاؤں کا عقیدہ جو ہندوؤں میں رائج ہے اس کے مطابق آدم ایک نہیں کئی آدم ہیں۔ ان کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ زمانے کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے یعنی زمانے کی ابتدا اور اس کے انجام تک اس کے چار دور ہیں ہر دور ہزاروں سالوں پر مشتمل

ہے۔ ساتھ ہی ہندوؤں میں یہ بھی عقیدہ ہے کہ مسلمانوں کی پیغمبر کی بعثت کے زمانے تک چوتھے دور کے تین ہزار سات سو اور کچھ اوپر سال گزر چکے ہیں۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ کیونکہ زمانے کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے چنانچہ جب چوتھا حصہ گزرتا ہے تو پھر سے پہلے حصے کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ اس طرح دنیا از سر نو ایک طرح سے قائم ہو جاتی ہے۔ چوتھے اختتام سے مراد قیامت ہے ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ یہ دنیا بہت قدیم ہے اور غیر فانی ہے لیکن اس کے خلاف بعض براہمنوں کا خیال یہ بھی ہے کہ یہ دنیا فانی ہے اور ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب یہ بالکل نیست و نابود ہو جائے گی۔

اس کے علاوہ قدیم آریاؤں کا مذہب جو ہندوستان میں رائج ہے اس کے مطابق کوئی طوفان نوح نہیں آیا تھا اس لیے کہ ان کو اس بات کا یقین ہے کہ گزشتہ زمانوں کی تمام اشیا محفوظ ہیں۔ ہندوؤں کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ زمانے کے پہلے حصے کی ابتدا سے لے کر اب تک دنیا میں انسان آباد رہا ہے اور ہندوؤں کا یہ بھی کہنا ہے کہ زمانے کے ہر ایک حصے میں علیحدہ آدم اور حوا مختلف اوصاف لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض زمانوں میں انسان دراز قد طویل عمر اور عظیم جثہ پیدا ہوتے ہیں اور بعض زمانوں میں اس کے بالکل برعکس یعنی چھوٹا قد ہوتا ہے عمر کم ہوتی ہے اور جسم پتلا دبلا انسانوں کی پیدائش کا یہ اختلاف درختوں اور نباتات میں بھی پایا جاتا ہے۔

ہر دور کے درخت اور پودے وغیرہ دوسرے دور کے درخت اور پودوں سے قد و قامت رنگ و بو میں مختلف ہوتے ہیں۔ ہندوؤں کا اس پر بھی اعتقاد ہے کہ براہمن اور کھتری روز اول سے موجود ہیں ان کے علاوہ دوسری ذاتیں زمانے کے تیسرے دور کے آخر میں نمودار ہوئی اور ہندوؤں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ راجپوت جو بڑے جنگجو خیال کیے جاتے ہیں ان کی ابتدا چوتھے دور میں ہوئی۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ہندوستان میں شروع سے انہی کھتریوں کی حکومت تھی اور پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پھر ایک ایسا دور بھی آیا کہ جس میں ہندوستان کی حکومت راجاؤں کے خاندان کے ہاتھوں سے نکل کر غلاموں اور ان کے متعلقین کے قبضے میں چلی گئی۔ سارے ملک میں طوائف الملوکی کا دور شروع ہو گیا رفتہ رفتہ ان غلاموں کی حالت دن بدن خراب سے خراب تر ہوتی گئی اور آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ حکومت اجین کے مشہور راجہ بکرماجیت کے ہاتھ میں چلی گئی۔

بکرماجیت نے ہندوستان کے طوائف الملوکی کو ختم کیا اور آہستہ آہستہ سارے علاقوں سے باغیوں اور سرکشوں کو نکال کر ان پر قبضہ کر لیا اور دکن تک اس کی حکومت قائم ہو گئی۔

راجہ بکرماجیت کے آخری زمانے میں ایک ستائیس سالہ براہمن نے جو پٹن کا رہنے والا تھا جس کا نام سالباہن تھا، دکن میں سرکشی کی اور تمام دکن پر قبضہ کر لیا۔ بکرماجیت نے سالباہن کے مقابلے کے لیے لشکر تیار کیا اور دریائے نربدا کے پاس جا پہنچا۔ سالباہن مقابلے پر آیا جنگ ہوئی اور اس میں راجہ بکرماجیت مارا گیا اور سالباہن کو فتح نصیب ہوئی۔

بکرماجیت کی وفات کے بعد سالباہن نے دریائے نربدا کو پار کر کے بکرماجیت کے ہندوستانی مقبوضات کو اپنے تصرف میں لانے کا ارادہ کیا لیکن دریا میں سخت طغیانی آ جانے کی وجہ سے اس کے سپاہی اور بار برداری کے جانور ہلاک ہو گئے اور سالباہن کو اپنے اس ارادے پر شرمندگی ہوئی اور اس نے یہ خیال دل سے نکال دیا لہٰذا اس نے اجین کی حکومت راجہ بکرماجیت کے بیٹے کے سپرد کر دی۔

اس طرح ان ہندوؤں کا یہ خیال ہے کہ براہمن اور کھتری ازل سے ہیں گو بیچ میں ان کے ہاتھوں سے حکومت نکل گئی لیکن آخر بکرماجیت نے یہ حکومت دوبارہ حاصل کر لی۔ ہندوؤں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ مسلمانوں کے محترم پیغمبر کی ہجرت کے وقت بکرماجیت کے چھ سو اکیس سال گزر چکے تھے اور

ہندوؤں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ آخر انہیں کھتریوں راجاؤں کی حکومت چلتی رہی یہاں تک کہ سلطان محمود غزنوی نے ان پر ضرب لگائی اور ان کی حکومتوں کے اس نے پرخچے اڑا کر رکھ دیے۔

یہاں تک کہنے کے بعد پوار رکی پھر کہنے لگی۔

اسلام میں تخلیق کائنات بڑی واضح ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ خداوند قدوس کے علاوہ کوئی بھی غیر فانی نہیں۔ ہر چیز فانی ہے اور ہر شے نے فنا ہو جانا ہے جبکہ ہندو ازم کہتا ہے کہ براہمن اور کھتری ازل سے ہیں مادہ اور راج غیر فانی ہیں اور نعوذ باللہ ان کی تخلیق خدا نے نہیں کی۔ اس طرح خدا کی وحدانیت اس کے خالق ہونے پر ضرب لگتی ہے اور سارے عقیدے متزلزل ہو کر رہ جاتے ہیں۔''

اس طرح پوار بڑی تفصیل کے ساتھ ہندوستان کی پرانی رسمیں، ہندوستان کے دھرم اور مختلف عقیدوں پر گفتگو کرتی رہی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ان علوم پر بھی روشنی ڈالتی رہی جو اس نے غزنی میں قیام کے دوران استاد خوارزمی سے حاصل کیے تھے۔

☆☆☆

علی بن ربیع اور عبدالرزاق دونوں قصر میں داخل ہوئے۔ سلطان مودود شاید ان دونوں کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا دونوں کو اپنے سامنے بٹھایا باری باری دونوں کا جائزہ لیا پھر کہنے لگا۔

''تھوڑی دیر پہلے باسکین کی طرف سے کچھ مخبر آئے ہیں اور سنگین حالات کی انہوں نے اطلاع دی ہے باسکین ایک مہم میں تو کامیاب ہوا ہے اس لیے کہ غوریوں کے دو لشکر ان دنوں غور اور اس کے گرد نواح میں متحرک ہیں ایک لشکر دارہجی غوری کی کمانداری میں ہے اور دوسرا ابوعلی غوری کی کمانداری میں کام کر رہا ہے جو مخبر خبریں لے کر آئے ہیں ان کا کہنا ہے کہ باسکین کا ٹکراؤ پہلے دارہجی کے ساتھ ہوا جس میں باسکین کامیاب رہا اور دارہجی غوری کو پیچھے ہٹنا پڑا لیکن یہ دارہجی غوری کی بدترین شکست نہیں تھی اس لیے کہ اس کے پاس خاصا بڑا لشکر ہے اور وہ کسی بھی وقت دوبارہ باسکین پر حملہ آور ہو سکتا ہے۔ دوسری طرف ابوعلی غوری ہے یہ دارہجی غوری کا عزیز رشتہ دار ہے مخبر اس بات کا خدشہ ظاہر کر رہے ہیں کہ ابوعلی غوری کسی بھی وقت اپنے لشکر کو متحرک کر کے باسکین کے خلاف دارہجی غوری کی مدد کو پہنچ سکتا ہے اگر ایسا ہو گیا تو یاد رکھنا باسکین اور اس کے پاس جس قدر لشکری ہیں ان میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچ سکے گا۔''

یہاں تک کہنے کے بعد سلطان مودود خاموش ہوا کچھ سوچا پھر باری باری ان کے چہروں پر نظریں جماتے ہوئے کہنے لگا۔

''ان حالات کو دیکھتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ علی بن ربیع میں تمہیں فی الحال غزنی میں رکھنا چاہتا ہوں جبکہ میری یہ خواہش ہے کہ عبدالرزاق ایک لشکر لے کر غور کا رخ کرے، باسکین دارہجی غوری کو اپنے ساتھ مصروف رکھے گا جو مخبر آئے ہیں میں نے انہیں روکا ہے میں چاہتا ہوں وہ ایک دن یہاں آرام کریں اس کے بعد واپس جا کر باسکین کو میرا یہ پیغام دیں کہ فی الحال وہ اپنی نگاہ دارہجی غوری پر رکھے ابوعلی سے نبٹنے کے لیے میں ایک تازہ دم لشکر غزنی سے روانہ کر رہا ہوں۔

میں چاہتا ہوں دو یا تین دن بعد عبدالرزاق یہ خبریں لے کر آنے والے مخبروں کے ساتھ روانہ ہو جائے۔ مخبر جانتے ہیں کہ دارہجی غوری نے کہاں قیام کر رکھا ہے جبکہ ابوعلی غوری اپنے لشکر کے ساتھ کہاں پڑاؤ کیے ہوئے ہے، جب ان دونوں کے مقابلے میں ہمارے بھی دو لشکر ہو جائیں گے تو پھر ہماری حالت مضبوط اور مستحکم ہو جائے گی۔ مجھے یقین ہے کہ ابوعلی غوری کو عبدالرزاق شکست دینے میں کامیاب ہو جائے گا اور اتنی دیر تک میں یہ بھی امید رکھتا ہوں کہ باسکین دارہجی غوری سے نبٹ لے گا۔''

یہاں تک کہنے کے بعد سلطان خاموش ہوا، کچھ سوچا اس کے بعد دوبارہ انہیں مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''علی بن ربیع اب تم کہو کہیں اس طرح معاملہ کر کے ہم غوریوں سے بہتر انداز میں نبٹ نہیں سکتے؟'' علی بن ربیع کے چہرے پر اس موقع پر ہلکا سا تبسم نمودار ہوا پھر سلطان کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''سلطان محترم! اس موقع پر اگر آپ برا نہ مانیں تو میں ایک گزارش کرنا چاہتا ہوں۔'' سلطان نے گھورنے کے انداز میں اس کی طرف دیکھا پھر کہنے لگا۔

''علی بن ربیع! آج کے بعد ایسا انداز گفتگو میرے ساتھ روا نہ رکھنا۔ میں نے کبھی بھی تمہیں صرف سالار نہیں سمجھا میری نگاہوں میں تمہاری حیثیت ہمیشہ ایک بھائی کی سی رہی ہے۔ مجھ سے یہ مت کہا کرو کہ میں ایک گزارش یا ایک التجا کرنا چاہتا ہوں مجھ سے صاف یہ کہا کرو کہ میں ایک تجویز دینا چاہتا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ جو تجویز یا جو بھی منصوبہ بندی تم دو گے میرے لیے وہ حرف آخر ہوا کرے گی۔ اس لیے کہ میں جانتا ہوں تمہاری تجویز میں خلوص اور تمہاری منصوبہ بندی میں بہترین حربی ہنر ہوتا ہے۔''

''سلطان محترم! میں ان دنوں اکیلا اور مجرد ہوں کبھی مستقر میں قیام کر لیتا ہوں کبھی اپنی حویلی میں رہ لیتا ہوں۔ جہاں تک عبدالرزاق کا تعلق ہے اس کے ساتھ اس کی بیوی ہے یہ مہم ایسی ہے کہ اس میں بڑی تگ دو اور بھاگ دوڑ کرنا پڑے گی۔ اگر ابوعلی کے لشکر کی تعداد زیادہ ہوئی تو اس کے ساتھ چھاپہ مار اور شب خون کا کھیل بھی کھیلنا پڑے گا۔ ایسی صورت میں یہ اپنی بیوی کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا اس بنا پر میری آپ سے گزارش ہے کہ اس مہم پر عبدالرزاق کے بجائے میں خود جاتا ہوں۔'' یہاں تک کہتے کہتے علی بن ربیع کو رک جانا پڑا اس لیے کہ بیچ میں سلطان بول اٹھا اور کہنے لگا۔

''علی بن ربیع! اگر تم خود جانا چاہتے تو پھر یہ تمہارا خلوص تمہاری حب الوطنی ہے ورنہ میں تمہیں غزنی میں اس لیے روکنا چاہتا تھا کہ تم شمال کی ایک بڑی مہم سے لوٹے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ تم چند ہفتے آرام کر لو اگر حالات کو دیکھتے ہوئے اس مہم پر عبدالرزاق کے بجائے تم خود نکلنا چاہتے ہو تو اس میں میری خوشی میرا سکون ہوگا۔''

مسکراہٹیں

پکڑ دھکڑ شروع ہونے سے پہلے سیاسی اثر و رسوخ رکھنے والے ایک صاحب کو بینک نے قرضے کی ادائیگی کے سلسلے میں خط لکھا تو انہوں نے جواب دیا۔

''مکرمی! ہم نے اپنے قرض خواہوں کو تین درجوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ پہلے درجے میں وہ لوگ اور ادارے شامل ہیں جن کے قرضے جلد ادا کر دیے جائیں گے۔ دوسرے درجے میں وہ ہیں جن کے قرضے شاید کبھی ادا کر دیے جائیں۔ تیسرے درجے میں وہ ہیں جن کے قرضے ادا کرنے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں۔ آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ آپ کے خط کے عاجزانہ اور دوستانہ مضمون کی وجہ سے ہم نے آپ کو تیسرے درجے سے نکال کر دوسرے درجے میں شامل کر لیا ہے۔''

☆☆☆

ایک عورت اپنے شوہر کو روزانہ بس کے کرائے کے لیے دو روپے دیتی تھی۔ ایک دن دفتر سے واپسی پر شوہر صاحب خوشی سے چیختے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ ''بیگم۔۔۔ بیگم۔۔۔ مبارک ہو، میرا لاٹری میں پچاس ہزار روپے کا انعام نکل آیا ہے۔''

بیگم نے شعلہ باز نگاہوں سے شوہر کو دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔ ''مبارک باد تو میں بعد میں دوں گی۔ پہلے یہ بتاؤ کہ لاٹری کا ٹکٹ خریدنے کے لیے تمہارے پاس پانچ روپے کہاں سے آئے؟''

سلطان کی اس گفتگو سے جہاں عبدالرزاق گھورنے کے انداز میں علی بن ربیع کی طرف دیکھ رہا تھا وہاں سلطان خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ علی بن ربیع نے اپنا رخ بدلا عبدالرزاق کی طرف دیکھا پھر نرم الفاظ میں اسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''عبدالرزاق میرے بھائی! جو کچھ میں نے کہا ہے یہی درست ہے۔ ان الفاظ کے جواب میں تمہیں مجھے اس طرح گھورنے کی ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ درست وہی ہے جو کچھ میں کہہ رہا ہوں۔'' علی بن ربیع کے ان الفاظ پر بڑی نرمی سے عبدالرزاق بھی مسکرا دیا تھا۔ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ علی بن ربیع نے بولنے میں پہلی کی اور سلطان کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''سلطان محترم! میں ابوعلی کو زیادہ وقت دینا نہیں چاہتا اگر میں نے تاخیر کے ساتھ یہاں سے کوچ کیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ ابوعلی اور دارہمی دونوں اپنے لشکر کو متحد کر لیں ایسی صورت میں باسکین کے لیے مسائل اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اس بنا پر میں چاہتا ہوں کہ میں آج رات کے پہلے حصے میں ہی یہاں سے کوچ کر جاؤں جو مخبر میرے ساتھ جائیں گے وہ برابر میری راہنمائی اور راہبری کرتے رہیں گے اور خداوند قدوس نے چاہا تو میں باسکین اور ابوعلی کے بیچ میں حائل ہو جاؤں گا اگر تو ابوعلی کے لشکر کی تعداد زیادہ ہوئی تو میں کوشش کروں گا کہ براہ راست اس سے ٹکرانے سے پہلے اس کے ساتھ شب خون کا کھیل کھیلوں۔ اس طرح میں نا صرف اس کے لشکر کی تعداد کم کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا بلکہ اس پر اور اس کے لشکریوں پر ایک طرح سے بدحواسی بھی طاری کر دوں گا۔ جب میں دیکھوں گا کہ ابوعلی کے لشکر کی تعداد میں کمی آ گئی ہے تو پھر خم ٹھونک کر اس کے سامنے آؤں گا اور میری یہ بھی کوشش ہوگی کہ ابوعلی اور دارہمی دونوں کو زندہ گرفتار کر کے آپ کے سامنے پیش کیا جائے۔''

سلطان نے علی بن ربیع کی تجویز سے اتفاق کیا تھا چنانچہ جواب میں علی بن ربیع بولا اور کہنے لگا۔

''سلطان محترم! اب جبکہ آپ نے اس منصوبہ بندی پر اپنی رضامندی اور خوشی کا اظہار کیا ہے تو میں یہاں سے سیدھا مستقر کی طرف جاؤں گا۔ اس لشکر کو تیاری کے لیے کہوں گا جسے لے کر میں نے آج کوچ کرنا ہے۔'' پھر عبدالرزاق کی طرف دیکھتے ہوئے علی بن ربیع کہنے لگا۔

''عبدالرزاق! تم سیدھے میری حویلی کی طرف جاؤ، وہاں سب لوگ بیٹھے ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے میری طرف سے انہیں مطمئن کر دینا۔'' اس کے ساتھ ہی دونوں سلطان سے اجازت لے کر اٹھ کھڑے ہوئے علی بن ربیع سیدھا مستقر کی طرف چلا گیا تھا جبکہ عبدالرزاق قصر سے نکل کر علی بن ربیع کی حویلی کا رخ کیے ہوئے تھا۔

☆☆☆

یوار بڑی تفصیل کے ساتھ وہ واقعات سب کو سنا رہی تھی جو اسے غزنی میں آ کر حاصل ہوئے تھے اچانک وہ رک گئی اور دیوان خانے کے دروازے کی طرف دیکھنے لگی اس لیے کہ دیوان خانے کے دروازے پر عبدالرزاق نمودار ہوا تھا اور آگے بڑھ کر وہ سامیارس کے پہلو میں بیٹھ گیا تھا۔

کچھ دیر خاموشی رہی یہاں تک کہ سامیارس عبدالرزاق کی طرف گھورنے کے انداز میں دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''عبدالرزاق میرے بیٹے! اکیلے آئے ہو؟ علی بن ربیع کہاں ہے؟''

جواب میں عبدالرزاق بولا اور کہنے لگا۔

''وہ مستقر کی طرف گیا ہے اس لیے کہ ایک لشکر لے کر آج ہی اس نے غور کا رخ کرنا ہے اس بنا پر وہ اس لشکر کو تیاری کا حکم دے گا اور اپنی بھی تیاری مکمل کرے گا اس لیے کہ اس کا کچھ سامان مستقر میں پڑا ہوا ہے۔'' اس کے بعد سلطان کے قصر میں علی بن ربیع اور عبدالرزاق کی جو گفتگو ہوئی تھی اس کی تفصیل عبدالرزاق نے سب سے کہہ دی تھی۔

جب وہ خاموش ہوا تب بڑے لشکر گزار اور
نوعیت کے انداز میں عمیمہ بولی اور کہنے لگی۔

''یہ بھائی علی بن ربیع کی بڑی مہربانی اور آپ سے محبت ہے کہ انہوں نے آپ کو اس مہم سے روکا اور اس مہم پر خود کو پیش کیا ایسا ہر کوئی نہیں کرتا۔''

جواب میں عبدالرزاق سنجیدہ ہو گیا تھا کہنے لگا۔

''عمیمہ! میں علی بن ربیع کو بچپن سے جانتا ہوں جب ہم دونوں اکٹھے سمرقند کی گلیوں میں کھیلا کرتے تھے اس جیسا بھائی اس جیسا دوست اس جیسا کماندار اس جیسا سالار ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا۔ تم جانتی ہو کہ میں عمر میں اس سے بڑا ہوں لیکن میں اس کا احترام اس کی عزت اس طرح کرتا ہوں جیسے وہ مجھ سے بہت بڑا ہے اور میں اس سے بہت چھوٹا ہوں بہر حال آنے والی شب کے پہلے حصے میں وہ لشکر کے ساتھ یہاں سے کوچ کر جائے گا۔ عمیمہ اس موقع پر میں تم سے یہ کہوں گا کہ علی بن ربیع کے لیے اچھا سا زادراہ تیار کیا جانا چاہیے۔''

عمیمہ اپنی جگہ پر اٹھ کھڑی ہوئی اور کہنے لگی۔

''میں اپنی حویلی میں جاتی ہوں وہاں سے سامان لے کر آتی ہوں اور یہیں سارا سامان تیار کرتے ہیں۔''

یوار بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور عمیمہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

''میں بھی عمیمہ تمہارے ساتھ جاتی ہوں۔''

دونوں وہاں سے اٹھ کر جانے لگی تھی کہ ام تمیم بول اٹھی۔

میری دونوں بچیوں تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے ساتھ میری حویلی میں چلو سارا سامان وہاں موجود ہے۔ آج میں اپنی نگرانی میں علی بن ربیع کے لیے زادراہ تیار کراؤں گی۔''

سامیارس اور عبدالرزاق وہیں بیٹھ کر گفتگو کرنے لگے بلا۔ ام تمیم، عمیمہ اور یوار تینوں اٹھیں اور سامیارس کی حویلی کی طرف چلی گئی تھیں آنے والی شب کے پچھلے پہر میں علی بن ربیع اپنے لشکر کے ساتھ غزنی سے کوچ کر گیا تھا۔

☆☆☆

علی بن ربیع سب سے پہلا کام یہ کرنا چاہتا تھا کہ ابوعلی غوری اور دلاچی غوری دونوں کے لشکروں کو آپس میں ملنے نہ دے۔ اصل طاقت ابوعلی ہی کے پاس تھی، دلاچی ایک طرح سے اس کا سالار تھا جہاں تک ان دونوں کا تعلق ہے تو ان دونوں کا تعلق خاندان غوا سے تھا اور مورخین لکھتے ہیں کہ غوریوں کا تعلق ایران کے بادشاہ ضحاک سے تھا۔ ضحاک بنیادی طور پر عرب تھا اس کا باپ یمن کا بادشاہ تھا جس وقت ضحاک کا باپ یمن کا بادشاہ تھا اس وقت ایران پر جمشید کی حکومت تھی اور جمشید وہ شخص تھا جسے ایران کا سب سے طاقتور اور وسیع سلطنت کا مالک بادشاہ تصور کیا جاتا تھا۔ بظاہر یہی لگتا تھا کہ یمن کے بادشاہ کا ایک عام سا بیٹا کچھ نہیں کر گزرے گا لیکن یہ ضحاک تھا جس نے ایران کے عظیم بادشاہ جمشید کی ساری طاقت اور قوت کو درہم برہم کر کے رکھ دیا مشہور ایرانی مورخ شالبی اور فردوسی کے علاوہ مورخ طبری بھی اس ضحاک سے متعلق بہت کچھ لکھتے ہیں طبری کہتے ہیں کہ ضحاک بڑا ظالم شخص تھا اس نے کئی بادشاہوں کو قتل کیا۔ تازیانے مارنا اور دار پر لٹکانا اس کا خاص مشغلہ تھا یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کی مدت حکومت بڑی طویل تھی یمن میں رہتے ہوئے اس ضحاک نے ایسی طاقت اور قوت پکڑی کہ ایران کے بادشاہ جمشید سے ٹکرایا اور اسے بدترین شکست دی اس طرح اس ضحاک نے ایران پر قبضہ کر کے وہاں اپنی حکومت قائم کر لی۔ ایران کے علاوہ اور بہت سے وسیع علاقوں کا بھی بادشاہ بن کر بیٹھ گیا۔

مورخین یہ بھی لکھتے ہیں کہ ضحاک کیونکہ سفاکانہ طبیعت کا مالک تھا چنانچہ ایسا ہوا کہ اصفہان کے ایک لوہار نام جس کا ''کاوا'' تھا اس کے دو بیٹوں کو اصفہان کے حاکم نے پکڑ کر ضحاک کے پاس بھیج دیا ان پر کوئی جرم عائد کیا گیا تھا جس کی وجہ سے ضحاک نے ان دونوں کو قتل کر دیا۔

ان کے باپ کاوا کو جب اپنے بیٹوں کے

مرنے کی اطلاع ہوئی تو اسے سخت رنج ہوا چنانچہ وہ اصفہان شہر میں ضحاک کے ظلم وستم کے خلاف لوگوں کو ابھارنے لگا اس نے ایسا کیا کہ اپنی دھونکنی کو ایک لکڑی سے باندھ کر فضا میں بلند کرتا اور کہتا۔

''یہ آزادی کا علم ہے جو لوگ ضحاک کے خونی پنجوں سے رہائی پانا چاہتے ہیں اور اس جھنڈے تلے جمع ہو جائیں۔''

چنانچہ لوہار ہونے کی وجہ سے اس نے اپنی دھونکنی ہی کو جھنڈا بنایا اور جھنڈے کو اس نے موتیوں سے آراستہ کیا تھا جس کی وجہ سے اس کا نام ''درفش کاویانی'' رکھا گیا کاوا کے اسی علم کی یاد منانے کے لیے ایران میں بعد کے دور میں آنے والے بادشاہوں نے اپنے علم کا نام درفش کاویانی ہی رکھا تھا۔

چنانچہ کاوا نے لوگوں کو ابھارنے کا عمل جاری رکھا اور وہ لوگوں کو کہتا کہ انسان کشی کے اس دور کو کب تک برداشت کرو گے میرا ساتھ دو کہ ہم سب مل کر ظلم وستم سے نجات حاصل کر لیں۔

چنانچہ کاوا کی اس پکار پر لوگ جوق در جوق اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے آخر کاوا نے بپھرے ہوئے ہجوم کو ساتھ لے کر اصفہان پر حملہ کیا اور حاکم اصفہان کو پکڑ کر قتل کر دیا۔ شہر پر آزادی پسندوں کا قبضہ ہو گیا کاوا نے سرکاری خزانہ حاصل کر کے سارا زر و مال لوگوں میں تقسیم کر دیا اس کے بعد کاوا نے اہواز شہر کا رخ کیا۔

وہاں بھی ضحاک کے ظلم وستم کے خلاف لوگوں کو ابھارا۔ اہل اہواز نے بھی اس کا ساتھ دیا اور وہاں کا حاکم بھی تہہ تیغ ہوا اور شہر پر کاوا کا قبضہ ہو گیا اس کے بعد کاوا جہاں جہاں جاتا لوگ اسے نجات دہندہ سمجھ کر اس کا خیر مقدم کرتے اور ضحاک کے حکام کو اپنے انتقام کا نشانہ بناتے۔ ضحاک اس وقت طبرستان میں تھا عوام کی بغاوت سے آگاہ ہوا تو باغی کاوا سے جنگ کرنے کے لیے اپنا لشکر بھیجا لیکن ضحاک کا بد دل لشکر اس کے سامنے نہ ٹھہر سکا۔ کاوا فتوحات حاصل کرتا ہوا رے شہر جا پہنچا اہل رے کو کاوا نے کہا۔

''اب ہم ضحاک کے نزدیک پہنچ گئے ہیں اگر اس نے ہمیں شکست دے دی تو لوگ اس کے ظلم وستم کا نشانہ بنتے رہیں گے اور اگر ہم اسے ہلاک کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ملک ہمارا ہو گا اور ظلم وستم کا خاتمہ ہو جائے گا اور ہر شخص امن اور چین سے زندگی بسر کر سکے گا میں خود بادشاہت کا خواہاں نہیں ہوں میں نہ شاہی نسل سے تعلق رکھتا ہوں نہ بادشاہت میرے بس کی بات ہے تم جسے چاہو بادشاہ بنا لینا لیکن ملک کو ضحاک سے بچانے میں میری مدد ضرور کرو۔''

اسی دوران ضحاک کو خبر ملی کہ ایران کے سابق بادشاہ جمشید کی نسل سے ایک شخص باقی ہے جس کا نام فریدون ہے ممکن ہے کبھی ملک کی حکومت اس کے ہاتھوں میں چلی جائے اس لیے ضحاک اب فریدون کی تلاش میں تھی فریدون جان بچانے کے لیے مارا مارا پھرتا تھا۔

فریدون طبرستان گیا تو ضحاک اس کے پیچھے طبرستان پہنچا فریدون وہاں سے نکل کر رے پہنچا اسی دوران کاوا نے سنا کہ شاہی خاندان کا ایک فرد نام جس کا فریدون ہے رے میں قیام کیے ہوئے تو اس کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی اس نے فریدون کو تلاش کر کے علم آزادی اس کے سپرد کر دیا اور ضحاک سے جنگ کرنے کو کہا۔

مورخین لکھتے ہیں کہ فریدون نے آزادی پسندوں کے لشکر کو منظم کیا اور کاوا کو لشکر کا سالار بنایا چنانچہ ضحاک کے ساتھ ایک نہایت خوف ناک جنگ کے بعد کاوا کو فتح اور ضحاک کو شکست ہوئی۔ ضحاک کو گرفتار کر لیا گیا اور اسے کوہستان ابرز کے ایک غار میں بند کر دیا گیا کاوا کے لشکر نے جشنِ مسرت منایا اور تاج وتخت فریدون کے حوالے کر دیا۔

کہتے ہیں فریدون نے ایران کی حکومت سنبھالی تو سپہ سالار کا منصب بدستور کاوا کے پاس رہا۔ کاوا جہاں جہاں لشکر کشی کرتا اپنا درفش کاویانی نام

کا جھنڈا اس کے ساتھ ہوتا اور اسے فتح حاصل ہوتی اس طرح چند برسوں میں کاوا نے ملک کو دشمنوں سے پاک کر دیا اور صلے میں فریدون نے اسے اصفہان کی حکومت دے دی۔

کاوا نے ایک عرصہ اصفہان پر حکومت کی اور اس کی وفات کے بعد اصفہان کی حکومت کاوا کے خاندان کے ہاتھوں میں رہی اور وہ تمام جاگیر جو کاوا کو فریدون نے انعام میں دی تھی وہ بدستور اس کے خاندان کے افراد کی ملکیت قرار دی گئی البتہ درفش کاویانی نام کا جھنڈا منگوا کر اسے شاہی خزانے میں رکھ دیا گیا۔ فریدون جب بھی کسی مہم پر روانہ ہوتا تو درفش کاویانی جھنڈا ضرور اپنے لشکر میں رکھتا تھا۔

چنانچہ انہی حالات کو آگے بڑھاتے ہوئے مورخین لکھتے ہیں جب ایران کا بادشاہ فریدون ضحاک پر غالب آیا تو ضحاک کے خاندان کے تمام افراد کو یا تو قتل کر دیا یا جلاوطن کر دیا گیا لیکن ضحاک کے خاندان کے دو بھائی جن کا نام سوری اور سام تھے وہ فریدون کے دربار سے ملازمت کے سلسلے میں منسلک ہو گئے تھے۔

کچھ دنوں تک ان دونوں بھائیوں نے فریدون کے دربار میں زندگی بسر کی لیکن حالات میں تبدیلی پیدا ہونا شروع ہوئی اور ان کے دل میں یہ خیال جنم لینے لگا کہ چونکہ فریدون کی ان کے خاندان سے دشمنی ہے لہٰذا وہ انہیں کسی بھی وقت قتل کروا سکتا ہے۔

چنانچہ یہ دونوں بھائی اپنے ہمدردوں کی ایک جماعت کے ساتھ نہاوند کی طرف فرار ہو گئے اور وہاں پہنچ کر اپنے حالات کو بہتر بنانا شروع کر دیا۔

سوری تو اپنے قبیلے کا سردار بنا اور سام نے اپنے لشکر کی سالاری اپنے ہاتھ میں لے لی اس طرح دونوں بھائیوں میں باہمی خلوص اور محبت خوب بڑھی سوری کی بیٹی کا نکاح سام کے بیٹے شجاع کے ساتھ ہوا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد سام کا انتقال ہو گیا اور شجاع اپنے چچا کے زیر سایہ بڑے آرام سے زندگی بسر کرنے لگا۔

لیکن یہ آرام کا زمانہ کچھ زیادہ عرصہ تک نہ رہا اور دشمنوں نے لگا بجھا کر سوری کو شجاع سے متنفر کر دیا اور سوری اس نتیجے پر پہنچا کہ شجاع سے اپنی بیٹی کو علیحدہ کرا کے اسے جلاوطن کر دے۔

سوری کی بیٹی کو جب ان حالات کا علم ہوا تو اس نے اپنے شوہر شجاع کو حقائق سے آگاہ کر دیا شجاع نے یہ سب کچھ سن کر وہاں سے چلے جانے کا فیصلہ کر لیا اور ایک رات شاہی اصطبل سے اعلا درجے کے گھوڑوں اور اونٹوں کی قطاریں حاصل کیں اور اپنے بیوی بچوں کو لے کر اور مال دولت جو ہاتھ لگا سب کچھ سمیٹتا ہوا غورستان کی طرف فرار ہو گیا۔

غورستان ایک محفوظ اور مضبوط مقام تھا اور اس کے ایک مناسب مقام پر پہنچ کر اس نے قیام کیا اس مقام کی مضبوطی سے شجاع کو اس قدر اطمینان ہوا کہ عالم مسرت میں اس کے منہ سے بے اختیار یہ کلمہ نکلا۔ ''زدمندیش۔''

یعنی اب کسی شے سے مت ڈرو اس بنا پر اس جگہ کا نام ہی زدمندیش پڑ گیا۔ شجاع نے اس مقام پر چند قلعے تعمیر کیے کچھ ہی عرصے بعد اس قدر قوت حاصل کر لی کہ وہ ایک عرصے تک ایرانیوں کے مقابلے اپنا دفاع کرتا رہا اور انہیں پسپا کرتا رہا۔

آخر ایک ایسا وقت بھی آیا جب کہ شجاع کو شکست اٹھانا پڑی اور اس نے ایرانیوں کی اطاعت اور باز گزاری قبول کر لی۔

فریدون کی اطاعت قبول کر لینے سے شجاع کو ایک فائدہ ہوا کہ اندرونی طور پر اس کو اپنی حکومت کے انتظامات کا موقع مل گیا اس کے حسن سلوک کا بڑا شہرہ ہوا اور ضحاک کی اولاد کے دوسرے لوگ جو ادھر اُدھر بھاگ کر اپنی جانیں بچا گئے تھے وہ گروہ در گروہ آ کر اس کے دامن میں پناہ لینے لگے۔ شجاع کی وفات کے بعد اس کے جانشینوں کو یکے بعد دیگرے اپنے قبیلے کی سرداری وراثت میں ملتی رہی۔ یہاں تک کہ اس کی اولاد میں سے ایک شخص شنسب کی

سرداری کا دور آیا جبکہ اس قبیلے نے اسی کے دور میں اسلام قبول کرلیا تھا۔

مورخین کہتے ہیں کہ یہ زمانہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا تھا اور اس عہد میں غوریوں کا سردار شنسب بن حریق اپنے قبیلے کے ساتھ مشرف بااسلام ہوا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شنسب اور اس کے قبیلے کی فرمانبرداری سے خوش ہوکر شنسب کو غواریوں کی حکومت کا فرمان اپنے دست مبارک سے لکھ کر بھیجا۔

چونکہ غوریوں میں شنسب پہلا شخص تھا جو مشرف بااسلام ہوا اس لیے یہ سارا قبیلہ ہی شنسبی کے نام سے مشہور ہوگیا۔ بنوامیہ کے عہد میں بھی یہ قبیلہ خوب ترقی کرتا رہا۔

یہاں تک کہ ہارون الرشید کے دور میں ان کا حکمران یحییٰ تھا۔ یحییٰ کا پوتا سوری تاریخ کے اوراق میں بڑا مشہور ہوا اس سوری کا بیٹا محمد بن سوری سلطان محمود غزنوی کا ہم عصر تھا۔ یہ سلطان محمود کی اطاعت نہیں کرتا تھا اس پر سلطان محمود نے اس کے خلاف لشکر کشی کی اور اسے گرفتار کرکے قید میں ڈال دیا۔ محمد بن سوری کو قید کرنے کے بعد سلطان محمود نے غور کی حکومت محمد کے بیٹے ابوعلی کو دی اب اسی ابوعلی کے خلاف علی بن ربیع معرکہ آرائی کے لیے روانہ ہوا تھا۔

☆☆☆

علی بن ربیع ابھی ابوعلی کے لشکر سے بہت دور تھا کہ سلطان کے جو مخبر ان علاقوں میں کام کررہے تھے وہ علی بن ربیع سے آکے ملے۔ کچھ مخبر پہلے سے علی بن ربیع کے ساتھ تھے جو ان علاقوں میں ان کی راہنمائی کررہے تھے جو مخبر باہر سے آئے ان کی آمد پر علی بن ربیع نے ایک جگہ اپنے لشکر کو روک دیا اور وہاں اس نے اپنے لشکر کو پڑاؤ کرنے کا حکم دیا۔ جب خیمے نصب ہوگئے تب علی بن ربیع نے آنے والے مخبروں کو لے کر اپنے خیمے میں داخل ہوا انہیں اپنے سامنے بٹھایا بڑی شفقت میں انہیں مخاطب کرکے کہنے لگا۔

''اب بتاؤ دشمن سے متعلق تمہارے پاس کیا تفصیل ہے؟'' اس پر آنے والوں میں سے ایک بولا اور کہنے لگا۔

''امیر دلاہچی اور ابوعلی کے پاس بہت بڑے بڑے لشکر ہیں ابوعلی کے پاس زیادہ بڑا لشکر ہے جب کہ دلاہچی کے پاس اس سے چھوٹا لشکر ہے جسے ایک بار باسکین پسپا کرچکا ہے۔

اس پسپائی کی خبر ابوعلی کو ہوچکی ہے لہٰذا ابوعلی کوہستانی سلسلوں میں سے ہوتا ہوا باسکین کے خلاف دلاہچی کی مدد کے لیے روانہ ہوچکا ہے لیکن اس کے آگے بڑھنے کی رفتار بہت کم ہے اس لیے کہ اس کے پاس بار برداری کے ان گنت جانور ہیں لشکر بہت بڑا ہے جس کی بنا پر لشکر کے پاس رسد اور خوراک کی دوسری اشیا کے ڈھیر ہیں اس بنا پر ابوعلی کے لشکر کی پیش قدمی کی رفتار بڑی سست ہے اگر ہم اندازہ لگائیں تو امیر جو لشکر آپ لے کر آئے ہیں اس سے کم از کم پانچ سے سات گناہ لشکر صرف ابوعلی کے پاس ہے جہاں تک دلاہچی کا تعلق ہے گو اسے ایک بار باسکین کے ہاتھوں پسپائی اٹھانی پڑ چکی ہے لیکن پسپا ہونے کے بعد وہ پیچھے ہٹا اور اب تک اس نے بھی اپنے لشکر میں خوب اضافہ کرلیا ہے۔''

یہاں تک کہنے کے بعد وہ مخبر رکا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔

''امیر دلاہچی تو ان دنوں اپنی تیاریوں میں مصروف ہے کیونکہ ایک بار وہ باسکین کے ہاتھوں شکست اٹھا چکا ہے لیکن اب وہ دوبارہ خوب سوچ سمجھ کر اور اپنی طاقت اور قوت میں خاصا اضافہ کرنے کے بعد باسکین سے ٹکرائے گا۔ جہاں تک ابوعلی کا تعلق ہے ان علاقوں کا اصل حاکم مالک اور سرکردہ ابوعلی ہی ہے امیر! اگر ابوعلی اور دلاہچی دونوں کے لشکر مل گئے تو پھر ہمارے لیے بڑے خطرات اٹھ کھڑے ہوں گے یہ بھی خطرہ ہے کہ آپ اس چھوٹے سے لشکر کے ساتھ خم ٹھونک کر ابوعلی کے سامنے گئے تو ہمارے لشکری ابوعلی کے لشکر کی تعداد کو دیکھ کر کہیں احساس کمتری اور کم حوصلگی کا شکار نہ ہوجائیں۔''

یہاں تک کہنے کے بعد وہ مخبر جب خاموش ہوا تب علی بن ربیع نے کچھ سوچا اس کے بعد جو بولا تھا اسے مخاطب کر کے علی بن ربیع کہنے لگا۔

''میرے بھائی! میرے چند سوالوں کا جواب دو اس کے بعد میں دیکھتا ہوں مجھے ان باغیوں اور سرکشوں سے نبٹنے کے لیے کیا کرنا ہے۔

پہلے یہ بتاؤ کہ اس وقت دلاہچی اور ابوعلی کے لشکروں کے درمیان اندازاً کتنا فاصلہ ہوگا؟'' جواب میں اس مخبر نے کچھ سوچا پھر کہنے لگا۔

''امیر! میرا اندازہ ہے دونوں کے درمیان اس وقت تک کم از کم تیس میل کا فاصلہ ہوگا۔'' علی بن ربیع نے اب دوسرا سوال کیا۔

یہ بتاؤ کہ باسکین اور دلاہچی کے لشکر میں کتنا فاصلہ ہے ان کے درمیان بھی فاصلہ بیس پچیس میل سے کم نہیں ہوگا۔

علی بن ربیع نے تیسرا سوال کیا۔

''دلاہچی باسکین کے لشکر کی کس سمت ہے؟''

''مغرب کی طرف۔'' مخبر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تھا۔

اس موقع پر کچھ خاموش رہ کر علی بن ربیع نے کچھ سوچا پھر دوبارہ بولا اور کہنے لگا۔

''اب مجھے یہ بتاؤ اگر میں رات کے پچھلے حصے میں کسی بھی وقت ابوعلی پر شب خون ماروں اور شب خون مارنے کے بعد میں ابوعلی کے لشکر کے مغربی جانب چلا جاؤں تو کیا وہاں محفوظ کوہستانی سلسلہ ہے۔''

جواب میں مخبر مسکرایا اور کہنے لگا۔

''امیر! اگر آپ ابوعلی کے لشکر پر شب خون مارنے میں کامیاب ہو جائیں تو مغرب کا علاقہ بہت محفوظ ہے۔ بلند پہاڑ ہیں اور ان کے درمیان ایک درے سے دوسرے درے دوسرے والے سے تیسرے درے کی طرف نکل جانے کے کافی راستے بھی ہیں۔''

علی بن ربیع کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی کہنے لگا۔

''میرے عزیز! میں چند دن تک ابوعلی کے ساتھ شب خون کے علاوہ چوہے بلی کا کھیل کھیلوں گا اس کے لشکر کی تعداد بہت کم کروں گا اس کے بعد میں اپنے دوسرے کام کی ابتدا کروں گا لہٰذا اب مجھے یہ بتاؤ کہ اگر میں چند کامیاب شب خون مارنے کے بعد ابوعلی کے لشکر کے غربی حصے کی طرف چلا جاتا ہوں تو وہاں سے مجھے کوئی ایسا محفوظ راستہ مل جائے گا جس پر تیزی سے حرکت کرتے ہوئے میں شمال کی طرف جاؤں اور دلاہچی پر بھی ضرب لگا دوں۔'' جواب میں مخبر بولا اور کہنے لگا۔

''امیر! یہ تو ایک بہترین منصوبہ بندی ہے جس کوہستانی شاہراہ پر سفر کرتے ہوئے ابوعلی اپنے لشکر کے ساتھ شمال کا رخ کیے ہوئے ہے وہ شاہراہ بھی کوہستانی سلسلوں کے اندر سے گزرتی ہے اگر اس شاہراہ کے مغرب میں بھی کافی ایسے راستے ہیں جن پر سفر کرتے ہوئے دلاہچی کے لشکر پر ضرب لگانے کے لیے بڑی تیزی اور کم وقت میں پہنچا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد علی بن ربیع پھر رکا کچھ سوچا اس پر کہنے لگا۔

''تم میں سے دو آنے والی صبح کو یہاں سے بڑی تیزی اور برق رفتاری کے ساتھ باسکین کا رخ کریں گے اسے جا کر کیا کہنا ہے میں رات کے وقت تم لوگوں کو تفصیل سے بتا دوں گا فی الحال تم آرام کرو اس لیے کہ میں اس ابوعلی کے خلاف جنگ کی ایسی منصوبہ بندی کروں گا کہ انہیں ایک چکر اور ایک ہیجان میں مبتلا کر کے رکھ دوں گا۔''

اس کے ساتھ ہی علی بن ربیع نے آنے والے مخبروں کو آرام کرنے کے لیے کہا۔ لشکر کے کھانے کا اہتمام کیا گیا پورے لشکر نے وہیں شب بسری کی اس کے بعد کچھ مخبر اگلے روز صبح ہی صبح باسکین کی روانہ ہو گئے تھے۔ باقی مخبروں کو اس نے اپنے پاس روک لیا تھا۔

(جاری ہے)

وحشت کدہ

شیطانی مخلوقات کے سلسلے کی
ایک حیرت ناک کتھا...
آرسی یشٹوک کے قلم سے۔

احمد صغیر صدیقی

شیطان کے چیلوں کی رونگھٹے کھڑے کر دینے والی دہشت ناک کہانی

جارج ہارڈ ڈیسل کے سوال کا سبب حقیقتاً دراصل وہ شخص تھا جو اسے کتوں سے تھا۔ وہ کسی کتے کو دیکھ کر رکے بنا نہیں رہ پاتا تھا اور اس کے سر کو تھپکی دیے بغیر وہ گزر ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ تو کسی خارش زدہ کتے کو بھی دیکھ کر اسے چمکارتا ضرور تھا۔

اس کے ساتھ ہونے والا المیہ شاید مل ہی جاتا اگر وہ ایک دن کے لیے گرین ہلز نامی جگہ نہ گیا ہوتا۔ اس علاقے کے بعض حصوں میں میلوں تک جنگلات کا سلسلہ ہے۔ جہاں چھوٹے چھوٹے درختوں، بھنی جھاڑیوں، کانٹے دار پودوں، اونچی نیچی گھاس کی بہتات ہے۔ یہ روپوش رہنے والی جنگلی حیات کے لیے بہترین جگہ کہی جا سکتی ہے مگر جارج کو اس کے بارے میں، چنداسی کی طرح کے اور اجنبیوں کی مانند زیادہ علم نہ تھا۔ وہ اس سرسبز نشیبوں میں پہنچ کر بہت خوش ہوا تھا کہ انہیں دیکھنے نکل پڑا تھا کہ یہ جگہ اسے دل فریب بھی لگی تھی اور ہوا بھی یہاں کی تازہ تھی۔

نوجوان آدمی تھا۔

اس نے جو آواز سنی تھی وہ کسی کتے کے بھونکنے جیسی تھی اور پھر اس کے قدم رک گئے۔ اس نے کان لگا کر اس آواز کی سمت کا تعین کرنے کی کوشش کی۔ یہ درمیانی دوپہر کا وقت تھا اور جہاں تک اسے علم تھا چاند پورا نہیں تھا۔ سورج کی کرنیں درختوں کی شاخوں سے چھن چھن کر نیچے آ رہی تھیں۔ اس کے چاروں طرف کی فضا گرم تھی اس میں جنگل کی مہک بسی تھی۔

اسے ایک بار کتے جیسے بھونکنے کی آواز پھر سنائی دی۔ اس آواز میں ایک قسم کی تکلیف موجود تھی۔ اس نے اس بار سمت کا پتا کر لیا۔ یہ اس کے بائیں جانب موجود، گھنی بیلوں کے پیچھے چھپی جھاڑیوں میں سے آ رہی تھی۔ کسی خوف کے بغیر جارج نے وہ راستہ چھوڑ دیا جو استعمال سے یہاں بن گیا تھا اور ادھر گھس پڑا جدھر سے اس کے خیال میں آواز ابھری تھی۔ ادھر قدرے اندھیرا ہو رہا تھا کیونکہ گھنے درختوں اور اونچی گھاس نے سورج کا راستہ مسدود کر دیا تھا۔ اسے خیال گزرا کہ کسی نے یہاں کوئی پھندا بنا رکھا ہوگا جس میں یہ غریب جانور پھنس گیا ہے۔ جانور کے لیے اس کا دل رحم سے بھر گیا اور کانٹوں اور جسم پر آنے والی خراشوں سے بے پروا وہ آگے بڑھنے لگا۔ کانٹے اس کے پیروں، پنڈلیوں میں چبھ رہے تھے مگر وہ بڑھتا رہا، تبھی وہ آواز پھر ابھری اس بار یہ ایک غراہٹ تھی۔ اگر جارج کے دماغ میں رحم نہ سمایا ہوتا تو اس غراہٹ کو سن کر وہ ضرور چوکنا ہو جاتا۔

کوئی دس منٹ تک وہ ادھر بڑھتا رہا۔ اس کے بعد اس نے رخ تبدیل کیا اور پھر وہ ایک بڑے سے درخت کے نزدیک پہنچ گیا جو ذرا کھلے حصے میں لگا ہوا تھا۔ ارد گرد کے سناٹے کو محسوس کر کے پہلی بار اسے خوف محسوس ہوا۔ اس کا امکان تو خیر نہ تھا کہ وہ اس گھنے جنگل میں گم ہو جائے گا تاہم یہ خبر ایسی رہی تھی جہاں کوئی درندہ بھی ہو سکتا تھا۔ فضا میں اس قسم کی وحشت اور تاریکی گھلی ہوئی تھی جو خطرناک سی تھی۔

اس نے منہ گھمایا اور واپسی کا فیصلہ کرتے ہوئے اور اندازے سے اسی راستے پر ہولیا جس پر چل کر وہ ادھر آیا تھا۔ ٹھیک اسی وقت ایک غراہٹ اس سے کوئی دس گز کی دوری پر ایک جانب سے ابھری۔ جارج کے دل سے جانور کی ہمدردی ایک دم سے نکل گئی اور اسے خوف نے آ دبوچا۔ اس نے زقند لگائی اور بھاگ اٹھا۔ اس نے سنا کہ اس کے عقب میں کوئی بھاری جسم جھاڑیوں کو کچلتا ہوا لپک رہا ہے۔ دوڑتے دوڑتے وہ ایک بار گرا بھی مگر پھر اٹھ کر بھاگنے لگا۔ اس کے تعاقب میں یقیناً کوئی درندہ ہی تھا جو برابر لپکتا چلا آ رہا تھا۔ یہ فاصلہ تیزی سے کم ہوتا جا رہا تھا۔

اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ پیچھے مڑ کر دیکھتا وہ بس جان توڑ کر بھاگ رہا تھا۔ جھاڑیوں کی چرچراہٹیں اور درندے کی ہانپتی سانسیں بتا رہی تھیں کہ اب فاصلہ صرف ایک دو گز کا ہی رہ گیا ہے اور پھر۔۔۔ اس کے حلق سے ایک خوف ناک چیخ نکلی۔

اس کی دائیں ران میں جیسے آگ اتر گئی تھی۔

وہ لڑکھڑایا اور گر گیا۔ درد اس قدر خوف ناک تھا کہ برداشت سے باہر تھا پھر اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اور وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو گیا۔

شاید گھنٹہ بھر بعد یا اس سے بھی زیادہ وقت ہوا ہوگا جب جارج کو ہوش آیا۔ وہ زمین پر پڑا ہوا تھا۔ پھر اسے اس جنگل میں پڑے ہونے کا سبب بھی یاد آ گیا۔ ہڑبڑا کر وہ اٹھ بڑا۔

روشنی بہت کم ہو چکی تھی اور شام ہو رہی تھی تاہم ابھی اتنی روشنی تھی کہ وہ قرب و جوار کی چیزیں دیکھ سکتا تھا۔ اپنے سے ذرا فاصلے پر ایک مردہ جسم کو دیکھ کر وہ لرز اٹھا۔ اس کا چہرہ سرخ تھا اور آنکھیں حلقوں سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔۔۔ یہ بہرحال کوئی خواب نہ تھا۔ آدمی درمیانی عمر کا تھا اس کے بال چھوٹے چھوٹے تھے۔ چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں اور اس کے دانت

پیلے پیلے تھے۔ یہ اس وقت کھلے ہوئے تھے جس سے چہرے کا تاثر مزید خوف ناک ہو گیا تھا۔ چہرے کی سرخی سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی موت دل کے دورے سے واقع ہوئی ہے۔

اگلا گھنٹہ کسی ڈراؤنے خواب کی مانند تھا۔ جارج جھاڑیوں اور گھاس میں لڑکھڑاتا گھسٹتا ہوا کسی طرح اس راستے تک پہنچ گیا جو بستی کی طرف جاتا تھا۔

دوسری صبح کو چند اسکاؤٹس بوائے کو وہیں مل گیا۔ پولیس اور کچھ رضا کاروں نے تمام جنگل کو مل کر کھنگال ڈالا مگر اس چھدرے جنگل میں انہیں کسی درندے کا پتا نہ چلا سکا البتہ انہیں وہ مردہ آدمی ضرور مل گیا تھا پتا چلا کہ یہ ایک کاشت کار تھا اور زیادہ تر تنہا ہی رہتا تھا۔ لاش کے پوسٹ مارٹم سے معلوم ہوا کہ اس کی موت واقعی دل کے دورے سے ہوئی تھی اس کا سبب غالباً وہ کوشش تھی جو اس نے زخمی نوجوان جارج ہارٹ کیسل کو بچانے کے لیے کی تھی۔

یہ واقعہ کوئی نو دن تک مقامی اخبار میں آتا رہا اس کے بعد لوگ اسے بھول بھال گئے۔

مسز ہارڈ کیسل خاصی سخت گیر قسم کی ماں تھی۔ اس نے زخم کے بھرنے تک تو اپنے بیٹے کی خبر گیری کی مگر پھر اس سے کہا کہ وہ اب چلا پھرا کرے۔ جارج ہارڈ کیسل اس روز سیر کو نکلا تھا کہ مطلع ابر آلود ہو گیا۔ وہ اس وقت ہمپٹن کورٹ کے علاقے میں تھا۔ بارش کا پہلا قطرہ نیچے آیا تو اس نے فیصلہ کیا کہ وہ آج اسٹیٹ رولز کو دیکھے گا۔ دراصل ہمپٹن کورٹ ایک عجائب گھر تھا۔ وہ مختلف کمروں میں یکے بعد دیگرے گھستا رہا۔ تصاویر دیکھتا ہوا۔ قدیم اشیا کو دیکھتا ہوا۔ پھر وہ ایک جگہ رک گیا جہاں ایک گائڈ، اس جگہ کی اشیا کے بارے میں تاریخی معلومات بتا رہا تھا۔ اس جگہ سیاح اور اسی طرح کے لوگ جمع تھے۔ جس وقت وہ اس کمرے میں داخل ہوئے جس میں ملکہ دربار لگاتی تھی تو اسے گھٹن سی محسوس ہوئی۔ لہٰذا وہ ایک مناسب کھڑکی کے پاس موجود سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہاں سے وہ بارش میں بھیگے ہوئے باغیچے کو کچھ دیر دیکھتا رہا۔ پھر اس نے جماہی لی اور مڑ کر دیکھا سامنے ایک لمبی راہداری تھی جو متعدد دروازوں کے درمیان سے دور تک چلی گئی تھی۔

تبھی اسے ایک لمبے سے بچھے ہوئے کارپٹ پر ایک ہیولا دکھائی دیا یہ ایک لڑکی تھی جو اس پر چلتی آ رہی تھی۔ اس نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ اس کا گورا رنگ اس لباس میں نچ رہا تھا۔ لڑکی خوب صورت تھی۔ مگر اس کے چہرے پر عجیب سی اداسی پھیلی ہوئی تھی وہ شاہی محل کے کمروں کو بھی ڈرے ڈرے انداز میں دیکھ رہی تھی۔

پھر وہ اسی کمرے میں آ گئی جس میں جارج بیٹھا ہوا تھا۔ اب وہ اس کے قدموں کی چاپیں بھی سن رہا تھا اور اس کی سانسوں کو بھی۔ کمرے میں لگی تصاویر کو اس نے دل چسپی سے دیکھا پھر ایک دم سے وہ ٹھہر گئی جیسے کسی آواز نے اسے ساکت کر دیا تھا۔ اس کی آنکھوں نے کمرے کو کھنگالا اور پھر اس کی نظریں جارج پر آ کر رک گئیں۔

ان آنکھوں میں چوکنے پن کے علاوہ حیرت بھی تھی۔ لمحہ بھر کے لیے جارج کو لگا جیسے لڑکی نے اسے پہچان لیا ہے۔ مگر وہ سمجھ نہ سکا کہ آخر اس نے اسے کس طرح پہچانا۔ اسے بہرحال یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس لڑکی سے پہلے کبھی ملا ہے۔ پھر وہ اسی کی طرف بڑھی اس کے لبوں پر ہلکا سا تبسم ابھرا ہوا تھا۔ قریب آ کر وہ سیٹ کے دوسرے کونے پر بیٹھ گئی اور اپنی خوب صورت سیاہ آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

پھر اس نے کہا۔ ”ہیلو۔۔۔ میرا نام کیرولا ہے۔“

اب سے پہلے کسی لڑکی نے جارج کی اس طرح پذیرائی نہیں کی تھی لہٰذا وہ تھوڑا سا شرما رہا تھا۔ جواب میں وہ کچھ نہیں بولا تو لڑکی نے دوبارہ کہا۔

”کیا بول نہیں سکتے۔“ اس کے لہجے میں ہلکی سی بے تکلفی موجود تھی۔ اس بار جارج نے ہمت کی اور کہا۔ ”بول سکتا ہوں۔“

''خوب۔'' لڑکی نے کہا۔ ''میں نے پہلی ہی
ملاقات میں رشتے کو تاڑ لیا تھا۔ یقیناً ہمارے درمیان
خاندانی تعلق ہوگا۔ تمہارا کیا خیال ہے۔''

عجیب سا سوال تھا۔ اس نے سوچتے ہوئے
کہا۔ ''خاندانی تعلق؟''

''ہاں۔'' لڑکی نے سر ہلایا۔ ''قریبی نہ سہی تو
دور کی کوئی نہ کوئی رشتے داری ضرور ہوگی۔ لیکن یہ جگہ
ان باتوں کے لیے مناسب نہیں۔ میں آج دن کی
روشنی میں باہر نکلی ہوں اور بہت خوش ہوں۔ راتوں
میں عجیب یکسانی ہوتی ہے اور پھر ان میں، میں اپنے
آپ میں بھی کہاں ہوتی ہوں۔''

جارج کو لڑکی کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ شاید یہ
لڑکی دماغی طور پر کھسکی ہوئی ہے۔ اس نے احتیاط
سے کہا۔ ''آج کا موسم ٹھیک نہیں ہے۔''

لڑکی نے اسے اس انداز سے دیکھا جیسے اس
نے کوئی بے تکی بات کہہ دی ہو۔

''کیا کہہ رہے ہو یہ تو نہایت پیارا موسم ہے۔
کالے گھنے بادل ہیں۔'' جارج کو لڑکی کی بات پہ تعجب
ہوا مگر اس نے دوسرا جملہ کہا۔

''مگر جلد ہی وہی پریشان کن سورج پھر نکل
آئے گا۔''

لڑکی اس کا جملہ سن کر ذرا سی دبک گئی جیسے یہ
جملہ اس کے لیے کوئی پتھر رہا ہو۔ وہ رندھے ہوئے
لہجے میں بولی۔ ''یہ تم کیسی دل آزار باتیں کر رہے
ہو۔ محکمہ موسمیات کی پیش گوئی ہے کہ موسم ابر آلود
رہے گا۔ تم مجھے ڈرا رہے ہو۔''

جارج کو یہ لڑکی بہت عجیب سی لگی تھی۔ اس نے
جذبات سے معذرت کی مگر لڑکی ابھی جارحانہ موڈ میں
تھی اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اگر میں تم سے نقرئی گولی کا ذکر کروں تو
تمہیں کیسا لگے گا؟''

اس بار بھی معاملہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ اس
نے ایک انگلی سے سر کھجایا۔ کچھ بھنویں سکوڑیں اور
ہچکچاتے ہوئے بولا۔

''میں تمہاری بات سمجھ نہیں سکا۔ تاہم یہ ذکر
چاہو تو کر سکتی ہو۔''

لڑکی نے اپنا رومال اپنے ہینڈ بیگ میں رکھا۔
اٹھی اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی کمرے سے باہر
نکل گئی۔ جارج اسے جاتے دیکھتا رہا جب وہ
راہداری عبور کر کے مڑ گئی تو وہ بڑبڑایا۔

''عجیب پاگل لڑکی تھی۔ بالکل پاگل۔''

یہ لڑکی اسے اچھی لگی تھی۔ مگر کتنا اچھا ہوتا کہ یہ
صحیح الدماغ بھی ہوتی۔ بہرحال اس لڑکی کے اس
طرح چلے جانے سے اسے ایک قسم کے زیاں کا
احساس ہو رہا تھا۔ کچھ دیر وہ اسی طرح خالی خالی بیٹھا
رہا۔ پھر اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا بارش رک چکی
تھی۔ البتہ گہرے بادل ابھی تک موجود تھے۔

''گھنے بادل ۔۔۔ پیارا موسم۔'' وہ لڑکی کی
باتوں کو سوچتا ہوا بڑبڑایا۔ جارج اس وقت صحن میں آ
چکا تھا جب کسی نے اسے پیچھے سے چھوا۔ اس نے مڑ
کر دیکھا۔ ایک غم زدہ سی مسکراہٹ موجود تھی۔

''دیکھو۔'' اس نے کہا۔ ''مجھے کوئی وضاحت
نہیں کرنی۔ خصوصاً اس سلسلے میں جو تمہیں معلوم
ہے۔ خیر تم ہمارے اپنوں میں سے ہو۔'' جارج نے
کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں ناراض
کر دیا۔'' اس لڑکی کا ملنا اس کے لیے کسی نعمت جیسا
تھا۔

''ٹھیک۔'' لڑکی نے آگے بڑھ کر اس کے
بازوؤں میں اپنا ہاتھ اس طرح پھنسا دیا جیسے ان کے
درمیان بہت پرانی شناسائی ہو اور خوشی بھرے لہجے
میں بولی۔ ''بس اب آئندہ ان باتوں کو مذاق مت
بنانا۔''

''ٹھیک ہے۔'' جارج نے کہا۔ ''مگر اس کے
فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ وہ باتیں کیا تھیں لڑکی نے
جن کا حوالہ دیا تھا۔ تاہم اس نے موسم اور نقرئی
گولیوں کے موضوع کو دوبارہ کبھی نہ چھیڑنے کا فیصلہ
ضرور کر لیا۔

''تم میرے ساتھ چل کر میرے والدین سے

ملو۔'' لڑکی نے کہا۔ ''وہ تم سے مل کر بے حد خوش ہوں گے۔ انہیں اپنی قوت شامہ پر یقین نہیں آئے گا۔''

ایک بار پھر جارج کو اس لڑکی کے کھسکے ہونے کا احساس ہوا۔ ''قوت شامہ'' اس نے سوچا مگر اس نے کہا۔ ''ابھی اتنی جلدی۔''

وہ ہنسی۔ ''تو اور کیا سارے وہ تو حیران ہو جائیں گے۔ برسوں بعد ہم کو موقع ملے گا کہ ہم کسی مہمان کے ساتھ کھل کر باتیں کر سکیں گے۔''

جارج مسلسل سوچ رہا تھا کہ اس لڑکی کی باتیں منتشر اور بے معنی سی ہیں تاہم اس نے کہا۔ ''میں فطری انداز کا قائل ہوں اور ڈھکی چھپی باتوں سے پرہیز کرتا ہوں۔''

''خوب۔'' لڑکی چہکی۔ ''میں ڈیڈی کو بتا دوں گی تاکہ وہ بھی تم سے فطری انداز میں ملیں۔'' وہ ہنسی تو جارج کو مزید حیرت ہوئی۔ اس میں ہنسنے والی کوئی بات نہیں۔ لڑکی ہنستے ہنستے ایک دم سے رک گئی۔ اس کی نظریں آسمان کی طرف تھیں جہاں گھنے بادل پھٹ رہے تھے۔ لڑکی کے منہ سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔

''شیطان کی قسم۔ شاید وہ مکروہ سورج نکلنے والا ہے۔''

''لگتا تو یہی ہے۔'' جارج ہکلایا پھر جلدی سے بولا۔ ''شاید تمہیں سورج پسند نہیں ہے۔''

لڑکی کے نقوش کسی نامعلوم خوف سے بگڑ گئے تھے۔ جارج کو یقین ہونے لگا کہ یہ لڑکی واقعی پاگل ہے مگر پھر بھی وہ تھی بہت حسین۔ اس نے اسے بازوؤں میں گھیر لیا۔

''تم مجھے اب جلدی سے گھر لے چلو، لڑکی نے تشویش ناک انداز میں کہا۔'' ''فوراً۔''

جارج نے آسمان پر نگاہ ڈالی جہاں گھنے بادل پھر سے قائم ہو گئے تھے اس نے کہا۔ ''تشویش کی بات نہیں، بادل پھر گھر رہے ہیں تب لڑکی نے اس کے سینے سے سر ہٹا کر اوپر دیکھا اور بادلوں کو دیکھا اور پھر اس کے سمٹے ہوئے ہونٹوں پر پھر ایک دلکش مسکراہٹ ناچ اٹھی۔

''خوب صورت۔۔۔ کیسے سیاہ بادل ہیں یہ اور ہوا بھی ہے۔ ہمیں اب خبیث سورج کا خوف نہیں۔''

جارج کو لڑکی کی باتوں سے، خود لڑکی سے دلچسپی پیدا ہو چکی تھی۔ اس نے اس تبصرے پر توجہ نہیں دی۔ جو محبت اب تلک اسے کتوں سے تھی اب وہ اسے اس لڑکی پر نچھاور کرنا چاہتا تھا۔

''چلو میں تمہیں تمہارے گھر پہنچا دوں۔''

☆☆☆

جارج نے وہ آہنی پھاٹک کھولا جس کے پیچھے ایک پختہ راستہ تھا جو ایک ایسے مکان پر رکتا تھا جس پر ابھی تازہ تازہ رنگ و روغن کیا گیا تھا۔ کھڑکیاں صاف ستھری تھیں۔ لندن کے مضافاتی علاقوں میں ایسے مکانات کی کمی نہ تھی۔

صدر دروازے پر ایک عورت نے بڑھ کر کیرولا کو اپنے سے چمٹا لیا۔ یہ عورت پختہ عمر کی تھی۔ بال سپید ہو چکے تھے۔ جسم فربہ تھا۔ ''اوہ شکر ہے۔ تم آ گئیں ہم تو ڈر گئے تھے کہیں تم شمسی طوفان میں نہ پھنس جاؤ۔''

کیرولا نے اپنے ماں کے سپید رخساروں کو بوسہ دیا۔ پھر اس نے چمکتی آنکھوں سے جارج کی طرف دیکھا۔ ''ممی یہ۔۔۔'' اس نے کہا۔ پھر ہنستے ہوئے بولی۔ ''کیا نام ہے تمہارا؟''

''جارج۔۔۔ جارج ہارڈ کیسل۔''

کیرولا کی ماں ایک دم سے چوکنی ہو گئی بلکہ یوں کہنا درست ہوگا کہ وہ دہشت زدہ ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی بیٹی کو اس طرح دبوچ لیا جیسے کسی آدم خور شیر سے اسے بچانا چاہتی ہو۔ تبھی کیرولا ہنسی۔ اس نے ماں کے کان میں کچھ کہا اور بوڑھی عورت کے تاثرات ایک دم سے تبدیل ہو گئے۔ وہ جیسی کھل اٹھی تھی۔

''کیا واقعی۔ تمہیں کہاں ملا؟''

''شاہی محل میں۔'' کیرولا نے کہا۔ اس کا لہجہ فخریہ سا تھا۔

ممی نے آگے بڑھ کر جارج کو بازوؤں سے تھام لیا اور اس کے ماتھے کو چوما۔ پھر پیچھے ہٹ کر اس نے جارج کا سر سے پیر تک کا جائزہ لیا۔

''آؤ میں تمہیں کیرولا کے باپ سے ملواؤں۔ وہ تم سے مل کر بے حد خوش ہوں گے۔ گھر میں ہم دو عورتوں کے سوا کوئی نہیں۔''

وہ ان کے ساتھ چلتا ہوا ایک نئے راستہ ہال میں داخل ہوا اس نے اپنا کوٹ اتارا۔ پھر ممی نے ایک دروازہ کھولا اور پرشور آواز میں جیسے حکم دیا۔

''فادر اپنی ٹائی باندھ لو۔ مہمان آئے ہیں۔'' کچھ کھڑ بڑسی ہوئی۔ ممی نے مسکرا کر جارج کو دیکھا۔

''چاہو تو اوپری منزل میں جا کر ہاتھ دھولو۔''

''نہیں شکریہ۔'' جارج نے کہا۔

''تو پھر آؤ پارلر میں چلتے ہیں۔''

''پارلر میں چمکیلے گلابی بلب لگے ہوئے تھے۔ عمدہ قسم کے صوفے اور آرام دہ کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ چند تصاویر بھی دیواروں پر آویزاں تھیں اور ایک طرف ایک ریکارڈ پلیئر رکھا ہوا تھا۔ یہاں ایک مصنوعی سا آدمی جس کے سر کے بال اڑ رہے تھے، صوفے پر سے جلدی سے اٹھا۔

''فادر!'' ممی نے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''اس سے ملو یہ جارج ہے۔ اس نوجوان کو کیرولا اپنے ساتھ لائی ہے۔'' رک کر اس نے کہا۔ ''یہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ تمہیں تشویش کی ضرورت نہیں۔'' فادر نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھایا اور گرم جوشی سے بولا۔ ''تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ میں واقعی خوش ہوں۔'' کیرولا کے لیے اب ضروری ہو گیا تھا کہ اپنے لیے کوئی رفیق ڈھونڈ لے۔ مگر اچھے رفیق آسانی سے کہاں ملتے ہیں اب۔''

فادر کا ہاتھ نہایت سرد تھا اور اس کا لمس بھی نا پسندیدہ تھا۔

''اچھا بس اب چپ ہو جاؤ۔'' ممی نے مداخلت کی کیونکہ کیرولا باپ کی باتوں پر شرما رہی تھی۔

''ارے بھئی تم کھڑے کیوں ہو۔ بیٹھو، بیٹھ جاؤ۔'' فادر نے جلدی سے کہا۔

جارج اس صوفے پر فادر کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

''کچھ کھایا پیا بھی تم نے۔۔۔؟'' ممی نے کہا۔

''فریج میں گوشت اور انڈے موجود ہیں۔ ذرا دیر میں تل لوں گی۔''

''اوہ۔۔۔ اس کی کیا ضرورت ہے۔'' جارج نے تکلیف برتا۔

''ارے بھئی پکانے دو انہیں۔ موقع ہی کہاں ملتا ہے۔'' فادر نے کہا۔

''تب ہم تم گپ شپ کریں گے۔''

دونوں ماں بیٹی کچن کی طرف چلی گئیں۔

تب فادر نے پوچھا۔ ''کیا تعطیلات پر نکلے ہو۔''

''نہیں۔''

فادر نے بات اچک لی۔ ہمیں کلیلون میں بڑا مزا آیا تھا۔ بہترین موسم تھا۔ دو ہفتے تک زبردست کھر پڑی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دیتا تھا۔

''خوب۔'' جارج نے مختصراً کہا اور پھر خاموشی میں ڈوب گیا۔ معاً اسے احساس ہوا کہ اسے ٹھوکا دیا جا رہا ہے۔

''بے شک میرا سوال نازک سا ہے۔ اگر تم جواب نہ دینا چاہو تو نہ دینا۔ مگر۔۔۔ یہ بتاؤ چولا کتنی بار بدلتے ہو؟''

عجیب سا سوال تھا۔ مگر اخلاقاً جواب دینا ضروری تھا۔ وہ ہکلایا۔

''بس۔۔۔ ہفتے ہفتے۔ دراصل میں نہانے میں بہت کاہل ہوں۔'' فادر کے چہرے پر گہری حیرانی پھیل گئی۔

''اتنی جلدی جلدی۔'' وہ بڑبڑایا۔ ''مجھے حیرت ہے۔ عموماً تو یہ عمل اسی وقت کیا جاتا ہے جب آسمان میں پورا چاند نکلا ہوا ہو۔''

''کیوں۔۔۔ کوئی خاص وجہ ہے۔'' اس بار

جارج نے پوچھا۔

''اسے چھوڑو۔'' معافادر نے کہا۔ ''مجھے خوشبو آرہی ہے۔ دراصل ہماری قوت شامہ بہت عمدہ ہے۔''

الجھا ہوا سوچتا ہوا جارج اس کے ساتھ کچن میں پہنچا۔ میز پر چھری کانٹے اور پلیٹیں سجی ہوئی تھیں۔ تین گلاس بھی بھرے رکھے تھے۔ جن میں اسٹرا موجود تھا۔ جارج کو اس وقت حیرت ہوئی جب صرف اسی کی پلیٹ میں انڈے اور گوشت ڈالا گیا۔

''لومیاں! تم تو شروع کرو۔'' فادر نے کہا۔

جبکہ بقیہ تینوں افراد نے گلاس میں بھرے ہوئے سرخ سیال سے شغل شروع کردیا۔ جارج نے سوچا شاید ٹماٹر کا جوس ہے۔ وہ اسٹرا کے ذریعے اسے پی رہے تھے۔ کیرولا نزاکت سے سپ کررہی تھی۔ ممی کے انداز میں کچھ تذبذب تھا جبکہ فادر کا انداز حریصانہ تھا۔ اپنے گلاس سے منہ ہٹاتے ہوئے ممی نے کہا۔ ''اب اصل مشروب کہاں ملتا ہے۔ براہ راست حصول کا مزا ہی اور تھا اب تو ڈبوں سے ہی کام چلانا پڑتا ہے۔''

نہ جانے کس طرح جارج کے منہ سے وہ سوال نکل گیا جو وہ پوچھنا نہیں چاہتا تھا۔ ''کیوں جناب کیا آپ لوگ کھانا نہیں کھاتے؟''

پھر جو خاموشی چھائی۔ جارج کو اسی سے اندازہ ہوا کہ اس نے کوئی بھیانک غلطی کردی ہے۔ فادر نے جلدی سے گلاس رکھ دیا۔ کیرولا نے کہا۔

''اوہ جارج!'' اس کے لہجے میں فہمائش تھی۔ پھر ممی کی آواز ابھری جس میں ناگواری تھی۔ ''لڑکے کیا تمہیں معقول تربیت نہیں ملی ہے؟''

''میں معذرت خواہ ہوں، مگر۔۔۔''

''تمہیں ہونا بھی چاہیے۔'' ممی نے ترشی سے کہا۔ ''بھلا یہ سوال کرنے کا ہوتا ہے۔ تمہی بتاؤ اگر میں تم سے پوچھوں کہ چاند راتوں میں تم نے کس کا گوشت چبایا ہے۔ تو تم کیسا محسوس کروگے۔ اچھا خیر چھوڑو۔ لو کچھ پڈنگ بھی کھاؤ۔''

بات بہ ظاہر ختم ہوگئی تھی مگر جارج کے پلے نہیں پڑا تھا کہ اس سوال میں کون سی برائی تھی۔ اسے کچھ برا بھی لگ رہا تھا کہ اس کی زیادہ تر باتیں اس گھرانے کو پسند نہیں آرہی تھیں۔

''دیکھو لڑکے! بہت سی باتیں کہنے کی نہیں ہوتیں۔'' فادر نے بھی ایک ٹکڑا اجڑا تو اس کا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا۔ اس نے چھری کانٹا پلیٹ پر پٹخ دیے۔ اور شاکی انداز میں بولا۔

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ میں کیا بولوں۔ میں نے موسم کی بات کی تو منع کردیا گیا۔ میں نے آپ حضرات سے کھانے کے بارے میں پوچھا تو آپ کو ناگواری ہوئی۔ آپ نے مجھ سے چولا بدلنے کی بات پوچھی تو میرا جواب آپ کو حیران کن لگا۔ پتا نہیں آپ لوگ کس دماغ کے ہیں۔''

کیرولا ایک دم سے رونے لگی اور خیر سے اٹھ کر باہر چل دی۔ فادر کے منہ سے کوئی بڑبڑاہٹ سی برآمد ہوئی۔ ممی کا چہرہ اتر گیا۔ کچھ سوچتے ہوئے بوڑھی عورت نے پوچھا۔ ''یعنی تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تمہیں کچھ نہیں معلوم؟''

''میں یہ سمجھنا چاہتا ہوں کہ مجھے آپ لوگوں کی باتیں معتہ لگ رہی ہیں۔'' جارج نے گرم لہجے میں کہا۔

ممی اور فادر نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر دونوں یک زبان ہوکر بولے۔ ''اسے بتانا ہوگا۔''

''تم بتاؤ۔'' ممی نے فادر سے کہا۔

''اس میں بتانا کیا ہے۔'' فادر نے بھنا کر کہا۔ ''میرے باپ نے مجھے کبھی نہیں بتایا کہ میں ایک ویمپائر ہوں۔''

''مگر یہ تمہاری طرح ذہین نہیں لگتا۔'' ممی نے کہا۔ ''پھر یہ اصل نہیں ہے۔ لگتا ہے گزیدہ ہے۔'' رک کر ممی نے جارج سے پوچھا۔

''تمہیں حال میں کاٹا گیا ہے؟''

جارج نے صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ اب یہاں نہیں رکنا چاہتا تھا۔

''ہماری ناک دھوکا نہیں دیتیں۔'' فادر نے کہا۔ ''لڑکے تم ایک ویئر وولف ہو۔ تمہارے اندر دوں نے ابھی کام شروع نہیں کیا ہے مگر ہمیں ان کی بو محسوس ہوتی ہے۔'' رک کر اس نے اپنی بیوی سے پوچھا۔ ''چاند کی کیفیت کیا ہے؟''

ممی نے جارج کو مخاطب کیا۔ ''میرا اندازہ ہے کہ اگلے جمعے کی رات میں تمہاری ہیئت بدلے گی۔ تمہارے قرب وجوار میں کوئی کھلی ہوئی جگہ ہے؟''

''ہاں۔ کیلاخم کا علاقہ ہے۔ ایک لمبا میدان ہے۔''

''تمہیں وہاں دوڑ لگانی چاہیے مگر اس سے قبل اپنا چہرہ چھپا لینا۔ عام لوگ کسی ویئر وولف کو پہلی بار دیکھ کر بات کا بتنگڑ بنا دیتے ہیں۔''

جارج نے اپنی کرسی چھوڑ دی اور چلنے لگا۔ ممی کے چہرے پر پرنا گواری پیدا ہو رہی تھی۔

''اب ہم صاف صاف بات کریں گے۔'' ممی نے کہا۔ ''یہ جو کچھ ہم پی رہے ہیں۔ تمہارے خیال میں یہ کیا ہے؟ ٹماٹو جوس؟ اور سنو یہ جان لو کہ ہم تمہارے بہترین دوست ہیں۔ جو بھی پورا چاند آسمان میں نکلا تم سے کوئی رابطہ رکھنا پسند نہیں کرے گا لہٰذا ہمارے ساتھ بگاڑ کی ضرورت نہیں۔''

مگر جارج وہاں سے کھسک چکا تھا۔ اس نے دوڑ کر ہال پار کیا۔ صدر دروازے سے باہر آیا اور بالآخر گیٹ سے بھی نکل آیا۔ پھر وہ فٹ پاتھ پر پہنچ کر بلند آواز سے چیخا۔

''پاگل کہیں کے۔۔۔ ایک دم پاگل۔''

چند راہگیروں نے اسے حیرانی سے دیکھنا شروع کر دیا۔

☆☆☆

اس بار جب آسمان میں پورا چاند ابھرا۔۔۔ تو جارج کے اندر ایک عجیب سی بے چینی پیدا ہونے لگی۔ وہ ایک دم سے جاگ گیا۔ حالانکہ وہ گہری نیند میں تھا۔

اسے چاندنی رات میں نکل کر دوڑنے بھاگنے، ناچنے کودنے کی ایک شدید خواہش محسوس ہوئی۔ وہ ہر ایسا کام کرنا چاہتا تھا جو انسانی خصلت میں شامل نہ تھا اور پھر جب وہ باہر آیا اور اس نے گردونواح میں پھیلی ایک کھلی جگہ پر دوڑنا بھاگنا شروع کیا تو اسے ایسی خوشی کا احساس ہوا جس سے وہ نا آشنا تھا۔ اس خوشی کا اظہار وہ صرف کسی کتے کی طرح بھونک کر ہی کر سکتا تھا۔ غراہٹوں سے ہی اس کا اظہار ممکن تھا۔

پھر جب اس کے کمرے کی کھڑکی میں سورج نے اپنی پہلی کرن ڈالی تو جارج کو جیسے ہوش آ گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ اور چہرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اس کے ذہن میں گزشتہ رات کے واقعات ابھرے ہوئے تھے۔

اب تک اسے بس اسی قدر علم تھا کہ اس میں کوئی خوف ناک تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ مگر یہ ابتدائی دور تھا یا یہ ابتدائی راتیں تھیں۔ کبھی کبھی وہ تکیے میں سر گھسا کر سسکنے بھی لگتا تھا اور سوچتا تھا کہ یہ سب ایک واہمہ ہے اور بس۔

''ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ پاگل لوگ اسے پاگل بنا رہے ہیں۔''

اس کے رویے میں جو تبدیلی پیدا ہو رہی تھی ایسی نہ تھی کہ کسی کو نظر نہ آتی۔ وہ ایک دم سے تنہائی پسند ہو گیا تھا۔ لوگوں سے گریزاں رہنے لگا تھا اور اکثر کسی معمولی سے کھٹکے پر بھی چونک اٹھتا تھا۔ اجنبی لوگوں سے اس نے دوری اختیار کر لی تھی۔ انہیں دیکھ کر اس کی آنکھیں غیر فطری انداز میں پھیل جاتی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد اس کے ہونٹوں پر ایک ایسی مسکراہٹ پھیلتی تھی جیسے کسی درندے نے منہ کھول کر اپنے دانتوں کی نمائش کی ہو۔ اس کی ماں نے اس کی عادتوں کی اس تبدیلی کو نوٹ کر لیا تھا اور اسے کئی بار جھڑکا بھی تھا۔

''کیا تمہارا دماغ خراب ہو رہا ہے۔ دودھ والا کل مجھے بتا رہا تھا کہ اس نے تمہیں مسز فورڈ کے کتے کے ساتھ اسی کی طرح غراتے سنا ہے۔''

''وہ میرے اوپر چلا رہا تھا۔'' جارج نے

وضاحت کی۔ ''میں کیا کرتا۔''

''خوب اور تم نے جواباً اسی کتے کی طرح غرانا شروع کر دیا تھا۔'' رک کر اس کی ماں نے ایک اور سوال جڑا۔ ''میرے سو جانے کے بعد کیا تم راتوں کو باہر نکلتے ہو؟''

جارج کے لیے جھوٹ بولنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے جواب میں ایک سوال کر دیا۔ ''مجھے کیا ضرورت ہے؟''

''یہ تم جانو۔'' اس کی ماں نے تجدیدی لہجے میں کہا۔ ''کچھ لوگوں نے کسی پاگل کو رات میں سامنے کے میدان میں دوڑتے بھاگتے دیکھا ہے۔''

جارج میں جسمانی تبدیلی بہت آہستگی سے شروع ہوئی تھی۔ ایک رات جب وہ جاگا تو اسے اپنے دانتے ہاتھ میں شدید درد کا احساس ہوا وہ یونہی پڑا رہا۔ ہاتھ کو دیکھنے کی اس میں ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے کچھ دیر بعد اپنے بائیں ہاتھ سے بیڈ لمپ روشن کیا اور پھر اس نے دائیں ہاتھ کو چادر سے باہر نکالا۔ اس نے دیکھا کہ اس کی ہتھیلی بالوں سے بھر گئی ہے۔ اسے اپنی انگلیاں سخت سی محسوس ہوئیں۔ وہ مڑ گئی تھیں کسی پنجے کی طرح اور ان میں سے تیز نوکیلے ناخن جھانک رہے تھے۔ ذرا سی دیر میں اس کی کراہت رفع ہونے لگی اور اس کی جگہ اسے ہر تبدیلی فطری لگنے لگی۔ گویا بال، یہ ناخن، یہ پنجے سب کوئی خاص بات نہ تھے۔

دوسری صبح اس نے دیکھا کہ اس کا دایاں ہاتھ بالکل نارمل ہے بائیں ہاتھ کی طرح۔ وہ رات کی بات کو ایک خواب سمجھ کر ٹال بھی نہیں سکا۔

البتہ ایک رات کو اس نے ایک خواب دیکھا۔ یہ بہت ہی بھیانک سا خواب تھا۔ اس میں حقیقت اور افسانہ ایک اٹل تھے۔ جارج انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ میدان میں لمبی لمبی زقندیں بھر رہا تھا اور اس کا دل خوشی سے مست ہو رہا تھا۔ ایک لامحدود آزادی کا احساس اس میں بھر گیا تھا وہ ایک سیاہ و سپید دنیا میں تھا۔ سیاہ گھاس، سپیدی بھرے اشجار، بھورا آسمان، سفید چاند، تاہم تمام تر مسرتوں کے باوجود اس کے شعور میں کہیں یہ بات موجود تھی کہ یہ سب کچھ غیر فطری ہے۔ یہ ایک خوف ناک تجربہ ہے۔ اسی شعور نے اسے کئی بار جھنجھوڑا۔

''جاگو، جاگ جاؤ'' مگر وہ تو جاگ رہا تھا۔ اسے چلتی ہوئی ہوا اپنے بال بھرے بدن سے مس ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک بڑی سی بلی اس کے سامنے سے بھاگ رہی تھی۔ وہ پناہ کے لیے درخت پر چڑھ جانا چاہتی تھی۔ لیکن ایک ہی زقند میں اس نے اسے پکڑ لیا اس کے پنجوں کی گرفت میں بلی کے منہ سے کئی اذیت ناک چیخیں برآمد ہوئیں۔ اس کے بعد چیر پھاڑ۔۔۔ خون نوچتے ہوئی دانت۔ یہ سارے کام مسرت بخش تھے۔ وہ آلودہ ہو رہا تھا۔

دوسری صبح جب وہ بے دار ہوا۔ اپنے بستر پر تو وہ اس سارے واقعے کو خواب کہہ کر بھلا سکتا تھا مگر وہ ان خراشوں کو کیا کہتا جو اس کے چہرے اور اس کے ہاتھوں پر تھیں اور وہ خون جو اس کے بالوں میں لگا ہوا تھا۔ اس کے ذہن میں ماہر نفسیات، سائیکاٹرسٹ، پاگل خانے، مذہبی عالم، پادری گھومنے لگے اور پھر وہ اسی نتیجے پر پہنچا جو سب سے قریب قیاس تھا۔ اس زمین پر صرف دو افراد ہی ایسے تھے جو ان ساری محیر العقول باتوں کی وضاحت کر سکتے تھے۔

ممی نے جارج کو اندر بلا لیا۔ فادر نے حسب سابق گرم جوشی سے اس سے ہاتھ ملایا۔ کیرولا نے اسے بوسہ دیا اور جب اس نے رونا شروع کیا تو کیرولا نے اسے تسلی دی۔

''ہم یہ نہیں پوچھتے کہ ہم کون ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''ہمارے پاس رہنے سے زیادہ رکھنے کی دلچسپیاں ہیں۔''

''ہاں، ہم سب کی عظیم قبرستان میں اپنی اپنی جگہیں ہیں۔'' فادر نے کہا۔ ''تم شکار کرتے ہو، ہم پیتے ہیں۔ غول نوچتے پھاڑتے ہیں، شیڈی لوگ چاٹتے ہیں، موک لوگ پھونکتے ہیں اور خوش قسمتی سے شیڈ موک صرف سیٹی بجاتے ہیں۔''

''کیا میں ہمیشہ یہی رہوں گا۔۔۔ جو ہوں۔'' جارج نے پوچھا۔

تینوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ممی نے سنجیدگی سے، فادر نے عالمانہ انداز میں اور کیرولا نے افسردگی سے کہا۔ ''ہاں ہمیشہ جب تک آسمان سے چاند رخصت نہیں ہو جاتا۔''

''یا پھر جب تک تمہارے سینے میں کوئی نقرئی گولی نہ اتار دے۔'' کیرولا نے سرگوشی میں کہا۔ ''یا پھر تم بہت ضعیف نہ ہو جاؤ اور تبدیلی ہیئت کے دوران تمہارا دل فیل ہو جائے۔''

''ایسی باتوں کی ضرورت نہیں۔'' ممی نے منع کیا۔ ''یہ غریب پہلے ہی بہت سہما ہوا ہے۔ اسے چائے بنا کر دو اور ہمارے لیے مشروب لاؤ۔''

اس جگہ کی مجلس میں تین افراد ہدایات اور مشورے دیتے رہے اور ایک فرد سنتا رہا۔

''سارے عفریتوں کو، گرجا گھروں سے، پادریوں سے، مذہبی علما سے اور بوائے اسکاؤٹوں سے ہمیشہ دور رہنا ہوتا ہے۔'' فادر نے کہا۔

''صلیب اور عبادت دونوں سے بچنا ضروری ہے۔'' ممی نے کہا۔

''ایک کے بجائے دو ہوں تو فرار میں آسانی رہتی ہے۔'' کیرولا نے کہا۔

دوسرے روز جارج نے اپنی ماں سے کہا کہ وہ اب اس گھر سے نکل کر خود اپنا گھر بنانا چاہتا ہے۔ مسز ہارڈ کیسل نے احتجاج نہیں کیا اسے خود اپنے بیٹے میں ایسی تبدیلیاں محسوس ہو رہی تھیں کہ وہ اسے اجنبی اجنبی لگنے لگا تھا۔ ''مناسب خیال ہے۔'' اس نے کہا۔ پھر اس نے سامان بندھوانے میں لڑکے کی مدد شروع کر دی۔

فادر کو مکانات کے بزنس میں کچھ تجربہ تھا اس نے جارج کے لیے ایک چار کمروں والی کاٹیج کا بندوبست کر دیا۔ یہ کاٹیج ایک چرچ یارڈ سے متصل تھی۔ اس میں کچھ ضروری سامان پہنچا دیا گیا۔ یہ مکان اس کے ذاتی مکان کے مقابلے میں بہتر نہ تھا مگر ادھر کھلی فضا کافی تھی اور آدھی رات کے بعد اس کی مصروفیات کے لیے یہ جگہ موزوں تھی۔

اس کے اندر کسی کو کاٹنے یا مارنے کی کوئی خواہش نہ تھی، ہوتی بھی کیوں۔ حیوانی دنیا میں درندے اسی وقت شکار مارتے ہیں جب بھوکے ہوں۔ وہ بھوکا نہیں رہتا تھا لہٰذا بس دوڑ بھاگ سے ہی اس کو آسودگی مل جاتی تھی۔ چاندنی راتوں کے اس کھیل میں کبھی کبھی وہ بھونکتا بھی تھا اس سے بھی اسے بہت مزا آتا تھا۔ اس کا یہ لطف دن بہ دن بڑھ رہا تھا۔

ان کی شادی عام سی نہ تھی۔ یہ ایک رجسٹری آفس میں ہوئی تھی۔ شاید شیطانی دیوتا ان پر مہربان تھے۔ اس روز صبح سے رات تک کہر پھیلی ہوئی تھی۔ دعوت ولیمہ سادگی سے ہوئی تھی۔ ان لوگوں کے لیے جو کھاتے تھے، کیک رکھا گیا تھا۔ جارج نے کسی کو بھی مدعو نہیں کیا تھا۔ اس نے اسی میں عافیت دیکھی تھی۔ تین غول سفید کفن میں ملبوس ایک ایسی چیز بیٹھے چبا رہے تھے جس کا ذکر مناسب نہیں۔ دولہن اور اس کے گھر والے ایک بڑے مرتبان سے ''سرخ سیال'' انڈیل انڈیل کر پی رہے تھے۔ یہاں انکل ڈیمارک تھے جو قدیم مکتب کے ایک ویمپائر تھے۔ وہ برابر کسی ایسے فرد کے چکر میں تھے جس کے جسم سے وہ براہ راست اپنا ''مشروب'' حاصل کر سکتے۔

دعوت کے بعد یہ جوڑا اپنے گھر کے لیے رخصت ہو گیا۔

کیرولا اور جارج نے دیکھا کہ چاند بہ آہستگی نشیب سے چرچ کے اوپر پہنچ رہا ہے۔ یہ ایک خطرناک بات تھی کیونکہ اس کی وجہ سے صلیب دمکنے لگتی تھی مگر یہ ایک ایسی رات تھی کہ اس میں یہ جوڑا خود پوپ سے بھی ٹکرا سکتا تھا۔

''ہم اب اکیلے نہیں ہیں۔'' کیرولا نے کہا۔

''ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ اس محبت نے ہمیں عفریت سے دیوتا بنا دیا ہے۔''

''ہاں اور اسی کی وجہ سے میری معمولی سی کاٹیج

...ت مریں بن گئی ہے۔'' جارج نے تائید کی۔

مگر وہ بھول گیا تھا کہ ہر پشت میں ایک سانپ بھی ہوتا ہے اور ان کی پشت کا سانپ چرچ کے پادری جان کول کی شکل میں ظاہر ہوا تھا۔ یہ پادری بدی کی قوتوں کو بھانپنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ جلد ہی اس کے ذہن میں ان لوگوں کے بارے میں شبہات سر اٹھانے لگے تھے جو چرچ یارڈ کے قریب بنی کاٹیج میں رہنے آئے تھے۔

ایک روز جب جارج باہر گیا ہوا تھا اس نے کیرولا سے ملاقات کی اور اس نے چرچ میں ہونے والی عورتوں کے ایک اجتماع میں کیرولا کو مدعو کیا۔ اس دعوت پر کیرولا سٹپٹا گئی اس نے جلدی سے معذرت کی تو پادری کول نے کہا کہ وہ انجیل مقدس کی ایک آدھ آیتیں پڑھ کر سنائے۔ بائبل کو دیکھ کر کیرولا کا رنگ زرد ہو گیا۔ اور وہ تھر تھر کانپنے لگی۔ تب پادری کول نے اتفاقی طور سے اپنی صلیب اس کی گود میں گرا دی اور کیرولا اس طرح چیخی جیسے کسی نے اسے آگ میں ڈال دیا ہو پھر وہ زمین پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔ مقدس پادری جب وہاں سے رخصت ہوا تو وہ بہت خوش تھا۔

دوسرے روز جارج نے پادری کول سے ملاقات کی وہ اس وقت کسی گناہ گار عورت کے گھر جا رہا تھا جو بستر مرگ پر تھی۔

''میں نے سنا ہے آپ نے میری بیوی کو آ کر ڈرایا تھا۔ یہ کل کی بات تھی۔'' پادری مسکرایا حالانکہ جارج اپنی انسانی جون میں تھا۔

''میری سمجھ میں نہیں آیا آخر وہ کس قسم کی عورت ہے جو بائبل سے ڈرتی ہے اور صلیب کے لمس سے چیخنے لگتی ہے۔''

''میں بتاتا ہوں۔'' جارج نے کہا اور پادری کے بازو کو گرفت میں لے لیا۔

''ہم دونوں ہی بائبل اور صلیب سے الرجک ہیں۔ ہم کن سوئیاں لینے والے پادریوں سے بھی الرجک ہیں اور مجھے ان تینوں سے نمٹنا بھی آتا ہے۔ تم سمجھ رہے ہو پادری صاحب!'' جارج کے لہجے میں تلخی بھی تھی اور دھمکی بھی۔

''اور میں خدا اور انسان دونوں کے سامنے جواب دہ ہوں۔'' پادری نے ٹیڑھے لہجے میں کہا۔ ''یہ میرا فرض ہے کہ بدی جہاں بھی نظر آئے اس کا سر کچل دوں۔ میرے پاس اس کے لیے ذرائع بھی موجود ہیں۔ سمجھ گئے۔''

پھر دونوں ایک دوسرے سے نفرت زدہ انداز میں رخصت ہو گئے۔ جارج نے اپنی کم علمی کی وجہ سے سوچا تھا کہ اسے خوف زدہ کر کے اپنا مقصد حاصل کر لے گا مگر اسے نہیں معلوم تھا کہ اس سے مزاحمت اور بڑھتی ہے۔ ایک رات جب پورا چاند نکلا ہوا تھا پادری کول کو چرچ کے قبرستان میں ایک ایسی چیز ملی جس نے پوری رات کے لیے اس کی نیند حرام کر دی۔ یہ شے جھکی ہوئی چل رہی تھی اپنے پچھلے پیروں پر اس کے دو بہت لانبے لانبے بازو تھے جو پنجوں کی شکل میں اختتام پر پہنچے تھے اور ان میں بڑے بڑے ناخن موجود تھے۔ اس شے کا چہرہ کسی ڈراؤنے خواب سے برآمد ہوا تھا اس میں ایک تھوتھنی سی موجود تھی۔

اسی لمحے ہر دوسری طرف، پادری کول کی بیوی مسز کول جو ایک خاصی ڈرپوک سی عورت تھی اور جسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ دو لکڑیوں کو کراس کر کے اپنے تحفظ کر سکتی ہے کوشاں تھی کہ اس کے منہ سے چیخ نہ برآمد ہو کیونکہ اس نے ایک سپید سا چہرہ دیکھا تھا یہ ایک جوان عورت کا تھا اور یہ عورت اس کے بیڈ روم میں اس کی جانب بڑھ رہی تھی۔ میاں بیوی دونوں کا ردعمل ان کے اپنے اپنے کرداروں کے مطابق تھا۔ مقدس پادری نے منہ سے ایک چیخ نکالی تھی اور اپنی جان لے کر بھاگا تھا پھر وہ اپنے چرچ میں آ کر ہی رکا تھا۔ جہاں ایک صلیب نے دروازے کو روک رکھا تھا۔ مسز کول کے منہ سے چیخ بھی نہیں نکل سکی تھی وہ بس بے ہوش ہو گئی تھی۔ میاں کی صرف سانسیں ہی پھولی تھیں جبکہ بیوی جب جاگی تھی تو اس کے بدن

...ن کی کچھ مقدار گھٹ چکی تھی۔

پادری لول کچھ عجیب عادات کا آدمی تھا تاہم ...لی ...بھی آبادی اس کی ڈراؤنی قسم کی تقریریں سنا ...لی تھی۔ اس خوف ناک واقعے سے دوچار ہونے ...بعد اس نے اتوار کے دن دھواں دھار قسم کی تقریر ...کی اور ساری آبادی کو خوش کر دیا۔

اس نے کہا۔ ''شیطان نے اپنی ذریت کو ...ہمارے درمیان گھسا دیا ہے اور وہ چرچ کے زیر سایہ ...رہی ہے۔ وہ خدا کے نیک بندوں کو اب اپنی حیوانی ...شکلوں میں نظر بھی آنے لگی ہے۔''

چند لوگوں نے دانت نکال کر مسکراتے ہوئے ...یہ باتیں سنیں تو پادری غضب ناک ہو گیا۔ ''ہنسنے کی ...بات نہیں ہے یہ۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے اس ...شیطانی حیوان کو دیکھا ہے۔ جہاں تم بیٹھے ہو اس سے صرف چند گز کے فاصلے پر اور میں تو سمجھا تھا کہ آج ...میرا نرخرہ ادھڑ ہی جائے گا۔ میں اپنے علم کے مطابق ...یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ مخلوق ایک ویئر وولف ...تھی۔''

سننے والوں میں سے تقریباً دس افراد نے یہی ...سمجھا تھا کہ پادری صاحب اب سٹھیا گئے ہیں۔ بیس ...عدد نے بات کو صحیح طرح سمجھا ہی نہیں کہ کیا کہا جا رہا ...ہے۔ ایک بوڑھی نے خیال کیا کہ پادری اسے کسی ...آیت کی تفسیر سنا رہا ہے۔ بقیہ نے اس کی بات سننے ...کی زحمت ہی گوارا نہیں کی۔

''یہی نہیں میری رفیق حیات جو عرصہ بیس ...سال سے ہے اس نے اپنے شب خوابی کے کمرے ...میں ایک اسی قسم کی شیطانی عورت کو دیکھا ہے۔'' ...مسٹر کول نے تلخ لہجے میں گرجتے ہوئے کہا۔

''یہ ایک ویمپائر تھی۔ ایک گندی چیز۔ قبر سے ...نکلنے والی۔ اس نے میری بیوی سے وہ کچھ حاصل کیا ...جو اس کے لیے بہت اہم۔۔۔''

لاعلمی اور جہالت کی وجہ سے کسی نے بھی مسٹر ...لول کی کہانی کو سنجیدگی سے نہیں سنا۔ سوائے ایک ...ملی ولیم کے ویلی کو ویمپائروں کا علم تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ عفریتوں کی اسی طرح اور نسلیں بھی ہیں مثلاً ویئر وولف، شیاطنین، جنی، اور دیگر عفریت۔ یہ ویلی کوئی بالغ آدمی نہ تھا بلکہ اس کی عمر صرف بارہ برس تھی۔ اس قسم کی مخلوقات کی کتابیں پڑھ پڑھ کر وہ ان کا عالم ہو گیا تھا۔ اس کی الماری میں ایسی ڈھیروں کتابیں تھیں اسے ان سے نمٹنے کے بھی بہت سے گر معلوم تھے۔ یہ سب اس نے ٹی وی اور فلمیں دیکھ کر بھی سیکھے تھے۔ مثلاً اسے معلوم تھا کہ کسی ویمپائر کو صرف اسی طرح ہلاک کیا جا سکتا ہے کہ اس کے سینے میں لکڑی کی ایک نکیلی میخ ٹھونک دی جائے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ کسی ویئر وولف کو صرف ایک نقرئی گولی سے ہی ہلاک کیا جا سکتا ہے۔ بعد میں پادری کی تقریر کو اس نے توجہ سے سنا۔ بلکہ وہ تو سب کو ان سے نمٹنے کے طریقے بھی بتانا چاہتا تھا مگر اس کی ماں نے اسے بری طرح جھڑک دیا تھا جو ساتھ ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

☆☆☆

مارچ کے مہینے کی ایک چمکیلی صبح کو قبرستان کے نزدیک ہی کاٹیج کی آبادی میں ایک اور فرد کا اضافہ ہوا۔ نئے سورج کی پہلی شعاع نے اس روز ایک ویئر ویمپ کو دیکھا۔ یہ اس کاٹیج کے مکینوں کا پہلا بچہ تھا جو ایک ویئر وولف نر اور ایک مادہ ویمپائر کے ملاپ سے پیدا ہوا تھا۔

یہ بھی دوسرے ہی بچوں جیسا تھا۔ چھوٹا سا جھریوں زدہ۔ نہایت بدصورت اس کے دو دانت بہت بڑے بڑے تھے۔ یہ جب روتا تھا تو یہ روتا نہیں تھا بلکہ اس کے منہ سے ایسی پھنکار برآمد ہوتی تھی جیسی کوبرا سانپ کے منہ سے نکلتی ہے۔ ایسے ہی متحرک چیز پر منہ مارنے کی بھی عادت تھی۔

''کیسا اچھا سا ہے۔'' کیرولا نے لمبی سانس لی اور بچے کے سامنے انگلی لہرائی۔ بچے نے منہ سے پھنکار سی نکالی۔

''میرا خیال ہے کہ یہ بہت چالاک نکلے گا۔'' جارج نے کہا۔

''اس کا ماتھا کشادہ اور آنکھیں سیاہ ہیں۔ یہ خاصا ذہین ہوگا۔''

''اس کا منہ بالکل تمہارے جیسا ہے۔'' کرولا نے کہا۔

''ابھی تو نہیں ہے۔'' جارج نے کہا۔ ''ابھی یہ انسان اور خون آشام یعنی ہیوم ویمپ کے ادوار میں ہے۔ لیکن جب چاند پورا ہوگا تو اس کے ہاتھوں میں ناخن اگ آئیں گے اور ایک دم بھی نکلے گی۔''

بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ اس نے صحیح اندازہ لگایا تھا۔ پادری جان کول نے کئی ہفتوں بعد ایک بار پھر اس گھر اپنے پر دستک دی۔ اس دوران اس نے کافی ہمت مجتمع کی تھی۔ لوگوں سے مشورے بھی لیے تھے جو اسے بددلی سے دیے گئے تھے۔ اس کی تقریر سننے کے لیے بھی اب لوگ ذرا کم آ رہے تھے بلکہ اسے سامنے سے آتا دیکھ کر اب اِدھر اُدھر ہو جاتے تاکہ وہ اس کی بہکی بہکی باتیں سننے سے بچ سکیں۔ البتہ ایک چھوٹا لڑکا ضرور اکثر و بیشتر اس کے کان کھاتا رہتا تھا۔ بہرحال اب پادری ایک ایک معرکے کے لیے تیار تھا۔ اس کے لیے اس نے چند چیزیں جمع کر لی تھیں مثلاً ایک صلیب، ایک چھوٹی سی وھسکی کی بوتل اور اپنا عقیدہ۔۔۔ ان ہتھیاروں کے سہارے وہ یہ جنگ لڑنے نکلا تھا۔ ویلی ولیم نے اپنے گھر کی کھڑکی سے، جہاں سے پادری کی رہائش گاہ نظر آتی تھی، سیاہ کپڑوں میں ملبوس ایک ہیولے کو دیکھا۔ اس نے جب اسے قریب ہوتے دیکھا تو پکار کر بولا۔ ''پادری جی سنو۔ آج آسمان میں پورا چاند ہوگا کیا تمہیں معلوم نہیں۔''

صدر دروازے پر پادری کی زوردار دستک کا کسی نے جواب نہیں دیا۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہ تھی۔ کیرولا مسز کول کے چکر میں دوبارہ نکلی تھی اور جارج ایک بھیڑ کے تعاقب میں گیا تھا۔ بچہ ابھی اتنا بڑا نہ تھا کہ کسی دستک کا جواب دے سکتا۔ بالآخر مقدس پادری نے خود ہی دروازہ کھول لیا۔ اس نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور اندر داخل ہو گیا۔

ڈرائنگ روم میں دو پرانی وضع کی کرسیاں پڑی تھیں ایک فولڈنگ میز تھی اور فرش پر اچھا سا قالین بچھا ہوا تھا۔ چھت سے ایک آئل لیمپ لٹکا ہوا تھا۔ آتش دان میں آگ موجود تھی۔ مسٹر کول نے آواز لگائی۔ ''گھر میں کوئی ہے؟'' اور جواب نہ پا کر وہ ایک قریبی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کرسی آرام دہ تھی اور کمرا گرم۔ پادری کی احتیاط اس آرام دہ ماحول میں گھل سی گئی اور وہ اونگھنے لگا۔ پھر اس کا منہ کھل گیا اور ذرا سی دیر میں وہ سو گیا۔ اس کے منہ سے ہلکے ہلکے خراٹے نکل رہے تھے۔

پادری کی آنکھ کھلی تو اس کی یہ بےداری عام سی نہ تھی۔ وہ بڑی زور سے چیخا تھا کیونکہ اس کے لٹکے ہوئے دائیں پیر میں ہونے والی اذیت ایسی ہی تھی۔ جب وہ حرکت میں آیا تو اسے احساس ہوا کہ کوئی بھاری سی مگر نرم سی چیز اس کے دائیں پیر کے اوپر لدی ہوئی ہے اور اس میں سے ہلکی ہلکی پھنکاریں نکل رہی ہیں۔ پادری کے منہ سے ایک اور چیخ نکلی اور اس نے پوری قوت سے اس شے کو اچھالا جو اس کے پیر پر لدی ہوئی تھی۔ یہ شے فضا میں اڑتی ہوئی کمرے کے فرش پر جا کر گری۔ اس کے منہ سے ایک تیز پھنکار نکلی پھر مڑتے ہوئے اس طرف رینگنا شروع کر دیا جدھر پادری موجود تھا اور تب پادری نے دیکھا کہ یہ ایک شیر خوار بچہ ہے۔ ایک ننھا منا سا بچہ ہے سپید چہرے والا۔ جس کے لبوں کے دونوں کناروں سے دو چھوٹے چھوٹے دانت باہر نکلے ہوئے تھے۔ اس کا سارا جسم بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ پنجوں سے مشابہ تھے اسی طرح اس کی ایک چھوٹی سی دم بھی تھی جو اکڑی ہوئی تھی۔ یہ دم اس وقت غصے میں بار بار ہل رہی تھی یہ بچہ اپنے پچھلے پیروں کے سہارے نہایت آرام سے اچھلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے دہانے پر وہ خون ابھی تک لگا ہوا تھا جو دراصل پادری مسٹر کول کے پیروں پر دانت گاڑنے کے باعث نکلا تھا۔

مسٹر کول کے منہ سے تین عدد چیخیں اور نکلیں۔

پھر وہ اچھلا اور دروازے کی طرف بھاگا۔ یہ ایک عجیب ہی منظر تھا۔ پادری کا ہیولا پاگلوں کی طرح قبروں کو روندتا پھلانگتا بھاگ رہا تھا۔ اس کے عقب میں وہ ''وئیر ویمپ بچہ'' چھلانگیں مارتا لپک رہا تھا۔ ذرا دیر بعد بچے نے منہ سے ایک بلند غراہٹ نکالی اپنے پنجوں سے زمین کو نوچنے لگا۔ یہ دراصل اس کے غصے اور شکار میں ناکامی کا اظہار تھا۔ اس کے ہاتھ سے گویا ایک بھری ہوئی فیڈنگ بوتل نکل گئی تھی۔

☆☆☆

ویلی ولیم بالآخر کامیاب ہوگیا تھا۔ ویلی نے ہی پادری کول کو اٹھایا تھا کہ بھاگتے ہوئے وہ ایک گھنی جھاڑی میں بری طرح پھنسا تھا اور منہ کے بل گر گیا تھا۔ یہ ایسی صورت حال تھی کہ وہ اب کسی بھی شخص کے مشورے کو سننے پر تیار تھا۔ اس کے حواس اس وقت اس طرح گم تھے کہ وہ حکم دینے کے بجائے کسی کے حکم پر خود آنکھ بند کر کے چلنے کی کیفیت میں پہنچا ہوا تھا۔

''وہ میں نے اسے دیکھا تھا۔'' ویلی نے خوشی سے بھرے لہجے میں کہا۔

''اس کے خوف ناک جبڑے تھے۔ دانتوں بھرے۔ وہ ادھر جھاڑیوں والی سمت میں جا رہا تھا۔ چھلانگیں لگاتا ہوا۔''

مسٹر کول نے کراہ کر ہنکاری بھری۔

''اور۔۔۔ میں نے ایک عورت کو بھی دیکھا ہے۔'' ویلی بتاتا رہا۔ ''وہ پادری جی! تمہارے گھر کی طرف گئی تھی۔ پھر بیڈ روم کی کھڑکی سے اندر داخل ہوئی تھی۔ ایسا ہی سین میں ایک ہارر فلم میں دیکھ چکا ہوں۔''

''ان شیاطین کو ختم کر دینا چاہیے۔'' پادری بڑبڑایا۔

''پادری جی! کسی ویمپائر کو صرف اسی طرح مارا جا سکتا ہے کہ اس کے سینے میں میخ ٹھونک دی جائے اور وئیر وولف کو اگر مارنا ہو تو اس پر نقرئی گولی چلانی چاہیے۔''

''تمہیں یہ اطلاع کہاں سے ملی ہے؟'' پادری نے پوچھا۔

''میری ہارر کامک کتابوں میں یہی لکھا ہے۔''

''کہاں ہیں یہ کتابیں؟'' مذہبی عالم نے دوسرا سوال کیا۔

جس وقت ان کا بیٹا ویلی، پادری کو لے کر اپنے گھر پہنچا تو ویلی کے والدین مسٹر اور مسز ولیم حیران رہ گئی۔

''گھبرانے کی بات نہیں۔'' لڑکے نے اپنی ماں سے کہا۔ ''پادری جی میری کامک بک دیکھنے آئے ہیں۔''

اوپری منزل پر بیٹھ کر مذہبی عالم کی معلومات میں خاطر خواہ اضافہ ہوا اور اسے تصاویر اور متن کی مدد سے معلوم ہوا کہ ویمپائروں، وئیر وولفوں اور دوسری سانس لینے اور سانس نہ لینے والی مخلوقات کی عادات مشاغل اور نظریات وغیرہ کیا ہیں۔''

''ہمیں یہ سب کہاں سے ملیں گی؟'' پادری نے پوچھا۔

''لکڑی کی نوکیلی میخ بنالیں گے۔'' لڑکے نے فوراً مشورہ دیا۔

''اور نقرئی گولی؟''

''ڈیڈ کی رائفل کی گولی پر چاندی کا خول آسانی سے چڑھایا جا سکتا ہے۔'' لڑکے نے ایک اور مشورہ دیا۔

مقدس پادری کے پیر میں جب سے بے بی ائر ویمپ نے دانت گاڑے تھے اس نے اس عجیب گھرانے کو تہس نہس کرنے کی ٹھان لی تھی۔

''میں اس عورت کا سر کاٹ لوں گا۔'' ویلی خوشی سے چہکا۔

دوسری بات کا سماں دیدنی تھا۔ اس وقت دو بجنے کا عمل ہوگا۔ ایک بھاری بھرکم پادری، صلیب، اور ہتھوڑے سے لیس چرچ یارڈ میں چوروں کی طرح رینگتا آگے آگے تھا اور اس کے عقب میں ایک بارہ سال کا لڑکا لکڑی کی میخ ایک ہاتھ میں اور

دوسرے ہاتھ میں ایک رائفل سنبھالے اس کے پیچھے پیچھے۔

کاریج کے دروازے پر پہنچ کر پادری نے صلیب سے دروازہ کھولا۔ اندر کا کمرا آرام دہ بھی تھا اور گرم بھی۔ آتش دان کی آگ سے دیوار پر سائے رقصاں تھے۔ چھت سے لٹکا ہوا لیمپ کسی ستارے کی طرح روشن تھا۔ اندھیروں میں گھرا ہوا یہ کمرا کسی روشن گھونسلے کا سماں پیش کررہا تھا۔ جان کول اس میں کسی موت کے فرشتے کی طرح متحرک تھا۔ اس نے اپنی صلیب بلند کرتے ہوئے آواز لگائی۔ ''میں آ گیا ہوں۔ شیطانوں کو نابود کرنے کے لیے۔ میرے آقا کا حکم ہے کہ اندھیروں کے باسیوں کو فنا کردیا جائے۔''

کمرے میں ایک تیز سانس کھینچی گئی۔ یہ ایک بین کرنے جیسی آواز تھی اور کیرولا کے منہ سے نکلی تھی جو کمرے کے ایک گوشے میں سہمی ہوئی دبکی بیٹھی تھی اس کا چہرہ سپید ہوگیا تھا اور آنکھیں دہشت سے پھیل گئی تھیں۔ پادری نے صلیب جھکالی۔

''مگر کیوں؟'' ایک سسکتی آواز نے پوچھا۔

''وہ کٹ کھنا بچہ کدھر ہے جس نے مجھے کاٹا تھا۔'' کیرولا کی آنکھیں مسلسل صلیب پر مرتکز تھیں۔

''وہ۔۔۔ اسے میں نے اس کے نانا کے گھر بھیج دیا ہے۔''

''اچھا تو تم اور رشتے دار بھی رکھتی ہو؟''

''ہماری نسل قریباً قریب اتحم ہے۔''

پادری کو عورت کی آنکھ میں پھیلی دہشت دیکھ کر دلی مسرت ہورہی تھی۔ جب وہ چیخے تو اسے اور لطف آیا۔ اس نے عورت کو گریبان سے پکڑا اور اسے گھسیٹا ہوا میز تک لایا۔ پھر اس نے اسے میز پر چت لٹادیا۔ عورت نے پھولتی سانسوں کے ساتھ التجا کی مگر اس کے منہ سے صرف کراہیں ہی نکل سکیں تاہم ایک چھوٹی سی مزاحمت کے طور پر اس نے پادری کے ہاتھ پر منہ مارا اور خون نکال دیا۔ پادری نے ایک جھٹکے سے اسے ساکت کر دیا۔ پھر اس نے میخ لے کر اسے کیرولا کے سینے پر رکھا اور دوسرے ہاتھ میں دبے ہوئے ہتھوڑے کو فضا میں بلند کرتے ایک زوردار ضرب سے میخ کو کیرولا کے سینے کے پار کردیا۔

''جہنم رسید ہو جاؤ۔'' اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

عورت کے سینے سے خون کا ایک فوارہ ابل پڑا۔ ہتھوڑا ایک بار پھر فضا سے اتر کر میخ پر پڑا۔ کیرولا نے ایک لمبی سانس کھینچی اور ساکت ہوگئی۔

''پادری جی! اس کا سر بھی کاٹ لو ورنہ یہ دوبارہ زندہ ہوجائے گی۔'' عقب میں کھڑا ہوا ولی سرگوشی میں بولا۔ اس کے لیے یہ منظر بہت ہی دل چسپ تھا اور وہ بڑے اشتیاق سے سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔

پادری کول کے بالوں اور منہ پر کیرولا کے خون کے قطرات جمے ہوئے تھے اور اس کا چہرہ خاصا ڈراؤنا ہورہا تھا۔

ولی نے عجلت سے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور وہاں سے اس نے ایک روئی کاٹنے والی چھری برآمد کی۔

لڑکے کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے پادری بڑبڑایا۔ ''اچھا ہوتا کہ میں ایک مضبوط آری ساتھ لے آتا۔''

ابھی وہ کیرولا کی گردن کاٹنے کے کام میں منہمک ہی تھا کہ دروازہ دھڑام کی آواز سے کھلا اور جارج اندر داخل ہوا۔ اس وقت وہ عجیب ہیئت میں تھا یعنی نہ انسان تھا نہ حیوان۔ لمحہ بھر تک وہ دروازے میں کسی خوف ناک پرچھائیں کی طرف منجمد رہا۔ پھر ایک دم سے اچھلا۔ مقدس پادری خوف زدہ ہوکر پیچھے ہٹتا چلا گیا۔

جارج نے بڑھ کر میز پر پڑے کیرولا کے جسم کو بانہوں میں بھرلیا اور چیخا۔ ''تم نے۔۔۔ تم نے میری محبت کو ختم کردیا۔'' اس نے شعلہ بار آنکھوں

سے پادری کو گھورا۔ لڑکے ویلی کے ٹہوکے کے تحت پادری کے جسم میں زندگی پیدا ہو گئی۔ اس نے صلیب کو اپنے سامنے پھیلاتے ہوئے جارج کو مخاطب کیا۔

''تم لوگ بدی کی پیداوار ہو۔ شیاطین کی خبیث روحوں کے ساتھ ہر عمل ایک نیکی ہے۔''

جارج کا چہرہ کسی پتھر کی طرح سخت ہو رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس میں تبدیلی سی ہونے لگی۔ انسانی نقش گم ہونے لگے اور اس کا چہرہ کسی بھیڑیے کے چہرے میں تبدیل ہونے لگا۔ پھر ایک جھٹکے سے اس نے کیرولا کے بدن کو میز پر ڈال دیا اور پادری کی سمت پلٹا۔

پادری نے صلیب سے اسے بھگانے کے لیے اسے آگے بڑھایا۔ مگر اس سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اس کے ہاتھ سے صلیب چھین لی گئی اور بالوں سے ڈھکے ہوئے ہاتھوں نے اسے توڑ کر ایک طرف پھینک دیا۔ پھر ایک غراہٹ کے ساتھ یہ غیر انسانی ہیولا اچھلا اور اس نے اپنے تیز دانت پادری شانے میں گاڑ دیے۔

اس کے بعد دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ نیکی اور بدی کی ایک جنگ شروع ہو گئی تھی۔ دونوں ہی اس لڑکے سے غافل تھے جو ایک رائفل سے مسلح وہاں موجود تھا۔ معا فضا میں ایک دھماکا ہوا۔ اور اس کے ساتھ ہی وئر وولف کے منہ سے ایک کریہہ چیخ برآمد ہوئی۔ وہ عجلت سے مڑا۔ اسے اپنے سامنے ایک نوعمر لڑکا دکھائی دیا جس کا چہرہ فاتحانہ روشنی سے دمک رہا تھا۔ وئر وولف نے لڑکے کی سمت جھپٹنا چاہا مگر رائفل کی گولی کا زخم بہت کاری تھا۔ وہ لڑکھڑایا اور فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

جب پادری ٹھیک سے دیکھنے کے لائق ہوا تو اس نے جارج ہارڈ کیسل کے چہرے کو دیکھا اور لرز کر رہ گیا۔

''پادری جی۔۔۔ عورت کا سر۔۔۔''

لڑکے نے یاد دلایا کہ ایک ضروری کام ابھی باقی ہے۔

☆☆☆

انہوں نے مقدس پادری جان کول کو ایک ایسے خاموش سے کرمان میں رکھا تھا جس کے اردگرد ایک خوب صورت باغ موجود تھا جبکہ ویلی ولیم کو بھی مجرم بچوں کی اس جیل میں پہنچا دیا گیا تھا جنہیں خاص خبر گیری کی ضرورت تھی۔ جارج اور کیرولا کی لاشوں کو چرچ یارڈ میں دفن کر دیا گیا تھا۔

یہ ایک افسوس ناک بات تھی کہ کسی نے بھی ویلی کی بات سننے پر توجہ نہیں دی تھی۔ جسے ایک مخصوص موضوع پر اچھا خاصا عبور حاصل تھا۔

ایک رات کو جبکہ آسمان پر پورا چاند نکلا ہوا تھا۔ دو افراد نے، جو اس گھر میں ملازم تھے جس کے گرد ایک خوب صورت باغیچہ موجود تھا۔ وہ دروازہ کھولا جس کے پیچھے پادری جان کول کو رکھا گیا تھا۔ وہ دونوں کمرے میں داخل ہوئے اور ابھی وہ کچھ کہنے ہی والے تھے کہ ایک دم سے ان میں سے ایک غش کھا کر زمین پر گر گیا۔ اس کی بے ہوشی انتہائی خوف کی وجہ سے تھی جبکہ دوسرا اس کا دماغ اس طرح الٹ گیا تھا کہ وہ پھر کبھی درست ہی نہ ہو سکا۔

نہ جانے کیا چیز نظر آئی تھی انہیں۔ کوئی نہیں جانتا کیونکہ یہ ایک ظاہری بات تھی کہ پادری جان کول کو ایک بے بی ویئر ویمپ نے کاٹا تھا جبکہ ایک مادہ ویمپائر نے اس کا ہاتھ زخمی کیا تھا اور ایک پورے ویئر وولف نے اس کے شانے پر اپنے دانت گاڑے تھے۔

پادری جان کول کی ہیئت کس طرح تبدیل ہوئی ہو گی۔ خدا ہی جانتا ہو گا یہ بات۔ وہ نہ جانے کیا بن گیا ہو گا۔

مونسٹر

سید احتشام

انہیں فاحشہ بدچلن قرار دے کر شہر سے نکال باہر کیا تھا مگر انہوں نے اپنے وطن کی خاطر خود کو دشمنوں کے لیے ایک ایسے عفریت میں تبدیل کردیا تھا جو جان لینے کے سوا کوئی کام نہیں کرتا

قدم قدم پر خطروں کا سامنا کرنے والی پانچ لڑکیوں کی داستان

صبح نو بجے جوہلجانہ میں کرفیو کی پابندیاں نرم کردی گئیں تھیں اور شام سے کچھ پہلے ہی کرفیو دوبارہ نافذ کردیا گیا۔ مقامی لوگوں کو اشیائے ضرورت خریدنے اور عزیزوں یادوستوں سے ملاقات کے لیے چند گھنٹوں سے زیادہ مہلت نہیں ملتی تھی۔ شب و روز فائرنگ کی گونج سے ہر کسی کا دل دھڑکتا رہتا تھا۔ شہر کے مختلف حصوں میں جگہ جگہ فوجیوں کے عارضی کیمپ لگے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود گلی کوچوں سے عارضی کیمپ لگے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود گلی کوچوں سے گزرتی وقت اٹالین سپاہیوں پر دہشت طاری رہتی تھی۔ کوئی فوجی شہر میں تنہا گھومنے کی جرات نہیں کرسکتا تھا۔ وہ اکثر رائفلیں کندھوں پر اٹھائے ٹولیوں میں گھومتے دکھائی دیتے تھے۔

صرف سارجنٹ راکو ہی ایک ایسا شخص تھا جو اپنی زندگی معمول کے مطابق گزار رہا تھا۔ وہ لمبے

بالوں والا ایک خوبرو نوجوان تھا جس کے چہرے میں عورتوں کے لیے بے پناہ کشش تھی۔ جو ہلچانہ میں مقیم دوسرے فوجی بہت بے زاری کے دن گزار رہے تھے۔ وہ ہر وقت کڑھتے تھے اور فرار ہونے کے خواب دیکھتے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی زیادہ دیر تک باہر نہیں گھوم سکتا تھا۔ شام ہوتی تو وہ ملٹری کے ان اڈوں پر جمع ہو جاتے جہاں وحشیانہ ہاتھوں سے بچی ہوئی تار تار طوائفیں ان کا دل بہلانے کے لیے مقیم تھیں لیکن سارجنٹ راکو بے زار نظر نہیں آتا تھا۔ وہ حیران تھا کہ آخر باقی فوجی بھی اس کی پیروی کیوں نہیں کرتے۔

وہ ہر شام صرف ایک بوسے کے لیے اپنی زندگی داؤ پر لگانے کے لیے نکل کھڑا ہوتا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ لڑکیوں کو اپنی طرف راغب کرنے کے فن سے واقف تھا اور سارجنٹ راکو کبھی ناکام واپس نہیں آتا تھا۔

ایک روز سرِ شام ہی وہ دو لڑکیوں کی بانہیں ڈالے گھوم رہا تھا۔ لڑکیاں زیادہ خوبصورت تو نہیں تھیں لیکن ان کے چہروں سے جوانی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ اگلے روز کئی سپاہیوں کی ایک ٹولی نے اسے ایک کھیت میں بے ہوش پڑے دیکھا۔ اس کے بالوں اور جیکٹ پر برف جمی ہوئی تھی۔ اس کی پتلون پھٹ چکی تھی اور رات بھر بہنے والا خون جم کر سیاہ پڑ گیا تھا۔

جس ایمبولینس میں سارجنٹ راکو کا بے ہوش جسم ملٹری اسپتال پہنچایا گیا وہ شہر کی گلیوں سے گزری تو بہت ہی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ دفعتاً ایک عورت کی دل دوز چیخ سنائی دی۔ لمبے سنہرے بالوں کا ایک ڈھیر کھڑکی سے تیرتا ہوا سڑک پر گر گیا اور اس کے ساتھ ہی کھڑکیاں دھڑا دھڑ بند ہوتی چلی گئیں۔ سنہرے بال ہوا کے تیز جھونکوں سے جلد ہی بکھر گئے اور چند لمحوں کے بعد خاردار تاروں اور فوجیوں کی آہنی ٹوپیوں پر پھیلے نظر آنے لگے۔

سارجنٹ راکو ہوش میں آیا تو اسے اپنے متعلق کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ اس نے حرکت کرنے کی کوشش کی لیکن تکلیف کی ایک تیز لہر نے بے حس و حرکت ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

آہستہ آہستہ اس کا ایک ہاتھ رینگتا ہوا اپنے پیٹ سے نیچے پھسلنے لگا اور جب وہ پیٹ کے درمیانی حصے سے ایک بالشت نیچے پہنچا تو ایک لمحے کے لیے اس کا ہاتھ ہی نہیں پورا جسم بھی کانپ گیا اور ایک ایسی دل دوز چیخ اس کے حلق سے نکلی جسے اس سے پیشتر کبھی کسی انسان نے کسی دوسرے انسان کے منہ سے نہیں سنی تھی۔

مارفین کا اثر زائل ہو گیا۔ سارجنٹ راکو نے عورتوں سے دوستی کی جو سزا پائی تھی اس کا تصور کسی بھی مرد کو کانپ جانے پر مجبور کر سکتا ہے۔

جب وہ دوبارہ ہوش میں آیا تو اس کا چہرہ درد کی مکمل تصویر تھا۔ میز پر درجنوں خوب صورت لڑکیوں کی تصویریں تھیں۔ وہ بے بسی سے ان تصویروں کو دیکھتا رہا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لہر پیدا ہوئی لیکن فوراً ہی کرب میں لپٹ کر دم توڑ گئی۔

تصویریں میز سے کھڑکی کے راستے اڑتی رہیں۔ یہ جو ہلچانہ کی وہ حسینائیں تھیں جو سارجنٹ راکو کی آغوش میں سمٹ چکی تھیں۔ ان بکھری ہوئی تصویروں کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔ آوارہ پتوں کی طرح تصویروں کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔ آوارہ پتوں کی طرح یہ تصویریں شہر کی گلیوں میں پھڑپھڑاتی ہوئی اڑتی رہیں لیکن غیرت مندوں کو ان کی کوئی پروا نہیں تھی، انہوں نے اپنی عزت کے لٹیرے سے جو انتقام لینا تھا وہ لے چکے تھے اور یہ ایک ایسا انتقام تھا جس کی کسک کوئی بھی مرد روح کی گہرائی تک محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

سارجنٹ راکو نے وحشیانہ انداز میں دانت پیسے اور ہاتھ رانوں کے درمیان سے ہٹا لیا۔ اس کے حلق سے نکلنے والی دوسری چیخ پہلی چیخ سے کہیں زیادہ دلدوز اور وحشت ناک تھی۔ نرس اسے پرسکون کرنے کے لیے دوڑی۔

اس نے نرس کو دونوں ہاتھوں سے جکڑ لیا۔ وہ خالی خالی نظروں سے اس مین لڑکی کو گھورنے لگا جو اس کی دیکھ بھال کے لیے مامور کی گئی تھی۔ نرس کے ہاتھوں میں پارفین کا انجکشن تھا لیکن راکو کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ اس کی آنکھوں میں بے بسی تھی۔ جب اس نے نرس کو آزاد کیا تو اس کے ہونٹوں پر خون پھیل گیا تھا اور راکو چہرہ چھپائے سسک رہا تھا۔

معاً اس نے نرس کے ہاتھوں سے سرنج چھین لی اور سوئی کو پوری قوت سے بار بار اپنے سینے پر آزمانے لگا۔ نرس کی چیخ سن کر ڈاکٹر اور ان کے ماتحت دوڑ پڑے۔ انہوں نے سرنج چھین لی تو راکو خون میں لت پت ہو چکا تھا۔ اس نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی۔

''مجھے کھڑکی تک پہنچادو۔'' اس نے سسک کر استدعا کی۔ اسے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ کھڑکی تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ فرش پر خون ہی خون پھیلا ہوا تھا۔ وہ کھڑکی سے جھانک کر شہر کے ان گھروں کو گھورنے لگا جہاں اس کی مردانگی کے قاتل رہتے تھے۔

''تم لوگوں کو بہت دیر ہوگئی تھی دوستو!'' وہ چیخا ''بہت دیر۔۔۔ تم جس وقار کو حاصل کرنا چاہتے تھے وہ میرے پیٹ کے نیچے نہیں تھا۔ وہ ٹھیک وقت پر کئی گھروں میں نمودار ہوگا۔ وقت کا انتظار کرو۔ پورے نو مہینے، اس کے بعد میری نشانیاں۔۔۔'' وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر سسک پڑا ''میں اب بھی مرد ہوں۔ تم چاہو تو آزمانے کے لیے۔۔۔'' اس کی آواز دھیمی ہوگئی اور وہ لہرا کر کھڑکی کے قریب ہی ڈھیر ہوگیا۔

نو بجے کرفیو کی پابندیاں نرم ہوتے ہی گھروں سے ریلا نکل کر سڑکوں اور گلیوں میں آ گیا۔ کسی نے گلی میں دو لڑکیوں کو وحشیانہ انداز میں دھکیل دیا۔ دونوں لڑکیوں کے سر منڈے ہوئے تھے اور ان کی سفید کھوپڑیاں چمک رہی تھیں۔ یہ چمک ان کی شرم ناک حالت زار کو دور دور تک ظاہر کر رہی تھی۔

دونوں خاموش تھیں اور مشینی انداز میں حرکت کر رہی تھیں۔ ان کے چہرے ستے ہوئے تھے اور آنکھیں جذبات سے عاری تھیں۔ ان کی کوئی منزل نہیں تھی۔ ہر طرف سے ان پر غلاظت پھینکی جا رہی تھی لیکن انہیں اپنا بچاؤ کرنے کا بھی ہوش نہیں تھا۔ فانحا کی کھوپڑی پر ایک گلاسٹرا سیب پڑا اور سفید کھوپڑی رنگین ہوگئی۔

تیسری گنجی لڑکی مین اسٹریٹ کے کونے سے برآمد ہوئی۔ وہ کوشش کر رہی تھی کہ اس کے چہرے سے ندامت کا اظہار نہ ہونے پائے۔ جیسے ہی ان دو گنجی لڑکیوں کی نگاہ اس پر پڑی وہ تیزی سے اس کی طرف دوڑیں غالباً انہیں توقع تھی کہ وہ ان دونوں کی حفاظت کر سکے گی۔

تین بجے جب کرفیو دوبارہ شروع ہوا تو ان گنجی عورتوں کی تعداد پانچ ہوگئی تھی۔ وہ شہر سے کچھ فاصلے پر تھیں اور اب ان کے چہروں سے شرم و ندامت کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ ان کے انداز سے خود اعتمادی جھلک رہی تھی۔

وہ اسپتال کے سامنے سے گزریں تو جونکا رک گئی۔ اس کی نگاہ ان کھڑکیوں پر جمی ہوئی تھی جن میں مریضوں کا ہجوم محو تماشا تھا۔

گشتی سپاہیوں نے انہیں اسپتال سے دور دھکیل دیا۔ وہ حیران تھے کہ آخر ان گنجی لڑکیوں کا کیا کریں۔ وہ تو ان کی طرف نگاہ بھر کر دیکھنے کی بھی جرات نہیں کر سکتے تھے۔

سارجنٹ راکو اسپتال کی ایک کھڑکی میں نمودار ہوا۔

اس کا چہرہ اپنی محبوباؤں کی کھوپڑیوں کی طرح زرد تھا۔ ان عورتوں کی عبرت ناک حالت دیکھ کر اس کے حلق سے چیخ نہیں نکلی اور نہ ہی اس کی آنکھوں میں بہانے کے لیے کوئی آنسو باقی رہ گیا تھا۔

پانچوں گنجی لڑکیاں بے مقصد اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں جیسے وہ ابھی تک اپنی منزل کا تعین کرنے میں ناکام رہی ہوں۔

جونکا ان پانچوں میں سے پہلی لڑکی تھی جس نے جوہلجانہ کے آس پاس پھیلے ہوئے جنگل کا رخ کیا۔ اس نے ایک پرانی سی گول ٹوپی پہن رکھی تھی۔ گرم موزے اور ایک ہلکا سا کوٹ اسے سردی سے محفوظ رکھنے کے لیے ناکافی تھے۔

مائرہ نے اپنی ٹھوڑی کے نیچے رومال کو گرہ دے رکھی تھی۔ یہ ان پانچوں میں سے کم عمر تھی اور اس وقت بھیڑ کے بچے کی طرح کانپ رہی تھی۔ جونکا کے لیے اس لڑکی کو برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا کیوں کہ وہ بار بار رونے لگتی تھی۔ وہ اتنی کمزور تھی کہ چلتے چلتے کئی بار گر پڑی تھی اور اسے سہارا دینا پڑا تھا۔ وہ تھکن سے چور چور پتوں کے ایک ڈھیر پر گر گئیں۔

''بے چارہ راکو۔'' مائرہ نے زیر لب کہا اور ہچکیاں لینے لگی۔ فانجا اسے تسلی دینے کے لیے اٹھی ہی تھی کہ جونکا نے اسے ڈانٹ کر خاموش رہنے کا حکم دے دیا۔

''ذرا سوچو مائرہ!'' فانجا نے کہا ''تجھے تو راکو کا ایک بوسہ بھی نصیب نہیں ہوا'' وہ ایک مغرور اور گستاخ لڑکی تھی لیکن اس وقت سب کا دکھ مشترک تھا۔ مائرہ اس سے لپٹ گئی۔

ان سب کو احساس تھا کہ سارجنٹ راکو کو یاد کرنا اب بے سود ہے کیوں کہ اب وہ اس قابل نہیں رہ گیا تھا کہ کوئی عورت اس کی محبت میں مبتلا ہو جاتی۔ ان میں سے ہر ایک اپنے اٹالین محبوب کو بھولنے کی کوشش کر رہی تھی بلکہ دو ایک تو اس کا نام بھی زبان پر نہیں لانا چاہتی تھیں۔

وہ جوان تھیں اور جوانی کے فطری تقاضوں نے انہیں ایک جوان شخص کی طرف کھینچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان سے جو بھی غلطی سرزد ہوئی تھی اس کی اتنی بڑی سزا نہیں ہونی چاہیے تھی۔ مارے غم کے اس کا عجب حال تھا حالانکہ وہ ایک دوسرے سے متنفر تھیں لیکن انہیں احساس تھا کہ اپنے گناہوں کا خمیازہ بھگتنے کے لیے سب کو ایک ساتھ ہی رہنا پڑے گا۔

دفعتاً جونکا اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ ایک طرف چلنے لگی تو باقی چاروں لڑکیاں بھی آہستہ آہستہ اس کے پیچھے ہی چل پڑیں۔ وہ ایک سڑک تک پہنچ گئیں۔ جہاں سے کبھی کبھی اٹالین یا جرمن فوجی ٹرک گزرتے تھے۔ غیر ارادی طور پر جونکا نے ایک پتھر سڑک پر لڑھکا دیا اور پھر جونکا نے دوسری لڑکیوں کی مدد سے پتھر لڑھکانے شروع کر دیئے حتیٰ کہ سڑک پر ایک رکاوٹ بن گئی۔

پہاڑوں کی سمت سے ایک اٹالین ٹرک تیزی سے اس طرف آ رہا تھا۔ سب لڑکیاں درختوں کی اوٹ میں چھپ کر اس کا انتظار کرنے لگیں حتیٰ کہ ٹرک پتھروں کی رکاوٹ سے ٹکرا کر الٹ گیا اور اس میں موجود فوجی افراتفری کے عالم میں فائرنگ کرتے ہوئے ڈھلوان پر اترتے چلے گئے۔

جب خاموشی چھا گئی تو جوہلجانہ کی آوارہ وطن لڑکیاں ٹرک کے قریب پہنچ گئیں۔ ٹرک سے بسکٹ، گوشت کے ڈبے اور ایک مشین گن اور کئی رائفلوں کے علاوہ ضرورت کی کئی چیزیں انہیں مل گئیں۔ جونکا نے مشین گن اپنے قبضے میں کر لی۔ اس سے پہلے مشین گن استعمال کرنے کا کبھی موقع نہیں ملا تھا لیکن پھر بھی وہ اسے اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی۔ اس کی انگلی سے ٹریگر دب گیا اور گولیوں کی آواز سے رات کا بیکراں سناٹا مجروح ہو گیا۔

وہ سب بھوکی تھیں۔ کھانے کے بعد وہ ہر طرف سے بے نیاز ہو کر جلد ہی نیند کی وادیوں میں گم ہو گئیں۔

وہ دو دن اور دو راتوں تک مسلسل چلتی رہیں تاکہ ان اٹالین دستوں سے محفوظ رہ سکیں جنہوں نے ٹرک کے سامان کی تلاش کرنا شروع کر دی تھی۔ مائرہ کی حالت سب سے ابتر تھی۔ وہ آہستہ آہستہ باقی لڑکیوں کے ساتھ گھسٹ رہی تھی۔ وہ جس صورت حال کا شکر تھی یہ اس کے خوابوں کی خوف ناک تعبیر تھی۔ وہ تو سوچ رہی تھی کہ اپنی ایک سہیلی کی طرح اپنے محبوب کے ساتھ فرار ہو جائے گی اور۔۔۔ کئی مرحلے ایسے بھی آئے جہاں جونکا اور باقی لڑکیوں

نے راہ فرار کو ترک کرنے کا ارادہ کیا لیکن قسمت انہیں ایسے مواقع فراہم کرتی رہی کہ ان میں جرات اور ہمت دوبارہ پیدا ہوجاتی۔ خاردار جھاڑیوں، جوہڑوں، دلدلوں اور ندی نالوں سے ہوتی ہوئی وہ مسلسل آگے بڑھ رہی تھیں۔

آخر کار جب وہ رک گئیں تو انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے تھکن اور گردوغبار سے بگڑ گئے تھے۔ ان میں سے کسی کو بھی خوب صورت نہیں کہا جاسکتا تھا۔ نفرت ان کی آنکھوں سے جھلک رہی تھی اور بگڑے ہوئے چہروں پر سختی آ گئی تھی۔

علی الصباح وہ ایک چھوٹے سے گاؤں کے قریب پہنچ گئیں۔ گاؤں کا ایک بھی گھر آباد نہیں تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے دہشت کی وجہ سے وہاں کا ہر مکین بڑی مدحواسی کے عالم میں فرار ہوگیا ہو۔ جونکا سیب کے ایک درخت سے پھل توڑ توڑ کر ان کی طرف پھینکنے لگی۔

ایک لڑھکتے ہوئے سیب کو اٹھاتے اٹھاتے ڈیرا کی نگاہ ایک چرچ پر پڑی۔ گرجے کے عقب میں ایک وسیع قبرستان تھا۔ تازہ قبریں دیکھ کر انہیں یہ احساس ہوا کہ پورا گاؤں حال ہی میں اس جگہ دفن کیا گیا ہے۔

''ان لوگوں کو کس نے قتل کیا ہے۔'' جونکا نے پوچھا۔

''اٹالین یا جرمن، آخر ان کا قاتل کون ہے۔''

کسی لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

مائرہ دہشت زدہ ہوگئی۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میری طرف دیکھو! اگر یہ سب کچھ اٹالین فوجیوں نے کیا ہے تو مجھے قتل کردو کیوں کہ میں سارجنٹ راکو کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔''

اس نے اپنا گوٹ کھول دیا۔ سب لڑکیاں رشک وحسد سے اسے گھورنے لگیں۔ اب تک انہیں اس حقیقت کا علم نہیں تھا۔

مائرہ جانتی تھی کہ وہ اٹالین فوجیوں سے روپوش ہوکر اِدھر اُدھر ماری ماری پھر رہی ہیں۔ ایسے میں کسی اٹالین فوجی کے خون کی اس کے رگوں میں آمیزش قابل نفرت ہی سمجھی جاسکتی تھی۔

آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر رخساروں پر ڈھلک آئے۔ کسی نے اسے تسلی نہیں دی۔ سب خاموش کھڑی اسے گھورتی رہیں۔ جیسے منتظر ہوں کہ مائرہ کے پیٹ میں چھپا ہوا دشمن کب حرکت میں آتا ہے۔

معاً جونکا نے رائفل اٹھائی اور مائرہ پر تان لی لیکن وہ فائر نہ کرسکی۔ اس کے جذبات اسے اس بات کی اجازت نہیں دے رہے تھے فانجا، جوبا اور ڈیرا تیزی سے مائرہ کی طرف لپکیں۔ انہوں نے بیک وقت ایک ہی جیسے جذبات سے مغلوب ہوکر اسے لپٹا لیا اور اس کے رخساروں کو چومتی ہوئی سسکیاں بھرنے لگیں۔

وہ اس ویران گرجے میں سوگئیں۔

انہوں نے اپنی حفاظت کے لیے کوئی احتیاطی تدبیر نہیں کی۔ تھکن سے ان سب کی حالت یکساں طور پر ابتر تھی۔ اب تک وہ مختلف مقامات سے گزرتی ہوئی محفوظ حالت میں وہاں تک پہنچ گئی تھیں۔ شاید اسی لیے انہیں اطمینان تھا کہ کوئی بھی انہیں نقصان پہنچانے کی حد تک قریب نہیں ہے۔

جب ان کی آنکھ کھلی تو کھانے پینے کا سامان ٹٹولا گیا لیکن کوئی چیز باقی نہیں بچی تھی۔ انہوں نے ایک بار پھر اپنا سفر شروع کردیا۔ جلد ہی وہ ایک بار پھر گھنے جنگل میں پہنچ گئیں۔ انہیں ایک گڈریے کی جھونپڑی دکھائی دی۔

جھونپڑی میں کھانے کی باسی چیزیں موجود تھیں۔ جھونپڑی سے کچھ فاصلے پر گڈریے کی لاش پڑی ہوئی تھی لیکن وہ اس کی طرف توجہ دیئے بغیر ان چیزوں کو نگلنے میں مصروف ہوگئیں۔

پیٹ کی آگ ذرا سرد پڑی تو انہوں نے اسلحہ سمیٹا اور ایک بار پھر چلنے لگیں، ان میں سے ہر ایک مسلح تھی۔ ابھی وہ تھوڑی ہی دور گئی تھیں کہ دفعتاً انہیں

چونک کر رک جانا پڑا۔

قریب ہی کہیں اٹالین فوج کا ایک دستہ موجود تھا۔ فوجی گلا پھاڑ پھاڑ کر گا رہے تھے۔ جونکا نے فوراً اپنی مشین گن سنبھالی اور ایک چٹان کی آڑ میں دبک گئی۔ ہر طرف سے بے نیاز فوجی گاتے ہوئے جنگل سے گزر رہے تھے۔

اچانک ان کے گانے کی آواز دم توڑ گئی اور جنگل گولیوں کے دھماکوں سے گونج اٹھا۔ ایک سپاہی کے حلق سے دل دوز چیخ نکلی اور فوراً ہی جواباً فائرنگ شروع ہوگئی۔ انہوں نے خود کو درختوں کی اوٹ میں چھپالیا اور اندھا دھند گولیاں برسانے لگیں۔ ان کے سامنے گھاس کا چھوٹا سا میدان تھا۔ جہاں لمبی لمبی گھاس لہلہا رہی تھی اور یہ یقین سے کہنا مشکل تھا کہ گھاس کی یہ حرکت ہوا کی وجہ سے ہے یا دشمن رینگتا ہوا ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔

جونکا کی گولیوں سے ایک سپاہی چیختا ہوا عین اس جگہ گرا جہاں مائرہ دبکی ہوئی تھی۔ وہ اپنی مردہ آنکھوں سے مائرہ کو گھور رہا تھا۔ مائرہ چیخ اٹھی۔ اس کی چیخیں سن کر فانجا تیزی سے اس کی طرف دوڑی۔

مائرہ کو اپنے پیٹ میں شدید تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ فانجا نے اسے لپٹا لیا لیکن اس دوران میں وہ اپنی حفاظت کی طرف سے بے پروا نہیں ہوئی تھی۔

وہ بار بار اِدھر اُدھر مشین گن گھما کر وقفے وقفے سے فائرنگ کر رہی تھی۔ ذرا سی حرکت پر وہ گولیوں کی بوچھاڑ کر دیتی جس کے نتیجے میں کئی بار دل دوز چیخیں سنائی دیتیں اور دم توڑتی ہوئی ہچکیاں ان کی سماعت سے ٹکراتیں لیکن وہ رحم کے جذبے سے عاری فائرنگ کرتی رہی۔

اب تک فوجی دستے کے کتنے آدمی ہلاک ہوگئے تھے ان کا اندازہ محض چیخوں سے نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ لیکن وہ خوش تھیں کہ خود کوئی نقصان اٹھائے بغیر انہوں نے دشمن کو کافی نقصان پہنچایا ہے۔

مائرہ کی چیخوں اور کراہوں سے اٹالین فوجیوں کو غالباً اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ آوازیں کسی زخمی عورت کی نہیں ہیں بلکہ یہ کرب ناک حالت کسی اور ہی نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔

دفعتاً ایک رائفل کے سرے پر سفید دھجی لہرانے لگی۔ ایک میڈیکل افسر ہاتھ اٹھائے جھاڑیوں سے نمودار ہوا۔ چہرے سے وہ ایک دلیر آدمی نظر آرہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اسی سمت بڑھ رہا تھا جدھر سے مائرہ کی درد میں ڈوبی ہوئی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

وہ آہستہ آہستہ ان سب کے نشانے پر آ گیا۔ جونکا اور دوسری لڑکیاں خاموش اپنی اپنی جگہ دبکی رہیں۔ انہوں نے سفید کپڑے کی دھجی دیکھ کر فائرنگ بند کر دی تھی۔ سب ڈاکٹر کو گھور رہی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا مائرہ کے قریب پہنچ گیا۔

مردہ سپاہی کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے سپاہی کی آنکھیں بند کر دیں۔ مائرہ اسے دیکھ کر خاموش ہوگئی تھی۔ فانجا فوراً ہی ایک درخت کی آڑ میں ہوگئی تھی۔

ڈاکٹر نے نرمی سے مائرہ کو پتوں کے ڈھیر پر لٹا دیا اور خاموشی سے اس کا معائنہ کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور دھیمی آواز میں کہا۔

''اس فوجی پتلون کی وجہ سے بچے کی پیدائش میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے۔''

اس نے مائرہ کے نڈھال جسم سے فوجی پتلون الگ کی اور خون دیکھتے ہی کسی طرف متوجہ ہوئے بغیر چیخا۔ ''پانی کی ضرورت ہے۔'' کسی عورت نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی کیوں کہ ندی اٹالین دستے کے عقب میں تھی۔

ڈاکٹر سمجھ گیا کہ اپنے آدمیوں کی مدد حاصل کیے بغیر وہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو پکارنا شروع کیا۔ جلد ہی پانی کے تین ڈبے اس تک پہنچا دیئے گئے لیکن یہ ڈبے لے کر وہ

ڈاکٹر کے قریب نہیں آئے تھے۔ انہوں نے ڈبوں کو کچھ فاصلے پر رکھ دیا تھا جہاں سے فانجا نے انہیں اٹھا کر ڈاکٹر تک پہنچا دیا تھا۔

مائرہ ایک بار پھر چیخنے لگی تھی۔

ڈاکٹر ایک گھنٹے تک مصروف رہا۔ اس کے بازو کلائیوں تک خون میں لتھڑ گئے تھے۔ آخر کار مائرہ کے بطن سے ایک بچے نے جنم لیا۔ اس ننھے منے سے بچے کے بال ایک رومال سے خشک کر کے ڈاکٹر نے اسے اسی رومال میں لپیٹ دیا اور مائرہ کی پتلون تہہ کر کے رومال کے اوپر سے لپیٹ دی۔

مائرہ ابھی تک تکلیف کی شدت سے چیخ رہی تھی اور خون جاری تھا لیکن جنگل میں اس بے سروسامانی کی حالت میں ڈاکٹر اس کے لیے کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے علاوہ اسے وہاں کام کرتے ہوئے کافی دیر ہوگئی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ جلد از جلد اپنے آدمیوں کے پاس واپس پہنچ جائے۔

کسی لڑکی نے سارجنٹ راکو کے بیٹے کو دیکھنے کے لیے بے تابی کا مظاہرہ نہیں کیا حتیٰ کہ مائرہ بھی اسے اپنے قریب نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

ڈاکٹر نے خالی ڈبے اٹھائے اور واپس چلا گیا۔

وہ جیسے ہی نگاہوں سے اوجھل ہوا جونکا نے ایک بار پھر فائرنگ شروع کردی اور باقی لڑکیوں نے بھی مختلف اطراف میں برسٹ مارے۔ ان میں سے کوئی بھی نوزائیدہ بچے کی چیخوں کی طرف متوجہ نہیں ہوئی تھی۔

اٹالین فوجی اب بہتر انداز میں دفاع کرتے ہوئے فائرنگ کررہے تھے کیوں کہ انہیں باغی لڑکیوں کی پوزیشن کا علم ہوگیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ان میں سے کوئی بھی فرار نہیں ہوسکتی لیکن یوں محسوس ہوتا تھا جیسے لڑکیاں قطعاً خوف زدہ نہ ہوں وہ تو مرنے مارنے پر تلی ہوئی تھیں۔

وہ اس بچے کے بارے میں سوچ رہی تھی جو اس کا بیٹا تھا لیکن ابھی تک اس نے اپنے بیٹے کو محبت سے گلے نہیں لگایا تھا۔ اسے اپنی ساتھیوں کی نفرت کا اندازہ تھا۔ وہ اس سے اٹالین فوجیوں سے زیادہ نفرت کرتی تھیں۔

دفعتاً مشین گن کا ایک برسٹ کارگر ثابت ہوا۔

مائرہ گلے سے پاؤں تک خون میں نہا گئی۔ پیٹ اور گلے سے خون کی دھاریں بہہ نکلیں۔ گولی مائرہ کے پیٹ میں اس وقت پیوست ہوئی جب وہ اپنے بلاؤز کو کھول کر ننھے سے سینے کو بے لباس کررہی تھی لیکن گولی نے اسے بے دم کردیا۔ پھر بھی وہ بچے کی طرف کروٹ بدلنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔

بچہ اپنی کنواری ماں کے سینے سے اس کی آخری سانسوں کو چوسنے لگا۔ خون آلود دودھ اس کے ہونٹوں تک پہنچا اور اس نے رونا بند کردیا۔ دوسری گولی مائرہ کے چہرے پر پڑی۔ خون چہرے سے گردن پر اور وہاں سے بہہ کر نوزائیدہ بچے کے زرد چہرے پر گرنے لگا۔

فائرنگ جس طرح اچانک شروع ہوئی تھی بالکل اسی طرح اچانک ہی بند بھی ہوگئی۔ اٹالین سپاہیوں نے محسوس کرلیا تھا کہ ان پر اب دو طرفہ فائرنگ ہورہی تھی۔

باغی لڑکیوں نے دیکھے بغیر کہ اس کڑے وقت میں کون ان کی مدد کے لیے فرشتۂ رحمت بن کر آیا ہے، اپنی اپنی جانیں بچانے کے لیے اندھا دھند دوڑنے لگیں۔ دوڑتے دوڑتے جونکا یکا یک پلٹی۔

اس نے ایک نظر بچے پر ڈالی۔ پھر اس کے ہاتھ بڑھے اور اس نے بچے کو ماں کی سرد آغوش سے جھپٹ لیا اور ایک طرف دوڑنے لگی۔

جوہلجانہ میں ملٹری اسپتال کے دروازے تھے جن پر خاردار تاروں کی رکاوٹیں لگی ہوئی تھیں۔ ایمبولینس کی آمدورفت پر سنتری ان رکاوٹوں کو ہٹا دیتے تھے۔ شہر میں بھی مختلف مقامات پر ایسی ہی رکاوٹیں لگائی گئی تھیں تاکہ سڑکوں کو نگرانی میں رکھا جاسکے۔

شہر میں جابجا یہ پوسٹر چسپاں تھے کہ اگر کسی

شہری نے سائیکل پر سوار ہو کر شہر میں گھومنے کی کوشش کی تو اسے سزائے موت دی جائے گی۔ ملٹری کے اعلا حکام ہر احتیاطی تدابیر اختیار کر رہے تھے تاکہ شہر میں بغاوت نہ ہونے پائے۔

دن بھر تو کوئی حادثہ نہیں ہوتا تھا البتہ اندھیرا پھیلتے ہی فوجیوں کے گرد خطرات منڈلانے لگتے تھے۔ جیسے ہی شام ہوئی ایک بچہ گاڑی دو انجانے ہاتھوں کے سہارے چلتی ہوئی ملٹری اسپتال کے دروازے پر پہنچی۔

فوراً ہی الارم بجنے لگا۔ کسی نے اس بچہ گاڑی کے قریب جانے کی جرات نہیں کی۔ بم استعمال کرنے کے لیے باغی آئے دن نت نئے طریقے اختیار کرتے تھے اس لیے ہر کوئی خوف زدہ تھا۔ سب کو یہی یقین تھا کہ یہ بچہ گاڑی بھی اس سلسلے کی کوئی خطرناک کڑی ہے۔

ڈیوٹی پر متعین سپاہیوں نے فوراً ہی ریت کی بوریوں کے عقب میں پناہ لے لی لیکن وہ وہاں زیادہ دیر تک بیٹھے دھماکے کا انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ یہ فیصلہ کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا کہ کوئی شخص رضا کارانہ طور پر اس بچہ گاڑی کے قریب جائے اور یہ دیکھے کہ اس میں کیا ہے۔

اچانک ایک بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز بچہ گاڑی سے بلند ہوئی تھی۔ سب حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے لیکن ان کی آنکھوں سے شبے کے تاثرات زائل نہیں ہوئے تھے۔

آہستہ آہستہ بچے کے رونے میں شدت آ رہی تھی۔ اس لیے ایک ایک کر کے سپاہی اپنی پناہ گاہ سے نکلنے لگے۔ اب انہیں صرف ایک ہی دھڑکا تھا کہ کہیں کوئی انہیں احمق نہ بنا رہا ہو لیکن اس خوف پر تجسس غالب آ رہا تھا۔

چند روز کا ایک خوب صورت بچہ گاڑی میں لیٹا بھوک اور پیاس سے نڈھال بری طرح حلق پھاڑ رہا تھا۔ آس کی آنکھیں پھٹی پھٹی سی تھیں اور ننھے ننھے ہاتھ پاؤں ہوا میں گردش کر رہے تھے۔

وہ جس غلیظ پتلون میں لپٹا ہوا تھا اس کے ساتھ ایک کاغذ کا پرزہ نتھی کیا گیا تھا۔ جس پر تحریر تھا۔

''میرا نام راکو ڈائی کانڈیا ہے۔''

ایک پرائیویٹ کمرے میں سارجنٹ راکو زندگی کا بوجھ سینے پر لیے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کی نیند اڑ چکی تھی۔ اس پر بار بار دیوانگی کے دورے پڑ رہے تھے وہ ہر کسی کو مغلظات سنانے پر تل جاتا تھا۔

جو ہلجانہ اسپتال میں مقیم واحد نرس سارجنٹ راکو کے کمرے میں سوئی تھی۔ اس کے علاوہ راکو کسی کی بات نہیں مانتا تھا۔ نرس کو اس سے ہمدردی تھی۔ اس لیے وہ ہر وقت اس کی دیکھ بھال میں مصروف رہتی تھی۔

اپنی تین سالہ سروس کے دوران اس نرس نے کئی زخمیوں کو دیکھا تھا اور سیکڑوں خطرناک زخموں کی مرہم پٹی کی تھی لیکن سارجنٹ راکو کا زخم اس کے لیے حیرت انگیز ہی نہیں تکلیف دہ بھی تھا۔ راکو اس سے کئی بار بے لباس ہونے کی درخواست کر چکا تھا اور نرس اس کی یہ خواہش پوری کر چکی تھی۔ ہر بار وہ جب بھی بے لباس ہوتی راکو چند لمحے اسے گھورتے رہتا۔ پھر چہرہ ڈھانپ کر رونے لگتا تھا۔

آس پاس کے مریضوں کے لیے یہ ایک دلچسپ تماشا تھا۔ وہ اکثر ''کی ہول'' سے اس منظر کو دیکھتے اور ایک دوسرے کو آنکھ کا اشارہ کر کے مسکرایا کرتے تھے۔ نرس کو سب کچھ معلوم تھا لیکن وہ سارجنٹ راکو کی درخواست کو کبھی رد نہیں کرتی تھی۔

سارجنٹ راکو کے بیٹے کی آمد کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ خود سارجنٹ کو یہ کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ اس سے چند قدم کے فاصلے پر اس کا بیٹا بھی موجود ہے وہ تو سب روز گن گن کر گزار رہا تھا۔ دواؤں اور نرس کے علاوہ اب اس کی زندگی میں کچھ بھی نہیں رہا تھا۔

کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ سارجنٹ کو اس

کے بیٹے کے متعلق اطلاع دے۔ حتیٰ کہ اعلا حکام نے بھی یہ اطلاع اس کے کانوں تک پہنچانے سے گریز کیا۔ انہیں معلوم تھا کہ یہ خبر سارجنٹ راکو کی جان لے لے گی۔

اسپتال سے زخمیوں کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک منتقل کرنے والی ٹرین اتوار کو جو ہلچلانہ اسٹیشن پر آئی تھی اور کرفیو ختم ہوتے ہی زخمیوں کو فی الفور ٹرین تک پہنچادیا جاتا تھا۔

جب سارجنٹ کو ایمبولینس میں رکھا گیا تو اس کا بیٹا نرس کی گود میں تھا اور نرس ڈرائیونگ سیٹ کے قریب بیٹھی تھی۔

باپ اور بیٹے نے ایک ہی ایمبولینس میں اسٹیشن تک ساتھ ساتھ سفر کیا اچانک بچہ رونے لگا اور سارجنٹ چونک کر فرنٹ سیٹ کو گھورنے لگا۔ اس کے دل میں ہلچل مچ گئی تھی۔

نرس نے پلٹ کر دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا تمہیں ایک بیٹے کی خواہش ہے سارجنٹ۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے دل سے ایک ہوک سی اٹھی اور وہ چپکے چپکے آنسو بہانے لگا۔

اسٹیشن آ گیا اور نرس نے اس سے جدا ہونے کی اجازت طلب کی تو سارجنٹ کو اپنی دنیا اندھیر ہوتی محسوس ہونے لگی۔ وہ جانتا تھا کہ اس نرس کے علاوہ اب دنیا کی کوئی عورت اس کی محبت کا دم نہیں بھر سکتی۔

جیسے ہی ٹرین نے حرکت کی بچہ رونے لگا۔

یہ بچہ اس کے پہلو میں لیٹا ہوا تھا۔ بچے کو چپ کرانے کے لیے سارجنٹ چٹکی بجانے لگا۔ اس نے محبت سے بچے کے ننھے ننھے تلوؤں کو گدگدایا اور اس کی ننھی منی سی ناک کو چھو کر مسکرانے لگا۔

ٹرین تیز رفتاری سے اٹلی کی طرف دوڑ رہی تھی اور اٹلی پہنچنے سے پہلے سارجنٹ راکو کو یہ اطلاع ملنے والی تھی کہ یہ بچہ درحقیقت اسی کا بیٹا ہے اور اس کی ماں مائرہ اٹالین فوجیوں سے لڑتی ہوئی مر چکی ہے۔

ٹرین سلووینیا کے جنگلات سے گزر رہی تھی۔

جونکا اور اس کی ساتھی لڑکیاں اسپتال کی اس ٹرین کو دیکھ رہی تھیں۔ گاڑی کی چھت پر اور اطراف میں ریڈ کراس کے بڑے بڑے نشان دور ہی سے نظر آ رہے تھے۔ جب ٹرین ان کے قریب سے گزری تو وہ بغیر سوچے سمجھے اس کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگیں۔ حتیٰ کہ وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ وہ پل پر رک گئیں۔

ان کے ہاتھ ریلنگ پر پھسلنے لگے اور وہ جھک کر پانی کو دیکھنے لگیں۔ پانی اتنے فاصلے پر تھا کہ دیکھنے والوں کو چکر آ جاتا تھا۔ کچھ دیر وہ پانی کو گھورتی رہیں۔ پھر وہ ریلنگ سے پھسل کر پل کے نچلے حصے میں پہنچ گئیں۔

انہوں نے ڈائنامائٹ نکالنے اور انہیں جگہ جگہ لگاتے ہوئے گنگنانے لگیں۔ ان کے لیے یہ پہلا تجربہ تھا، لیکن وہ فلموں میں کسی نہ کسی کو ایسا کرتے دیکھ چکی تھیں اور اب انہیں اس کام میں بہت لطف آ رہا تھا۔

ڈیرالبتہ کچھ بے دلی سے کام کر رہی تھی۔

اسے یقین نہیں تھا کہ ان کا یہ منصوبہ کامیاب بھی رہے گا یا نہیں۔ وہ ان چھوٹی چھوٹی چھڑیوں کو اس قدر تباہ کن سمجھنے پر آمادہ نہیں تھی۔ جن کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ لوہے کے بھی چیتھڑے اڑا دیتی ہیں۔

کام نمٹا کر وہ پل سے دور چلی گئیں اور اس کی تباہی کا انتظار کرنے لگیں، اب انہیں خوف نے گھیر لیا تھا اور وہ دھماکے کے انتظار میں ایک دوسرے سے چمٹ گئی تھیں۔

جوبا اس صورت حال کو برداشت نہ کر سکی اور رونے لگی۔ دوسری تینوں لڑکیاں بھی رونا چاہتی تھیں، لیکن ان کے دل دماغ پر نفرت کا تسلط گہرا تھا۔

''یہ ناقابل یقین ہے۔'' جونکا نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''کہ ہمارے چھوٹے چھوٹے ہاتھ اس عظیم پل کو تباہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں جس کی تعمیر پر کثیر دولت خرچ ہوئی ہے۔''

''جونکا'' ڈیرہ نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔ ''کیا تباہی پھیلانا کوئی اچھی بات ہے۔''

''احمق لڑکیو! پل کے بارے میں افسوس کرنا چھوڑ دو۔'' جونکا چیخ پڑی۔

''چلو یہاں سے آگے بڑھو۔''

''وہ جنگل کی طرف تیز تیز چلنے لگیں۔''

وہ بہت کم کھاتی تھیں اور سونے کے لیے بھی بہت ہی کم وقت ملتا تھا۔ وہ جو کچھ بھی حاصل کرتی تھیں۔ اس کے لیے انہیں اپنی زندگی داؤ پر لگانی پڑتی تھی۔

دن کے وقت وہ ایسے چھوٹے چھوٹے گاؤں میں پہنچ جاتی تھیں جہاں دشمن فوجوں سے نفرت کرنے والوں کی اکثریت تھی۔ اب وہ قتل کرنے کے فن سے واقف ہوگئی تھیں اور ان کے حملے دن بدن بڑھتے جارہے تھے۔ راتیں ایسی ہی جھڑپوں اور تباہ کاریوں میں گزر جاتی تھیں۔

انہیں اپنی بیتی ہوئی زندگی کے واقعات ایک ایسے ناول کے واقعات محسوس ہونے لگے تھے جسے انہوں نے بہت پہلے پڑھا تھا اور اب ان کی یاد ذہن سے محو ہوتی جارہی تھی۔ ان واقعات کو یاد کرکے وہ خوف زدہ ہوجاتی تھیں، بالکل اسی طرح جیسے وہ جرمنوں سے دہشت زدہ تھیں۔

اٹالین فوجی ان کے مثالی دشمن تھے اور انہیں قتل کرنا ان کے نزدیک ایک فطری فعل تھا۔ ان کے انداز میں زندگی جھلکتی تھی اور وہ اپنے دشمنوں میں درندوں کے نام سے مشہور تھیں۔ اگرچہ وہ ظلم وستم کے نت نئے طریقے ایجاد کرنے کی ذہانت سے عاری تھیں، لیکن ان کی غیر متوقع سنگ دلی اور نفرت نے انہیں شدت پسندوں جیسا بنا دیا تھا۔

مزاج کے اعتبار سے چاروں لڑکیاں یکسر مختلف تھیں، لیکن قتل کرتے وقت ان میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا۔ اگرچہ ان کے رویے کی وجوہات موجود تھیں، لیکن تباہی پھیلانے کی پیاس کو کسی بنیاد پر قائم نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ مسلسل سفر کررہی تھیں۔

ہر روز انہیں کئی مرد اور عورتیں ملتی تھیں، لیکن وہ رسیوں سے لٹکی ہوئی درندگی کی تصویریں تھیں۔ ایسی لاشوں کو دیکھ دیکھ کر ان چاروں کے دل نفرت سے بھر جاتے تھے۔

جونکا فائرنگ کے وقت آنکھیں بند کرلیتی تھی۔ پہلی نگاہ میں تو انہیں کوئی بھی شناخت نہیں کرسکتا تھا۔ تھکن نیند کی کمی اور خوف ودہشت کے مناظر نے ان کا سب کچھ بدل کر رکھ دیا تھا۔ اب ان کے چہروں پر نسوانی حسن ونزاکت کو تلاش نہیں کیا جاسکتا تھا۔

جونکا ایک حسین لڑکی تھی، لیکن اب اس کی حرکتوں سے مردانہ پن ٹپکنے لگا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں کھردرا پن آگیا تھا۔ جوبا ایک بھاری سینے والی لڑکی تھی، لیکن اب وہاں برائے نام ہی ابھار رہ گئے تھے۔ وہ دن بھر جوؤں سے بھری ہوئی عورتوں کی طرح خود کو نوچتی کھسوٹتی رہتی تھی۔

ایک صبح جوبا بے دار ہوئی تو اسے اپنے سر میں ایک ننھا سا گہرا زخم محسوس ہوا۔ اس کی کھوپڑی پر بال دوبارہ اگنے شروع ہوگئے تھے۔ اس نے خوب ٹٹول کر دیکھا تو محسوس ہوا کہ وہ بے خبری کی نیند میں کسی چوہے کے دانتوں کا شکار ہوئی ہے۔

چوہوں سے بھی ان کو جرمنوں جیسی ہی نفرت تھی۔ ایک مقام پر تو انہوں نے چوہوں پر مشین گن کے دہانے کھول دیے تھے۔ ان کا نشانہ اب بھی خالی نہ جاتا تھا۔ اگر آنکھ کا نشانہ لیتیں تو آنکھ پر ہی گولی لگتی تھی، لیکن انہیں تو دشمنوں کی پیشانیوں پر گولیوں کے سوراخ بنانے کی خواہش تھی اور وہ کسی بھی موقع پر اس خواہش کو تشنہ نہیں رہنے دیتی تھیں۔

''جب تک ہم جانب داروں کے گروپ میں شامل نہیں ہوجاتیں ہماری حیثیت محض مجرموں جیسی رہے گی۔'' جوبا نے کہا۔

اگرچہ اس کی ساتھی لڑکیاں بھی یہی چاہتی تھیں، لیکن انہوں نے کبھی اس بات کا اظہار نہیں کیا تھا۔

''لیکن جانب داروں کی ہماری ضرورت نہیں ہے۔'' فانجا نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے بے بسی ظاہر کی۔

''ہمیں ان کی پروا بھی نہیں کرنی چاہیے۔'' جونکا نے ناک چڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ہم اپنی حفاظت خود بھی کر سکتے ہیں۔''

''لیکن ہمیں یہ ہمیشہ احساس رہتا ہے کہ وہ ہمارے آس پاس ہی کہیں موجود ہیں۔'' فانجا نے دوبارہ طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میں حیران ہوں کہ انہوں نے ہمارے سامنے آنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔''

''انہیں ہم پر اعتماد نہیں ہے، گندے سور۔'' ڈیرا چیخ پڑی۔

اور یہ تھی بھی حقیقت۔ انہوں نے اکثر محسوس کیا تھا کہ جانب داروں کی آنکھیں ان کی نگرانی کر رہی ہیں، لیکن ان میں سے کبھی کوئی سامنے نہیں آیا تھا۔ البتہ وہ ہر کڑے وقت میں ان کی مدد ضرور کرتے تھے۔

''میں نے جیسے ہی ان میں سے کسی کو دیکھا فوراً ہی گولی چلا دوں گی۔'' ایک صبح جونکا نے اعلان کیا۔

یہ ایک خوب صورت دن تھا۔ ان کے دل میں بے ساختہ یہ خواہش پیدا ہوئی کہ جنگ کو بھول کر انہیں یہ دن پرسکون انداز میں گزار دینا چاہیے۔ وہ ایک جھیل پر پہنچیں جس کے کنارے پر بید مجنوں کی بہتات تھی۔ اس وقت تک وہ تھکن سے چور چور ہو چکی تھیں۔

انہوں نے اپنے بوٹ اور اونی موزے اتار دیے۔ طویل پیدل سفر کی وجہ سے پیروں میں چھالے پڑ کر ادھڑ گئے تھے اور وہاں چھوٹے چھوٹے زخم بن گئے تھے۔

وہ گھٹنوں تک ٹانگیں پانی میں ڈال کر بیٹھ گئیں اور ٹانگوں کی حرکت سے ایک دوسرے پر چھینٹے اڑانے لگیں۔ آہستہ آہستہ وہ بے لباس ہو گئیں۔ اب صرف ان کے سروں پر ٹوپیاں تھیں۔

وہ چیختی ہوئی پانی میں کود گئیں۔

ایک عرصے بعد انہیں نہانے کا موقع ملا تھا۔ انہوں نے نہ جانے کتنے دنوں بعد اپنے نسوانی جسم کو دیکھا تھا۔ یہ جسم ہمارا تو نہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے دل میں یہی ایک بات کئی بار پیدا ہوئی۔ پھر وہ سب کچھ بھول کر نہانے میں مصروف ہو گئیں۔

جب وہ پانی سے نکلیں تو ٹھنڈی ہوا سے ان کے جسم نازک پتوں کی طرح کانپ گئے۔ انہوں نے کپڑے نہیں پہنے کیوں کہ شدید سردی انہیں زندگی میں پہلی بار بہت پرلطف محسوس ہوئی تھی۔

''بلاشبہ۔۔۔'' ڈیرا نے مسکرا کر کہا۔

''کیا؟'' سب چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

''وہ برا آدمی نہیں تھا۔ میں اسے بے پناہ پسند کرتی تھی۔ وہ زندگی کا لطف اٹھانے کے فن سے واقف تھا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ہم سب سارجنٹ راکو کو مختلف وجوہات کے تحت پسند کرتی تھیں۔ ممکن ہے وہ تم سب کے لیے مثالی شخص نہ ثابت ہوا، لیکن پھر بھی تم اس کے دام میں آئے بغیر نہ رہ سکی تھیں۔''

کوئی بھی لڑکی اپنے چہرے سے اس گفتگو کا کوئی خاص ردعمل ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''درحقیقت اس کی حالت ایک بھنورے جیسی تھی۔'' ڈیرا نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ وہ ہمیشہ سرد آہ بھر کر ماضی کی باتیں کیا کرتی تھی۔ وہ ہنسنے لگی۔ ''ذرا سوچو تو سہی اگر سارجنٹ راکو اچانک یہاں آ جائے اور ہمیں اس حالت میں دیکھ لے تو میں شرط لگا سکتی ہوں کہ وہ باری باری ہم سب کو چوم لے گا۔ جیسے اس کے لیے ہماری یہ حالت بالکل نئی ہو۔''

کسی نے ہنسنے میں اس کا ساتھ نہیں دیا۔ جونکا خاموشی سے کپڑے پہننے لگی۔ ان کے عقب میں بید مجنوں کا جھنڈ تھا اور اس کے عقب میں ایک لہلہاتا ہوا کھیت تھا۔

دفعتاً ان کی سماعت سے مردانہ ہنسی کی آواز ٹکرائی۔ ان کے ہاتھ اپنے کپڑوں کے بجائے تیزی سے اپنی اپنی رائفل کی طرف لپکے لیکن جو لوگ انہیں دیکھ رہے تھے۔ ان کے قہقہے ختم نہیں ہوئے۔

یہ جانب داروں کا ایک دستہ تھا۔ جونکا نے فائر جھونک مارا اور وہ لوگ ہنستے ہوئے غائب ہوگئے۔ جونکا ان کے پیچھے دوڑی وہ اندھا دھند گولیاں برسا رہی تھی، لیکن ان دھماکوں کے باوجود ہنسنے کی آوازیں اس کے کانوں سے مسلسل ٹکرا رہی تھیں۔

وہ رک گئی۔ پتوں کی سرسراہٹ سنائی دی اور وہ دوبارہ اپنی رائفل میں گولیاں بھرنے لگی۔ وہ پتوں سے پیدا ہونے والی آوازوں کی پروا کیے بغیر آگے بڑھتی رہیں۔ اسے احساس تھا کہ قریب ہی کوئی شخص چھپا ہوا اس کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہا ہے۔ لیکن وہ اسے دیکھ نہیں سکتی تھی۔

اچانک اس نے فائرنگ بند کردی۔

زمین پر ایک شخص لیٹا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں جونکا پر جمی ہوئی تھیں۔ سنہرے بالوں کی ایک لٹ اس کی پیشانی پر ہوا کے نرم جھونکوں سے لہرا رہی تھی۔ جب بھی اس کی نگاہ جونکا کے حلیے پر پڑتی وہ تھوک نگل کر رہ جاتا۔

جونکا چیختی رہی۔ وہ جوان جھاڑیوں کے قریب گھاس پر لیٹا ہوا تھا۔ جونکا نے فائرنگ کی دھمکی دیتے ہوئے اسے باہر آنے کا حکم دیا، لیکن وہ جہاں لیٹا تھا وہاں سے اس سے ہلنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھتی رہی۔

وہ مردانہ وار آگے بڑھی۔ اسے ذرا بھی جھجک یا شرم و حیا کا احساس نہیں ہوا۔ دفعتاً اس شخص نے زقند لگائی اور ایک ہاتھ جونکا کے منہ پر رکھتا ہوا وہ اس کے اوپر آ گیا۔ دونوں گھاس پر لڑھکنے لگے۔

جونکا ایک طاقت ور لڑکی تھی۔ بے لباس ہونے کا احساس اسے سنہرے بالوں والے نوجوان کی بانہوں میں آتے ہی ہوگیا تھا اور اب وہ بالکل اس انداز سے لڑ رہی تھی جیسے کسی دشمن کے ہاتھوں میں پہنچ گئی ہو۔

جانب داروں کے گروہ سے تعلق رکھنے والا وہ جوان بھی مضبوط اور توانا تھا۔ اس نے جونکا کا بازو پکڑ لیا اور اسے اتنی سختی سے مروڑا کہ لڑکی کو اپنا بازو کہنی پر سے ٹوٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ جونکا کے ناخنوں سے اس کے چہرے پر جو خراشیں پڑ گئی تھیں۔ وہ ان کی لذت سے محظوظ ہو رہا تھا۔

وہ جونکا کا بازو مروڑتے ہوئے اسے تکلیف پہنچا کر بھی لذت حاصل کر رہا تھا۔ اس نے جونکا کو جکڑ کر اپنے ہونٹ اس کی طرف بڑھائے، لیکن اسے ایک لمحے سے زیادہ کامیابی نہیں ہوئی، لیکن یہ وقفہ جونکا کی توانائی نچوڑنے کے لیے کافی تھا۔ اسے اپنی توانائی کمزور پڑتی محسوس ہونے لگی۔

دونوں بری طرح ہانپ رہے تھے، لیکن وہ حلق سے کوئی آواز نکالے بغیر ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ کچھ فاصلے سے ان لڑکیوں کی آوازیں سنائی دیں جو اپنی ساتھی کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی تھیں۔ وہ اسے پکارتے ہوئے قطار بنائے آ گئیں۔ ان کی آوازوں سے خوف جھلک رہا تھا۔ جیسے انہیں خدشہ ہو کہ جونکا جوابی فائرنگ سے ہلاک ہوگئی ہو۔

جوبا کی نگاہ دونوں پر نہیں پڑی۔ حالانکہ وہ قریب سے گزری تھیں۔ جیسے ہی جوبا نگاہوں سے اوجھل ہوئی جونکا کو گناہ کا احساس ہونے لگا، لیکن اب اس کی جدوجہد دم توڑ چکی تھی۔ وہ بے حس و حرکت ہوگئی۔

سنہرے بالوں والا اسے لپٹائے ہوئے تھا اور اس کے انداز سے جوش و خروش ظاہر ہو رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں نے جونکا کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔ جونکا بے حس و حرکت رہی۔ وہ اس کی کسی حرکت کے خلاف جوابی کارروائی نہیں کر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہوتی چلی گئیں۔

وہ اب بھی جدوجہد کر رہے تھے۔ جیسے ایک

دوسرے سے نبرد آزما ہوں۔ دفعتاً جونکا کے گرم گرم آنسو سنہرے بالوں والے جوان کا چہرہ بھگونے لگے، لیکن اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔

اچانک وہ رومال کھل گیا جس سے جونکا کا گنجا سر ڈھکا ہوا تھا۔ اس کی کھوپڑی پر نگاہ پڑتے ہی سنہرے بالوں والا کانپ گیا۔ نفرت نے لذت و سرور پر غلبہ پالیا اور اچھل کر کھڑا ہوگیا۔

یہ محسوس کرتے ہی جونکا بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے روکتا جونکا تیزی سے ایک طرف دوڑنے لگی۔ دوڑتے دوڑتے ایک بار پھر سنگ دلی نے اس کے وجود کو گرفت میں لے لیا۔ وہ رک گئی۔ پھر اس نے پلٹ کر سنہرے بالوں والے پر فائرنگ شروع کردی۔ اس بار وہ باقاعدہ نشانہ لے کر گولیاں برسا رہی تھی۔ سنہرے بالوں والے نے اس کی فائرنگ کا جواب نہیں دی۔ وہ پیچھے ہٹا اور آخر کار جونکا کی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔

گولیوں کی آواز سے دوسری لڑکیاں بھی متوجہ ہوگئیں اور وہ جونکا کی حفاظت کے لیے بری طرح گولیاں برسانے لگیں۔ گولیوں سے جھلکی ہوئی شاخیں ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگیں اور پتے ننھے منے پرزوں کی طرح ہوا میں اڑنے لگے۔

کچھ ہی دیر بعد ان کے پاس گولیاں ختم ہوگئیں اور جنگ کا خاتمہ ہوگیا۔ جانب داروں کا گروہ پہاڑوں کی طرف اور لڑکیوں کی ٹولی جھیل کی طرف پسپا ہوگئی، جہاں ان کا سامان اور جونکا کے باقی ماندہ کپڑے اس وقت بھی موجود تھے۔

جونکا نے دوسری لڑکیوں کو یہ نہیں بتایا کہ اس کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا ہے۔ لڑکیاں تو اسے واپس اپنے ساتھ دیکھ کر اتنی خوش ہوئی تھیں کہ انہوں نے اس کی ہچکچاہٹ اور جھوٹ کو بھی قبول کرلیا اور کسی قسم کا شبہ ظاہر نہیں کیا۔

''اوہ خدایا۔ میں تو جانب داروں کو پسند کرنے لگی ہوں۔'' فانجا نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

یہ ایک ایسی حقیقت تھی جسے دل ہی دل میں سب نے تسلیم کرلیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی ملک دوست گروہ سے مل کر کارنامے سرانجام دے بظاہر جونکا نے اس بات کی مخالفت کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ آزادرہ کر وہ بہتر انداز میں دشمنوں سے نمٹ سکتی ہیں۔

لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ سب کی سب بے ضابطہ زندگی گزارتے گزارتے اب تنگ آ گئی تھیں۔ اس طرح انہیں ہر وقت خطرہ لاحق رہتا تھا۔ دوستوں کی کمی سے زندگی اجیرن ہورہی تھی۔ ماضی کی یادیں خاص طور سے سارجنٹ راکو کی یاد ان سب کو بے چین کردیتی تھی۔ اس لیے انہیں مردانہ رفاقت کی شدت سے کمی محسوس ہورہی تھی۔

اچانک جرمن دستے اس علاقے میں پہنچ گئے اور آناً فاناً چپے چپے میں پھیل گئے۔ ان کے انداز سے بے پروائی ظاہر ہورہی تھی، گویا انہیں خود پر ضرورت سے زیادہ اعتماد تھا۔ انہیں سب سے پہلے ڈیرا نے دیکھا تھا۔

دوسری لڑکیوں کی نگاہ جیسے ہی جرمن فوجیوں پر پڑی انہوں نے اپنی اپنی رائفل سنبھال لی اور مرنے مارنے پر تل گئیں۔ آس پاس کے تمام گاؤں خالی ہورہے تھے اور کسانوں نے پہاڑوں میں پناہ لے لی تھی۔ جاتے وقت وہ آسانی سے جو کچھ لے جاسکے اسے لیتے گئے، لیکن انہوں نے اپنے پیچھے اتنا کچھ چھوڑ دیا تھا کہ جرمنوں کو لوٹ مار کر کے مزا آ گیا تھا۔

لڑکیاں خاموشی سے ان پناہ گزینوں کو دیکھتی رہیں جو جرمنوں کے خوف سے فرار ہورہے تھے۔ وہ ان میں شامل ہونے کی خواہش کو بری طرح دبائے ہوئے تھیں، کیونکہ انہیں احساس تھا کہ بھگوڑے کسان انہیں قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔ پھر ان کے نظریات بھی لڑکیوں سے مختلف تھے۔ وہ آزادی سے زیادہ امن پسندی کے چکر میں تھے۔ لڑکیاں آزادی اور انتقام کے جذبوں سے سرشار تھیں۔

جرمنوں نے مغربی حصے میں اپنا کیمپ لگالیا

تھا۔ جبکہ مشرقی حصے میں جونکا اپنی ساتھیوں کے ساتھ ان کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔

ویران گاؤں میں قیام کر کے پھلوں پر زندگی گزارنا ایک نیا تجربہ تھا جوان لڑکیوں کو بہت پسند آیا تھا۔ جونکا کے مزاج میں ہر گھڑی تبدیلی پیدا ہو رہی تھی۔ اس نے اب کھل کر کہنا شروع کر دیا تھا کہ کسی قسم کی احتیاط کی ضرورت نہیں۔ وقت پڑنے پر جو بھی مملن ہو کر گزرو۔ وہ اپنی ساتھیوں کی ہر بات کو سختی سے رد کرنے لگی تھی۔

''میں پوچھتی ہوں تمہیں کیا ہو گیا ہے۔'' ڈیرا اس پر الٹ پڑی۔

''ہمیں جانب داروں کے ساتھ مل جانا چاہیے۔'' فانجا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''آخر تم ان سے مخالفت کی توقع کیوں رکھتی ہو۔'' وہ واحد لڑکی تھی جو اپنی لیڈر کے ساتھ بحث کرنے کی جرات کر لیتی تھی، ورنہ لڑکیاں تو اس کے غصے سے خوف زدہ رہتی تھیں۔

جوبا خاموش تھی، لیکن اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بھی دوسری لڑکیوں کی طرح جونکا کی لیڈر شپ سے بے زار ہو چکی ہے۔

''کم از کم جواب تو دو۔'' جونکا نے مشین گن سنبھالی اور کھڑکی سے باہر پھیلے ہوئے کھیتوں کو گھورنے لگی جن کے عقب میں جرمن کیمپ سے دھوئیں کی ایک باریک سی لکیریں بلند ہو رہی تھی۔

جوبا نے اپنی مشین گن سنبھالی اور سامان اپنے کندھے پر رکھتے ہوئے غرائی۔ ''آؤ چلیں۔۔۔ اسے یہیں چھوڑ دو۔ آؤ فانجا چلو ڈیرا۔''

''لیکن خدا کے لیے یہ تو بتاؤ کہ تم آخر یہاں کیوں رہنا چاہتی ہو۔'' جوبا نے یکا یک پلٹ کر سوال کیا۔ وہ اپنے آپ پر حیرت انگیز طور پر قابو پا چکی تھی۔

''جانب دار ہمیں پسند نہیں کرتے۔'' جونکا نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

''حالانکہ ہمارے دشمن مشترک ہیں۔ اگر وہ ہمیں پسند نہیں کرتے تو ہمیں واپس جو ہلجانہ چلے جانا چاہیے۔ ہم اپنے گھروں میں چھپ کر بھی زندگی گزار سکتی ہیں۔''

''دیکھو! گاؤں کو آگ لگی ہوئی ہے۔'' جونکا نے کہا۔

''چلو ڈیرا۔'' جوبا نے اصرار کیا۔ ''اگر یہ یہیں رہنا چاہتی ہے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔''

ڈیرا نے جلتے ہوئے گاؤں کی طرف دیکھا اور پھر اس کی توجہ جرمنوں کے کیمپ کی سمت مبذول ہو گئی۔ دفعتاً وہ چیخ پڑی۔ ''وہ آ رہے ہیں، کھیتوں میں دیکھو، وہ جرمن کتے۔''

جوبا دروازے کی طرف بڑھی۔ ''میں جا رہی ہوں، اگر تم اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا چاہتی ہو تو شوق سے یہیں بیٹھی رہو۔''

ڈیرا بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ اس نے جونکا اور فانجا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم اسے اس حالت میں تنہا نہیں چھوڑ سکتیں۔'' وہ جونکا کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''لیکن تم جو کچھ کر رہی ہو وہ ٹھیک نہیں ہے۔''

جوبا پاؤں پٹختی ہوئی نکل گئی۔ وہ کھڑکی سے اسے دیکھتی رہیں۔

''جوبا۔۔۔ جوبا۔'' فانجا نے اچانک چیختے ہوئے کہا اور دوڑتی ہوئی مکان سے باہر چلی گئی۔ اس نے جلدی سے جوبا کا بازو جکڑ لیا اور استدعا کی۔ ''ہمیں چھوڑ کر نہ جاؤ، آؤ واپس چلو۔''

دفعتاً ایک دھماکا ہوا۔ ان کے قریب ہی ایک مارٹر شیل گرا۔ انہوں نے جلدی سے خود کو زمین پر گرا دیا۔

جونکا کھڑکی میں کھڑی تھی۔ اس نے دشمن کو دیکھ لیا تھا۔ فانجا اور جوبا کو بچانے کے لیے ڈیرا نے فائر کھول دیا۔ وہ دونوں تیزی سے مکان کی طرف واپس آ رہی تھیں۔

جرمن قریب آ گئے تھے۔ جونکا بری طرح گولیاں برسا رہی تھی۔

جلد ہی چاروں گنجی لڑکیاں ایک بار پھر متحد ہوگئیں اور بے جگری سے فائرنگ کرنے لگیں۔

گولیوں کی سنسناہٹ میں ایک بار پھر انہیں لطف آنے لگا تھا۔گاؤں کے مختلف مکانوں کی چھتیں اڑ رہی تھیں۔

گاؤں کے دائیں حصے سے یکا یک فائرنگ شروع ہوگئی اور جرمنوں کی پیش قدمی رک گئی۔ فضا میں خون کی بو محسوس ہونے لگی۔ دھوئیں اور بارود کی بو میں خون کی آمیزش سے لڑکیوں کو ہر سانس لینے کے بعد درندگی پر اتر آنے کی خواہش میں شدت کا احساس ہوتا تھا۔

”جانب داروں کا گروہ جانب داروں کا گروہ۔“ فانجا خوشی سے چیخ اٹھی، وہ دیوانہ وار جرمنوں کی سمت گولیاں برساتی رہی اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

صرف جونکا ان لوگوں کی آمد پر خوش نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ اس مدد سے بدمزا ہورہی تھی۔اسے یہ ہرگز پسند نہیں تھا کہ جانب دار انہیں بے بس اور مظلوم سمجھ کر بار بار ان کی مدد کو دوڑے آئیں۔

”سامنے آؤ۔“ جونکا چیخ پڑی۔”سامنے آؤ، کیا تم ہم سے شرمارہے ہو۔اگر ایسا ہے تو یہاں سے دفاع ہوجاؤ۔ ہمیں تمہاری بالکل ضرورت نہیں۔ ہمیں کسی کی مدد نہیں چاہیے، اگر کسی نے۔۔۔“

گولیاں برس رہی تھیں اور یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ جانب داروں نے جونکا کی باتیں سنی ہوں گی یا نہیں۔ جونکا باہر آگئی۔ وہ مشین گن سے گولیاں برساتی ہوئی دشمن سے قریب تر ہوتی جارہی تھی اور جانب داروں سے اس کا فاصلہ بڑھتا جارہا تھا۔ وہ اپنے دشمنوں کا تنہا مقابلہ کرنا چاہتی تھی۔اس کے ذہن میں بار بار صرف یہی خیال گردش کررہا تھا کہ جانب دار اس کا شکار چھیننے کے لیے آئے ہیں۔

جانب داروں کا دستہ بھی تیزی سے دشمنوں کی طرف بڑھ رہا تھا اور وہ جونکا کے پہلو میں پہنچ گئے تھے۔ جونکا جلدی سے بائیں طرف ہوگئی اور تنہا اپنے دشمن پر گامزن رہی۔

یہ جنگ رات تک جاری رہی۔

کوئی بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ جنگ کا خاتمہ کس وجہ سے ہوا ہے۔ جونکا یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھی کہ فائرنگ اندھیرے کی وجہ سے بند ہوئی ہے۔ وہ لڑکیوں کی طرف متوجہ ہوئی اور انہیں کھلے میں چلنے کا حکم دیا۔انہوں نے ایک بار پھر جونکا کی لیڈرشپ کو منظور کرلیا تھا۔اس لیے وہ بغیر احتجاج کیے اس کے حکم کی تعمیل کرنے لگیں۔

صبح ہوتے ہوتے وہ دوبارہ اپنی سابقہ پوزیشن پر آگئیں۔ان کے ساتھ ڈوموبرانگی گروہ سے تعلق رکھنے والے پانچ آدمی تھے۔ فسطائیوں کے سادہ لبادوں میں لپٹے ہوئے یہ غدار اس وقت بری طرح پھنس گئے تھے۔ ان کے چہروں سے خوف اور دہشت ظاہر ہورہی تھی۔

اجالا ہوتے ہی ان پانچوں کو احساس ہوا کہ وہ چار جوان لڑکیوں کے قیدی بن چکے تھے۔ اگرچہ انہیں اس صورت حال سے بے پناہ ندامت کا احساس ہوا، لیکن ان کے پاس خود کو لڑکیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

جانب دار بھی اپنی کمین گاہوں سے نکل آئے۔

وہ ہنس رہے تھے اور ان کا مضحکہ اڑا رہے تھے۔لڑکیاں انہیں گھورتی رہیں، لیکن اس بار انہوں نے دیکھتے ہی فائرنگ نہیں شروع کردی تھی۔

برانکو وہ نوجوان جس نے جونکا سے ایک کھیت میں ہاتھا پائی کی تھی، وہ بھی اس گروہ میں موجود تھا۔وہ اس وقت بریگیڈ کمانڈر کے ساتھ کھڑا مسکراتی ہوئی نگاہوں سے جونکا کو گھور رہا تھا۔ جونکا نے ایسا انداز اختیار کرلیا جیسے پہلے کبھی اس نوجوان کو دیکھا تک نہ ہو۔جلد ہی اس نے بھی جونکا سے نگاہ ہٹالی۔ گویا وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ اسے بھی کوئی ایسی خاص پروا نہیں ہے یا پھر یہ معذرت کا کوئی انوکھا انداز تھا جو صرف اسی کی ذات تک محدود تھا اور دنیا میں کہیں بھی رائج

ہیں تھا۔

کمانڈر نے جونکا سے ہاتھ ملایا، پھر وہ ڈیرا اور وہا کی طرف متوجہ ہوا۔ فانجا نے برانکو کو لپٹالیا اور ان کے خوش نما بالوں کو چومنے لگی۔ ہر کوئی ہنسنے لگا، عارضی طور پر وہ یہ بھول ہی گئے تھے کہ دشمن ان سے زیادہ دور نہیں ہے۔

جانب داروں کے گروہ کا ہر شخص خوش نظر آرہا تھا۔ پولیٹیکل مشیر ایک طویل قامت شخص تھا۔ وہ بھی دوسروں کی طرح نوجوان تھا، لیکن اس کے انداز سے سردمہری واضح تھی۔ وہ آگے بڑھا۔ اس وقت کمانڈر لڑکیوں سے ان کی کہانی سن رہا تھا کہ وہ ان کی باتوں میں دل دے بیٹھا۔

''تمہارا انداز دیوانگی لیے ہوئے تھا۔ آج کے بعد تم سے جو کچھ کہا جائے گا تمہیں اس کی پابندی کرنی پڑے گی۔ جنگ کوئی کھیل نہیں ہے۔ یہ علم حساب کی طرح ایک ضابطہ ہے جو کوئی کم خون ضائع کرتا ہے اور اپنے آپ کو زندہ رکھتا ہے، وہی جیت جاتا ہے۔ جنگ میں ہمت کو زیادہ دخل نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارا گروہ بغیر منصوبہ کے کوئی قدم نہیں اٹھاتا۔''

جونکا سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ یکا یک اسے احساس ہوا جیسے وہ خود بھی قیدی بن گئی ہو۔ دوسری لڑکیاں خوشی سے جھوم اٹھی تھیں۔ ان کی یہ خواہش خود بخود ہی پوری ہوگئی تھی کہ جانب داروں میں شامل ہوکر جنگ کو جاری رکھا جائے۔ غالباً اس طرح وہ خود کو زیادہ محفوظ سمجھنے لگی تھیں۔

''تم کون ہو۔'' جونکا نے پوچھا۔

''میں پولیٹیکل مشیر ہوں اور کمانڈر کا مشیر بھی سمجھا جاتا ہوں، میرا نام ویلکو ہے۔''

''ہوں۔۔۔ اس کے علاوہ تمہارا کیا کام ہے؟''

''وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تمہیں اس کا بھی اندازہ ہوجائے گا۔''

سوتکو نے مداخلت کی۔ یہ نوجوان کروٹین کمانڈنٹ تھا۔ ''یہ شخص ایک خیال پیش کرتا ہے اور ہم سب اس نظریے پر جنگ کی بنیاد رکھ کر لڑتے ہیں۔ یہ ہماری کمزوریوں کی نشان دہی کرتا ہے اور ان کو دور کرنے کے منصوبے بناتا ہے۔ جو لوگ اس کی باتوں پر عمل نہیں کرتے، انہیں باقاعدہ سزا دی جاتی ہے۔''

''تم ان قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتی تھیں۔'' برنکو نے پوچھا۔

لڑکیاں خاموش رہیں۔

''ان کے لیے تم نے کیا سوچا۔'' برنکو نے ویلکو سے پوچھا۔

ویلکو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ وہ کمانڈر کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا تھا۔ دفعتاً جونکا بول اٹھی۔ ''یہ ہمارے قیدی ہیں اور ان کے بارے میں ہمیں ہی کچھ نہ کچھ سوچنے کا حق ہے۔''

جانب داروں میں سے ایک نے چیخ کر کہا۔ ''تم ان کا کیا کروگی۔ میرا خیال ہے یہ کسی کنجی لڑکی سے محبت کرنا پسند نہیں کریں گے۔''

آس پاس کھڑے ہوئے سب آدمی ہنس پڑے۔ جونکا نے تلملا کر سب مشین گن سنبھال لی۔ اگر ویلکو فوراً ہی اس پر جھپٹ نہ پڑتا تو مشین گن سے نکلی ہوئی گولیاں اس شخص کو چھلنی کرچکی ہوتیں۔

ویلکو نے مشین گن دور پھینک دی۔ جس شخص نے مضحکہ اڑایا تھا، وہ آہستہ آہستہ گن تک پہنچا اور اسے اٹھا کر واپس لے آیا۔ اس نے مشین گن جونکا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میں مذاق کررہا تھا۔ تمہیں برا نہیں ماننا چاہیے۔ دوستوں میں ایسا مذاق ہوتا ہے۔ کیا وقت گزارنے کے لیے میں آئندہ مذاق نہ کروں؟''

جونکا نے اس کے ہاتھ سے مشین گن چھین لی۔

اسے توقع تھی کہ دوسری لڑکیاں اس کی طرف داری میں جانب داروں کے خلاف صف آرا ہوجائیں گی، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ انہوں نے اپنے آپ کو کمانڈر کے احکامات کا پابند کرلیا تھا۔

کمانڈر کی عمر پچیس سال سے کچھ زیادہ ہی تھی۔

اس کی سنہری داڑھی چہرے پر عجیب سی لگتی تھی۔ ناواقف آدمی اسے بے رحم اور سفاک قسم کا مبلغ سمجھ سکتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا قیدیوں کی طرف گیا اور ان سے مخاطب ہوا۔ ہمارے جو آدمی تمہارے ہاں قید ہو جاتے ہیں تم ان کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہو؟''

قیدیوں میں سے ایک بوڑھے نے نفرت سے تھوک کر جواب دیا۔

''جنہیں ہم زندہ حالت میں پاتے ہیں، انہیں لٹکا دیا جاتا ہے اور جو مردہ حالت میں ملتے ہیں ان کی لاشیں ٹکڑے ٹکڑے کر دی جاتی ہیں۔ تم میں سے کسی ایک کو بھی مذہبی رسومات کے مطابق دفن ہونے کا حق نہیں ہے۔''

برانکو تیزی سے آگے بڑھا۔ اس نے پوری قوت سے بوڑھے کے منہ پر ٹھوکر ماری اور غرایا۔

''یقین کرو تمہارا بھی یہی حشر ہوگا۔''

''تمہیں صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی گولی مار دی جائے گی۔'' کمانڈر نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اور یہ گولیاں تمہارے دوستوں کی طرف سے چلائی جائیں گی۔ ہم اپنا اسلحہ تم پر ضائع نہیں کریں گے۔''

اس حکم کو سن کر جانب داروں میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ ورنہ وہ ان پانچوں کی تکا بوٹی کرنے پر تل گئے تھے۔ اجالا دھیرے دھیرے پھیل رہا تھا اور گولیوں کے تبادلے کا وقت ہو گیا تھا۔

ویلکو نے لڑکیوں کو اپنے ساتھ چلنے کا حکم دے دیا۔

قیدی جہاں تھے وہیں رہے۔ برانکو ان کے قریب کھڑا خاموشی سے سگریٹ نوشی میں مصروف تھا۔ اس کے انداز سے جلد بازی ظاہر نہیں ہو رہی تھی۔ بلکہ وہ سکون سے قیدیوں کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ قیدیوں کے چہرے گھبراہٹ اور خوف کے پسینے میں لتھڑے ہوئے تھے۔

''اپنے بوٹ اتار کر میرے حوالے کر دو۔'' برانکو نے حکم دیا۔

قیدیوں نے بوٹ اتار کر اس کی طرف اچھال دیے۔

''اپنے جیکٹ بھی اتارو۔'' برانکو نے انگلی کے اشارے سے کہا اور قیدیوں نے بلا حیل و حجت اس کا یہ حکم بھی مان لیا۔

برانکو نے ان سب چیزوں کو ایک تھیلے میں ٹھونس لیا اور تھیلا کندھے سے لٹکا کر وہ دوبارہ ان کی طرف متوجہ ہوا ہے۔ ''اب تمہاری باری ہے دوستو!'' اس نے عجیب لہجے میں کہا۔

قیدی اٹھ کھڑے ہوئے۔

برانکو نے انہیں ایک کھلی جگہ میں دھکیل دیا اور خود ایک جھونپڑے کی دیوار سے ٹک کر کھڑا ہو گیا اس کا رخ جرمنوں کی طرف تھا۔

''اسی جگہ خاموش کھڑے رہو۔'' برانکو نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اور منہ دیوار کی طرف کر لو۔'' یہ کہہ کر وہ آہستہ آہستہ کھسکنے لگا۔ وہ پیچھے ہٹتا ہوا ان سے دور ہو گیا۔ دفعتاً اس نے مشین گن کا رخ جرمن کیمپ کی طرف کیا اور ایک برسٹ مارا۔ اس کے ساتھ ہی خود کو زمین پر گرا کر وہ تیزی سے اس طرف لپکا جدھر اس کے ساتھی جا رہے تھے۔

جرمن مشین گنوں نے فوراً ہی اس فائرنگ کا جواب دیا۔ برانکو کی فائرنگ سے انہیں سمت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس لیے آنے والی تمام گولیاں اسی طرف آئیں اور وہاں ان کے دوست موجود تھے۔

ان کی چیخیں بڑی دل دوز تھیں۔

قیدیوں کی چیخوں سے جرمن کیمپ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے اسی سمت میں اندھا دھند گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ وہ اپنے ہی دوستوں کو بھون رہے ہیں۔

اس دوران میں قیدیوں کے جوتے اور جیکٹ تھیلے میں سمیٹے ہوئے برانکو اپنے ساتھیوں کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ جو اس وقت تک کافی دور نکل گئے تھے۔

جانب داروں کا دستہ تیزی سے پہاڑوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جرمن ان کے پیچھے تھے۔ جرمن

فوجیوں کے پاس لوٹ کا کافی سامان تھا۔ اس لیے وہ گوریلا سرحد میں داخل ہونے سے گھبراتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کچھ دور تک پیچھا کرنے کے بعد وہ واپس چلے گئے اور جانب داروں کا دستہ خطرے سے نکل آیا۔

جونکا اپنے ساتھیوں کے ساتھ سب سے پیچھے چل رہی تھی، پہلی بار وہ کسی کے احکامات کی پابندی پر مجبور تھی۔ ذمے داری ختم ہوگئی تو وہ بے چینی سی محسوس کرنے لگی۔ وہ خوش نہیں تھی، کیونکہ اس کی دانست میں جانب داروں کے دستے نے اس کا وقار مجروح کر دیا تھا۔

''کیا بات ہے جونکا۔ جونکا ہمیں بتاؤ۔''

ڈیرا، جوہا اور فانجا نے باری باری اس سے ایک ہی سوال کیا، لیکن جواباً جونکا نے محض کندھے اچکا دیے اور خاموش رہی۔ اس کے انداز سے اب غرور اور تمکنت ظاہر نہیں ہو رہی تھی۔ جارحانہ عزائم البتہ اب بھی اس کی آنکھوں میں کروٹیں لے رہے تھے۔ وہ گزشتہ چند گھنٹوں میں تبدیل ہونے والی زندگی سے نالاں نظر آ رہی تھی۔

برانکو دستے کی قطار کے آگے پیچھے دوڑا پھر رہا تھا۔ اس کے انداز سے سارجنٹ راکو جیسی صحت مندی اور حسن ٹپکتا تھا اور چہرے پر کبھی کبھی بھیڑیے جیسے تاثرات نظر آنے لگتے تھے۔ پہاڑوں کی طرف سے جو ہوا آ رہی تھی وہ اس سے بہت مسرور تھا۔ اس نے نتھنے پھیلا کر سونگھا۔ برفانی ہوا میں ان عورتوں کی بو باس محسوس کر کے اس کے ذہن پر نشہ سا طاری ہونے لگا جو اس کے قریب ہی چل رہی تھیں۔

دوسرے جانب داروں نے لڑکیوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی بلکہ ان کے انداز سے یہ ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ انہیں بھی اپنی طرح مرد ہی سمجھ رہے ہیں۔ برانکو نے جونکا کے قریب سے گزرتے ہوئے اپنا جسم اس کے جسم سے مس کرنے کی کوشش کی تو جونکا کی آنکھوں سے کچھ جھلکنے لگی۔

برانکو نے محسوس کیا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے درمیان دشمنی سی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ وہ ایک خوش مزاج جوان تھا۔ اسے جنگ سے محبت تھی اور اس کا نظریہ تھا کہ موت نام کی کوئی شے دنیا میں یا کم از کم اس کی ذات سے کوئی تعلق نہیں رکھتی حالانکہ وہ کئی بار موت کے دہانے سے واپس آیا تھا۔

اس کا یہ کھلنڈرا پن اس کے ساتھیوں کے لیے ٹانک کے طور پر کام کرتا تھا۔ فائرنگ کے دوران میں بھی وہ گنگناتا رہتا تھا۔ جب گولیاں سنسناتی ہوئی اس کے قریب سے گزرتی تھیں تب بھی اس کی گنگناہٹ ختم نہیں ہوئی تھی۔

بعض اوقات تو وہ ایک ایسا نوجوان دکھائی دیتا جسے آس پاس پھیلتی ہوئی تباہی یا موت کا قطعاً علم نہ ہو۔ وہ جلد ہی خون کی اس ہولی کو ذہن سے اتار پھینکتا تھا جو اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھیل کر واپس آتا تھا۔ وہ دشمن کی لاشوں کو بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔ اس کے نزدیک مرنے کے بعد بھی دشمن، دشمن ہی رہتا تھا۔

وہ جونکا کا مسلسل مضحکہ اڑا رہا تھا۔ بار بار گستاخ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا اور قہقہے لگاتا تھا۔ وہ نت نئی کہانیاں گھڑ گھڑ کر سنا رہا تھا اور ان سے پیدا ہونے والے خوف و ہراس سے محظوظ ہو رہا تھا۔

فانجا اور ڈیرا اس کی باتوں سے بہت متاثر نظر آ رہی تھیں لیکن جونکا کس سے میں ہوتی نظر نہ آتی تھی۔ وہ مسلسل سامنے گھور رہی تھی۔ اسے دیکھ کر احساس ہوتا تھا جیسے وہ کسی قدیم مصری ملکہ کی شبیہ ہو۔

''کیا تم جانتی ہو کہ سارجنٹ راکو کو کس نے خصی کیا تھا۔'' اس نے بھونڈے پن سے ہنستے ہوئے سوال کیا۔

''بکواس بند کرو برانکو۔'' اس نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ اسے کسی صدمے سے دوچار کرنا چاہتا ہو۔ جونکا نے اس بات پر بھی کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔

برانکو کے انداز سے جارحیت ظاہر ہو رہی تھی۔

وہ کڑے تیوروں سے جونکا کو گھورنے لگا۔ گویا اس کے سر پر پہنی ہوئی ٹوپی کو نوچ لینے کا ارادہ ہو۔

لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ دونوں ہاتھوں سے اس نے ڈیرا کے کندھوں کو جکڑ کر اسے جھنجوڑ ڈالا۔

''کیا تم جاننا چاہتی ہو کہ تم سب کے مشترکہ محبوب کو اس حالت میں پہنچانے والا کون ہے؟''

فانجا نے دونوں ہاتھوں سے کانوں کو ڈھانپ لیا۔ اس کے چہرے سے ہسٹریائی کیفیت ظاہر ہونے لگی تھی۔ جوبا اور ڈیرا کی حالت بھی قابل رحم تھی۔ سارجنٹ راکو کے تذکرے نے انہیں ایک بار پھر شرم وحیا سے وابستہ کر دیا تھا۔

''بہرحال میں بتاؤں گا۔ میں ضرور بتاؤں گا کہ اس بندر جیسے چہرے والے اٹالین کو اس حالت میں پہنچانے والا صرف اور صرف ایک ہی شخص ہو سکتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ رک گیا اور باری باری چاروں لڑکیوں کو گھورنے لگا۔ پھر یکا یک چیخ پڑا اور وہ شخص میں تھا۔ میں نے ہی اسے مردانگی سے محروم کیا تھا۔ ہاہاہا۔۔۔ہاہاہا۔۔۔''

اس کا قہقہہ اس قدر بھیانک تھا کہ ڈیرا دھڑام سے گر گئی۔ دفعتاً جانب داروں کا قافلہ رک گیا۔

لیکن کوئی بھی ان کے قریب نہیں آیا۔

جونکا نے حیرت انگیز ضبط وتحمل کا مظاہرہ کیا۔ وہ اب بھی پہلے کی طرح ٹھس اور بے حس نظر آ رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ پروقار انداز میں چلتی ہوئی ڈیرا کے قریب آئی اور اس کو زمین سے اٹھنے میں مدد دی۔ ڈیرا اس کے سہارے سے ایک بار پھر چل پڑی۔

''تمہیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے احمق۔'' وہ غرائی۔

''کہیں تم واقعی اس شخص کی محبت میں تو گرفتار نہیں ہو گئیں۔ اگر ایسا ہے تو اسے ذہن سے نکال دو۔ وہ اب دنیا میں کسی عورت کے قابل نہیں رہ گیا ہے اور اس کمینے کی باتوں پر مت جاؤ اگر راکو کو مردانگی سے محروم کرنے کا کارنامہ اسی نے سرانجام دیا ہے تو ہماری بلا سے۔'' وہ دانت پر دانت جمائے دھیمی لیکن سخت آواز میں بولتی رہی۔

''نہیں۔۔۔ جونکا۔۔۔ میں۔۔۔ اس سے محبت نہیں کرتی۔ میں قسم کھا سکتی ہوں کہ مجھے اب اس کی پروا بھی نہیں ہے۔'' ڈیرا نے سسک کر کہا لیکن اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔

''اپنے آنسوؤں کو خشک کر لو۔'' جونکا نے ہدایت کی۔

''مجھے آنسو بہا لینے دو جونکا! میں کہیں کی نہیں رہی۔ اس نے صرف ایک بار میرے رخسار پر بوسا دیا تھا۔ دوسری ملاقات میں اس نے مجھے اپنی ایک تصویر دینے کی درخواست کی تھی جسے میں نے یوں پورا کر دیا کہ آخر اس میں حرج بھی کیا ہے۔ کیا میں نے غلطی کی تھی جونکا؟''

جونکا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''تیز تیز چلتی رہو۔'' کچھ دیر بعد جونکا نے ہدایت کی۔

برانکو اب ان کے پاس سے ہٹ کر آگے بڑھ گیا تھا۔ اس نے ایک دو بار پیچھے آنے کی کوشش کی لیکن کمانڈر نے اسے سختی سے روک دیا تھا۔ جانب داروں کا دستہ جب آزاد علاقے میں پہنچا تو خوشی سے جھوم جھوم کر گانے لگا۔ اس وقت وہ ایک ایسے گاؤں کے قریب پہنچ گئے تھے جہاں کسی بھی بیرونی مداخلت کا اندیشہ نہیں تھا اور وہ وہاں آرام وسکون سے سو سکتے تھے۔

گاؤں میں داخل ہوتے ہی لمبے سیاہ بالوں والی ایک خوب صورت لڑکی جونکا اور اس کی ساتھیوں کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئی۔

''میرا نام بوجا ہے۔'' اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

س کی پروقار حرکات سے فانجا کے دل سے ایک ہوک اٹھی۔ بوجا کی نسوانی کشش، اس کا حیا آلود رکھ رکھاؤ اور گفتگو کا نرم ونازک انداز ان چاروں کے دلوں پر آری کا کام کرنے لگا۔ یکا یک وہ اپنی ہی نگاہوں میں ہیچ ہو گئیں۔ بوجا کے سامنے انہیں اپنی شخصیت پھیکی پھیکی اور ناپائیدار محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے لمبے لمبے بالوں کو دیکھ کر انہیں اپنی وہ زلفیں

ہا آ گئیں جنہیں ایک اٹالین سارجنٹ نے بوبت لی ہا اوش میں کاٹ دیا گیا تھا۔

ڈیرا اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکی۔

اس نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر بوجا کے سیاہ ...ی بالوں کو چھولیا۔ اس کے ہاتھ کا لمس محسوس کر ے بوجا ایک لمحے کے لیے ٹھٹک گئی۔ اسے ڈیرا کا لمر دار ہاتھ مردانہ لمس سے بھرپور محسوس ہوتا تھا۔ اس لیے وہ غیر ارادی طور پر اسے جھٹکے بغیر نہیں رہ لی۔

ڈیرا کے چہرے پر کرب کے تاثرات ابھر آئے۔ جنہیں دیکھ کر بوجا نے جلدی ہی خود پر قابو پالیا۔ اس نے پیار سے ڈیرا کا ہاتھ تھام لیا اور ایک لٹ اس کے رخساروں سے چھودی۔ ڈیرا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

بوجا جلد ہی ان سے بے تکلف ہو گئی۔

اس کے لیے بے تکلف ہوتے ہی ڈیرا اور جوبا دونوں ہی اس کی زلفوں سے کھیلنے لگیں۔ فانجا بھی ایسا کیے بغیر نہ رہ سکی۔ البتہ جونکا لیے دیئے رہی۔ وہ ان سے کچھ فاصلے پر کسی چٹان کی طرح بے حس و حرکت بیٹھی ہوئی تھی۔

''تم کہاں سے آئی ہو۔'' ڈیرا نے پوچھا۔

''کارلود یک سے۔۔۔ اور تم۔۔۔''

''ہم سب کا تعلق جو ہلجانہ سے ہے۔''

بوجا آنکھیں بند کر کے مسکرانے لگی۔ ''آہ، جو ہلجانہ کس قدر خوب صورت شہر ہے۔ میرا ایک دوست بھی وہیں سے آیا ہے۔''

جونکا بوٹ اتار رہی تھی۔ اس نے ابھی تک گفتگو میں حصہ نہیں لیا تھا لیکن وہ ان کی ایک ایک بات بغور سن رہی تھی۔ بوجا بتا رہی تھی کہ جانب داروں کے کمانڈر کے احکامات بہت سخت ہیں۔ کسی کو محبت کرنے کی اجازت نہیں۔ ڈریکا نامی ایک لڑکی نے ویک نام کے ایک نوجوان سے تعلقات استوار کر لیے تھے تو انہیں گولی ماردی گئی تھی۔

اندھیرا پھیلتے ہی وہ گھاس کے بستر پر لیٹ گئیں۔ کچھ دیر بعد برانکو اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ آیا اور وہ بھی اس کمرے میں سونے کے لیے لیٹ گئے۔ جونکا نے برانکو کی طرف سے منہ پھیر لیا لیکن نینداس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

☆☆☆

اس عرصے میں ان کی زندگی نہایت شان دار تھی۔ کسی طرف سے حملے کا کوئی خوف نہیں تھا۔ تحفظ کے احساس نے ان کے دل و دماغ میں خوشیاں ہی خوشیاں بھر دی تھیں اور انہیں خوف زدہ حالت میں لمبے لمبے سفروں سے نجات مل گئی تھی لیکن ویلکو خوف زدہ تھا وہ حیران تھا کہ جنگ اور سیاست کو ایک دوسرے سے کس طرح الگ کیا جاسکتا ہے۔

''کسی خاص نظریے کے بغیر جنگ ہمیشہ قتل و غارت گری کا باعث ہوتی ہے۔'' وہ اکثر یہ بات کہتا تو اس کے ساتھ تائید میں سر ہلا دیتے لیکن وہ سب آہستہ آہستہ چڑچڑے ہوتے جارہے تھے کیوں کہ ویلکو انہیں بور کرنے لگا تھا۔

سیاسی اجتماع عموماً اسی انداز میں شروع ہوتے تھے۔ ویلکو باتیں کرتا رہتا تھا۔ اسے احساس تھا کہ وہ بار بار ایک ہی بات کو دہرانے لگا ہے لیکن یہ سوچ کر مطمئن رہتا کہ اعادہ ذہن نشینی کے لیے از حد ضروری ہے۔

گفتگو کے دوران میں اس کی سبز آنکھیں ایک ایک چہرے کا جائزہ لیتی رہتی تھی۔ وہ اپنے مردہ ساتھیوں کا نام لے لے کر نعرے لگاتا اور سب حلق پھاڑ پھاڑ کر اس کا ساتھ دیتے تھے۔

ایسے میں کوئی نہ کوئی اسے ٹوک دیتا تو وہ سنبھل کر کہتا۔ ''ہاں میں جانتا ہوں کہ یہ دیانت داری نہیں لیکن کیا اس جنگ میں دیانت داری کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ کیا یہ ایک جائز جنگ ہے۔ کچھ چیزیں دوسروں کے نزدیک جائز ہوں گی لیکن وہ ہمارے لیے جائز نہیں ہو سکتیں۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے جونکا کی طرف دیکھا

اور نہ جانے کیوں وہ اس کی طرف متوجہ ہوتا تھا اس کی آنکھیں جھک جاتی تھیں۔ ''محبت'' کا لفظ ہارویلکو کی زبان پر آیا تھا لیکن یہ سب کچھ جونکا اور اس کے ساتھیوں کے لیے بالکل نیا اور اجنبی تھا۔

برانکو ہمیشہ بے صبری کا مظاہرہ کرتا۔ وہ اپنی زندہ دلی کھو بیٹھا تھا اور بغاوت اس کے دل و دماغ پر غلبہ پا چکی تھی۔

''ہم تمہاری باتیں سن سن کر پاگل ہو گئے ہیں۔'' وہ چیخ پڑا۔

''محبت کرنا قانون کے خلاف ہے، ہمیں معلوم ہے لیکن خدا کے لیے اب بار بار اسے دوہرا کر ہمارا دماغ خراب مت کرو۔ تمہارا لیکچر ہمیں حکم عدولی پر مجبور کرنے لگا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ سیاسی اجتماع صرف اسی وقت ہونا چاہیے جب کوئی اہم معاملہ زیر بحث لانا ضروری ہو۔ یہ اجتماعات صرف اس لیے ہونے لگے ہیں کہ تم استادوں کی طرح لیکچر پلاتے رہو۔ ہم تمہارے شاگرد نہیں بننا چاہتے۔ میں جا رہا ہوں بہت تھک گیا ہوں اس لیے اطمینان سے سو جاؤں گا۔ ساتھیو اٹھو تم سب کو بھی نیند آ رہی ہوگی۔''

برانکو دروازے کی طرف بڑھا لیکن ایک سنہرے بالوں والے نوجوان نے اسے روک لیا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' اس نے کہا۔

''مجھے جانے دو۔'' برانکو چیخا۔

دفعتاً دونوں ایک دوسرے کے دشمن نظر آنے لگے۔

''اپنا پستول مجھے دے دو اور اتنی دور نکل جاؤ کہ تمہیں کوئی تلاش نہ کر سکے۔

برانکو نے اپنی بیلٹ سے پستول نکالا اور دیوار کی طرف کھینچ مارا۔ وہ اپنے ان ساتھیوں کو گھورنے لگا جو اپنی جگہوں پر بے حس و حرکت بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر وہ دل میں ان سب کے لیے نفرت کا طوفان لیے وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔

وہ ابھی زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ پہاڑوں کی سمت سے آنے والی سرد ہوا نے اسے ٹھٹھرا دیا سر جھکائے وہ اندھی بکری کی طرح ٹھوکریں کھاتا اور لڑکھڑاتا ہوا واپس آ گیا۔ دروازہ نیم وا تھا۔

ویلکو کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی اور آخر کار اس نے فیصلہ کر لیا اور وہ کسی کی طرف دیکھے بغیر دوبارہ اندر آ گیا۔

''تمہیں ہر چیز کا عادی ہونا چاہیے۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''آج کے ہیرو کل کے عادی مجرم بھی بن سکتے ہیں برانکو! ہم سب کو چاہیے کہ اپنی اپنی عادتوں کو ایک دوسرے کی مرضی کے مطابق بنائے۔''

برانکو بغیر آنسوؤں کے رو پڑا۔ اس کا گلا رندھ گیا تھا اور آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہ اپنے ساتھیوں کو گھور رہا تھا جیسے وہ یکا یک مفلوج ہو گئے ہوں۔

''آخر تم مجھے یہ سب کچھ کیوں کہتے رہتے ہو۔'' میں ان چیزوں کے بارے میں ہر وقت سوچنے رہنا پسند نہیں کرتا۔ یہ سب کچھ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔

''اس کی وجہ بھی تمہیں ہی معلوم ہونی چاہیے۔'' برانکو کے احتجاج کو نظر انداز کر کے جواب دیا گیا۔

''میں نہیں چاہتا کہ قتل و غارت گری تمہاری عادت بن جائے کیوں کہ تم مجھے بھی قتل کر سکتے ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمہیں میری آواز سنائی نہیں دیتی ہماری پارٹی۔۔۔''

''پارٹی ۔۔۔ پارٹی ۔۔۔ آخر یہ پارٹی کون ہے۔ تم تو اس انداز میں گفتگو کرتے ہو جیسے پارٹی کسی ایک شخص کا نام ہے اور وہ دشمن تم خود ہو۔ کبھی کبھی تو میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ کہیں تم کوئی مبلغ تو نہیں ہو۔ اور تم کسی ایسے مذہب کا پرچار کر رہے ہو جو میری سمجھ سے بالاتر ہے۔''

ویلکو خاموش رہا۔ سب لوگوں نے مایوسی سے سروں کو ہلا دیا اور وہ بھی خاموش رہے۔

کچھ دیر بعد ویلکو دوبارہ گویا ہوا۔ ''سوچو میں یہ نہیں چاہتا کہ تم کسی خاص نظریے کے بغیر جنگ کرو۔ میں تمہیں مرنے کے لیے تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔

ن لوگوں نے اب تک کوئی قتل کیا ہے وہ اپنا ہاتھ سر ے بلند کرلیں۔''

سب نے ہاتھ اٹھا دیئے۔ ویلکو نے جونکا اور ں کی ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ انہوں نے بھی ہاتھ ٹھا رکھے تھے۔

''اپنے ہاتھ نیچے کرلو۔'' وہ جونکا کی طرف منہ ر کے چیخا۔ ''کیا تم نے اٹلی کے فوجیوں کے ساتھ ساتھ ہمارے ساتھیوں کو بھی قتل نہیں کیا؟''

لڑکیوں نے ہاتھ نہیں گرائے۔

''میٹنگ جاری رہے گی۔'' اس نے کہا۔ ''تم میں سے کون جانا چاہتا ہے۔''

''میں جانا چاہتا ہوں۔'' سرخ داڑھی والے جوزا نے کہا۔ وہ چہرے سے کوئی راہب نظر آتا تھا۔ ''میں جس قدر بھی جلدی ممکن ہو زاگ ریب جانا چاہتا ہوں۔'' یہ کہنے کے بعد وہ شرما گیا اور سب نے ہنسنا شروع کردیا۔

''کیا کرنے کے لیے۔''

''میں وہاں جا کر شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

ایک بار پھر سب ہنس پڑے، اس دفعہ کمانڈنٹ نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ ویلکو اس طوفان بدتمیزی کے ختم ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ پھر بولا۔

''مجھے افسوس ہے جوزا، یہ نہیں ہوسکتا۔''

''کیوں؟'' جوزا نے حیرت سے پوچھا۔

''بریگیڈ ہنی مون کی چھٹیاں منظور نہیں کرسکتا۔''

''میں ایک سال سے یہاں ہوں اور اب مجھے ایک بیوی کی ضرورت ہے۔'' جوزا غصے اور جھنجھلاہٹ سے چیخ اٹھا۔

''جوزا۔۔۔!'' ویلکو نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''ہمارے ملک میں پہلے ہی بیواؤں کی کمی نہیں ہے۔ اس لیے۔''

''اگر صرف یہی اعتراض ہے تو ان تمام بیوہ عورتوں کو دوبارہ شادی کرلینی چاہیے۔'' جوزا نے بدستور غصیلی آواز میں کہا۔

اس بات پر سب ہی شور مچانے لگے اور ویلکو اس شور کو دبانے کی کوشش میں ناکام رہا لیکن دفعتاً جونکا کی آواز گونجی تو خاموشی چھا گئی۔

''میں بھی جانا چاہتی ہوں۔'' اس نے اپنے سر کو بے نقاب کرتے ہوئے کہا۔ وہ اس بات سے بے پروا نظر آرہی تھی کہ اس کے گنجے سر کو دیکھ کر محفل میں موجود بیشتر آدمیوں کے چہرے نفرت سے سکڑ گئے تھے۔

''ذرا غور سے دیکھو۔'' جونکا نے تلخی سے کہا۔ ''ہمیں سزا دینے کے لیے ہمارے سروں کو مونڈ دیا گیا تھا۔ وہ تمہارے ہی ساتھی تھے اور ممکن ہے انہیں بھی کسی ایسی ہی میٹنگ میں ہمارے سر مونڈنے کا حکم دیا گیا ہو۔ لیکن اب ہمیں یہ سوال کرنے کا حق ہے کہ کیا تم ہم سب کو قبول کرنے پر آمادہ ہو۔ ہمیں موت سے ذرا بھی خوف نہیں آتا اور ہم تنہا اس جنگ کو جاری بھی رکھ سکتی ہیں۔''

جوہا اور ڈیرا نے بھی اس کی تائید کی۔

''تمہیں اس میٹنگ میں شمولیت کی اجازت دی گئی تھی۔'' ویلکو نے کہا۔ ''کیوں کہ ہیڈ کوارٹرز نے تمہیں ہم میں سے ایک قرار دیا تھا۔ تمہارا ماضی شہر میں دفن ہوچکا ہے۔ اس لیے اب صرف احکامات کی پابندی کرو اور ہمارے لیے دشواریاں نہ پیدا کرو اور آج کے بعد سے تمہیں اپنی نسوانی کمزوری سے دشمنوں کے مقابلے میں زیادہ خوف زدہ رہنا چاہیے۔''

جونکا نے اپنا سر دوبارہ ڈھانپ لیا۔

گہری خاموشی چھا گئی۔

''کامریڈز!'' کمانڈنٹ سونکو نے کہا۔ ''کیا کوئی اور بھی کچھ کہنا چاہتا ہے۔'' اس نے باری باری سب کی طرف دیکھا۔ ویلکو نے نفی میں سر ہلا دیا کیوں کہ کسی نے کچھ کہنے کی اجازت کے لیے ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ گویا سب ہی باتوں سے اکتا گئے تھے۔ کمانڈنٹ سونکو نے اگلی صبح اور رات بھر کے لیے احکامات دینے شروع کیے تو سب ہی بے چینی سے

دروازے کی طرف دیکھنے لگے تھے۔

☆☆☆

سلووینیا میں فاتح اٹالین فوج کا کمانڈر جنرل روہالی خاموش ہوگیا جیسے وہ اپنے دلائل کی بنیاد کو بھول گیا ہو۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا کیوں کہ اس نے انتہائی غصے کے عالم میں تقریر ختم کی تھی۔ وہ ان افسروں کو گھور رہا تھا جو اس وقت کو سیو جی ہال میں جمع تھے۔

نومبر کی سردی کے باوجود کمرا خاصا گرم تھا۔ آتش دان دہک رہے تھے لیکن کمرے میں گہری خاموشی تھی۔

تمام جنرل پہلی قطار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے کرنل اپنے جذبات سے عاری چہروں کے ساتھ براجمان تھے۔ سب سے پیچھے غلیظ وردیوں اور دھوپ سے جھلسے ہوئے چہروں والے کیپٹن کھڑے تھے۔ وہ اس انداز میں اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے جیسے کسی ناگہانی حملے سے خوف زدہ ہوں۔

جنرل روہالی ہلکے سے کھانسا اور گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ اسے اپنے افسروں سے کسی اچھے مشورے کی توقع تھی۔ دفعتاً جنرل ریگی نے بولنے کی اجازت طلب کی اور جب وہ بولا تو اس کی آواز حیرت انگیز حد تک تیز اور ناگوار ثابت ہوئی۔

''باغیوں کے خلاف ہم نے بڑے موثر اقدام کیے ہیں لیکن یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ہمارے ہتھیاروں کی دسترس سے بہت دور ہیں۔ ایسی صورت میں ہمیں چاہیے کہ بعض ایسے اقدام کریں جن سے وہ آبادی سے کٹ جائیں۔ اس سلسلے میں سزائے موت ہی کافی نہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ان باغیوں تک غذائی ضرورت کی اشیاء پہنچنے کے راستے ختم کردیں تاکہ وہ نڈھال ہوکر باہر آجائیں۔''

کمرے میں موجود ہر شخص نے اثبات میں سر ہلا کر گویا اس کی تائید کردی۔

''کل سے میں طبی ضروریات کے سامان کی نگرانی کروں گا تاکہ ایسا سامان شہر سے باہر نہ جانے پائے۔ اس طرح مختلف بیماریاں ہمارے لیے ہتھیار بن کر باغیوں کا صفایا کریں گی۔ اس سلسلے میں بڑی سختی سے چیکنگ ہونی چاہیے۔ کیوں کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ فرسٹ ایڈ کے کئی پیکٹ اب تک غائب ہو چکے ہیں۔''

گہری خاموشی نے ایک بار پھر ماحول کو لپیٹ میں لے لیا۔ ''اس طرح باغیوں کے گرد حلقہ تنگ ہوتا جائے گا اور ہم ان پر آسانی سے قابو پانے میں کامیاب ہوجائیں گے۔'' جنرل ریگی نے تقریر ختم کرتے ہوئے کہا۔

کمانڈر جنرل روہالی نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ یکایک تروتازہ اور خوش نظر آنے لگا تھا۔ ہال میں بحث شروع ہوگئی کہ کن کن ذرائع سے باغیوں کا امدادی سامان روکا جاسکتا ہے۔ جنرل ریگی ایک ذہین شخص تھا اس لیے سب ہی اس کی قدر کرتے تھے۔

میٹنگ ختم ہوگئی تو تمام جنرل ایک جگہ جمع ہوگئے اور ان کے درمیان ذاتی قسم کی گفتگو شروع ہوگئی۔

اسی رات ملٹری کے بازار حسن سے یہ خبر چاروں طرف پھیل گئی کہ طبی سامان رکھنے والوں کی سختی سے چیکنگ شروع ہونے والی ہے اور دوائیں لانے یا لے جانے پر سخت پابندی عائد ہورہی ہے۔

یہ خبر پھیلتے ہی ہر عمر کی عورتیں کرفیو کی پروا کیے بغیر روتی دھوتی گشتی فوجیوں کے سامنے پہنچ گئیں کہ انہیں طبی سہولتوں سے محروم نہ کیا جائے۔ کرفیو ختم ہو تو فوری طور پر دواؤں کی خریداری شروع ہوگئی اور دکانوں کے شیلف خالی نظر آنے لگے۔

یہ خبر آس پاس کے شہروں میں پھیل گئی تو وہاں بھی دواؤں کی خریداری کا سلسلہ زور پکڑ گیا یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ان شہروں پر شدید وبائی حملہ ہونے والا ہو۔

ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا کہ بوڑھی عورتوں کے گردہ چہروں کو شالوں میں چھپائے

پہاڑوں کی طرف روانہ ہوگئے تاکہ وہاں چھپے ہوئے اپنے بیٹوں سے ملاقات کر سکیں۔ انہوں نے اپنے ا میلے ڈھالے لبادوں میں دوائیں چھپا رکھی تھیں۔

سونکو کی قیادت میں جو بریگیڈ کام کر رہا تھا وہاں ندھیرا پھیلتے ہی الارم بجنے لگا۔ جو لوگ درختوں پر ڑھے نگرانی کر رہے تھے انہوں نے بوڑھی عورتوں کو یکھ لیا تھا۔ چند لمحوں تک انتظار کے بعد جب اطمینان وگیا کہ ان کے ساتھ دشمن سپاہی نہیں ہیں تو سونکو اپنی اں کی طرف لپکا اور اس سے لپٹ گیا۔

ویلکو نے اس منظر کو دیکھا اور مسکرانے لگا۔ جن ورتوں کو ان کے بیٹے نہیں ملے وہ بری طرح آہ اری کر رہی تھیں اور انہیں سمجھانے بجھانے کی تدبیر ائیگاں جا رہی تھیں۔

کچھ فاصلے پر جونکا اپنی ساتھیوں کے ساتھ ؤں کو اپنے اپنے بیٹوں سے لپٹتے ہوئے دیکھ رہی ھی۔ جب سے وہ اس گروپ میں شامل ہوئی تھی ان ی زندگی ہی بدل گئی تھی۔

جن عورتوں کے بیٹے موجود نہیں تھے وہ ویلکو کو ہر آلود نگاہوں سے گھور رہی تھیں اور وہ سونکو کی طرف گھورتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”سونکو! ان عورتوں نے اس کمین گاہ کو دشمنوں ی نگاہوں میں بے نقاب کر دیا ہے۔ ان کو جتنی لدی ممکن ہو سکے یہاں سے واپس بھیج دو۔ ہمیں س علاقے کو فوری طور پر چھوڑ دینا چاہیے۔“

”ہم ان سے لڑیں۔“

”ہمیں جو احکامات دیئے گئے ہیں ان کے طابق جنگ سے پہلو تہی کرنی چاہیے۔ ہمارے س زیادہ اسلحہ نہیں ہے۔ صرف دس منٹ گولیوں کا دلہ ہوگا اور پھر ہمارے لیے یہاں سے نکلنا بھی مکن ہو جائے گا۔“

اپنی ماں کو لپٹائے ہوئے سونکو نے جواب دیا۔ اگر اٹالین دستے نے ہم پر حملہ کیا تو ان کا اسلحہ چھین ر انہی پر استعمال کریں گے۔ ان عورتوں نے اپنی ندگی کو محض ہمارے لیے خطرے میں ڈالا ہے۔ یہ دوائیں لیے دن بھر پیدل چلتی رہی ہیں۔ یہ ہماری مائیں ہیں اس لیے ہم انہیں اس حالت میں واپس جانے کی اجازت نہیں دے سکتے۔“

”دوبارہ غور کرو سونکو! تم اس بریگیڈ کے کمانڈنٹ ہو۔“

”میں اس سلسلے میں پہلے ہی فیصلہ کر چکا ہوں۔“

ویلکو نے پلٹ کر اپنے باقی ساتھیوں سے کہا کہ وہ فوری طور پر سامان باندھیں اور وہاں سے فرار ہو جائیں۔ جونکا کو اس نے حکم دیا۔ ”میرا سامان بھی باندھ دینا۔“ اس نے کہا۔

”میں۔۔۔ کیوں؟“ جونکا نے غصیلی آواز میں پوچھا۔

ویلکو کو فوراً ہی احساس ہو گیا کہ اس سے غلطی سرزد ہو گئی ہے اس نے جونکا کو اس انداز میں حکم دیا تھا جیسے وہ اس کی ساتھی نہیں بلکہ بیوی ہو۔

دفعتاً ایک عورت آگے آئی۔ اس کا چہرہ پسینے سے بھیگا ہوا تھا وہ اپنے بیٹے سے لپٹ گئی۔ ”میرا بیٹا میرے ساتھ جا رہا ہے۔“ عورت نے اپنے بیٹے کو لپٹاتے ہوئے کہا۔ ”میں اسے چھپا لوں گی۔ مجھے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں کہ سلووینیا پر کون حکومت کرتا ہے۔ لیکن میرے بیٹے کو زندہ رہنا چاہیے۔ اگر میں تنہا رہ گئی تو ایسی آزادی کو کیا کروں گی؟“

دوسری عورتیں بھی ویلکو کے گرد جمع ہو گئیں۔ سب یہی کہہ رہی تھیں۔ ان کا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ ویلکو کو اپنا دشمن سمجھ رہی ہوں۔

”تم سب کے سب مر جاؤ گے۔۔۔ سب۔۔۔“ یہ ایک ایسی عورت کی پکار تھی جسے اس کا بیٹا زندہ حالت میں نہیں ملا تھا۔

”جس کسی نے بریگیڈ کو چھوڑنے کی کوشش کی اس پر مقدمہ چلائے بغیر ہی اس سے نمٹ لیا جائے گا۔“ ویلکو نے ایک ایک شخص کو گھورتے ہوئے سخت لہجے میں اعلان کیا۔

عورتیں خاموش ہو گئیں۔ کوئی بھی اس کی

مخالفت میں بولنے کی جرات نہیں کر سکتی تھی۔ ہر آدمی اپنے اپنے سامان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

عورتوں میں ویلکو کے فیصلے کے بعد اتنی دہشت پھیل گئی تھی کہ انہوں نے الوداعی انداز میں ہاتھ بھی لہرانے کی کوشش نہیں کی۔

ویلکو ان بوڑھی عورتوں کی طرف متوجہ ہوا۔

اگر تم اپنے بیٹوں کو بچانا چاہتی ہو تو تمہیں یہاں آرام کرنے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ فوراً واپس چلی جاؤ۔ ممکن ہے آج رات اس جگہ کو گھیرے میں لے لیا جائے۔ صبح کوئی بھی زندہ نہیں رہے گا۔ اگر تم میں سے کوئی گرفتار ہو جائے اور دشمن یہ معلوم کرنا چاہے کہ ہم میں سے کون کون زندہ ہے تو انہیں ہرگز حقیقت سے آگاہ نہ کیا جائے۔ البتہ مردہ لوگوں کے نام لے کر بتایا جائے کہ وہ سب ابھی زندہ ہیں اور جو لوگ زندہ ہیں انہیں مردہ ظاہر کیا جائے۔ اس طرح انہیں احمق بنا کر فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اگر ڈوموفرالسی یا یوٹاسی سے مڈبھیڑ ہو جائے تو دور ہی سے انہیں چیخ چیخ کر یقین دلانے کی کوشش کرنا کہ تم ان کی دشمن نہیں ہو۔ ورنہ وہ دور ہی سے تمہیں ہلاک کر دیں گے۔''

ویلکو ایک طرف چل پڑا اور سب اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ دفعتاً ویلکو نے رک کر بوڑھی عورتوں سے کہا۔ ''الگ الگ ہو جاؤ ایک ساتھ تم سب ہی ماری جاؤ گی۔''

بوڑھی عورتیں منتشر ہو گئیں اور ویلکو اپنے ساتھیوں کے ساتھ پہاڑ کی برفانی چوٹیوں کی طرف بڑھ گیا۔

گاؤں میں دو دن اور دو راتیں گزارنے کے بعد جانب داروں کا بریگیڈ واپس اپنی پرانی کمین گاہ میں آ گیا۔ ویلکو قطار میں سب سے پیچھے تھا لیکن وہ حقائق سے آگاہ تھا۔ اس کی چھٹی حس نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ ان کی غیر موجودگی میں جرمن دستوں نے وہاں کیا ستم ڈھایا ہوگا۔

جب وہ وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے تو جرمن دستوں نے جھنجلاہٹ میں پورے گاؤں کو تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ جن جھونپڑوں میں رہتے تھے انہیں زمین بوس کر دیا تھا۔

پرانی قیام گاہ تک پہنچتے ہی کچھ لوگ مایوسی کا شکار ہو گئے تھے۔ انہیں نڈھال دیکھ کر ویلکو چیخ اٹھا۔

''یہ آرام کرنے کا وقت نہیں ہے۔ ہمیں فوراً اپنے مکانوں کو دوبارہ تعمیر کرنا ہے۔ سب سے پہلے شہتیروں کے لیے بڑے بڑے درختوں کو فوراً کاٹنا شروع کر دو۔''

کسی نے اس کے حکم کی پیروی نہیں کی۔ سب نڈھال تھے اور جہاں ٹک گئے تھے وہیں کاہل مویشیوں کی طرح پڑے رہے۔ دفعتاً جونکا اپنی جگہ سے اٹھی اور کام میں مصروف ہو گئی۔

اس کی دیکھا دیکھی دوسری لڑکیاں بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ لڑکیوں کو کام میں لگے دیکھ کر مردوں کی غیرت بھی جاگ اٹھی اور وہ بھی کام کے لیے اٹھے لیکن سونکو کی آواز سن کر رک گئے۔

''کیا بات ہے سونکو!'' ویتا نے دریافت کیا۔

''ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ہماری مائیں خیریت سے اپنے اپنے گھروں تک پہنچ گئی ہیں۔ کسی کو اس کام کے لیے چلے جانا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے تم لوگ کام شروع کرو میں جاتا ہوں۔''

''نہیں ۔۔۔ میں جاؤں گا۔ تم تو جلدی ہی آ کر کہہ دو گے کہ وہ سب زندہ ہیں۔ چاہے تمہیں ان کی لاشیں ہی کیوں نہ نظر آ جائیں۔''

ویلکو چند لمحوں تک اسے گھورتا رہا پھر اس نے خلاف معمول خفگی ظاہر کیے بغیر جواب دیا۔ ''ٹھیک ہے سونکو تم ہی چلے جاؤ گڈ لک!''

کمانڈر زیادہ دیر وہاں نہیں رکا۔ اس نے بوٹوں کے تسمے باندھے اور وہاں سے رخصت ہو گیا۔

اس کے جاتے ہی ویلکو باقی لوگوں پر برس پڑا اور سب لوگ خاموشی سے جھونپڑوں کی تعمیر میں لگ گئے۔

''کیا تمہیں اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں کہ بوڑھی عورتوں کا کیا حال ہے۔'' جونکا نے پوچھا۔

''وہ محفوظ ہیں۔'' ویلکو چیخ پڑا۔

''تم یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو۔''

''میرا خیال ہے تم غیب داں نہیں ہو۔'' جونکا نے تلخی سے پوچھا۔

''جس کسی نے بھی اس چھوٹے سے گاؤں کو دیکھ لیا ہے وہ اس وادی کی طرف سے نہیں آیا تھا۔ اس لیے جرمن دستوں کو وہ بوڑھی عورتیں نظر نہیں آئی ہوں گی۔ جرمنوں میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ وہ اونچے مقامات کی طرف سے آئیں۔ وہ ہم سے خوف زدہ ہیں اور انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ ہمارے پاس زیادہ اسلحہ نہیں ہے۔''

''یہ بات تم نے مردوں سے کیوں نہیں کہی۔''

''میں انہیں تم سے بہتر انداز میں جانتا ہوں۔ وہ کبھی میری بات پر یقین نہ کرتے۔''

جونکا کی نگاہیں جھک گئیں۔ شروع شروع میں اسے ویلکو سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ اس لیے اب وہ اس پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ اس کی آنکھوں میں اس کے لیے تعریفی چمک پیدا ہو گئی ہے۔

دن بھر کام کاج میں گزر گیا۔

شام تک چند جھونپڑے تیار ہو گئے اور سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے ہی سونگو واپس آ گیا۔ وہ بہت خوش تھا کیوں کہ تمام بوڑھی عورتیں زندہ سلامت اپنے اپنے گھروں تک پہنچ گئی تھیں۔

جانب داروں کے دستے میں ایک بار پھر ویلکو کی ذہانت کا سکہ بیٹھ گیا۔ وہ تھکن سے چور چور تھے۔ اس لیے جلد ہی سو جانا چاہتے تھے لیکن ویلکو نے انہیں ایک جگہ جمع ہونے کا حکم دیا اور تقریر شروع کر دی۔

میٹنگ رات کے اس پہر ختم ہوئی جب دوسری یونٹ کے نگراں اپنی اپنی ڈیوٹی سنبھال چکے تھے۔ کچھ دیر بعد جونکا بادام کے ایک درخت سے ٹک کر کھڑی ہوئی تھی کہ ویلکو اس کے قریب سے گزرا۔ اسے دیکھ کر وہ رک گیا۔ ''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟''

جونکا نے جواب نہیں دیا اور نہ ہی اپنی جگہ سے حرکت کی۔

''کیا بات ہے۔'' ویلکو نے دوبارہ پوچھا۔

''ہمیں دوسرے بریگیڈ میں تبدیل کر دو۔''

''کیا تم مجھے حکم دے رہی ہو؟''

''نہیں لیکن اس خواہش کی چند وجوہات ہیں۔''

''سب کچھ طے ہو چکا ہے۔ تمہیں اسی بریگیڈ کے ساتھ رہنا پڑے گا۔''

''ہم تمہاری اجازت کے بغیر ہی چلی جائیں گی۔''

''کیا بات ہے۔'' ویلکو نے چونک کر کہا اور گہری نگاہوں سے جونکا کو گھورنے لگا۔

''کیا ہوا ہے؟''

وہ ایک دوسرے سے بہت قریب کھڑے تھے اور دبی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ ''تم لوگ ہمارا انداق اڑاتے ہو۔''

''جب نئے رنگروٹ آتے ہیں تو پرانے لوگ ان کا مضحکہ اڑاتے ہیں لیکن وہ جلد ہی ایک دوسرے سے مانوس ہو جاتے ہیں اور یہ سلسلہ خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔۔۔ بشرطیکہ۔۔۔''

بشرطیکہ۔۔۔؟'' جونکا نے تلخی سے پوچھا۔

''یہی کہ تمہارے ماضی کو فراموش کر دیا جائے۔''

جونکا نے اس کے منہ پر تھوک دیا اور وہاں سے ہٹ گئی۔ جب وہ اپنے جھونپڑے میں پہنچی تو فانجا گہری نیند سو رہی تھی۔ جوبا اور ڈیرا ابھی جاگ رہی تھیں اور ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے جیسے ہی جونکا کی آہٹ سنی جلدی سے الگ ہو گئیں اور یوں ظاہر کرنے لگیں جیسے بہت دیر سے گہری نیند سو رہی ہوں۔

برانگو کے نگراں اس رات گاؤں کے پہلو کی

حفاظت پر مامور تھے۔ چاندنی پہاڑیوں پر جمی ہوئی برف سے منعکس ہوکر نیلگوں ہورہی تھی اور خاموشی میں یہ علاقہ غیر حقیقی نظر آرہا تھا۔ ہر چیز کانچ کی بنی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔

وہ اس وقت مناظر کے حسن میں نہیں بلکہ اس راستے میں کھویا ہوا تھا جو جھونپڑوں کی طرف جاتا تھا۔ دفعتاً اسے بوجا نظر آئی۔ وہ ایک سے دوسری چٹان پر ہوتی ہوئی مسلسل بڑھ رہی تھی۔ اس نے برانکو کو متوجہ کرنے کے لیے سیٹی بجائی۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھ گیا۔

وہ بے تابی سے اس سے لپٹ گئی۔

برانکو نے دستانے اتارے اور بوجا کا ہاتھ تھام لیا۔ ان کے بوس وکنار میں برسوں کی بھوک اور پیاس تھی۔ اچانک انہیں کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی، کوئی اسی طرف آرہا تھا۔

وہ دیوانہ ہورہا تھا۔ اس نے بوجا کو سختی سے بھینچ رکھا تھا۔ بوجا قدموں کی چاپ سن کر اس کی بانہوں میں مچلنے لگی۔ جلد ہی برانکو بھی ہوش میں آگیا اس نے پھرتی سے اپنی مشین گن سنبھالی اور آنے والے کا انتظار کرنے لگا۔

تین جرمن دکھائی دیے۔ ان کے سنہرے بال ہوا سے لہرا رہے تھے۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سر سے بلند کررکھے تھے۔ گویا وہ ہتھیار ڈالنے آئے تھے برانکو نے گن اٹھائی اور سیفٹی کیچ ہٹادیا۔

جرمنوں نے فوراً ہی گھٹنوں کے بل جھک کر خود کو اس کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔ ''تم ہتھیار کیوں ڈال رہے ہو؟'' برانکو غرایا۔

''ہم خوف زدہ ہیں۔'' ایک نے جواب دیا۔

''دراصل ہم جرمن نہیں ہیں بلکہ ہمارا تعلق دائی انیس سے ہے۔ جب آسٹریا آزاد تھا تو ہم سوشلسٹ تھے جیسے کہ اس وقت تم ہو۔ ہمارے خاندان موجود ہیں اور ہم بہت خوف زدہ ہیں۔''

برانکو نے دیکھا کہ ان کے اٹھے ہوئے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ برانکو نے بوجا کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ نہتے جرمنوں کو گھور رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا انہوں نے دونوں کو قابل اعتراض حالت میں دیکھ لیا تھا۔

اس نے فیصلہ کیا کہ انہیں ہلاک کردینا چاہیے۔ وہ جرمنوں کی طرف متوجہ ہوا اور انہیں حکم دیا کہ پشت اس کی طرف کرکے کھڑے ہوجائیں۔

بوجا فوراً سمجھ گئی کہ وہ انہیں ہلاک کردینا چاہتا ہے

''کیوں؟'' اس نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا اور اسی لمحے وہ بھی اسی خوف میں مبتلا ہوگئی جو برانکو کے دل ودماغ پر غالب آگیا تھا۔ اس میں عام عورتوں کی طرح رحم کا جذبہ عود کر آیا۔ وہ اپنے محبوب کو کسی بے گناہ کے خون سے ہاتھ رنگنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔ وہ ویلکو کی باتیں دوہرا کر اسے احساس دلانا چاہتی تھی۔

تینوں بھگوڑے ان کے سامنے گھٹنوں کے بل جھکے رہے۔ غالباً وہ اس خوف سے خاموش تھے کہ کہیں تکرار سے برانکو فوراً ہی بے زار ہوکر گولی نہ چلا دے۔ بوجا جرمنوں اور برانکو کے درمیان آگئی۔

''ہٹ جاؤ بوجا!'' وہ غرایا۔ ''ہم انہیں کیمپ تک زندہ حالت میں نہیں لے جاسکتے۔''

بوجا بے حس وحرکت کھڑی رہی۔

برانکو اسے قائل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

''تم پاگل ہوگئی ہو احمق لڑکی! کیا تم ویلکو تک یہ خبر پہنچانا چاہتی ہو کہ ان بھگوڑوں نے کسی محافظ نہیں بلکہ دو محبت کرنے والوں کے سامنے ہتھیار ڈالے ہیں۔''

بوجا ان کی طرف پلٹ کر بولی۔ ''ہم تمہاری جان بخشی صرف ایک شرط پر کرسکتے ہیں کہ۔۔۔''

جرمن فوراً ہی گڑگڑانے لگے۔ انہیں ان کی ہر شرط منظور تھی۔

''انہیں کہہ دو کہ اس منظر کو بھول جائیں۔'' بوجا نے کہا۔ ''انہیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ تمہیں کسی لڑکی کے ساتھ نہیں دیکھا۔''

''بہرحال یہ جرمن ہیں۔'' برانکو نے تلخی سے کہا۔ ''تم سامنے سے ہٹ جاؤ انہیں اپنے جرائم کی

سزا بھگتنے دو۔ کون جانتا ہے کہ اب تک انہوں نے ہمارے کتنے آدمیوں کو اذیت دے دے کر ہلاک کیا ہو۔

بوجا نے اس کی گردن میں اپنے بازو حمائل کرنے کی کوشش کی لیکن برانکو نے اسے سختی سے دھکیل کر ہٹا دیا۔

''میں درخواست کرتی ہوں کہ ایسا نہ کرو۔''

بوجا پر رحم کے جذبے نے پوری طرح غلبہ پالیا تھا۔

''تمہیں خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر قیدیوں نے یہ کہہ بھی دیا کہ انہوں نے مجھے یہاں تمہارے ساتھ دیکھا تھا تو تم انکار کرسکتے ہو۔ ان کی بات کو کوئی بھی اہمیت نہیں دے گا۔ میں جونکا اور ڈیرا سے بات کرلوں گی۔ وہ کہہ دیں گی کہ میں ان کے پہلو میں سو رہی تھی اور میں رات بھر جھونپڑے سے باہر نہیں گئی تھی۔ ان سے زیادہ ہماری بات کی اہمیت ہے برانکو!''

قیدی بے بسی اور خوف کے مارے کانپ رہے تھے۔ وہ ہاتھ اٹھائے ہوئے تھک گئے اور ہاتھوں کو اٹھائے رکھنا ان کے لیے مشکل ہورہا تھا وہ گھٹنوں کے بل گھسٹتے ہوئے بولے۔

''ہم سوشلسٹ ہیں۔۔۔سوشلسٹ۔''

''برانکو یہ نہتے ہیں۔ ویلکو تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔ ایسی صورت میں تم جو کچھ بھی کہو گے وہ تسلیم نہیں کیا جائے گا۔''

''سامنے سے ہٹ جاؤ۔'' برانکو چیخ پڑا۔

باجو نے خاموشی سے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔ اسے احساس تھا کہ برانکو نے محبت کو ٹھکرا دیا تھا۔

اچانک قیدیوں نے جھاڑیوں میں پناہ لینے کے لیے دوڑ لگادی۔ یہ ان کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ گولیاں ان کی پشت میں پیوست ہوگئیں۔

''چلی جاؤ جلدی! کہیں کوئی تمہیں یہاں دیکھ نہ لے۔

بوجا کے لیے حرکت کرنا دوبھر تھا۔ اسے وہاں سے بھگانے کے لیے آخرکار برانکو کو گن اس کی طرف اٹھا کر یہ دھمکی دینی پڑی کہ وہ اسے بھی گولی مار دے گا۔ وہ خوف زدہ ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی ہوئی جلد ہی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔

سب مشین گن کی آواز نے پورے کیمپ کو بے دار کردیا۔

نیند میں ڈوبے ہوئے نیم برہنہ جانب دار اپنے ہتھیاروں کی طرف لپکے اور پھر دوڑتے ہوئے اپنے جھونپڑوں سے باہر آگئے۔

بوجا تیزی سے اپنے جھونپڑوں کی طرف دوڑی۔

جونکا نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا جیسے ہی بوجا دروازے پر پہنچی تو وہ اٹھ چکی تھی۔ اس نے گہری نگاہوں سے بوجا کی طرف دیکھا جس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا اور اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

بریگیڈ مردہ قیدیوں کے گرد جمع ہوگیا تھا۔

ویلکو، برانکو سے سوالات کررہا تھا۔ ان کے درمیان تین لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ برانکو کے عقب میں اس کے تمام ساتھی سانس روکے کھڑے ہوئے تھے۔

''میں نے قدموں کی سرسراہٹ سنی۔'' برانکو نے کہا۔ ''میں نے پوچھا کہ کون ہے۔ انہوں نے فرار ہونے کی کوشش کی مجبوراً مجھے گولی چلانی پڑی۔''

''برانکو!'' ویلکو کا لہجہ سخت تھا۔ ''یہ نہتے تھے۔ ان کے ہتھیار کہاں ہیں؟ ان میں سے ایک کے جوتے بھی نہیں ہیں۔''

''جوتے تو میں نے پہن لیے ہیں۔'' اس نے ان بوٹوں کی طرف اشارہ کیا جنہیں وہ ان لوگوں کی آمد سے پہلے ہی پہن چکا تھا۔ ''اس بات کا مجھے بعد میں احساس ہوا کہ ان کے پاس ہتھیار نہیں ہیں۔''

جونکا اس وقت ڈیرا اور جوبا کے ساتھ کھڑی اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی وہ جانتی تھی کہ درحقیقت کیا

واقعہ ہوا ہے۔

''حقیقت یہ ہے کہ تم سو گئے تھے۔ کیا یہ غلط ہے۔'' کمانڈر نے پوچھا۔ برانکو نے اثبات میں سر ہلا دیا کیوں کہ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ سونکو اس کی مدد پر آمادہ ہے۔

''یہ بہت عجیب سی بات ہے۔'' ویلکو نے کہا اور متلاشی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ غالباً وہ کسی سے اپنے شبہات کی تصدیق چاہتا تھا۔ جیسے ہی اس کی نگاہ جونکا پر پڑی ویلکو کے تاثرات یک دم بدل گئے۔ اس کی آنکھیں سکڑ گئیں اور اس کے انداز سے ظاہر ہونے لگا کہ برانکو پر شبہ کر کے اس نے غلطی نہیں کی تھی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ برانکو نے اس سے جھوٹ بولا تھا۔ چند لمحوں تک وہ جونکا اور برانکو کو گھورتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا واپس جھونپڑے کی طرف بڑھ گیا لیکن سب ہی جانتے تھے کہ معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوا ہے۔

صبح ہونے تک قیدیوں کی لاشوں کو اسی جگہ دفن کر دیا گیا جہاں انہیں پایا گیا تھا۔ ان کا سامان اور کپڑے لڑکیوں اور چند مردوں میں تقسیم کر دیے گئے۔ فانجا کے حصے میں خون میں لتھڑے ہوئے موزے آئے جنہیں اس نے بغیر خشک یا صاف کیے پہن لیا تھا۔ پھر وہ اپنے ہاتھوں کو خون آلود دیکھ کر رونے لگی تھی۔

میٹنگ کے دوران بھی ویلکو کی تفتیش کا سلسلہ جاری رہا۔

''ہمارے ہاں دھوکا دہی کی وارداتیں زور پکڑتی جا رہی ہیں۔'' اس نے برانکو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ویلکو جانتا تھا کہ برانکو وفادار ہے لیکن وہ اس کی بے ضابطگیوں سے بھی آگاہ تھا۔

بحث کا آغاز ہوا تو ویلکو نے کہا کہ برانکو کو سزا ملنی چاہیے تاکہ دوسروں کو عبرت حاصل ہو۔ اس پر چند افراد نے کہا کہ وہ اگر برانکو کی جگہ ہوتے تو ان سے بھی یہی حرکت سرزد ہوتی۔

''برانکو اس بات کا اقرار کر چکا ہے کہ ڈیوٹی کے دوران میں سو گیا تھا۔ اگر یہ بے دار ہوتا تو اتنی جلدی فائرنگ بھی نہ کرتا۔'' سونکا نے طرف داری کی۔

''برانکو! حقیقت بتاؤ کیا تم واقعی سو گئے تھے۔'' ویلکو نے سوال کیا۔

''میرا خیال ہے ایسا نہیں ہوا۔ میں تمہیں جانتا ہوں۔ تم ڈیوٹی کے دوران میں سو جانے والے نہیں ہو۔ بتاؤ واقعہ کیا ہوا تھا۔ تم نے بریگیڈ کے تحفظ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ میں تم پر یہ الزام عائد کرتا ہوں۔''

میٹنگ بغیر کسی فیصلے کے ختم ہو گئی۔ ویلکو صبر و تحمل سے ہی کوئی فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔ بوسکو نامی ایک شخص برانکو کو پسند کرتا تھا۔ یہ ایک عجیب کھچڑی قسم کا آدمی تھا۔ غصے اور جھنجلاہٹ میں یہ مختلف زبانوں میں گالم گلوچ پر اتر آتا تھا۔

اس وقت بھی وہ نہ جانے کون کون سی زبانوں میں گالیاں بک رہا تھا۔ اس کی کوئی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس لیے سب ہی خاموش تھے۔

''برانکو کسی نہ کسی لڑکی کے ساتھ تھا۔'' ویلکو نے کہا۔ اس وقت وہ سونکو کے ساتھ تنہا تھا اور دونوں رات کے حادثے پر گفتگو کر رہے تھے۔ ''میرا خیال ہے اس کے ساتھ نئی لڑکیوں میں سے کوئی تھی۔''

''کیا تمہیں یقین ہے؟''

ویلکو نے کندھے اچکائے۔

''وہ ایک اچھا ساتھی ہے۔''

''میں جانتا ہوں لیکن صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے۔''

''تو پھر تم کیا کرنا چاہتے ہو۔ ہم اسے دشمن سمجھ کر قتل تو نہیں کر سکتے۔''

''میں اس حادثے کی اطلاع ہیڈ کوارٹرز کر دوں گا۔ یہ معاملہ میں تنہا ہی نہیں نمٹا سکتا۔ میں بھی برانکو کو پسند کرتا ہوں لیکن میں ایک سیاسی مشیر ہوں اور مجھے اپنے فرض سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔''

''ویلکو! ہمیں چاہیے کہ ان لڑکیوں کو یہاں سے رخصت کر دیا جائے۔ ان کی وجہ سے پریشانیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ آخر یہ ہمارے لیے کس کام کی ہیں۔ تمہارے ارادے تو نیک ہیں نا۔ ڈویژن کے ہیڈ کوارٹرز سے کہو کہ فوراً ان کا تبادلہ کہیں اور کر دے۔'' سونکو نے پرجوش آواز میں کہا۔ اس کا لہجہ دھیما تھا لیکن آواز میں سختی تھی۔

''اگر ان میں سے کسی نے اصولوں کو توڑا ہے تو محض تبادلہ ہی کافی نہیں ہوگا۔'' ویلکو نے کہا۔

''ہمیں ان سے چھٹکارا حاصل کر لینا چاہیے ویلکو! اگر اور کچھ نہیں ہو سکتا تو کم از کم جونکا کو یہاں سے بھگا دو۔ یہ لڑکی باقی لڑکیوں میں بغاوت پیدا کر رہی ہے۔ وہ ہم سب سے نفرت کرتی تھی اور ہماری مخالفت کرنا اس کی فطرت ہے اور اس سے سب ہی کچھ ممکن ہے۔''

ویلکو اس انداز میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا جیسے اسے شبہ ہو کہ جونکا کہیں آس پاس چھپی ہوئی ان کی باتیں سن رہی ہو۔ یہ ایک انکشاف کرنے والا عمل تھا۔ یکا یک اسے محسوس ہوا کہ وہ جونکا کو سزا نہیں دے سکتا اور نہ ہی اسے اپنی نگاہوں سے دور کر سکتا ہے۔

''میں برانکو کو بچانا چاہتا ہوں۔'' سونکو چیخ پڑا۔ اگر اس سلسلے میں جونکا کو کوئی سزا ملتی ہے تو مجھے اس کی بھی کوئی پروا نہیں۔ اگر کوئی عورت ہی اس معاملے میں ملوث ہے تو وہ جونکا کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتی۔

''انہیں یہاں سے بھگا دو تاکہ ایسی بدتمیزیوں کا خاتمہ ہو جائے۔ میں تمہیں تنبیہ کرتا ہوں ویلکو! اگر تم نے برانکو کو سزائے موت دی تو تمہیں اپنے ہاتھوں سے اسے گولی مارنی پڑے گی۔ ہم میں سے کوئی بھی اسے گولی نہیں مارے گا۔''

''اس میں لڑکیوں کی کوئی خطا نہیں۔ اصل معاملہ صرف یہ ہے کہ ہم ان سے برابری کا سلوک نہیں کر رہے ہیں۔''

''مجھے تمہاری پرکشش تقریروں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اگر تمہارا خیال ہے کہ برانکو جھوٹ بول رہا ہے تو بھی اس کے خلاف کوئی شہادت تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم ہم سب سے ظالم ہو اور اس ظالمانہ انداز کو اپنے خوب صورت الفاظ میں چھپائے رہتے ہو۔'' وہ پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

ویلکو وہیں کھڑا سوچتا رہا۔ رات ہو رہی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اس جھونپڑے میں آ گیا جہاں لڑکیاں تھیں۔ وہ سو رہی تھیں وہ ان کے اوپر سے پھلانگتا ہوا اپنی جگہ جا کر لیٹ گیا۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں لیکن وہ جانتا تھا کہ اسے نیند نہیں آئے گی۔ کچھ دیر بعد سناٹے میں کسی کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے دیکھا کہ بوجا اپنی جگہ سے اٹھی اور جھونپڑے سے نکل گئی۔

وہ خاموشی سے اٹھا اور دبے قدموں اس کے پیچھے چل پڑا۔ بوجا ان قبروں کے پاس پہنچی جہاں ان تینوں قیدیوں کو دفن کیا گیا تھا۔ ''تم یہاں کیا کر رہی ہو۔'' ویلکو کی آواز ابھری۔

اس نے پلٹ کر دیکھا تو بوجا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ ویلکو سے لپٹ گئی اور بری طرح سسکنے لگی۔ جیسے اس کے ضمیر پر کوئی بہت بڑا بوجھ ہو اس نے آہستہ آہستہ سب کچھ ویلکو کو بتا دیا۔ اس نے سارا الزام اپنے سر لے لیا تھا۔ وہ برانکو کو بے گناہ ظاہر کر رہی تھی۔ یہ ایک بچکانہ حرکت تھی۔ جسے کم از کم ویلکو جیسا شخص کسی بھی طرح قبول نہیں کر سکتا تھا۔

اگلے روز میٹنگ میں اس مسئلے پر بحث شروع ہو گئی۔

اعترافِ گناہ کے بعد بوجا منہ چھپائے سسکیاں بھرتی رہی۔

سونکو نے برانکو اور بوجا کے اس فعل کو فطری قرار دیتے ہوئے ان کی متوقع مخالفت کی راہیں بند کرنے کی کوشش کی لیکن ویلکو کسی کی کوئی بات ماننے پر آمادہ نہیں تھا۔

''میں جانتا ہوں کہ برانکو۔۔۔!''

''مجھے تمہاری ہمدردی کی کوئی ضرورت نہیں۔'' برانکو چیخ پڑا۔

''بہرحال میں صرف بوجا کو سزا دینے کے حق میں نہیں ہوں۔'' ویلکو نے سرد آواز میں کہا۔ ''برانکو ایک ظالم آدمی ہے۔ اس نے اٹالین سارجنٹ کو خصی کردیا تھا اور یہ فعل سراسر غیر انسانی ہے لیکن میں حیران ہوں کہ اس وقت ہمیں کیا کرنا چاہیے۔''

دفعتاً ڈیرا اٹھ کھڑی ہوئی لیکن فانجا نے اسے کھینچ کر دوبارہ بٹھادیا۔

''اس سے پہلے وک اور ڈریکا بھی اسی جرم کی سزا کے طور پر موت سے ہمکنار ہوچکے ہیں۔ اگر ہم ان دونوں کو چھوڑ دیتے ہیں تو ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان سے پہلے جوڑے کو ہم نے قتل کیا تھا اور ان کا خون ہماری گردنوں پر ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ان دونوں کو بھی سزا دی جائے۔''

دونوں قیدیوں کو عارضی قید خانے میں بند کردیا گیا اور ووٹنگ شروع ہوگئی اور آخر کار سونکو سے کہا گیا کہ وہ بوجا اور برانکو کو اس فیصلے سے آگاہ کردے جو ان کے خلاف ہوا تھا۔

قید خانے میں تنہائی ملتے ہی ان دونوں کے جذبات میں ایک بار پھر آگ لگ گئی۔ وہ بری طرح لپٹ گئے لیکن جلد ہی انہیں احساس ہوگیا کہ موت کی بو باس چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے اور اس کی وجہ سے نشاط کی گھڑیاں جو بن پر نہیں آرہی ہیں۔

صبح تک وہ اسی طرح لپٹے پڑے رہے۔

اجالا ہوتے ہی جانب داروں میں سے کئی افراد اپنے اپنے جھونپڑے سے نکلے اور اس کی ساتھی لڑکیاں بے دار ہوئیں تو انہیں عجیب سی خاموشی اور خالی پن کا احساس ہونے لگا۔

انہیں جو سب سے پہلا احساس ہوا وہ یہ تھا کہ بریگیڈ رات کے کسی پہر انہیں چھوڑ کر کہیں چلا گیا ہے۔ پھر انہیں ویلکو اور سونکو دکھائی دیئے۔ وہ جنگل کے کنارے کھڑے تھے اور جھاڑیوں کے نیچے جانب داروں کا دستہ بکھرا ہوا تھا۔

''تم قیدیوں کو موت سے ہم کنار کروگی۔'' سونکو لڑکیوں کی طرف دیکھ کر چیخ پڑا۔

جونکا فوراً ہی سمجھ گئی کہ کیا معاملہ ہے۔ فانجا رونے لگی لیکن جو حکم سنایا جانا تھا وہ سنایا جاچکا تھا اور اب اس پر عمل کرنے کا وقت آگیا تھا۔

وہ خاموشی سے ویلکو کے پیچھے پیچھے قید خانے کی طرف چل پڑیں۔ قیدیوں کو باہر لایا گیا۔ وہ ننگے پاؤں تھے۔ وہ خاموشی سے ایک پہاڑی کی طرف بڑھنے لگے۔ انہیں موت سے ہمکنار کرنے والے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں سب مشین گنیں دبی ہوئی تھیں۔

بغیر کسی حکم کے بوجا اور برانکو الگ الگ ہوگئے۔ جونکا، برانکو کے عقب میں جا کھڑی ہوئی۔ جوانا فانجا اور ڈیرا خاموشی سے بوجا کے پیچھے پیچھے چل رہی تھیں۔ بوجا ایک ایسی چٹان کی طرف بڑھ رہی تھی جہاں اگر اسے قتل کیا جاتا تو اس کو کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ غالباً اس کی خواہش بھی یہی تھی کہ اس کا انجام مارنے والوں کے علاوہ کوئی نہ دیکھے۔

''جس کسی نے بھی تمہیں چاہا وہ موت سے ہم کنار ہوگا۔'' برانکو نے جونکا سے کہا۔ ''کیا تم مطمئن ہو۔''

جونکا خاموش کھڑی رہی۔ اس کے چہرے کے عضلات میں بے پناہ کھچاؤ تھا۔ وہ دل کی دھڑکن میں شدت پیدا نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔''

''کیا تم سن رہے ہو ویلکو!'' برانکو چیخا۔ ''تم نے سنا میں نے ابھی ابھی کیا کہا تھا۔ میں نے اس سے محبت کی تھی لیکن تم مجھے دوبار سزائے موت نہیں دے سکتے۔'' وہ جونکا کی طرف متوجہ ہوا۔ ''گولی چلاؤ اور اس شخص کو ہلاک کردو جس نے تمہارے سب سے پہلے محبوب کو مردانگی سے محروم کردیا تھا۔ اگر تم چاہتی ہو کہ میں خاموش ہوجاؤں تو تمہیں تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔''

جونکا اسے اس وقت قتل نہیں کرنا چاہتی تھی کیوں کہ وہ اس کی توہین کررہا تھا۔ ''جب تم خاموش

ہو جاؤ گے تو میں تمہیں موت کی آغوش میں پہنچا دوں گی۔'' اس کے لہجے میں اتنا سکون تھا کہ موت سے قریب تر ہونے کے باوجود برانکو چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

وہ خاموش ہو گیا تھا اور گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔

''اب گھوم جاؤ۔'' جونکا نے کہا۔

''تمہیں اسی انداز میں مجھے قتل کرنا ہوگا۔ میں دشمن نہیں ہوں اس لیے میں پشت کی طرف سے گولی نہیں کھاؤں گا۔ ویلکو اس سے کہو کہ گولی چلا دے۔''

جونکا نے تیزی سے حرکت کی۔ وہ اس کے عقب میں پہنچنا چاہتی تھی لیکن برانکو تیزی سے گھوم گیا۔ وہ دوبارہ حرکت میں آئی لیکن اس بار بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

''گولی چلاؤ۔'' ویلکو غرایا۔

برانکو نے پلٹ کر ویلکو کی طرف دیکھا اور جونکا نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں تاخیر نہیں کی۔ گولیاں اس کے پہلو اور گردن کو چاٹ گئیں۔ کچھ فاصلے سے گولیاں چلنے کی آواز آئی اور بوجا بھی زمین پر گر گئی۔

جلد ہی جھاڑیوں میں بکھرے ہوئے افراد واپس آ گئے اور اپنے جھونپڑوں میں جاتے ہی گر کر گہری نیند سو گئے جیسے رات ابھی ختم نہ ہوئی ہو اور یہ گہری نیند میں ڈوب جانے کا وقت ہو۔

لیکن یہ خاموشی زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی۔ جرمن دستہ قریب ہی تھا۔ اس کے کانوں تک مشین گن کی آواز پہنچ چکی تھی۔ کچھ دیر بعد ایک مارٹر شیل اس جھونپڑے پر گرا جہاں فالتو گولہ بارود موجود تھا سب کچھ بھک سے اڑ گیا۔

پہاڑ آگ سے روشن ہو گئے۔ جوبا اور ڈیرا ایک جھونپڑے میں لیٹی ہوئی تھیں۔ جرمن حاروں طرف سے حملہ آور ہوئے۔ سونکو جلتے ہوئے جنگل کی طرف دوڑا اور اس کے ساتھ بھی اسی سمت میں دوڑنے لگے۔

وہ جلتی ہوئی شاخوں اور کانٹوں سے بچتے ہوئے دوڑتے رہے۔ اچانک ایک شخص آگ میں گر گیا اور فوراً ہی اس کے چیتھڑے اڑ گئے اس کی جیبوں میں رکھے ہوئے گرینیڈ پھٹ گئے تھے۔ بھاگتے ہوئے جانب داروں کے پیچھے ہی پیچھے ہوا کے جھونکے ان کے ساتھی کے جلتے ہوئے گوشت کی بو بھی اڑائے چلے آ رہے تھے۔

جونکا نے محسوس کیا کہ وہ شعلوں میں گھر چکی ہے۔ وہ مدد کے لیے چیخ پڑی لیکن چیختی ہوئی شاخوں میں اس کی آواز دب گئی۔ دفعتاً ویلکو کی نگاہ اس پر پڑی۔ وہ دھوئیں کی دیوار کو چیرتا ہوا آگے بڑھا اور اسے گھسیٹ کر برف پر پھینک دیا۔ جونکا کی جیکٹ اور پتلون کو آگ لگ چکی تھی۔ وہ برف پر لوٹنے لگی تاکہ شعلے سرد پڑ جائیں۔

جھلسے ہوئے غیر جانب داروں نے جنگ جاری رکھی۔

رات کا بہت تھوڑا حصہ باقی تھا کہ ویلکو کو اپنی رپورٹ تیار کرنے کا موقع ملا۔ اس نے جو رپورٹ لکھی وہ کچھ اس طرح تھی۔

''آج برانکو، روڈو اور بوجا دشمنوں سے لڑتے ہوئے مارے گئے۔ ہم پر اچانک حملہ ہوا تھا۔ کمانڈر سونکو اس بات کا ذمے دار ہے کہ اس کے نگراں ناکارہ تھے۔ ہم جھلس چکے ہیں اور بری طرح زخمی ہیں۔ ہم نے جلتے ہوئے جنگل سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی جب کہ ہمارے پاس صرف دو سو گولیاں اور چار گرنیڈ تھے۔ بہرحال ہمیں جلد ہی ہر چیز کی ازسرنو سپلائی ہونی چاہیے۔

ویلکو پولیٹیکل مشیر۔''

جانب داروں کے لیے بعد کے مہینے نہایت پر امن ثابت ہوئے۔ انہوں نے نئے کوارٹرز تلاش کر لیے تھے اور اب ان میں بعض تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ موسم بہار کے انتظار میں ان کا بیشتر وقت کاہلی سے گزر رہا تھا۔ اگرچہ جھڑپیں نہیں ہو رہی تھیں لیکن پھر بھی جانب داروں نے ڈومو برانکی میں کئی جگہ حملے

کر کے کافی اسلحہ حاصل کرلیا تھا۔ اس کے علاوہ انگریزوں نے پیراشوٹ کے ذریعے انہیں بہت سا اسلحہ فراہم کردیا تھا۔

موسم بہار شروع ہوگیا۔

فطرت کی بے داری سے پہلے ہی موسم بہار، لڑکیوں کی آنکھوں سے جھلکنے لگا تھا۔ اس کے فوراً ہی بعد جھونپڑوں کے سامنے سے برف پگھلنے لگی اور سڑکیں سیاہ دلدل سے بھری بھری نظر آنے لگیں۔

جونکا اور دوسری لڑکیاں اب جانب داروں کے ساتھ سکون کی زندگی گزار رہی تھیں۔ ذلت اور رسوائی کا زمانہ بیتے عرصہ ہوگیا تھا اور اب انہیں اپنے ساتھیوں کا مکمل اعتماد حاصل تھا۔

''ایسا نہیں ہوسکتا۔ میں یقین نہیں کرسکتی۔'' جونکا بار بار یہ کہتی تو ڈیرا اور جوبا چونک کر اسے گھورنے لگتیں۔ وہ اس سے اس بات کا مقصد دریافت کرتیں تو جونکا فوراً ہی موضوع بدل دیتی۔ فانجا ایسے موقعوں پر خاموش ہی رہتی تھی۔

جب پہلی بار سورج نظر آیا تو ڈیرا نے کوئی وجہ جانے بغیر ہی رونا شروع کردیا۔ فانجا اور جونکا اسے اب مزید برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ انہوں نے اس کے ساتھ سخت رویہ اختیار کرلیا۔ وہ ایک دوسرے میں دلچسپی لینے لگی تھیں اور کسی دوسرے کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے انہیں ایک دوسرے سے ہی محبت ہوگئی تھی۔

ایک رات فانجا دبے قدموں جونکا کے پاس پہنچی۔ اس وقت سب لوگ سو رہے تھے۔ وہ سرگوشیوں میں بات کرنے لگی۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں جوبا اور ڈیرا بے دار ہوکر اس کی باتیں نہ سن لیں۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتی تھی اس کی اچھی طرح وضاحت نہیں کرسکی کیوں کہ ڈیرا جاگ گئی تھی۔

اس نے جونکا سے باہر چلنے کے لیے کہا اور دونوں باہر آگئیں۔ مرطوب ہوا میں پہنچ کر جونکا اپنی دوست کے منہ سے کچھ سننے کے لیے بے چین ہوگئی لیکن اس نے فانجا کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔

فانجا کے لیے بات کرنا مشکل ہورہی تھی کیوں کہ اس نے جونکا کی سرد مہری کو محسوس کرلیا تھا۔

''جونکا۔۔۔ جونکا۔'' اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''مجھے۔۔۔ مجھے سونکو سے محبت ہوگئی ہے۔ میں اسے بے حد پسند کرنے لگی ہوں لیکن میں نہیں جانتی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔'' وہ کانپ رہی تھی لیکن اس کے انداز سے بچپنا ظاہر نہیں ہورہا تھا۔ وہ ایک لمبی لڑکی تھی اور اس قدر بھدی تھی کہ کوئی سنجیدگی سے اس کی طرف متوجہ نہیں ہوسکتا تھا۔

''تم اسے پسند کرتی ہو یا اس سے محبت کرتی ہو؟''

''معلوم نہیں۔ جب وہ میری طرف دیکھتا ہے تو میں بے چین اور خوف زدہ ہوجاتی ہوں۔ اب دن پھر گئے ہیں اس لیے میں اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتی۔ وہ مجھ سے اپنی قمیصیں دھلواتا ہے اور۔۔۔''

جونکا اس کی طرف دیکھے بغیر خاموشی سے سنتی رہی۔

''تم کیا سوچ رہی ہو جونکا!''

''تم مجھ سے کیا چاہتی ہو۔'' جونکا نے سوال کیا

''کچھ نہیں لیکن میں کسی نہ کسی کو راز دار بنانا چاہتی تھی۔ تم مجھے دوسروں سے بہتر طور پر جانتی ہو۔ جوبا اور ڈیرا مجھے پریشان کردیتی ہیں۔ وہ تو ایک دوسرے کی محبت میں مبتلا ہیں اور جب بھی موقع ملتا ہے وہ بوس و کنار میں مصروف ہوجاتی ہیں۔''

جونکا نے کچھ نہیں کہا۔ وہ خاموشی سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ فانجا اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی رہ گئی۔

ویلکو کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔

کبھی کبھی وہ رک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا تھا۔ کھلے دروازے سے باہر کا منظر انتہائی پرکشش اور جاذب نظر تھا۔ اس کے مزاج میں بڑی حد تک تبدیلی آگئی تھی اور اس کے ساتھی اب اسے نیا آدمی کہنے لگے تھے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ وہ کسی کی محبت میں مبتلا ہوگیا ہے لیکن بیشتر لوگوں کو یقین تھا کہ ویلکو

تا کمزور نہیں کہ اس کے دلی جذبات دماغ پر غالب جائیں۔

ایک خوب صورت صبح بریگیڈ دھوپ میں لیٹا وا تھا۔ جونکا اپنی قمیص دھو رہی تھی کہ ویلکو گھومتا ہوا ھر نکل آیا۔ اس نے اپنی قمیص اور سویٹر اتار کر پانی ں بھگوئے اور انہیں بھونڈے پن سے رگڑنے لگا۔

جونکا ہنس پڑی۔ ویلکو اسے گھورنے لگا۔

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن گفتگو کا آغاز کرنا شکل ہو رہا تھا۔

اس کی نگاہوں میں برانکو اور بوجا کے چہرے گھوم رہے تھے۔ دفعتاً وہ اٹھا اور وہاں سے دور ہٹ گیا۔

شام ہوتے ہی نہ جانے کیسے پانچ جرمن نشے ں دھت اس گاؤں کی طرف نکل آئے۔ انہیں یہ حساس ہی نہیں تھا کہ وہ ان جانب داروں کے کیمپ کے قریب پہنچ چکے ہیں کیوں کہ اس وقت ہر آدمی بے رر کسان نظر آ رہا تھا۔

سونکو اور ویلکو حیرت زدہ رہ گئے۔ انہوں نے نچوں کو دیکھ لیا تھا لیکن کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔ یک جوبا کی نگاہ ان پر پڑی تو وہ بری طرح چیخ ی۔ تب ان پانچوں کو احساس ہوا کہ وہ کہاں پھنسے ہیں۔

ان کے ہاتھ تیزی سے اپنے اسلحے کی طرف ھے لیکن انہیں بہت دیر ہو چکی تھی۔ سونکو نے ان ں سے ایک کی گردن پکڑ لی اور اسے سختی سے دبانے ۔ اس شام جب میٹنگ شروع ہوئی تو ویلکو نے ی حرکت کو سفاک اور غیر انسانی قرار دیتے ہوئے مت کا اظہار کیا۔

جونکا اسے تعریفی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ ں کے انداز میں ویلکو کے لیے بے پناہ احترام تھا۔

آخر کار ہیڈ کوارٹرز سے احکامات آ گئے کہ تمام ب دار پہاڑی کمین گاہ سے نکل کر کھلے آسمان ے دشمنوں کے خلاف صف آرا ہو جائیں۔ اس یڈ کو جو بلجانہ کے قریب سرگرم عمل دستے کی مدد کے لئے طلب کر لیا گیا تھا۔

بہترین سپاہیوں کی طرح انہوں نے فوراً ہی کوچ کی تیاری مکمل کر لی اور رات ہوتے ہی ان کی روانگی عمل میں آ گئی۔ دن بھر وہ جنگلات میں دبکے آرام کرتے اور رات کو سفر کرتے رہے۔ انہوں نے احتیاط سے کام لیا تھا تاکہ اٹالین دستوں کو حیرت میں مبتلا کر کے نقصان سے دوچار کر سکیں۔

جیسے ہی وہ جوبلجانہ کے قریب پہنچے تو ان کی ملاقات، دوسرے دستوں سے بھی ہوئی جنہیں جنگجو دستوں کی مدد کے لیے بلایا گیا تھا۔ شہر میں خون ہی خون بکھرا ہوا تھا جیسے کوئی ان دیکھی تلوار کسی عفریت کو کاٹ رہی ہو اور عفریت خون اگلتے ہوئے زخموں سے چاروں طرف دوڑتا پھر رہا ہو۔

وہ خاموشی سے اپنے شہر کو دیکھ رہے تھے انہیں یاد آ رہا تھا کہ کبھی وہ اپنے ان گھروں کی طرف خوش و خرم انداز میں جایا کرتے تھے لیکن اب وہ اجنبیوں کی طرح اپنے ہی شہر میں داخل ہو رہے تھے۔ گویا اٹالین فوج نے ان کے شہر پر ہمیشہ کے لیے قبضہ کر لیا تھا۔

شہر میں داخل ہوتے ہی غیر اختیاری طور پر جونکا نے مشین گن اٹھائی اور ایک نیم روشن کھڑکی کو نشانہ بنایا۔ ویلکو نے پھرتی سے گن اس کے ہاتھ سے چھین لی اور اوپر تلے دو تین طمانچے جونکا کے رخساروں پر جڑ دیے۔ جونکا نے خاموشی سے اس سزا کو قبول کر لیا۔

فائرنگ کی وجہ سے ویلکو نے دستے کو واپس جنگل میں چلے جانے کا حکم دے دیا۔ اس آواز سے دشمن متوجہ ہو سکتا تھا وہ دیر تک درختوں کی اوٹ میں چھپے رہے۔ پھر باہر آ گئے۔

رات کے اندھیرے میں ایک بار پھر وہ شہر میں داخل ہوئے لیکن اس بار لڑکیوں کے جسم پر نسوانی لباس تھا اور وہ اس لباس میں خود کو اجنبی اجنبی سی محسوس کر رہی تھیں۔ ویلکو نے یہ لباس فراہم کرنے کے بعد انہیں ایک نقشے کی مدد سے بعض مقامات کے بارے میں سمجھا دیا تھا اور انہیں حکم دیا تھا کہ کسی بھی

حالت میں وہ خفیہ کمین گاہ کا رخ نہ کریں۔

ان کے ہینڈ پرس میں ریوالور اور دستی بم رکھے ہوئے تھے۔

وہ انہیں کچھ دور تک چھوڑنے کے لیے ساتھ آیا تھا اور پھر واپس چلا گیا تھا۔ لڑکیاں تنہا شہر کی گلیوں میں مسلسل ایک طرف بڑھ رہی تھیں۔ گشتی سپاہیوں کا دستہ قریب آتا جا رہا تھا۔

دستہ گلی کے نکڑ پر پہنچ گیا۔ اس وقت تک لڑکیاں دو حصوں میں تقسیم ہو کر مختلف سمتوں میں چل پڑی تھیں۔ جونکا کے ساتھ جو باتھی۔ دستے پر نگاہ پڑتے ہی جونکا نے جوبا کو ایک گھر میں دھکیل دیا۔

گشتی سپاہی گزر گئے تو وہ باہر آ گئیں۔

جونکا نے تھوڑی دیر بعد اپنے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ اس کی ماں نے دروازہ کھولا تو وہ اس کے حیرت سے کھلے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے اندر لے آئی اور دروازہ بند کر دیا۔

☆☆☆

ابھی وہ دودھ کا گلاس پی کر فارغ ہی ہوئی تھی کہ اٹلی کی پیدل فوج حرکت میں آ گئی۔ گویا جانب دار انہیں جو ذہنی دھچکا پہنچانا چاہتے تھے اس میں انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔

ایک بار پھر چاروں لڑکیاں شہر کے وسطی حصے میں ایک طے شدہ جگہ جمع ہوئیں۔ گشتی سپاہیوں کے دستے پر مختلف گھروں کی کھڑکیوں سے فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔

دفعتاً کسی کی آواز سنائی دی۔ ''فانجا۔۔۔ فانجا۔۔۔!''

یہ ایک اٹالین فوجی تھا جو فانجا کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر فانجا کو اپنی طرف بلایا۔ فانجا نے پرس کھولا اور ایک دستی بم نکال کر اپنے پرانے دوست کی کھلی ٹانگوں کے درمیان میں دے مارا اور دوڑتی چلی گئی۔

اسی لمحے دُو ہلکے ٹینک دکھائی دیے۔ چاروں لڑکیاں اس وقت تک ایک بیکری میں پناہ لے چکی تھیں۔ جیسے ہی ٹینک بیکری کے سامنے سے گزرے وہ دستی بم سنبھالے باہر آ گئیں جوبا نے ٹینک پر چڑھنے کی کوشش کی لیکن تنگ اسکرٹ کی وجہ سے فٹ پاتھ پر گر گئی۔ ٹینک تیزی سے واپس آیا اور اسے کچلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

دیکھنے والے دہشت زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئے لیکن اپنی ساتھی کے انجام پر تینوں لڑکیاں دیوانہ وار ایک طرف دوڑنے لگیں۔ گشتی سپاہیوں کا دستہ بھی بروقت پہنچ گیا اور ٹینک سے بھی فائرنگ شروع ہو گئی۔

جونکا اور فانجا آہستہ آہستہ چل رہی تھیں۔

ایک دکان کے سامنے سے گزرتے وقت انہیں چند افراد دکھائی دیے جنہوں نے تعظیماً اپنے ہیٹ اتار لیے تھے۔ سامنے ہی ایک کھڑکی سے سیاہ پرچم ہوا کے تھپیڑوں پر ماتم کر رہا تھا۔

قیدیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ویلکو بھی ان قیدیوں میں شامل تھا۔ سونکو بھی اس کے ساتھ تھا لیکن اس کے سر پر خون میں لتھڑی ہوئی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ وہ لڑکیوں کی طرف توجہ دیے بغیر بڑھتے رہے غالباً انہیں یہ خطرہ تھا کہ کہیں اس طرح انہیں شناخت نہ کر لیا جائے۔

دونوں لڑکیوں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پایا تھا کیوں کہ وہ آنسو بہا کر دشمنوں کو ہوشیار نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

جب قیدیوں کا قافلہ گلی کے نکڑ پر پہنچ گیا تو فانجا پوری قوت سے چیخ پڑی۔ ''مائی لو۔۔۔ مائی لو۔۔۔'' اس نے سونکو کی طرف دوڑنے کی کوشش کی لیکن جونکا نے اسے پکڑ لیا۔ سیاہ لبادے والے ایک شخص نے مضحکہ خیز انداز میں پلٹ کر ان کی طرف دیکھا اور گالیاں بکتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

جب قیدی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو اس کے فوراً بعد ایک سیاہ ویگن جونکا اور فانجا کے قریب آ کر رک گئی۔ اس میں سے ڈیرا اتری تو انہوں نے دیکھا کہ وہ مردانہ لباس میں ہے۔

وہ جونکا اور فانجا کے ساتھ گاڑی کے عقبی حصے میں پہنچی اور دروازہ کھول کر دو قیدیوں کو اتارا۔ یہ ایک اٹالین لیفٹیننٹ تھا اور اس کا ساتھی ایک ماتحت افسر تھا۔ دونوں بندھے ہوئے تھے انہیں کھولنے کے بعد ڈیرا نے اپنی مردہ ساتھی کی لاش اٹھانے کا حکم دیا تھا جو ایک بوسیدہ کپڑے میں لپٹی ہوئی تھی۔

ڈیرا نے فوراً ہی مردانہ لباس اتار کر عام کپڑے پہن لیے۔

اب وہ خاموشی سے اس راستے کی طرف بڑھ گئے جو جنگل کی طرف جاتا تھا۔ وہ رات بھر چلتے رہے۔ دونوں قیدی افسر خاموشی سے ان کے ہر حکم کی تعمیل کر رہے تھے کیوں کہ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ لڑکیاں انہیں کسی بھی لمحے بھون کر رکھ سکتی ہیں۔

اجالا پھیل گیا تو وہ ایک جگہ آرام کے لیے رک گئے۔

اچانک ایک جرمن دستہ دکھائی دیا۔ وہ ٹھٹک گئے۔ جونکا نے دونوں افسروں کو جوبا کی لاش ایک طرف جھاڑیوں میں پھینک دینے کا حکم دیا۔ اس حکم کی فوراً ہی تعمیل کی گئی۔ وہ اس وقت ایسی پوزیشن میں تھے کہ کہیں فرار نہیں ہو سکتے تھے اور نہ ہی فوری طور پر کہیں چھپنا ممکن تھا۔

لاش کو چھپانے کے بعد جونکا نے اپنی ساتھیوں کو اشارہ کیا انہوں نے اپنے اپنے پرس سے ریوالور نکالے اور قیدی افسروں کے پیٹ سے لگا کر ان سے لپٹ گئیں۔ انہوں نے یک دم ہنسنا شروع کر دیا تھا۔ افسروں کو سختی سے ہدایت کی گئی کہ وہ اس صورت حال میں ان کا ساتھ دیں ورنہ وہ جرمنوں کے ہتھے چڑھنے سے پہلے انہیں گولی مار دیں گی۔ جرمن دستہ قریب سے گزرنے لگا۔

راستے سے کچھ دور انہوں نے تین لڑکیوں کو دو اٹالین افسروں سے بوس و کنار کرتے دیکھا تو ان کا مضحکہ اڑاتے ہوئے مسلسل آگے بڑھتے رہے ان میں سے بعض حسرت بھری نگاہوں سے انہیں دیکھ رہے تھے لیکن وہ اٹالین افسروں کی محبوباؤں کو حاصل نہیں کر سکتے تھے۔

دستہ گزر گیا تو وہ افسروں سے الگ ہو گئیں۔

نوجوان افسر جونکا کو گھور رہا تھا۔ ''کیا تم ہمیں قتل کر دو گی؟'' اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

جونکا خاموش رہی تو وہ اپنے افسر کی طرف متوجہ ہوا۔

''لیفٹیننٹ! یہ ہمیں قتل کر دیں گی۔''

لیفٹیننٹ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''ان کے بہت سے ساتھی ہماری قیدی ہیں۔ اس لیے یہ ہمیں قتل نہیں کر سکتیں احمق اپنے آپ کو سنبھالو۔''

''تم کہاں سے آئے ہو۔'' جونکا نے پوچھا۔

''فورلے سے۔'' لیفٹیننٹ نے جواب دیا۔

''لیکن اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں تم جانتی ہو کہ ہمیں احکامات کی پابندی۔۔۔''

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''ماریو۔۔۔''

''ٹھیک ہے اب خاموشی سے آگے بڑھو۔'' جونکا نے حکم دیا اور ان کا سفر ایک بار پھر شروع ہو گیا۔

جانب داروں کے پسپا ہونے والے بریگیڈ کو ان کی واپسی کی کوئی امید نہیں تھی۔ جب وہ خفیہ مسکن تک پہنچیں تو سب ہی شبے کی نگاہ سے انہیں دیکھنے لگے۔ ایک دو نے تو اس کا اظہار بھی کر دیا۔

''ہم دو افسروں کو قید کر کے یہاں تک لے آئی ہیں۔'' ڈیرا نے تلخی سے کہا۔ ''جب کہ ہم اپنے گھروں تک بھی محدود رہ سکتی تھیں۔''

''ہمارا حملہ ناکام ہوا ہے اور بہت سے اہم افراد دشمن کی قید میں پہنچ گئے ہیں۔ کسی نے غداری کی ہے اور وہ تم میں سے کوئی ایک ہے۔''

''کیا تم اپنے الزام کا کوئی ثبوت پیش کر سکتے ہو۔'' جونکا غرائی۔

''تمہیں اپنی بے گناہی کا کوئی ثبوت پیش کرنا ہوگا لڑکی!'' نئے مشیر نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ یہ شخص ویلکو کی جگہ متعین ہوا تھا۔

جونکا نے جوبا کی بوسیدہ کپڑے میں لپٹی ہوئی لاش کو بے نقاب کر دیا۔

''یہ ہم میں سے ایک ہے۔'' اس نے زہریلی آواز میں کہا اور پھر وہ غصے میں جو جی میں آیا کہتی رہی۔ حتیٰ کہ فانجا نے مداخلت کی۔

''کامریڈز!'' فانجا نے کہا۔ ''ان باتوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ سونکو اور ویلکو کو دشمنوں کی قید سے کیسے رہا کرایا جائے؟''

اس وقت بوسکو بریگیڈ کا انچارج تھا۔ اس نے نئے مشیر کو سمجھایا کہ ویلکو کس قسم کا آدمی تھا اور اس نے کبھی لڑکیوں پر شبے کا اظہار نہیں کیا تھا۔

''کسی نے ہم سے غداری کی ہے۔'' مشیر چیخا۔ ''یہ لڑکیاں شہر میں گئی تھیں اور ہمیں ان کے اشارے کا انتظار کرنا تھا تاکہ بھرپور حملہ کیا جاسکے لیکن اس کے بجائے اٹالین ٹینک ہم پر چڑھ دوڑے اور ہمارے بیشتر ساتھیوں کو قیدی بنالیا گیا۔ ہم ان لڑکیوں کو شبے سے بالاتر نہیں سمجھ سکتے پارٹی۔۔۔''

بوسکو نے انہیں سمجھا بجھا کر خاموش کرادیا۔ اس دوران میں فانجا پر دورہ پڑ چکا تھا۔ وہ ان قیدیوں کو قتل کردینا چاہتی تھی لیکن نئے کمانڈر بوسکو نے اسے روک دیا اور تیز لہجے میں کہا۔

''جب تک ہمیں اپنے ساتھیوں کے بارے میں معلوم نہیں ہو جاتا قیدیوں کو زندہ اور محفوظ رکھا جائے گا۔''

ہوا میں تیزی آگئی تھی۔ لڑکیوں کے کپڑے اڑنے لگے۔ اس طرح وہ کبھی کبھی نیم عریاں نظر آنے لگتی تھیں۔ بوسکو چیخ اٹھا۔ ''یہ کپڑے اتار دو اور پتلون قمیص پہن لو تم باقی ماندہ آدمیوں کو دیوانہ بنا کر انہیں بھی تباہ کردوگی۔''

جونکا نے اثبات میں سر ہلایا اور خاموش رہی۔

نئے مشیر موشا کو ابھی تک جونکا، ڈیرا اور فانجا پر شبہ تھا۔ اس کی دانست میں وہ غدار تھیں۔ بوسکو نے اسے ایک بار پھر سمجھایا۔ تو اس نے لڑکیوں کو حکم دیا کہ وہ قیدیوں کی نگرانی کریں۔ اس کا خیال تھا کہ جلد یا بدیر ان میں سے کوئی لڑکی اٹالین افسروں کی آغوش میں دکھائی دے گی تو سب کچھ خود ہی سامنے آجائے گا۔

نگرانی کے دوران میں جونکا نے موشا کو دق کرنا شروع کردیا۔ اس طرح وہ ویلکو کا خیال ذہن سے دور رکھنے کی کوشش کررہی تھی۔

''ہمارا مشیر نگرانی کررہا ہے۔'' وہ اٹالین افسروں کی طرف دیکھ کر بلند آواز میں کہتی۔ ''وہ آس پاس کہیں چھپا ہوا ہے اسے انتظار ہے کہ میں کب تم دونوں کو فرار ہونے کا موقع دیتی ہوں۔ بہرحال تم فرار ہونے کی کوشش نہ کرنا کیوں کہ میں تمہیں فوراً ہی گولی ماردوں گی۔''

اٹالین لیفٹیننٹ کے چہرے پر گھبراہٹ نہیں تھی۔ البتہ دوسرا افسر بار بار اس سے پوچھ رہا تھا کہ آخر ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا۔ لیفٹیننٹ ماریو کندھے اچکا کر رہ گیا تو وہ لڑکیوں سے پوچھنے لگا۔ جونکا نے جواب دیا کہ وہ فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتی۔

''اگر سونکو کو پھانسی دی گئی تو میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے قتل کردوں گی۔'' فانجا چیخ پڑی۔ ماتحت افسر لیفٹیننٹ سے فرار ہوجانے کی درخواست کرنے لگا لیکن لیفٹیننٹ ماریو جانتا تھا کہ فرار کی تمام راہیں بند ہیں۔ حتیٰ کہ وہ تو واپسی کے راستوں سے بھی واقف نہیں تھے۔ جونکا کی باتیں زور پکڑ رہی تھیں۔ کیوں کہ ماریو نہایت صبر و تحمل سے سن رہا تھا۔ جونکا کے بال اب بڑھ کر کانوں کو ڈھانپ چکے تھے اور رفتہ رفتہ اس کا نسوانی حسن اور کشش لوٹ آئے تھے۔

لیفٹیننٹ کو اس کی باتوں سے اندازہ ہوگیا تھا کہ جانب داروں کی زندگی کے بارے میں ان کے خیالات بالکل غلط تھے۔ وہ جونکا سے معذرت طلب کرنا چاہتا تھا لیکن حیران تھا کہ گفتگو کا آغاز کہاں سے کرے۔

کچھ دیر بعد وہ خاموش نہ رہ سکا۔ ''جونکا! میں جانتا ہوں کہ میری رائفل سے نکلی ہوئی گولیوں سے

تمہارے کئی ساتھی ہلاک ہوئے ہیں لیکن یہ سب کچھ میرا فرض تھا لیکن اس کی ذمے داری مجھ پر عائد نہیں ہوتی۔ میں نے اپنی حقیقی اور آزاد زندگی میں کوئی قتل نہیں کیا۔''

موشا اس وقت بھی ایک خفیہ جگہ بیٹھا ان کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہا تھا لیکن جونکا اب اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ وہ لیفٹیننٹ ماریو سے بے تکلف ہو رہی تھی اور اب اس نے اپنے بارے میں باتیں شروع کر دی تھیں۔ اندازہ کچھ ایسا تھا جیسے وہ بوڑھی ہو چکی ہو اور اس کا ماضی اس کے لیے کسی خطرے کا باعث نہ بن سکتا ہو۔''

''میں ہر روز اسکول سے واپسی پر اس سے ملا کرتی تھی۔'' اس نے سارجنٹ راکو کے بارے میں بتایا۔ ''میں نے اس کی طرف پہلے تو زیادہ توجہ نہیں دی تھی کیوں کہ وہ خود کو بہت حسین سمجھتا تھا اور میں اسے ان گنت لڑکیوں کے پیچھے دوڑتے ہوئے دیکھ چکی تھی لیکن پھر بھی وہ مجھ سے ایسی باتیں کرتا تھا جیسے میرے علاوہ اسے کسی سے بھی محبت نہ ہو۔

وہ میرے گھر کے سامنے کھڑا رہتا اور اکثر بچوں کے ساتھ کھیلتا نظر آتا۔ سب ہی اسے پسند کرتے تھے کیوں کہ وہ ہنسنے اور ہنسانے کے فن سے واقف تھا۔ ایک شام میں گھر میں نہیں تھی تو اس نے میری ماں سے دوستی کر لی اور میری ماں نے اسے رات کا کھانا کھلائے بغیر جانے کی اجازت نہیں دی۔

وہ ہر شام ہمارے ہاں آنے لگا اور میری ماں کو ''ماں'' کہہ کر مخاطب کرنے لگا۔ ہمارے درمیان کبھی جنگ سے متعلق بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اپنا رویہ سخت رکھا۔

''ایک شام میری ماں گھر پر نہیں تھی۔ راکو نے مجھے پکڑ لیا اور میرا بوسہ لینا چاہا، چند لمحوں تک میں اس کی آغوش میں سمٹی رہی۔ پھر مجھے احساس ہوا وہ ہمارا دشمن ہے لیکن اب کچھ سوچنے کا وقت نہیں رہ گیا تھا۔

چند روز بعد ایک شام ہم لیٹے ہوئے تھے کہ میری ماں گھر واپس آ گئی۔ اس لیے مجھے اس سے نفرت سی ہونی لگی اور میرے دل میں اسے قتل کرنے کی خواہش پیدا ہو گئی۔ حتیٰ کہ اسے ایک کھیت میں زخمی حالت میں پایا گیا۔ اسے مردانگی سے محروم کر دیا گیا تھا۔

جونکا نے ایک سرد آہ بھری۔ وہ بھول گئی تھی کہ موشا کہیں چھپا ہوا ان کی نگرانی کر رہا ہے۔ ''جب یہ خبر میرے کانوں تک پہنچی تو مجھے بے پناہ دکھ ہوا۔ مجھے اپنا دل پھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

دفعتاً وہ اٹھی اور بغیر خدا حافظ کہے موشا کی کمین گاہ کی طرف بڑھی۔ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ جھاڑیوں میں چھپا ہوا موشا اچھل کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس نے جونکا کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم اٹالین فوجیوں کو پسند کرتی ہو؟''

''نہیں بلکہ شاید میں تمہیں پسند کرنے لگی ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ تم براکو جیسا انجام پسند نہیں کرو گے۔''

اس نے اپنا ہاتھ چھڑایا اور تیزی سے جھونپڑوں کی طرف بڑھ گئی۔ موشا اندھیرے میں کھڑا اسے دیکھتا رہ گیا۔

ماتحت افسر نے فرار ہونے سے پہلے اس بات کا خاص طور سے انتظار کیا کہ لیفٹیننٹ ماریو گہری نیند میں پہنچ جائے۔ وہ اب مزید انتظار نہیں کر سکتا تھا اور اس پر جو ہیجانی کیفیت طاری تھی اس کی وجہ سے وہ کوئی منصوبہ بھی نہ بنا سکا۔ اس کے ذہن پر تو بس وہاں سے کسی نہ کسی طرح نکل بھاگنے کی دھن سوار تھی۔ غیر یقینی کیفیت زندگی سے محبت اور خوف کے ساتھ ساتھ مایوسی نے اس کے دل و دماغ پر گہرا اثر کیا تھا اور وہ اس حد تک دلیری محسوس کرنے لگا تھا کہ خودکشی پر بھی آمادہ ہو گیا۔ وہ جس حالت میں فرار ہو رہا تھا یہ ایک طرح سے خودکشی ہی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ باڑے کے دروازے کی طرف کھسکنے لگا۔

ڈیرا سب مشین گن کندھے پر اٹھائے ٹہل رہی تھی۔ وہ اس وقت تک منتظر رہا جب تک وہ اس کی

طرف سے نہلتی ہوئی چند لمحوں کے لیے بے نیاز ہوگئی جیسے ہی اس کی پشت قیدی کی طرف ہوئی وہ دوڑ پڑا اور جھاڑیوں میں گھس کر پہاڑیوں کی طرف بھاگ اٹھا۔

وہ ابھی زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ ڈیرا اس کا پیچھا کرتی ہوئی ایک چٹان پر پہنچ گئی۔ اس نے قیدی کو ایک سے دوسری چٹان کی طرف کودتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ سب مشین گن نے موت کا قہقہہ لگایا اور وہ خون میں لت پت ہوکر وہیں گر گیا۔ اس کا جسم تڑپے بغیر ہی ٹھنڈا ہوگیا۔

موشا دوڑنے والوں میں سب سے آگے تھا۔ اس کی نیند بوڑھوں کی طرح معمولی سی آہٹ پر ٹوٹ جاتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بلی جیسی تیزی تھی۔ صورت حال بالکل واضح تھی اس لیے وضاحت طلب کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ باڑے سے لیفٹیننٹ کے رونے اور اپنے ساتھی کو اس انداز میں پکارنے کی آوازیں آرہی تھیں جیسے وہ ابھی زندہ ہو۔ کسی کو اپنے دشمن کی آہ وزاری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، اس لیے وہ آپس میں باتیں کرنے لگے۔

''اب ہم ان لڑکیوں پر اعتماد کرسکتے ہیں۔'' کمانڈر نے موشا سے کہا۔

''اس لیے تمہیں اب ان کی جاسوسی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جاؤ اور سو جاؤ تمہیں زیادہ نیند کی ضرورت ہے۔''

موشا ان لوگوں کی پے در پے مخالفتوں سے تنگ آ گیا تھا۔ وہ ہر دل عزیز بننا چاہتا تھا لیکن اس کی فطری ہٹ دھرمی آڑے آجاتی تھی۔ کسی نہ کسی طرح وہ پرسکون ہوکر گہری نیند میں ڈوب گیا۔

سب لوگ واپس اپنے اپنے جھونپڑے میں چلے گئے اور لاش جہاں تھی وہیں پر چھوڑ دی گئی۔ جونکا دروازے کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ ڈیرا کی ڈیوٹی ختم ہوچکی تھی۔ لیفٹیننٹ اپنے ساتھی کی موت پر دل برداشتہ تھا۔ وہ جونکا کے قریب نہیں آیا۔ وقت بغیر کسی حادثے اور گفتگو کے گزر گیا۔ جلد ہی صبح ہونے والی تھی اور فانجا کو جونکا کی طرح ڈیوٹی سنبھالنی تھی۔ مردہ افسر کا جسم اس وقت بھی چٹان پر بے حس وحرکت پڑا تھا۔

اچانک لیفٹیننٹ ماریو اٹھ کھڑا ہوا۔ فانجا باڑے کی طرف ڈیوٹی سنبھالنے آرہی تھی۔ ماریو نے استدعا کی۔ ''پلیز! لاش کو وہاں سے اٹھوادو۔''

جونکا بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے لاش کی طرف دیکھا اور خاموشی سے لاش کی طرف بڑھ گئی۔ پھر اس نے ٹھوکر مار کر لاش کو چٹان سے لڑھکا دیا۔ اب یہ لاش باڑے سے دکھائی نہیں دے سکتی تھی۔ ماریو نے دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ لیے اور سسکیاں بھرنے لگا۔ جونکا واپس آئی تو اسے اس حالت میں دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ ''میں اس کے علاوہ کچھ نہیں کرسکتی تھی۔''

ماریو خاموشی سے باڑے کے کونے میں چلا گیا۔ سورج نکل آیا تھا۔ اچانک خفیہ ہیڈ کوارٹرز نعروں سے گونج اٹھا۔ یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی خاص بات ہوگئی ہو اور یہ خاص بات اس کے علاوہ اور کیا ہوسکتی تھی کہ ان کے جو ساتھی گرفتار ہوگئے تھے ان کے زندہ وسلامت ہونے کی خوش خبری وہاں تک پہنچ گئی تھی۔

فانجا نے ڈیوٹی سنبھال لی۔ اس نے ماریو کو بتایا کہ ان کے ساتھی زندہ ہیں اور اٹالین فوج کے اعلا حکام قیدیوں کے تبادلے پر رضامند ہوگئے ہیں۔

قیدیوں کے تبادلے میں جو اقدام ضروری تھے ان پر تبادلہ خیال کرنے کے لیے سب لوگ ایک جگہ اکٹھے ہوگئے۔ موشا نے بحث کے دوران یہ بات ظاہر نہیں کی کہ ایک قیدی کی ہلاکت سے معاملہ بگڑنے کے امکانات پیدا ہوگئے ہیں۔ یہ طے پا گیا کہ لیفٹیننٹ کو فوج کے حوالے کرنے کے لیے موشا تینوں لڑکیوں کے ساتھ جائے گا۔

بعد میں تنہائی ملی تو موشا نے اپنے اس موقف کی وضاحت کی۔ ''دراصل میں اٹالین فوج کو ان کی سابق محبوبائیں دکھا کر جلانا چاہتا ہوں۔''

''میں جانتا ہوں کہ تم ایسا کیوں کر رہے ہو۔''

نئے کمانڈر بوسکو نے عجیب لہجے میں کہا۔ ''تم یہ اعتراف نہیں کرنا چاہتے کہ تمہیں لڑکیوں کے بارے میں غلط فہمی ہوگئی تھی۔ اس کے بجائے تم اب بھی یہ ثابت کرنے میں لگے ہوئے ہو کہ تمہارا نظریہ درست تھا۔ کوئی حماقت مت کرو، لڑکیوں کو ساتھ لے جانا چاہتے ہو تو بے شک لے جاؤ لیکن ان کے ساتھ کوئی الٹی سیدھی بات نہ کرنا ورنہ پچھتاؤ گے۔ عورتوں کے سلسلے میں حسد کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں موشا!''

یہ کہہ کر بوسکو عجیب وغریب زبان میں گالیاں بکتا ہوا وہاں سے ہٹ گیا۔

اگلے روز وہ سفر پر نکل کھڑے ہوئے۔ یہ ایک ایسا دن تھا جس کے بارے میں ان تینوں لڑکیوں کا خیال تھا کہ کبھی نہیں آئے گا۔ موشا نے قیدی کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تاکہ وہ راستہ نہ دیکھ سکے۔ سب سے پہلے انہیں ڈویژن ہیڈ کوارٹرز جا کر احکامات حاصل کرنے تھے پھر وہاں سے طے شدہ مقام پر جانا تھا۔

نیا مشیر موشا اس وقت کسی تجربے کار اسکاؤٹ کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ نگاہ اٹھا کر ڈیرا کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا جو سفید جھنڈا اٹھائے اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ موشا بہت محتاط تھا۔ وہ تین بار اپنے کیمپ کی طرف گھوم کر آیا پھر کہیں جا کر اس نے ڈویژن ہیڈ کوارٹرز کی طرف جانے والے راستے پر قدم رکھا تھا۔

وہ دیر تک چلتے رہے۔ گرمی کی وجہ سے ان کی ٹانگیں شل ہو رہی تھیں جیسے ان میں سیسہ بھر گیا ہو۔ ان کی کمر جھکتی جا رہی تھیں اور جسم پسینے سے نہا رہے تھے۔

ہیڈ کوارٹرز پہنچ کر انہیں خاصی دیر وہاں رکنا پڑا۔ تب کہیں قیدیوں کے تبادلے کے لیے طے شدہ مقام کا علم ہوا۔ انہیں اس سلسلے میں چند ہدایات دی گئیں اور قیدیوں کے تبادلے کے چند اصول بھی بتائے گئے۔

وقت تھوڑا تھا اس لیے وہ کچھ کھائے پیے بغیر ہی چل پڑے۔

راستے میں وہ چلتے ہوئے کچھ نہ کچھ کھاتے رہے۔ پھر بھی جب وہ مقررہ مقام پر پہنچے تو انہیں دیر ہو چکی تھی۔ اٹالین پہلے سے وہاں پہنچ چکے تھے اور ان کا انتظار کر رہے تھے۔ مقررہ جگہ پہنچنے سے پہلے ہی انہیں کچھ فاصلے پر ایک سفید جھنڈا لہراتا ہوا نظر آ گیا تھا۔

جواباً ڈیرا نے بھی سفید جھنڈا لہرانا شروع کر دیا۔

قیدی کے قدم سست پڑ گئے۔ جیسے وہ جونکا سے جدا ہونے سے پہلے کے معمولی وقفے کو طول دینا چاہتا ہو۔ موشا نے اسے تیز تیز چلنے کا حکم دیا لیکن قیدی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس کی سست روی برقرار رہی۔

جب موشا نے لیفٹیننٹ ماریو کی آنکھوں سے پٹی ہٹائی تو تیز دھوپ کی وجہ سے وہ فوری طور پر کچھ بھی نہ دیکھ سکا۔ وہ اٹالین ٹرک سے کچھ فاصلے پر رک گئے تھے۔ اس نے جونکا کی طرف دیکھا لیکن وہ کسی اور طرف گھور رہی تھی۔ موشا تنہا ہی اٹالین افسر سے گفت وشنید کے لیے آگے بڑھا۔

''تمہارے ساتھ کتنے قیدی ہیں۔'' اٹالین اسکواڈ کے کپتان نے پوچھا۔

''صرف ایک قیدی۔''

''لیکن تمہیں دو قیدیوں کو لانا چاہیے تھا۔''

''لیفٹیننٹ ماریو ہمارے ساتھ ہے۔ اس کا ماتحت افسر گھبراہٹ میں فرار ہو گیا اور ہمیں تلاش کے باوجود نہیں مل سکا۔'' موشا نے جھوٹ بولا۔

''اس سلسلے میں ہم صرف ایک قیدی کو رہا کر سکتے ہیں۔ ہمارے پاس اس وقت تمہارے دو ساتھی ہیں۔ بتاؤ ان میں سے کسے آزاد کیا جائے۔ یہ فیصلہ کرنا تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔''

''مجھے ان سے بات چیت کی اجازت دو تو۔۔۔''

''میں ایسا نہیں کر سکتا لیکن میں تمہیں صرف اتنا بتا دینا چاہتا ہوں کہ دونوں کی حالت ابتر ہے۔ ان میں سے ایک تو اس قدر ناقص حالت میں ہے اسے آزاد کروا کر ساتھ لے جانا تمہارے لیے کسی

فائدے کا باعث نہیں ہوگا۔''

''کون ہے وہ؟'' موشا چونک کر بولا۔

''دائیں طرف جو قیدی ہے۔'' کیپٹن نے اشارہ کیا۔ ''یہ سونکو ہے۔''

''کتے کی اولاد! تم نے انہیں اذیتیں دی ہیں۔'' موشا چیخ پڑا۔

''جب انہیں گرفتار کیا گیا تھا تو یہ زخمی تھے۔ تم نے جو بے عزتی کی ہے اس کے لیے تمہیں خود ہی کسی نہ کسی دن افسوس ہوگا۔ تم ان اصولوں کی خلاف ورزی کر رہے ہو جو ایسے موقعوں پر خاص طور سے محفوظ رکھنے چاہئیں۔ یہ اصول ہمارے اعلا حکام کے مابین باقاعدہ طے ہوئے تھے۔''

''تم بھی محتاط رہو۔'' موشا غرایا۔ ''ہماری پوزیشن مضبوط ہے۔ کیپٹن اور تمہیں کسی غلط اقدام سے پہلے غور کرنا ہوگا۔''

اٹالین کیپٹن کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ وہ اس شخص سے مزید بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ غالباً اسے افسوس ہو رہا تھا کہ وہ گوریلوں سے معاملہ کرنے کے لیے کیوں چلا آیا ہے۔

''فوراً فیصلہ کرلو کہ ان دونوں میں سے تمہیں کس کی زیادہ ضرورت ہے۔'' کیپٹن نے سرد مہری سے کہا۔ ''یا پھر تم یہ چاہتے ہو کہ میں خود ہی کسی ایک کا انتخاب کر کے اسے تمہارے حوالے کر دوں۔''

موشا دانت پیسنے لگا۔ اسے جلد ہی کوئی فیصلہ کرنا تھا اور وہ کوئی غلط فیصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے سختی سے کہا۔ ''دوسرے آدمی کو ہمارے حوالے کر دو۔''

کیپٹن نے حکم دیا کہ ویلکو کو آزاد کر دیا جائے۔ ویلکو اپنے زخمی ساتھی کو چھوڑ کر آزاد نہیں ہونا چاہتا تھا لیکن زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا سونکو نے اسے تذبذب میں دیکھ کر دھکیل دیا وہ لڑکھڑاتا ہوا اپنے ساتھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

''مجھے اب چلے جانا چاہیے۔'' ماریو نے کہا۔ جونکا نے ہاتھ ملانے کے لیے اپنا بازو اس کی طرف بڑھایا۔ ماریو اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات میں جونکا کے لیے بے پناہ تعظیم تھی۔ جونکا اس کی آنکھوں میں پیدا ہونے والی پاکیزہ محبت کی چمک دیکھ چکی تھی۔ وہ اس کے جذبات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ جھکی اور ماریو کے رخسار پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

''کسی نہ کسی روز یہ جنگ ختم ہو جائے گی۔'' ماریو نے پلٹ کر جونکا سے کہا۔ ''اور پھر ہم ایک دوسرے کے دشمن نہیں رہیں گے۔ گڈ لک!''

ماریو اور ویلکو درمیانی جگہ پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے آئے اور انہوں نے دوستانہ انداز میں ایک دوسرے سے مصافحہ کیا اور پھر خاموشی سے اپنے اپنے ساتھیوں کی طرف بڑھ گئے۔

فانجا نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ سونکو آزاد نہیں ہوا اور وہ اسے کبھی نہیں دیکھ سکے گی تو اس کے حلق سے ایک دل دوز چیخ نکلی جو سونکو کا نام بن کر دور دور تک گونج اٹھی۔

اس نے اٹالین ٹرک کے پیچھے دوڑنا شروع کر دیا۔ ڈیرا کچھ فاصلے پر ایک درخت کی اوٹ میں چھپی ہوئی تھی اس نے جلدی سے اسے پکڑ لیا۔ جانب داروں کا چھوٹا سا قافلہ واپس چل دیا۔ فانجا کو ڈیرا نے سنبھال رکھا تھا ورنہ اس میں تو چلنے کی سکت نہ رہ گئی تھی۔ وہ رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی۔

''بہتر ہوتا کہ تم بھی ان کے ساتھ ہی واپس چلی جاتیں۔'' موشا نے جونکا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے جونکا کو ماریو کو بوسہ لیتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور غالباً وہ اب اس حرکت کا بدلہ لے رہا تھا۔ جونکا خاموشی سے چلتی رہی جیسے موشا کی بات اس کے کانوں تک پہنچی ہی نہ ہو۔

''تم نے لیفٹیننٹ کو قتل کیوں نہیں کیا تھا۔'' ویلکو نے پوچھا۔

''دوسرا فرار ہو رہا تھا اس لیے مارا گیا ورنہ وہ بھی زندہ ہوتا تو سونکو کو واپس لایا جا سکتا تھا۔'' موشا نے جواب دیا اور کندھے اچکائے۔

''جونکا اس وقت تک ان کے پہلو میں پہنچ چکی تھی۔

اس نے بغور ویلکو کی طرف دیکھا۔ وہ کمزور نظر آ رہا تھا۔ وہ بھی کنکھیوں سے جونکا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جونکا جانتی تھی کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے لیکن وہ خوف زدہ نہیں تھی۔

''تمہارے لمبے بال تمہارے فرائض میں حائل ہو رہے ہیں، اس سے پہلے کہ میں انہیں کوئی نقصان پہنچاؤں بہتر ہوگا کہ تم خود ہی انہیں کاٹ ڈالو۔ تمہیں بالکل شرم نہیں آتی تم ہمیں ذلیل کروا کر خوش ہوتی ہو۔''

جونکا کچھ بولے بغیر چلتی رہی۔

''کیا تم میری باتیں سمجھ رہی ہو۔'' ویلکو چیخ پڑا۔

''جیسا میں کہہ رہا ہوں، ویسا ہی کرو، انہیں آگ لگا دو۔''

''اور یہ کام فوراً ہی کر ڈالو۔'' موشا نے لقمہ دیا۔ وہ ویلکو کی طرف متوجہ ہوا۔ ''ہمیں اس لڑکی کو تھوڑا سا سبق دینا چاہیے۔ مجھے تو یہ لڑکی پہلے دن سے ہی پسند نہیں ہے۔''

''میں یہ کام کبھی اپنے ہاتھوں سے نہیں کروں گی۔'' جونکا نے کہا۔ اس کا لہجہ ہموار تھا اور آواز نرم تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ویلکو کے لہجے میں جو شدت ہے اس کی وجہ صرف حسد ہے۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''میں نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس پر مجھے شرم آنی چاہیے۔ میں جنگ میں شامل تھی اور اس جنگ کو اس وقت تک جاری رکھوں گی جب تک مجھے بھی تم جیسا مقام نہیں مل جاتا۔ اس جنگ نے تمہیں اخلاقی اعتبار سے دیوالیہ کر دیا ہے۔ تم مجھ پر جو الزام تراشی کر رہے ہو میں اس کا دفاع کرتے ہوئے یہ ثابت کر دوں گی کہ میں نے جو کچھ بھی کیا تھا وہ ٹھیک تھا۔ موشا! محض پتلونیں سنگینوں سے باندھ کر فتح و کامرانی کے پرچم نہیں لہرائے جا سکتے۔''

ویلکو تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ اس نے جونکا کو گرا دیا اور اپنی جیب ٹٹولنے لگا۔ اس نے ماچس نکالی اور جونکا نے سر تسلیم خم کر دیا۔

ڈیرا اور فانجا خاموشی سے انہیں دیکھتی رہیں۔ ماضی کو ایک بار پھر دوہرایا جا رہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ کیا انہیں ہمیشہ اسی طرح گناہ گار سمجھا جاتا رہے گا۔ جب بھی ان کے بال بڑھیں گے تو کیا انہیں فوراً فاحشہ قرار دے کر پھر ان کے بالوں کو کاٹ دیا جائے گا۔ یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔ آخر کب تک؟

بال جلنے کی بو انتہائی ناگوار تھی۔ جلتی ہوئی دیا سلائی اب ویلکو کی انگلیوں کو جھلسا رہی تھی۔ جونکا نے اس کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر اسے سنبھالنے کی کوشش کی لیکن وہ گر گیا۔

گھٹنوں کے بل جھک کر جونکا نے مدھم آواز میں اسے پکارا۔ وہ اس سے محبت کرتی تھی وہ آج یہ راز اس پر ظاہر کر دینا چاہتی تھی۔ اس نے موشاد، ڈیرا یا فانجا کی طرف قطعاً توجہ نہیں دی۔

''میں تم سے محبت کرتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔ فانجا نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی اور وہ جلد ہی سنبھل گئی۔ جونکا اور موشا کی مدد سے ویلکو اٹھ کھڑا ہوا لیکن اب وہ جونکا سے نگاہیں چار نہیں کر رہا تھا۔ جب وہ کیمپ کے قریب پہنچا تو ان کے ساتھیوں نے ہوائی فائرنگ کر کے ان کا استقبال کیا اور سرخ جھنڈیاں لہرانے لگے۔

''خاموش ہو جاؤ۔'' فانجا چیخ پڑی۔ ''بند کرو یہ ہنگامہ، سونکو ابھی تک ان کی قید میں ہے۔ سونکو آزاد نہیں ہوا۔''

''موشا! ہم سونکو کی آزادی کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔'' ویلکو نے سوال کیا۔

''کچھ نہیں۔۔۔ کچھ نہیں۔''

''ہمیں زیادہ سے زیادہ قیدی بنانے پڑیں گے تاکہ اپنے ساتھیوں کو رہا کروا سکیں۔'' ڈیرا نے فانجا سے کہا۔

ویلکو دوبارہ گر گیا۔

اسے اٹھا کر ایک جھونپڑے میں پہنچا دیا گیا اور جب اس کے کپڑے اتارے گئے تو انہوں نے دیکھا کہ ویلکو کا پورا جسم زخموں سے بھرا ہوا ہے۔ پہلی بار جونکا کو افسوس ہوا کہ اس نے لیفٹیننٹ ماریو کے رخسار کو کیوں چوما تھا۔ اس نے اظہار ندامت کیا تو جانب داروں کے بریگیڈ نے اسے قبول کر لیا اور ویلکو کی آنکھوں میں پہلی بار اس کی محبت کے دیپ جل اٹھے۔

ساتویں قسط

چمگادڑ

ایم اے راحت

ایک شخص کی داستان جس نے زندگی کی حقیقتوں سے آشکار ہونے کے بعد اپنی نئی منزلوں کی تلاش شروع کر دی۔ وہ جو رشتوں پر یقین رکھتا تھا۔ اپنوں کی لالچ کا شکار بنا۔ اس کے خلاف بنی سازشوں نے اسے ایک مختلف انسان بنا دیا۔ وہ ہر مشکل کے سامنے سینہ سپر تھا۔
زندگی کے نشیب و فراز اور عروج و زوال کی ایک انوکھی داستان جو لمحہ بہ لمحہ آپ کو تجسس کے سحر میں جکڑ لے گی۔

عمران ڈائجسٹ کا پر تجسس دل بہلا دینے والا سلسلہ

''گڈ۔۔۔اس کا مقصد ہے کہ اب مجھے بینی کین کو اطلاع کر دینی چاہیے۔'' آقا نوشیرواں نے کہا۔

میں خاموش ہی رہا اور میں نے یہ پوچھنے کی کوشش بھی نہیں کہ بینی کین کون ہے۔۔یہ تو اتفاق تھا کہ مجھے یہ نام ڈاکٹر وسکارٹ کی زبانی معلوم ہو گیا تھا۔

آقا نوشیرواں کافی دیر تک مجھ سے باتیں کرتا رہا اور اس کے بعد پرخیال انداز میں گردن ہلاتا ہوا باہر چلا گیا۔ ویسے مجھے آقا نوشیرواں سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ نا ہی میں اس کی نیت پر کوئی شک کر سکتا تھا بلاشبہ وہ ایک نفیس انسان تھا۔ لیکن پتا نہیں کیا مشکل ہے اس کے راستے میں کہ وہ وضاحت کے ساتھ مجھ سے کوئی بات نہیں کر پاتا۔ بینی کین کا حوالہ اور زباں بندی کی بات یہ نشان دہی کرتی تھی کہ شاید ان کے درمیان کوئی اخلاقی معاہدہ ہو۔ ہوتا ہے تو ہوتا رہے میرے اوپر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ بس ٹھیک ہے۔ حالات جس حد تک میرے علم میں آ چکے ہیں وہ کم از کم مجھے اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ صورت حال بہتر رہے گی اور کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ اس سلسلے میں قدم آگے بڑھاتے ہوئے۔

لیکن یہ رات میرے لیے بڑی تعجب خیز رات تھی۔ رات کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا اور پروگرام یہی رہتا تھا کہ پہلے میں لڑکی کو کھانا کھلاؤں اس کے بعد اسے آرام سے سلا کر میں اپنی رہائش گاہ میں جاتا تھا۔ میں اس سارے پروگرام کو مرحلے وار کرتا ہوا لڑکی کے کمرے میں پہنچ گیا تھا۔ اب اس کا کمرا بھی بالکل صاف ستھرا رکھا جاتا تھا اور اس سلسلے میں، میں بڑی محنت کیا کرتا تھا۔ بعض اوقات تو خود مجھے اپنے ہاتھ سے کام کرنے پڑے تھے۔ کھانے وغیرہ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد میں نے محبت سے اسے اس کے بستر تک پہنچایا۔ لڑکی بستر پر لیٹ گئی۔ صاف ستھرے بستر میں نجانے کیوں آج وہ بہت دلکش نظر آ رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ کبھی مجھ سے نگاہیں نہیں ملاتی۔ عموماً وہ دیوار ہی کو دیکھتی رہتی تھی اور اس کا چہرہ بے تاثر رہتا تھا۔ لیکن اس وقت بڑی عجیب بات ہوئی، میں نے اسے بستر پر لٹا کر اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور پھر سیدھا ہوا ہی تھا کہ میں نے لڑکی کو خود پر نگاہیں جمائے دیکھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ مجھے براہ راست دیکھ رہی تھی۔ میں چونک کر رک گیا اور یہ اندازہ لگانے لگا کہ یہ صرف اتفاق ہے یا پھر وہ جان بوجھ کر مجھے دیکھ رہی ہے، لیکن وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھے اس کی آنکھیں بے حد حسین لگیں اور اس کے بعد اچانک وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ بستر پر ٹکائے۔ چہرہ اوپر اٹھایا اور اچانک ہی اس کے ہونٹ ہلنے لگے۔ اس کے ہونٹ تیز رفتاری سے ہل رہے تھے اور اس کی ایک عجیب سی کیفیت تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہہ رہی ہے۔ لیکن اس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ بس ہونٹ تیز رفتاری سے ہل رہے تھے۔ آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ ایک ایسی سوگوار کیفیت تھی ان آنکھوں میں کہ میرا دل پگھل کر موم ہو گیا۔ میں اس کے پاس بستر پر بیٹھ گیا۔ لڑکی بدستور مجھ سے شکایتی انداز میں کچھ کہے جا رہی تھی۔ لیکن بے آواز اس کے ہونٹ اتنی تیزی سے ہل رہے تھے کہ مجھے تعجب ہو رہا تھا۔ پھر اچانک ہی اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس کے ہونٹ اب بھی مسلسل ہل رہے تھے۔ نجانے کیوں میرا دل پھٹنے لگا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا کہ کاش تو بے آواز نہ ہوتی، میں تیرے دل کا درد تو سمجھ سکتا، پھر اچانک ہی لڑکی نے دونوں ہاتھ سیدھے کیے اور میری گردن میں حمائل کر دیے۔ میں بری طرح چونک پڑا تھا۔ کچھ عجیب سے جذبات امڈ آئے تھے اس کے۔ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اس خوں خوار لڑکی سے جسے میں دو، تین بار خانان کے ساتھ وحشت زدہ انداز میں اچھل کود کرتے دیکھ چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میری گردن سے لپٹے ہوئے تھے۔ کچھ

یب سے جذبات کا احساس ہو رہا تھا۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بہت دیر تک وہ مجھ سے اس طرح لپٹی رہی اور اس کے بعد اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ وہ اب بھی مسلسل روئے جا رہی تھی۔ لیکن اس کے چھوڑنے کے بعد میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھائے اور اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے اس سے کہا۔

''بول سکتی ہو اگر۔۔۔ اگر اپنی زبان کو کسی خاص وجہ سے خاموش کر رکھا ہے تو بول دو مجھ سے۔ اپنے دل کے سارے راز کہہ دو، میں تمہارا بہترین راز دار ثابت ہوں گا۔ دنیا سے لڑ جاؤں گا تمہارے لیے۔ میری زندگی میں رکھا ہی کیا ہے۔ بتاؤ مجھے کیا کہ ہے تمہیں، کیا چاہتی ہو، کیا کرنا ہے، تمہارے لیے سب کچھ پیچھے چھوڑ سکتا ہوں، ایک بے زبان شخصیت کے لیے۔ دوسرے تو اپنی من مانی کر سکتے ہیں۔ وہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ جو وہ چاہتے ہیں۔ لیکن تم۔۔۔ تم بول دو لڑکی بول دو اگر پرہیز کر رہی ہو، اگر بولنے سے گریز کر رہی ہو تو بول دو آج میں تمہارے لیے ساری دنیا سے لڑ جانے کے لیے تیار ہوں اور تم سے اس کا کوئی صلہ نہیں مانگوں گا۔ وعدہ کرتا ہوں، بول دو، میں کہتا ہوں بول دو۔''

وہ مجھے دیکھتی رہی اور پھر اس طرح مسکرائی کہ میں حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے اچانک ویرانوں میں لاتعداد پھول کھل گئے ہوں۔ ہوائیں مسکرانے لگی ہوں۔ لیکن وہ کچھ بولی نہیں تھی۔ بڑی عجیب سی کیفیت تھی۔ اب اس کی آنکھوں میں سکون نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر مجھے دیکھا۔ گردن جھکائی اور میرے سینے کو چوم لیا۔ اس کے بعد وہ آرام سے لیٹ گئی تھی۔ میں دیر تک اسے دیکھتا رہا، پھر میں نے اس سے کہا۔

''میں جاؤں؟''

لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی نگاہیں پھر چھت کی طرف اٹھ گئی تھیں۔ میں نے کئی بار اسے آواز دی، لیکن اس نے اپنی نظریں نہ ہٹائیں اور اس کے بعد اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ سونے کی کوشش کر رہی ہے۔ تب میں دبے پاؤں وہاں سے واپس پلٹ پڑا۔ لیکن اس رات میں سکون کی نیند نہیں سو سکا تھا۔

کھانے وغیرہ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد میں نے اس پر غور کیا اور یہی فیصلہ کیا کہ وہ واقعی نہیں بول سکتی، لیکن کیوں آخر کیوں؟ اور اس کیوں کا ابھی کوئی جواب نہیں مل سکتا تھا۔ بہر حال میں نے بھی ذہن کو بوجھ سے آزاد کر دیا۔ وقت کے فیصلے سب سے بہتر ہوتے ہیں اور وقت ہی بتائے گا کہ اس لڑکی کی کہانی کیا ہے؟ پھر سب سے پہلے مجھے عالی نے اس بارے میں اطلاع دی تھی۔ اپنے معمولات سے فراغت حاصل کرنے کے بعد میں انیکسی میں آیا تھا اور عالی نے معمول کے مطابق میرے سامنے کھانا لگایا تھا۔ لیکن وہ بہت افسردہ تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر یہ افسردگی دیکھی تو کہا۔

''کیا بات ہے عالی! طبیعت خراب ہے تمہاری؟''

''نہیں۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''مگر مجھے لگ رہا ہے۔''

''نہیں ٹھیک ہوں۔''

''اور میں یہ بھی محسوس کر رہا ہوں کہ تم مجھے بتانے سے گریز کر رہے ہو، دل تو چاہتا ہے کہ تم مجھے اپنی اس وقت کی کیفیت کے بارے میں بتا دو، لیکن تمہیں مجبور کرنے کا کوئی حق نہیں ہے مجھے۔ چنانچہ خاموش ہو جاتا ہوں۔''

عالی میرے سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی پیشانی میرے گھٹنے پر رکھ دی تھی۔ میں نے پیار سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''طبیعت خراب ہے تو مجھے بتاؤ تم میرے لیے بہت بڑی حیثیت رکھتے ہو۔ میرے دوست ہو تم، میرے ساتھی ہو۔''

''عالی طرب! کیا آپ کو اس بات کا علم ہے کہ آپ لوگ ایک مہم پر جانے والے ہیں۔''

''ہاں۔۔۔تھوڑی سی کہانی میرے علم میں آئی تو ہے، لیکن آقا نوشیرواں نے ابھی تک مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

''میرا خیال ہے اس میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ میں اپنے لیے افسردہ ہوں عالی طرب! کہ بدقسمتی سے انسان بھی ہوں۔ جانور تک اپنے مالک سے محبت کرتے ہیں، تو انسانوں کے دل میں تو یہ محبت جانوروں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے میں غلط کہہ رہا ہوں۔ اپنے دل کی بات کر رہا ہوں آپ سے، دل چاہے تو جان لیں، ورنہ میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے اپنے آپ کو سمجھانے کا۔''

''تم جو کچھ بھی کہنا چاہتے ہو کم از کم ان الفاظ میں تو کہو کہ میں انہیں سمجھ لوں۔'' میں نے کہا۔

''عالی طرب۔۔۔! زیادہ وقت نہیں ہوا ہے آپ کی خدمت کرتے ہوئے۔ لیکن جیسا کہ میں آپ سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ہر شخص کے اندر ایک انسان ہوتا ہے اور انسان کے سینے میں دل ضرور ہوتا ہے۔ پھر خصوصاً کوئی اسے عزت سے مخاطب کرے، کبھی اس کے ساتھ کوئی ایسا عمل نہ کرے جو اس کے ذہن کے لیے قرب بن جائے تو اس سے محبت ہونا تو فطری بات ہے۔ عالی طرب! مجھے آپ سے جدائی کا افسوس ہے۔''

''اوہ! یہ بات ہے۔''

''ہاں عالی طرب!''

''لیکن ظاہر ہے ہم اگر کہیں جا بھی رہے ہیں تو ہماری واپسی تو ہوگی نا۔''

''عالی طرب۔۔۔! میں نے جان بوجھ کر یہ گفتگو نہیں سنی لیکن آقا نوشیرواں اپنی آرام گاہ میں یہ گفتگو کر رہے تھے عمران سے اور یہ طے کر رہے تھے کہ یہاں سے ملازموں میں سے کسے کسے ساتھ لیا جائے گا۔ پہلے بھی جب آقا اپنے سفر پر جاتے رہے ہیں تو یہاں سے ملازموں کو لے جاتے رہے ہیں۔ عالی طرب وہ تندرست و توانا لوگوں کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں، کیونکہ مہمات میں طاقت ور لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے اور اس سے پہلے میں نے کبھی اپنے دل میں یہ تصور نہیں کیا کہ مجھے بھی کہیں ساتھ لے جایا جائے۔ دل بھی نہیں چاہتا تھا کبھی اس طرح۔۔۔ لیکن عالی طرب آپ کو چھوڑتے ہوئے دکھ ہو رہا ہے اور دل میں سوچتا ہوں کہ کاش! میں بھی طاقت ور توانا ہوتا۔''

''مہمات میں عالی! بڑی جاں فشانی کرنی پڑتی ہے، موسم جھیلنے پڑتے ہیں، صعوبتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔''

''میں جانتا ہوں عالی طرب۔۔۔! لیکن بظاہر میں کمزور ہوں، لیکن اندر سے میں بہت مضبوط انسان ہوں۔''

''گویا اگر تمہیں دوسرے ملازموں کے ساتھ لے جائے تو۔۔۔''

''آقا میرے بارے میں ایسی بات کبھی نہیں سوچیں گے۔''

''خیر۔۔۔ مگر جا کب تک رہے ہیں یہ لوگ؟''

''عالی طرب شاید بہت جلد۔۔۔ ان کی گفتگو سے یہی اندازہ ہوتا تھا۔''

میں نے عالی کو اس سلسلے میں کوئی تسلی نہیں دی۔ لیکن شاید میرے اندر بھی وہی جذبے موجود تھے یعنی جو کوئی بھی محبت سے پیش آئے، اس کے لیے دل کے دروازے کھول دوں۔ عالی کی افسردگی بھی مجھے دکھی کر گئی تھی لیکن یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں عالی کو ساتھ لے جانے کے سلسلے میں آقا کو مجبور کرسکتا ہوں۔ البتہ دل میں یہ ضرور سوچا تھا کہ آقا سے اس سلسلے میں بات ضرور کروں گا۔ لیکن یہاں تو مسئلہ یہی تھا کہ خود مجھ سے بھی تو کوئی بات کی جائے۔ بات تو بے شک نہ کی گئی، لیکن دو، تین دن کے اندر ہی اندر ایک صبح میں نے آقا نوشیرواں کو کچھ افراد کے ساتھ اصطبل میں جاتے ہوئے دیکھا۔ آقا نوشیرواں نے مجھے طلب کیا تو میں بھی ان کے پاس پہنچ گیا۔

ایک سرکش گھوڑا وہاں موجود تھا جو کسی کے قابو

میں نہیں آ رہا تھا۔ آقا نوشیرواں نے نئے آنے والوں میں سے ایک سے کہا۔

''اور تم کہتے ہو پیٹر! کہ یہ گھوڑا بے کار ہے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ تمہارے پاس کوئی صحیح سائیس ہی نہیں ہے جو اس گھوڑے کو قابو میں کر سکے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ میرا تجربہ اس سلسلے میں ناقص ہے۔''

''بالکل۔۔۔ بہرحال میں چونکہ تمہارے ہاتھ تمام گھوڑے فروخت کر رہا ہوں۔ اس لیے میں یہ نہیں چاہوں گا کہ ایک گھوڑا میرے اصطبل میں رہے۔ اصل میں گھوڑوں سے مجھے اس قدر محبت ہے کہ میں ان کی پرورش خود ہی کرتا ہوں اور کسی ایک شخص پر اعتبار نہیں کر سکتا۔

لیکن ایک آدمی ایسا ہے جو اس پر سواری کر کے دکھا سکتا ہے۔''

'تو پھر اس پر کیوں نہ سواری کر کے دکھائے۔''

نو وارد نے جس کا نام پیٹر تھا، کہا اور آقا نوشیرواں نے مجھے اشارہ کر دیا۔ میں گردن ہلانے کے بعد اچھل کر اس کی پشت پر سوار ہو گیا۔ کافی دنوں سے گھوڑوں کی سواری چھوڑ دی تھی، لیکن نجانے کس طرح مجھے اس کی مشق تھی۔ گھوڑے کو کافی دیر تک میں کودا تا رہا۔ پیٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''چلو ٹھیک ہے آقا! یہ گھوڑا میرا ہو گیا، لیکن کیا یہ ہیرا بھی تم مجھے دے سکتے ہو؟''

''اس سے پہلے بھی ایک شخص نے مجھ سے یہ الفاظ کہے تھے اور مجھ سے اس کی قیمت پوچھی تھی تو جانتے ہو میں نے اس سے کیا کہا؟''

''کیا؟'' پیٹر نے سوال کیا۔''

''میں نے کہا۔ اس کی قیمت کے طور پر تمہارے پاس جتنا کچھ ہے وہ مجھے دے جاؤ اور خود میرے اصطبل میں نوکری کر لو، تو یہ آدمی میں تمہارے حوالے کر سکتا ہوں۔''

پیٹر نے ایک بے تکا سا قہقہہ لگایا اور بولا۔

''چلو ٹھیک ہے ہمارا سودا ہو گیا۔''

گھوڑے پیٹر کی تحویل میں دے دیے گئے تو میں نے گردن خم کر کے آقا سے واپسی کی اجازت مانگی۔

''تمہیں ان گھوڑوں کی فروخت سے کوئی افسوس نہیں ہوا فرزان!''

''آپ نے فروخت کیے ہیں جناب اور بہرحال یہ آپ کا کاروبار ہے۔''

''میں نے انہیں اس لیے فروخت کر دیا کہ اب اس کے بعد ہمیں دوسرے جہانوں کی سیر کرنی ہے۔ اگر میرا مطلب نہیں سمجھ رہے تو تمہیں بتانا پسند کروں گا، ہم لوگ بہت مختصر وقت میں یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں، اسی مہم پر جس کا میں تم سے مختصر تذکرہ کر چکا ہوں۔''

''چونکہ میں آقا کے احکامات کا پابند ہوں اور خود اپنے اندر نہ وہ جرات پاتا ہوں اور نہ جرات کر سکتا ہوں، جس کے تحت میں آقا سے ان کے فیصلوں کے بارے میں معلومات حاصل کر سکوں۔''

''ارے ارے نہیں، اس انداز میں نہ سوچو۔ سوچ کا یہ انداز میرے لیے بڑا ہی تکلیف دہ ہو گا۔ تم تو میرے لیے بہت قیمتی شخصیت کے مالک ہو، اصل میں بس یوں سمجھ لو کہ میں تم سے بہت جلد رجوع کرنا چاہتا تھا۔ یعنی تمہیں بتانا چاہتا تھا کہ اب ہم لوگ کیا منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔''

''جی آقا!''

''بلکہ آج رات کو ہی میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ کھانے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد میرے پاس پہنچ جانا، بلکہ میں خود ملازم سے تمہیں اپنے پاس طلب کر لوں گا یعنی ان لمحات میں جب تم اپنی تمام ضروریات سے فارغ ہو چکو۔''

''جی بہتر۔'' میں نے جواب دیا۔ لیکن اب میرے ذہن میں سنسنی پیدا ہو گئی تھی۔ میں جلد از جلد وہ گفتگو سن لینا چاہتا تھا۔

اور پھر اسی شام سورج چھپنے سے پہلے اس وقت جب میں اس ملازمہ کے ذریعے لڑکی کو صاف ستھرا

لیاس پہنا رہا تھا۔ اب وہ اس سلسلے میں ماہر ہو چکی تھی۔ آقا نوشیرواں، ڈاکٹر وسکارٹ اور عمران کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ عمران اور ڈاکٹر وسکارٹ کچھ چوکنے سے نظر آ رہے تھے۔ جبکہ آقا نوشیرواں مکمل اعتماد کے ساتھ وہاں آیا تھا۔ اس نے ڈاکٹر وسکارٹ سے کہا۔

''اور اس دوران تم نے دیکھا ہوگا کہ وہ کبھی وحشت زدہ ہو کر اس طرح باہر نہیں بھاگی جیسے اکثر وہ اس عمارت سے باہر بھاگ جاتی تھی۔''

''ہاں۔۔۔ مگر وہ ہے کہاں؟''

''چند لمحے توقف کریں، میں ابھی اسے آپ کے سامنے پیش کردوں گا۔'' میں نے کہا اور ڈاکٹر وسکارٹ مسکراتی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا، پھر بولا۔

''ویسے تو یہ شخص انتہائی باکمال ہے۔ لیکن اگر اس نے اس وحشی لڑکی کو قابو میں کر لیا ہے تو یہ واقعی میرے لیے ایک عجوبہ ہوگا۔''

''آپ دیکھ لیجیے ڈاکٹر وسکارٹ!'' آقا نوشیرواں نے کہا اور کچھ ہی لمحوں کے بعد میری ہدایت پر لڑکی کو باہر لے آیا گیا۔ اس نے جھکتی ہوئی سی نگاہ ان تینوں پر ڈالی، ایک نگاہ مجھے دیکھا اور اس کے بعد گردن جھکا کر واپس اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ ڈاکٹر وسکارٹ اور عمران کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔

''یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ تو واقعی جادوگر ہے۔ یہ شخص ہے ہی جادوگر۔'' ڈاکٹر وسکارٹ نے تعریفی لہجے میں کہا اور آقا قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

''اور اس جادوگر کی جادوگری ہمارے مستقبل میں جس طرح کام آئے گی تم لوگ سوچ بھی نہیں سکتے۔ جبکہ میری نگاہیں ہمیشہ دور، دور تک دیکھتی ہیں۔'' اس کے بعد آقا نوشیرواں نے مجھ سے کہا۔

''اور تم پروگرام کے مطابق رات کو میرے پاس پہنچو گے۔''

''جی آقا۔۔۔! مجھے یاد ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

ان لوگوں کے چلے جانے کے بعد میں اپنے طور پر سوچوں میں گم ہو گیا تھا۔ بہر حال سوچوں سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ آقا نوشیرواں سے مقررہ وقت پر ملاقات کی۔ اس وقت وہ اپنی مخصوص نشست گاہ میں تھا جو لائبریری کی شکل رکھتی تھی۔ اس کمرے کے بارے میں مجھے اس بات کا علم تھا کہ اس میں کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔ تھا بھی ذرا الگ تھلگ ہی حصے میں۔ اس کا مطلب ہے کہ آقا نوشیرواں مجھ سے نہایت خفیہ گفتگو کرنا چاہتا ہے۔ اس نے مسکرا کر میرا استقبال کیا اور بولا۔

''یہ ایک عجیب بات ہے کہ تم اتفاقیہ طور پر مجھے ملے ڈیئر فرزان! اور تمہاری اپنی شخصیت میں بھی ایک ایسا پوشیدہ نکتہ ہے جس سے بہت سے عجیب و غریب احساسات نے جنم لیا۔ بہر حال میں گفتگو کو طویل نہیں کروں گا۔ وہ لڑکی جسے تم نے واقعی بڑے کمال کے ساتھ سنبھال لیا ہے، ایک عجیب و غریب شخصیت ہے۔ میں تمہیں مختصر تفصیل بتاتا ہوں۔'' آقا نوشیرواں نے بھی وہی تفصیل بتائی تھی جو ڈاکٹر وسکارٹ اپنے طور پر مجھے بتا چکا تھا۔ بہر حال اس تمام گفتگو کے بعد آقا نوشیرواں نے کہا۔

''دیکھو خدا کا دیا میرے پاس سب کچھ ہے۔ لیکن تم نے یہ جملہ سنا ہوگا کہ شوق کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ یہاں بھی ایک ایسا ہی سلسلہ ہے۔ وہ لڑکی ایک ایسے قبیلے سے تعلق رکھتی ہے جو کرسٹیا کے نواحی علاقوں میں آباد ہے۔ انتہائی پراسرار قبیلہ ہے۔ ہم اس لڑکی کو لے کر اس کے قبیلے میں جانا چاہتے ہیں۔ تاکہ اسے اس قبیلہ کے لوگوں کے سامنے پیش کر کے ان کی محبت اور ان کی عنایت حاصل کریں اور اس کے بعد وہ عظیم الشان خزانہ جو روایتی حیثیت رکھتا ہے۔ جیسا کہ میں نے تمہیں اس کے بارے میں تفصیل بتائی۔ ایک عجیب و غریب واقعہ ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمارا مقصد صرف اتنا ہی نہیں ہے۔ فرض کرو اگر ہم اس خزانے کے حصول میں ناکام بھی

ہو گئے تو یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ یہ تو ایک ایڈونچر ہے۔ ایک شوق ہے سب لوگوں کا، میں صرف اپنے بارے میں یہ بات کہہ رہا ہوں۔ ڈاکٹر وسکارٹ، عمران اور ہینی کین ہوسکتا ہے مجھ سے مختلف سوچ رکھتے ہوں۔ لیکن میرے عزیز دوست! اصل مسئلہ یہ ہے کہ ایسے معاملات میں جب بھی کسی نے کسی پر اعتماد کیا اپنی زندگی کھو بیٹھا۔ ہمیں اپنے اپنے گروہوں کے ساتھ مستعد رہنا ہوگا۔ عمران بہت نفیس انسان ہے۔ اس نے کبھی آج تک مجھے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ مجھ سے الگ کوئی شخصیت ہے۔ لیکن ہینی کین اور ڈاکٹر وسکارٹ کے بارے میں آخری بات نہیں کہہ سکتا۔ اعتماد کے راستے اپنے ہاتھوں کو دوسرے کے ہاتھوں میں دے دینا کم از کم ایسے معاملات ہیں۔ دنیا کی سب سے بڑی حماقت ہوتی ہے۔ تم میرے گروہ میں غیر معمولی انسان ہو جس کا تم بارہا ثبوت دے چکے ہو اور یہ ایک حقیقت ہے کہ میں تم پر مکمل اعتماد کرتا ہوں۔ میرے دوست میں تمہیں اپنا دست راست بنانا چاہتا ہوں۔ کیا تم اس حیثیت کو قبول کرو گے اور کیا تم یہ محسوس کرتے ہو کہ میرے لیے تم اپنے دل میں یہ گنجائش نکال لو گے؟''

''کوئی جذباتی بات نہیں کہوں گا۔ آقا نوشیرواں میں بس صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ میری اپنی زندگی کا کوئی اہم مقصد نہیں ہے اور آپ کے ساتھ ایک طویل عرصہ گزار چکا ہوں۔ بہت اچھے ماحول میں بہت اچھا برتاؤ کیا ہے آپ لوگوں نے میرے ساتھ ایسی صورت میں، آپ کی کسی بات سے انحراف میرے لیے کسی بھی طرح نہ ضروری ہے نہ فائدہ مند۔ آپ اطمینان رکھیے۔ میری اپنی زندگی میں ایسا کوئی اہم معاملہ نہیں ہے جس کے لیے آپ سے غداری کرنے پر مجبور ہو جاؤں۔''

''نہیں پلیز۔ ایسے الفاظ بھی نہ کہو، میں بھی آخر دنیا گزار چکا ہوں۔ غداروں کے بارے میں جانتا ہوں کہ وہ کس طرح کے ہوتے ہیں۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم لوگ تین گروہوں کی شکل میں یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں۔ اصولی طور پر لڑکی کو تمہارے ساتھ ہونا چاہیے لیکن میں ایسا نہیں کر رہا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ابھی ہم نے ہینیکین کو بھی دیکھنا ہے۔ لڑکی کو ہم اپنے ساتھ لے کر وہاں پہنچیں گے تم یہاں سے صرف تین افراد کے ساتھ روانہ ہوں گے ان میں ایک ناصری ہے دو اور ایسے آدمی ہیں جو ابھی تک تمہارے سامنے نہیں آئے ہیں۔ خصوصاً تم سے ایک ایسے شخص کا تذکرہ کروں گا جس پر میں تمہاری ہی طرح اعتبار کرتا ہوں۔ وہ شخص ابھی تک تمہارے سامنے نہیں آیا لیکن وہ اتنا اعلا انسان ہے جب تم اس کا ساتھ حاصل کرو گے تو تمہیں بے پناہ خوشی ہوگی۔ یہ تین اجنبی ہیں جن میں ایک احمر ہے۔ دوسرے اس کے دو ساتھی ہیں۔ احمر کے اندر تمہیں سب سے بڑی خوبی یہ نظر آئے گی کہ وہ انسائیکلو پیڈیا ہے یعنی دنیا کے مختلف علاقوں کے بارے میں اتنا کچھ جانتا ہے کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ وہ پڑھا لکھا آدمی ہے، صاحب حیثیت ہے لیکن ایڈونچر پسند ہے۔ نہ ڈاکٹر وسکارٹ اسے جانتا ہے نہ ہینی کین اور نہ عمران۔ میں تمہیں صرف اپنا رازدار بنا رہا ہوں اور اس کی وجہ یہی ہے کہ میں اپنے طور پر بھی ایک بہترین تحفظ چاہتا ہوں۔ جو مجھے نقصان نا پہنچا سکے۔ میں ان میں سے کسی شخص سے بھی کسی بھی طرح انحراف نہیں برتنا چاہتا۔ لیکن اگر ان میں سے کوئی غلط راستوں پر نکل گیا تو پھر تو صورت حال کو دیکھنا ہوگا نا۔''

''میں سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے حیران نگاہوں سے آقا نوشیرواں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ بات واقعی بڑی چالاکی اور ذہانت کی تھی۔ پھر میں نے ان سے پوچھا۔

''یہ احمر کیا مقامی آدمی ہے؟''

''ہاں۔۔۔ بڑا ہی خوش مزاج انسان ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ میں اسے تمہارے بارے میں ساری تفصیل بتا چکا ہوں۔''

''لڑکی کے مسئلے میں آپ کیا کہتے ہیں۔'' میں

نے سوال کیا۔

''وہ انتہائی تحفظ کے ساتھ وہاں پہنچے گی لیکن میں اسے تمہارے ساتھ نہیں بھیجنا چاہتا کچھ ایسے ہی معاملات ہیں۔''

''مجھے اعتراض نہیں ہے ظاہر ہے آپ اس سلسلے میں زیادہ بہتر سمجھ سکتے ہیں آقا نوشیرواں!''

''تو میرے دوست تم مجھے بتاؤ کہ اس سلسلے میں ہمیں مزید کیا کرنا ہے۔''

''یہ تو آپ ہی فیصلہ کریں گے آقا!'' میں نے جواب دیا پھر اچانک ہی مجھے عالی یاد آیا تو میں نے کہا۔

''لیکن آقا! کیا آپ اپنے ساتھ یہاں سے ملازموں کو بھی لے جا رہے ہیں؟''

''پہلے ایک فیصلہ کیا تھا لیکن بعد میں یہ سوچا گیا کہ یہ سب کچھ مناسب نہیں رہے گا جن علاقوں میں ہم جا رہے ہیں وہاں ہمیں خطرناک حالات یقینی طور پر پیش آئیں گے۔ ہم دوسروں کی زندگیاں کیوں خطرے میں ڈالیں؟ چھوٹے موٹے کام ہوں گے۔ ہم دیکھ لیں گے۔ حالانکہ۔۔۔'' آقا نوشیرواں نے اچانک اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس کی پیشانی پر سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ پھر اس نے کہا۔

''بہرحال کوئی خاص بات ہے تمہارے اس سوال میں؟''

''نہیں، اصل میں عالی کو میں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔'' آقا نوشیرواں مجھے دیکھنے لگا پھر بولا۔

''ویسے میں تمہاری کسی بات پر انکار نہیں کروں گا لیکن یقین کرو یہ بالکل غیر مناسب ہوگا کیونکہ ہمیں صورت حال کا جائزہ لینا ہے ہم اس سلسلے میں بالکل غیر مطمئن ہیں۔''

''اگر یہ ممکن نہیں ہے اور یہاں سے دوسرے ملازم بھی نہیں جا رہے تو میں ضد نہیں کروں گا۔''

''یقین کرو۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں عالی بہت اچھا انسان ہے لیکن یہ مہم جس انداز کی ہے اس میں عالی کی گنجائش نہیں نکلتی۔''

بعد میں یہ بات میں نے عالی کو بتائی تو اس نے افسردگی سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''عالی طرب! ایسی کوئی بات نہیں ہے بس ایک لگاؤ ہو گیا تھا آپ سے جس کی بنا پر میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہتا۔ لیکن خیر کوئی خاص بات نہیں ہے کم از کم میری دعائیں آپ کا تحفظ کریں گی۔'' میں نے عالی کو شانہ تھپتھپا کر اللہ حافظ کہا۔

بہرحال آقا نوشیرواں کی یہ پیش کش اور اس کی سنائی ہوئی داستان بڑی عجیب نوعیت کی تھی۔ یہ تبدیلیاں بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں لیکن تھوڑا تھوڑا سا خیال دل میں یہ تھا کہ آقا نوشیرواں بھی چالاک آدمی ہے۔ ڈاکٹر وسکارٹ بہرطور ایک الگ نسل کا شخص ہے اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ مجھے ان جھگڑوں سے نجات مل رہی تھی یعنی محترمہ عزیمہ یا خاتون ایرش بلاوجہ کے جھگڑے گردن میں آن پڑے تھے۔ ناصری کے بارے میں بھی مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس بات کو کیسا محسوس کرے گا۔

آقا نوشیرواں نے بقیہ پروگرام جو مجھے بتایا تھا وہ بڑا عجیب نوعیت کا تھا لیکن بہرحال پھر دوسرے دن میری ملاقات احمر سے کرائی گئی۔ احمر کے ساتھ دو افراد اور بھی تھے۔ بھدی سی شکل وصورت کا یہ شخص ایک نگاہ دیکھنے سے ہی نہایت نفیس انسان معلوم ہوتا تھا اس نے پرجوش انداز میں مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

''آقا نوشیرواں اتنے اچھے انسان ہیں کہ الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا اور اتنا اعتماد ہے مجھے ان کی ذات پر کہ اگر وہ کسی کی تعریف کر دیں تو یقینی طور پر قابل تعریف ہی شخص ہوگا اور آقا نے آپ کی اتنی تعریف کی ہے مسٹر فرزان! کہ میرے دل میں آپ سے ملنے کا بے حد اشتیاق تھا۔'' آقا نوشیرواں نے کہا۔

''اور یہ حقیقت ہے کہ خانان کے سلسلے میں اگر میں احمر کو ایک اشارہ کر دیتا تو شاید خانان کی لاش بھی

کسی کو دستیاب نہ ہو پاتی۔ خانان کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ وہ یہاں سے نکل بھاگا ہے۔ اصل میں جو کچھ اس نے کیا تھا اس کا اسے خود بھی احساس ہوگا چلو چھوڑو، ذرا ذرا سی بات پر کسی کو نقصان پہنچانا بہتر بات نہیں ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اب احمر کا اور تمہارا ساتھ رہے گا۔ احمر تمہیں سفر کے لیے جو ہدایات جاری کی گئی ہیں، ان کی تکمیل جس قدر جلد ہو کرلو۔''

''آپ بالکل فکر نہ کریں آقانو شیرواں! بلکہ میں تو اب یہ چاہتا ہوں کہ آپ فرزان صاحب کو میرے پاس ہی بھیج دیں۔''

''کہیں حالات کچھ ایسے ہیں کہ میں ایک بڑا رسک لے رہا ہوں، لیکن خیر بعض ضرورتوں کے لیے ایسا کیا ہی جاتا ہے۔''

احمر سے خاصی دیر تک ملاقات رہی۔ اس کے بعد کچھ معاملات طے ہوئے اور پھر میں آقانو شیرواں کے ساتھ ہی چل پڑا۔ آقانو شیرواں گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

''بہت سی باتیں ایسی ہوں گی جو تمہارے ذہن میں الجھی ہوں گی فرزان! تم نے بے شک مجھ سے اس کے بارے میں سوالات نہیں کیے۔ مختصراً تمہیں بتائے دیتا ہوں حالانکہ اس وقت تمہارا میرے ساتھ رہنا میری سب سے بڑی ضرورت تھی لیکن جیسا کہ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ بینی کین سے ہماری ملاقات وہیں کورسٹیا میں ہوگی اور اس کے علاوہ بینی کین سے کچھ اشارے بھی ملے ہیں مثلاً یہ کہ ڈارکر وہاں موجود ہے۔ اب ہم اپنا پروگرام تو ملتوی نہیں کر سکتے۔ مگر ڈارکر سے بچ کر ہمیں نکلنا ہے۔ یہ ٹولیاں اس لیے بنادی گئی ہیں کہ اگر کوئی ایک ٹولی کسی طرح ڈارکر کی لگاہوں میں آجائے تو دوسری تمام ٹولیاں اس کے تحفظ کے لیے مستعد رہیں۔ سارے پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلیاں کرنی پڑی ہیں۔ بینی کین کی اس اطلاع کے بعد سمجھ رہے ہو نا تم اور چونکہ وہ لڑکی ایک طرح سے چاروں پارٹیوں کی ملکیت ہے اس لیے میں اپنے کسی حکم کے تحت اسے تمہاری تحویل میں نہیں دے سکتا۔ احمر گویا میرا پہلا دستہ ہے جو وہاں میرے مفادات کا تحفظ کرے گا اور تم اس کے ساتھی ہو گے۔ یہ تبدیلی ایک طرح سے حالات کی ضرورت ہے اور ہم نے اسی لیے یہ تبدیلی کی ہے اگر کوئی اور بات تمہارے ذہن میں ہو؟''

''نہیں آقانو شیرواں! میں بات کو سمجھ گیا۔ تو کیا ہمیں کورسٹیا پہنچ کر بینی کین سے ملاقات کرنا ہوگی؟''

''نہیں یہ ہمارے پہنچنے کے بعد ہوگا۔ پہلے ہم ذرا ٹولیوں میں بیٹھ کر وہاں کا جائزہ لے لیں اس کے بعد صحیح صورت حال کا فیصلہ کیا جا سکے گا۔''

''لڑکی کو آپ سنبھال لیں گے؟'' میں نے سوال کیا

''سب سے مشکل کام یہی ہوگا لیکن بہرحال ہمیں امید ہے کہ ہم لوگ یہ کام کر ڈالیں گے۔''

''باقی مجھے اور کوئی فکر نہیں ہے۔''

پھر ناصری نے رات کو مجھ سے ملاقات کی اور بولا۔

''خدا کا شکر ہے، حالانکہ تمہارا ساتھ میرے لیے بے انتہا اہمیت کا حامل تھا اور میری دلی آرزو تھی کہ میں تمہارے ساتھ سفر کروں لیکن۔۔۔''

''کیا مطلب مسٹر ناصری!''

''یار۔۔۔! وہ بھی ساتھ جا رہی ہے میرا مطلب ہے شمین اور میں اس سے دور رہنا نہیں چاہتا یہ خود اس کی اپنی فرمائش ہے۔''

''کیا وہ اس مہم میں ہمارے ساتھ ہے۔''

''ابھی تک تو میرے علم میں یہی بات ہے عمران اسے اپنے ساتھ لے جائیں گے بھلا وہ یہاں کہاں رہے گی نہ اسے تنہا واپس بھیجا جا سکتا ہے۔ امکانات اسی بات کے ہیں کہ وہ ساتھ ہی ہو اور پھر میں اس کے ساتھ نہ ہوں۔۔۔''

''مگر آقانو شیرواں نے تو مجھ سے کہا تھا۔۔۔''

''بے شک کہا تھا پہلے پروگرام تھا اب پروگرام میں ذرا سی تبدیلی ہو چکی ہے اور شاید تمہیں اس کے

بارے میں اطلاع بھی مل جائے۔ ویسے کورسٹیا میں تو ملاقات ہوگی ہی۔''

''ہاں امکانات تو ہیں اس بات کے۔''

''بہرحال ٹھیک ہے۔''

عالی کو حالانکہ میں نے اللہ حافظ کہہ دیا تھا لیکن ابھی عالی کا اور میرا ساتھ تھا۔ اصل میں مجھے صحیح صورت حال ہی معلوم نہیں تھی۔ آقا نو شیرواں نے بتایا تھا کہ احمر اور ایک اور آدمی ساتھ ہوگا لیکن اب احمر کے ساتھ مزید دو افراد سے ملاقات ہوئی تھی۔ بہرحال یہ آقا نو شیرواں کا معاملہ تھا۔ میں اس پر کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں کرسکتا تھا۔ پھر میں انتظار کرتا رہا۔ ایرش وغیرہ کو شاید اصل پروگرام سے آگاہ نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہی عزیمہ کو اس بارے میں معلومات حاصل تھیں۔ آقا نو شیرواں نے عقل مندی سے کام لیا تھا۔ ویسے جہاں تک میرا خیال تھا آقا نو شیرواں کو یہ اندازہ نہیں ہو چکا تھا کہ ڈاکٹر وسکارٹ مجھے اپنے طور پر لڑکی کی کہانی سنا چکا ہے۔ لیکن آقا نو شیرواں نے خود خدشات ظاہر کیے تھے۔ ڈاکٹر وسکارٹ کے انداز سے ان کی تھوڑی بہت تصدیق ہوتی تھی اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ معاملات واقعی آگے چل کر خاصی سنجیدہ شکل اختیار کر جائیں گے۔

بہرحال اس کے بعد روانگی کا وقت آ گیا۔ پاسپورٹ، ویزا اور دوسرے کاغذات وغیرہ کا انتظام احمر نے کرلیا تھا۔ میں روزانہ کے معمولات کے مطابق ہی آقا نو شیرواں کے حکم پر باہر نکلا تھا لیکن میں یہ جانتا تھا کہ احمر کے پاس پہنچنے کے بعد یہاں میری واپسی نہیں ہوگی بلکہ ہمیں اپنی مہم پر روانہ ہو جانا ہوگا اور بہرحال اس وقت میرے ذہن میں ویسے ہی سنسنی خیز لمحات تھے جسے عموماً اس طرح کے حالات میں پیدا ہو جایا کرتے تھے۔

احمر نے میرا پُرجوش استقبال کیا اور مجھے میری ضروریات کی تمام چیزیں دکھاتے ہوئے کہا۔

''ویسے تو کورسٹیا بھی چھوٹی جگہ نہیں ہے۔ ظاہر ہے جس بڑے ملک کے تحت یہ علاقہ آتا ہے وہ خود بھی معمولی نہیں ہے ہمیں ایڈی لیڈ پہنچنے کے بعد فوراً ہی کورسٹیا روانہ ہو جانا ہوگا اور اگر تمہیں کچھ سامان کی ضرورت پیش آئی بھی تو وہاں پر اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا لیکن پھر بھی اگر یہاں سے کچھ خریدنے کے خواہش مند ہو تو۔۔۔''

''نہیں میری کچھ ضروریات نہیں ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

آخر کار سارے معاملات طے ہوئے اور مجھے ایک طویل ہوائی سفر طے کرنا پڑا میرے ساتھ صرف احمر اور اس کے دو آدمی ہی تھے۔ ہمیں یہ اطلاع بھی دے دی گئی تھی کہ ڈارکران علاقوں میں موجود ہے اور شاید اسے کسی قسم کا کوئی شبہ ہے۔'' دوران سفر میں نے احمر سے پوچھا۔

''احمر! کیا تمہیں اس بات کا علم ہے کہ ڈارکر کس چیز ہے؟'' احمر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔

''آقا نو شیرواں کی اکثر مہمات میں میں ساتھ ہوتا تھا اور اس خطرناک آدمی کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ مسئلہ یہ ہے کہ اس وقت ہمیں جو سفر کرنا ہے وہ ذرا مختلف حالات کے تحت کرنا ہے۔ کورسٹیا پہنچنے کے بعد جب ہم وہاں سے علیحدگی اختیار کریں گے تو ہمیں خاصے خطرناک سفر کی ہدایت دی گئی ہے یعنی ان علاقوں سے مجھے کورنیان پہنچنا ہوگا جن علاقوں کو انتہائی مخدوش سمجھا جاتا ہے۔ اصل میں کچھ ایسے معاملات ہیں جن کا تفصیلی علم تمہیں کورسٹیا جا کر ہوگا۔

''ٹھیک ہے۔''

سفر ختم ہوا اور ہم ایک عجیب و غریب دنیا میں پہنچ گئے۔ ایک جدید ترین ملک کا جدید ترین شہر ایڈی لیڈ۔۔۔ ایڈی لیڈ سے ہمیں ایک پرائیویٹ گاڑی کے ذریعے کورسٹیا کا سفر کرنا تھا۔ یہ پرائیویٹ گاڑی وہاں پر کرائے پر دستیاب ہو جاتی تھی۔ احمر واقعی ایک ذہین آدمی تھا۔ وہ کافی مستعدی سے اپنے سارے کام سرانجام دے رہا تھا۔ ہماری حیثیت بلاشبہ

باتوں جیسی ہی تھی لیکن ہمیں اس بات سے آگاہ کردیا گیا تھا کہ ڈارکر کے آدمی ہمیں چاروں طرف تلاش کررہے ہوں گے چنانچہ ہمیں محتاط رہنا پڑے گا۔ پرائیویٹ گاڑی کے حصول کے بعد ہم لوگوں نے سفر کا آغاز کردیا۔ شروع کا ایک گھنٹہ تو ذرا تجسس میں گزرا اور یہ سوچا گیا کہ ہوسکتا ہے ڈارکر کے آدمی قرب وجوار میں موجود ہوں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہم ان کی نگاہوں میں آگئے ہوں۔ احمر نے اس کے بعد کچھ سرگوشیوں میں بتایا۔

''اصل میں اس آدمی کے یہاں کافی اثر رسوخ ہیں اور زیادہ پریشان کن بات یہ ہے کہ وہ مجھے بھی پہچانتا ہے۔''

''لیکن آقا نوشیرواں اور دوسرے لوگ جب یہاں پہنچیں گے تو ڈارکر ان کے لیے خطرناک نہیں ثابت ہوگا۔''

''آقا نوشیرواں کے ساتھ جن لوگوں کی شمولیت ہے وہ خود بھی ان علاقوں میں خاصا اثر و رسوخ رکھتے ہیں اور یقینی طور پر وہ اپنے لیے مناسب بندوبست کرلیں گے اصل میں مجھے آقا نوشیرواں کی جانب سے جو ہدایت ملی ہے وہ یہ ہے کہ ہم لوگوں کو انتہائی خفیہ طریقوں سے کورسٹیا اور وہاں سے کورنیان کے ابتدائی علاقوں میں پہنچنا ہوگا۔'' احمر نے کہا تو پھر میں نے پوچھا۔

''جن حالات کی تم نشان دہی کررہے تھے وہ کیا ہیں؟''

''میرا خیال ہے اس کے بارے میں ہمیں معلومات حاصل ہوجائیں گی۔''

پھر ہم کافی سفر طے کر کے کورسٹیا پہنچ گئے۔ یہاں کی زندگی بڑی خوب صورت اور سادہ قسم کی تھی۔ قرب وجوار میں بکھرے ہوئے مکانات اور درخت لگتا ہی نہیں تھا کہ کسی بڑے ملک کی ملکیت ہیں۔ اس علاقے میں سادگی کا دور دورہ تھا اور شاید یہاں کی آبادی ایڈی لیڈ کی آبادی کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔ معصوم اور سادہ لوح لوگ یا پھر مقامی فوجی جو جیپوں میں اِدھر اُدھر گردش کرتے پھر رہے تھے۔ قیام کے لیے ایک جگہ حاصل کی گئی اور یہاں آکر ہمیں پتا چلا کہ قرب وجوار کے پہاڑی قبائلیوں نے بغاوت کررکھی تھی۔ وہ اپنے علاقے کی آزادی چاہتے تھے اور اس کے لیے یہاں شدید جدوجہد ہورہی تھی۔ عموماً مقامی پولیس میں اور باغیوں میں جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ چنانچہ یہ سرحدیں کافی مخدوش تھیں۔ میں نے کسی قدر تکدر محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''کیا ایسے عالم میں ان علاقوں کو عبور کر کے دوسری طرف پہنچنا خطرناک نہیں ہوگا؟''

''یقیناً ہوگا۔ میں نے اس سلسلے میں آقا نوشیرواں سے بات کی تھی۔ لیکن ایک اور عجیب مسئلہ ہے اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ اس کے بعد ان علاقوں میں کچھ اس قسم کے واقعات ظہور پذیر ہونے والے ہیں جس میں ہماری یہ مہم شاید چار سے چھ سال تک ملتوی ہوجاتی۔ بڑے صلاح مشورے کے بعد یہ طے کیا گیا ہے کہ اپنے معاملات ہم خود دیکھیں گے۔''

''یہ تو بڑی مخدوش صورت حال ہے۔''

''لیکن پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمارا اصل کام یہی تو ہے اور اس کے لیے ہم یہاں کورسٹیا میں بندوبست کر کے جس قدر جلد ممکن ہوگا یہاں سے آگے نکل جائیں گے۔''

''بقیہ لوگوں سے کہاں ملاقات ہوگی؟''

''کورسٹیا کی سرحد عبور کرنے کے بعد کورنیان کے ابتدائی علاقے میں۔''

''کیا وہاں قبائلیوں کا خوف نہیں ہوگا؟''

''خوف تو ہر جگہ ہوتا ہے میرے دوست! ہمیں انہی حالات کا تو سامنا کرنا ہے۔'' احمر نے کہا۔

میں خاموش ہوگیا بہرحال اپنی ہی اکیلی زندگی کا معاملہ نہیں تھا اور بھی لوگ تھے۔ جب خطرات پیش آئیں گے تو دوسرے لوگوں کی کیفیت بھی مجھ سے مختلف نہیں ہوگی۔ چنانچہ میں نے اپنے آپ کو آزاد چھوڑ دیا۔ البتہ یہ اندازہ مجھے ہوگیا تھا کہ صورت حال کیا ہے اور اس سلسلے میں اپنے تحفظ کا بندوبست بھی

کیا جاسکتا تھا۔ رہ رہ کر اس لڑکی کا خیال آرہا تھا جو مجھ سے بے حد مانوس ہوگئی تھی کیا وہ لوگ اسے قابو میں کرسکیں گے۔ کہیں وہ پھر اسے تشدد کے راستے پر آگے بڑھا کر ذہنی طور پر اسی جگہ نہ لے آئیں۔ جہاں سے میں نے اس کی نئی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ بہرحال سب کچھ بھاڑ میں جائے۔ اب جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔

احمر اپنے دونوں ساتھیوں کو میرے پاس چھوڑ کر کچھ ضروری انتظامات کرنے کے لیے چلا گیا تھا ان لوگوں سے بھی میری اچھی خاصی بے تکلفی ہوگئی تھی۔ دونوں ہی خوش مزاج نوجوان تھے۔ ہم لوگوں نے تھوڑی دور تک سیر و سیاحت بھی کی۔ مجھے سب سے زیادہ حیرت اس بات پر تھی کہ یہ ایک جدید ترین ملک کا ایک شہر یا قصبہ تھا۔ لیکن یہاں کی زندگی میں بڑی عجیب صورت حال ملتی تھی۔ امید نہیں تھی کہ ان جدید علاقوں میں بھی ایسا ماحول ہوگا۔ لیکن بہرحال پھر اس کے بعد احمر واپس آ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے کہا۔

''انتظام تو ہوگیا ہے اور ہم نے جس انداز میں یہ انتظام کیا ہے یقین کرو ڈیئر فرزان! کسی دوسرے کے لیے سخت مشکل ہوجاتا۔ یہاں کے حالات اس قدر سنگین ہیں اس کی صحیح رپورٹ شاید آقا نوشیرواں کو بھی نہیں تھی۔ ورنہ وہ کچھ نہ کچھ سوچتے کچھ انتظام کرتے۔ سرحدوں پر بڑی زبردست چیکنگ ہے۔ باغی گروپوں کے چھاپہ مار حملے فوجی ٹولیوں پر ہوجاتے ہیں۔ اس لیے سرحدیں خاصی ٹائٹ ہیں۔''

''تو پھر کیا ہوگا؟''

''کچھ نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ کام آگے ہی بڑھے گا۔ آقا نوشیرواں میں یہی ایک خوبی ہے کہ جب قدم آگے بڑھا لیتے ہیں تو پیچھے نہیں ہٹتے۔ مجھے ان کے بارے میں اچھی خاصی معلومات حاصل ہیں۔''

''ٹھیک ہے انتظام کیا کیا ہے آگے بڑھنے کا؟''

''ایک ٹرک جو ہمیں یہیں سے پک کرے گا میں نے ساری تیاریاں مکمل کرلی ہیں۔''

بہرحال احمر کا کہنا غلط نہیں تھا۔ شام تقریباً ساڑھے تین یا پونے چار بجے ہوں گے ایک شخص ہمارے پاس پہنچ گیا۔ مقامی آدمی تھا۔ اس نے ہمیں ٹرک کے آنے کی اطلاع دی تھی۔ چنانچہ سب اپنے مختصر سامان کے ساتھ باہر نکل آئے۔ سامنے ٹرک تھا جس کا پچھلا حصہ ترپالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک عمر رسیدہ، سفید فام بیٹھا ہوا تھا۔ میں اور احمر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گئے باقی افراد پچھلے حصے میں چلے گئے۔ ٹرک اسٹارٹ ہوا چل پڑا۔ راستے میں وہ ایک جگہ رکا اور مزید دو آدمی اس کے عقبی حصے میں سوار ہوگئے۔ ہم تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہے تھے اور میں قرب و جوار میں پھیلے کھیتوں اور باغوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ احمر نے کہا۔

''بیٹھے بیٹھے تھک جاؤ تو پیچھے جاکر آرام کرلینا۔ کافی جگہ ہے اس میں۔''

''شکریہ۔'' میں نے کہا لیکن میں نے پیچھے جانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ ویسے بھی ابھی اس قدر تھکن نہیں تھی۔ البتہ ہمیں سفر خاموشی سے طے کرنا پڑ رہا تھا۔

شام کے سائے جھکنے لگے اور پھر آہستہ آہستہ رات کی تاریکیاں پھیلتی چلی گئیں۔ میں نے اپنا ذہن آزاد چھوڑ دیا تھا اب مزید کسی بات کے بارے میں سوچنا حماقت تھی۔ بس صرف اتنا ہی تھا کہ آگے چل کر اگر مشکل حالات پیش آئے تو مجھے اپنی زندگی بچانے کے لیے خود جدوجہد کرنا پڑے گی۔ لیکن اب مجھے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔

رات گہری سے گہری ہوتی چلی گئی پھر ایک جگہ ٹرک روک کر کھانا کھایا گیا۔ ڈرائیور اور پیچھے موجود چار آدمی جن میں سے دو ہمارے اپنے ساتھی تھے اور دو اجنبی سب ہمارے ساتھ ہی کھانے پینے میں

صرف ہو گئے تھے اور اس کے بعد پیچھے بیٹھے ہوئے
آدمیوں میں سے ایک نے آگے آکر ڈرائیونگ
بٹ سنبھال لی تھی۔ احمر نے مجھ سے کہا۔
''میرا خیال ہے فرزان! پیچھے جا کر کچھ وقت
رام کر لو بہتر رہے گا۔'' میں نے سوچا کہ مناسب
ہے کوئی حرج نہیں ہے۔ احمر اگر قابل اطمینان آدمی
ہوتا تو آقا نوشیروان یقینی طور پر میرے ساتھ اسے
بھی نہ بھیجتا اس لیے آرام کر لینے میں کوئی حرج نہیں
ہے۔ میں کچھ وقت کے بعد ٹرک کے پچھلے حصے میں
پہنچ گیا یہاں خاصی جگہ تھی لیکن اب نیند کی اتنی دیوانگی
بھی ذہن پر سوار نہیں تھی کہ یہاں سو جاتا۔ بس
آنکھیں بند کیے ٹرک کے ایک حصے سے ٹکا رہا۔
قرب و جوار میں پہاڑی سلسلے بکھرے ہوئے
تھے۔ جہاں کی صورت حال خاصی مختلف تھی۔ ویسے
بھی ٹرک اب ہموار راستوں پر سفر نہیں کر رہا تھا بلکہ
خاصی اچھل کود ہو رہی تھی۔ غالباً یہ پکی سڑک نہیں
تھی۔ ہاں کبھی کبھی تھوڑی دیر کے لیے یوں محسوس ہوتا
جیسے ٹرک پکی جگہ سفر کر رہا ہو۔
بہر حال خاصا وقت اسی طرح گزر گیا اور اس
کے بعد میں نے ٹرک کو رکتے ہوئے محسوس کیا۔ باقی
لوگ بھی سنبھل گئے تھے۔ ہم نے ترپالوں کی دوسری
طرف دیکھا۔ ٹرک درختوں کے ایک جھنڈ کے پاس
رک گیا تھا اور ڈرائیور اور احمر نیچے اتر آئے تھے۔ میں
اور میرے ساتھی بھی نیچے اتر گئے۔ قرب و جوار میں
تاریکیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ میں نے احمر سے کہا۔
''کیوں خیریت یہاں کیسے رک گئے؟''
''یہ پہاڑی دیواریں دیکھ رہے ہو بس یوں سمجھ
لو ہم تقریباً اپنی منزل پر پہنچ گئے ہیں۔''
''کیا اب باقی وقت یہاں گزارا جائے گا۔''
''نہیں تھوڑا سا جائزہ لیا جا رہا ہے جیسا کہ
تمہیں معلوم ہے نا کہ اس علاقے کو عبور کرتے
ہوئے فوجیوں کی موجودگی بھی ہو سکتی ہے اب ہم یہ تو
بعد ہی میں انہیں یقین دلائیں گے کہ ہمارا تعلق ان
گوریلوں سے نہیں ہے جو حکومت کو رستیا سے جنگ
کر رہے ہیں۔ عموماً فوجی گاڑیاں گزرتی رہتی ہیں۔
ذرا اطمینان کے بعد آگے بڑھیں گے۔''
''اندازہ کیسے ہوگا؟'' میں نے سوال کیا۔
''اندازہ لگایا جا رہا ہے۔'' احمر نے جواب دیا۔
پھر کچھ وقت یہاں گزارنے کے بعد غالباً یہ
اندازہ ہو گیا کہ اس طرف صورت حال نارمل ہے۔
چنانچہ ایک بار پھر ہم سب ٹرک میں بیٹھ گئے اور ٹرک
اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ لیکن اب کافی احتیاط کی
جا رہی تھی۔ ہیڈ لائٹس بند تھیں اور ڈرائیونگ کی رفتار
بے حد سست، ہم ایک راستے سے گزرے پھر
بلندیوں پر چڑھنا پڑا اور اس کے بعد ایک وسیع
میدان جس میں درخت نظر آ رہے تھے، یہ درخت
بے شک رات کے سناٹے اور تاریکی میں ڈوبے
ہوئے تھے۔ لیکن یہ احساس ہو رہا تھا کہ سرسبز اور
پھلوں سے لدے ہوئے ہیں یہاں تک کہ جب صبح
کا اجالا پھوٹنے لگا۔ تب بھی راستہ یہی رہا اور موسم
بے حد حسین نظر آتا رہا۔ پھر کچھ وقت کے بعد مخصوص
طرز کی عمارتیں دھندلی چھاؤں میں ڈوبی نظر آنے
لگیں، یہاں تک کہ ایک پہاڑی ٹیلے کی آڑ میں ٹرک
روک لیا گیا اور احمر نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''اب یہ سفر زیادہ طویل نہیں رہا ہے ہاں اگر
کچھ وقت یہاں رکنا چاہو تو ضرور رکو۔ بڑی بہترین
صورت حال ہے اس علاقے کی۔ موسم بھی شاندار
لیکن بس وہی مسئلہ ہے کہ ذرا خطرہ مول لینا پڑے
گا۔ رپورٹ یہ مل رہی ہے اس جگہ کی کہ کبھی اور کسی
وقت بھی قبائلی حملہ کر دیتے ہیں اور اچھی فضا کو خراب
کر دیتے ہیں۔''
''کیا یہ ٹرک ہمارے ساتھ ہی رہے گا۔'' میں
نے سوال کیا۔ احمر نے مسکراتے ہوئے مجھے آنکھ
ماری پھر قریب آ کر بولا۔
''یوں سمجھ لو کہ صورت حال بڑی عجیب ہے۔
کچھ منصوبے اِدھر سے اُدھر ہو گئے ہیں لیکن خیر فکر کی
بات نہیں ہے۔ ٹرک ہمارے ساتھ ہی رہے گا اس
میں تو ہماری ضرورت کا سارا سامان موجود ہے۔''

''ہوں ویسے یوں محسوس ہو رہا ہے احمر جیسے بہت سے مسئلے ہماری توقع کے خلاف ہوئے ہیں۔''

''نا صرف خلاف بلکہ یوں سمجھ لو کہ جن باتوں کی امید نہیں تھی وہ ہو رہی ہیں لیکن بہر حال ہمیں آسانیاں حاصل ہیں دیکھ لیں گے۔ پریشانی کی بات نہیں ہے میرا اندازہ یہ ہے کہ اگر کچھ وقت سو لیا جائے تو زیادہ بہتر رہے گا۔''

''کھانے پینے کا مسئلہ طے کر لیا جائے اس کے بعد سونے کی کوشش کرتے ہیں۔ ٹرک کے پچھلے حصے میں کافی جگہ ہے بس وہیں اپنے لیے جگہ بنا لوں گا۔ سب سے بہتر رہے گا۔''

میں نے احمر کی بات سے اتفاق کیا تھا باقی لوگ بھی اپنے اپنے طور پر فیصلے کر کے اپنے لیے ٹھکانے تلاش کرنے لگے تھے۔ میں بھی ٹرک کے پچھلے حصے میں چڑھ گیا۔ دن کی روشنی میں اسے آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا۔ ٹرک کے پچھلے حصے میں ڈیزل کے کچھ کین رکھے ہوئے تھے۔ لیکن بعد میں انہیں ٹرک کے ٹینک میں خالی کر کے وہیں پھینک دیا گیا۔ میں سو گیا تھا۔ پھر نجانے کتنی دیر تک سوتا رہا اور اس کے بعد احمر نے ہی مجھے جگایا تھا۔

''کیا خیال ہے چلا جائے؟''

''او ہو بڑی دیر تک سویا میں۔''

''تو باقی لوگ کون سا جاگ رہے تھے۔''

''روانگی ہو رہی ہے؟''

''ہاں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔

ٹرک پھر اسٹارٹ ہو کر چل پڑا تھا۔ نیند پوری ہو چکی تھی۔ اس لیے اب سبھی خوش نظر آ رہے تھے اور آپس میں گپیں لگا رہے تھے۔ اس وقت احمر بھی ٹرک کے پچھلے حصے میں میرے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''اب ہمیں مزید کتنا سفر طے کرنا ہوگا؟''

''رات بھر سفر کریں گے اور پھر دن میں گیارہ بجے تک۔ اس کے بعد قیام کیا جائے گا اس کے بعد رات کو بارہ بجے ہم اپنی منزل پر پہنچیں گے میرا مطلب ہے کورسٹیا کی دوسری سرحد۔''

''کیا تم پہلے بھی اس راستے پر آ چکے ہو احمر؟''

''نہیں۔''

''تو اتنا سفر میرا مطلب ہے اتنا صحیح راستہ کیسے اختیار کیا گیا۔''

''ڈارکن اس راستے کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہے اور اکثر ادھر آتا رہتا ہے۔'' احمر نے کہا۔

''ڈارکن کون؟''

''وہ ڈرائیور۔''

''اپنا آدمی ہے۔''

''خریدا گیا ہے۔'' احمر نے جواب دیا اور میں نے گردن ہلا دی۔ پھر اس کے بعد کچھ پوچھنے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔

سفر جاری رہا۔ رات ہو گئی۔ آسمان پر چاند نکل آیا اور ماحول میں ایک خوب صورت کیفیت پیدا ہو گئی۔ چاند بادلوں کی اوٹ میں آتا تو اطراف میں بکھری ہوئی چٹانیں سیاہ کمبل اوڑھے ہوئے بھوتوں کی شکل اختیار کر لیتیں۔ پھر جب چاند نکلتا تو یہ بھوت روپ بدل لیتے اور اس کے بعد روشنی کی کرنیں بھوتوں کے اس کھیل کو ختم کر دیتیں۔ تا حد نظر پھول، درخت اور سرسبز راستے بکھرے ہوئے تھے۔ وسیع و عریض پہاڑی ٹیلے دور دور تک بکھرے ہوئے نظر آتے تھے۔ اس حسین ماحول میں رات کا یہ سفر ختم ہوا اور دن کو ایک بجے ٹرک روک دیا گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا پہاڑی سلسلہ تھا اور جگہ جگہ جنگل بکھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ یہاں پہنچ کر وہ خاص بات کے بارے میں سوچ رہے ہوں۔ احمر نے کہا۔

''یہ سفر کا سب سے خطرناک مرحلہ ہے، ہم اگر اس مرحلے کو عبور کر جائیں تو سمجھ لو کہ مشکلات سے دور ہو جائیں گے۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور اس کے بعد انتظار کرتے رہے۔ کوئی ایک گھنٹے کا سفر طے کرنے

ے بعد آخر کار ہم ایک درے میں داخل ہو گئے جو
ا ہموار تھا۔ ٹرک بری طرح اچھل رہا تھا اور ڈرائیونگ
کرنے والے کو اسٹیئرنگ سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔
اچانک ہی دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں
سنائی دیں اور ڈرائیور نے گھبرا کر بریک لگا دیئے۔
''کیا بات ہے؟'' احمر نے پوچھا۔
''خطرہ۔'' ڈرائیور نے خوف زدہ لہجے میں
کہا۔
''کیا مطلب؟''
''ک۔۔۔ کک۔۔۔ کتوں کی آوازیں سن
رہے ہو۔'' اس کی سہمی ہوئی آواز ابھری۔
''انجن بند کر دو۔'' احمر نے جیسے ساری صورت
حال کو سمجھ لیا تھا۔ ڈرائیور نے جلدی سے سوئچ آف
کر دیا۔ اس کے بعد مکمل خاموشی چھا گئی۔ دس منٹ
تک سب اسی طرح کھڑے آہٹیں لیتے رہے۔ پھر
احمر نے کہا۔
''ٹرک اسٹارٹ کر کے بائیں سمت بڑھاؤ۔''
کتوں کی آوازیں بند ہو گئی تھیں لیکن احمر شاید کچھ اور
سمجھ رہا تھا۔ اس نے ڈرائیور سے کہا۔
''درے سے باہر نکلتے ہی رخ بدل لینا راستہ
کسی بھی سمت نظر آئے مگر سیدھے نہیں چلنا ہے۔ سمجھ
رہے ہو نا۔''
''یس سر!'' ڈارکن نے جواب دیا۔
لیکن مشکل سے مزید دس منٹ آگے بڑھے
ہوں گے کہ کتوں کی آوازیں پھر سنائی دیں اور
ڈرائیور نے جلدی سے انجن دوبارہ بند کر دیا۔ تھوڑی
دیر تک انتظار کیا گیا لیکن اب آوازیں مسلسل سنائی
دے رہی تھیں۔ احمر نے ٹرک کے پچھلے حصے سے دو
اسٹین گنیں نکالیں اور اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف
بڑھاتے ہوئے بولا۔
''تم لوگ دونوں سمتوں میں ہوشیار ہو جاؤ میں
آگے جا رہا ہوں۔'' پھر اس نے مجھ سے کہا۔
''اور یہ پستول تم بھی رکھ لو اور آؤ میرے پاس
بیٹھ جاؤ۔''

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ بدن میں
سنسنی دوڑ رہی تھی اور اندر سے یہ احساس ابھر رہا تھا
کہ اب کوئی زبردست خطرہ پیش آنے والا ہے۔
ڈارکن کو بھی ٹرک کے پچھلے حصے پر بھیج دیا گیا تھا۔ پتا
نہیں یہ شخص کیا چیز تھا۔ ویسے جس طرح یہ ہم لوگوں
کے ساتھ تعاون کر رہا تھا اس سے تو یہ احساس ہوتا تھا
کہ یہ ہر طرح کے خطرات میں ہمارا ساتھ دینے کے
لیے تیار ہے۔
بہر حال ٹرک سست رفتاری سے آگے بڑھ رہا
تھا اور احمر بڑی ہوشیاری سے اسے سنبھالے ہوئے
تھا۔ درہ کافی طویل تھا اور اس کے دوسرے سرے
کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں ہونے پا رہا تھا۔ پھر
دفعتاً پہاڑوں میں کچھ آہٹیں ابھریں، پتھروں کے
لڑھکنے کی آوازیں سنائی دیں اور اس کے ساتھ ہی
کتوں کی زور زور سے بھونکنے کی آوازیں بھی۔ پھر
اچانک ہی کچھ سر ہمارے بائیں سمت نظر آئے اور
احمر کے حلق سے غرائی ہوئی آواز نکلی۔
''لعنت ہے یار! وہ پہنچ گئے۔'' پھر اس نے
پھرتی سے ٹرک روکا اور چیخ کر بولا۔
''کودو نیچے کود جاؤ جلدی۔'' اور پھر خود بھی وہ
دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا تھا۔ پچھلے حصے میں بیٹھے
ہوئے تمام آدمی نیچے کود گئے۔ احمر کے اشارے پر ہم
پھرتی سے دوڑ دوڑ کر چٹانوں کی آڑ لینے کی کوشش
کرنے لگے۔ لیکن کتوں کا مسئلہ سب سے ٹیڑھا تھا۔
ان کی آوازیں اب طوفانی ہوتی جا رہی تھیں۔
چھوٹے چھوٹے پتھر بھی لڑھک رہے تھے اور صورت
حال سمجھ میں آ رہی تھی۔ غالباً وہ جو کوئی بھی تھے انہوں
نے ہماری تلاش کے لیے یا ہم پر حملہ کرنے کے لیے
کتے چھوڑ دیئے تھے۔ ایک بار پھر احمر کی آواز
ابھری۔
''بھاگو۔۔۔ اس کے ساتھ ہی وہ خود بھی اس
چٹان کے عقب سے نکل بھاگا تھا۔ جیسے ہی ہم نے
چٹان کی پناہ چھوڑی اچانک ہی فائرنگ شروع
ہو گئی۔ ہمیں دیکھ لیا گیا تھا اور اب گولیاں ہمارے

دائیں بائیں سے نکل رہی تھیں۔ دفعتاً دلدوز چیخ لہرائی اور بھاگنے والوں میں سے ایک کم ہوگیا۔ لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ وہ کون تھا۔ اندازہ لگانے کی نوبت ہی نہیں آرہی تھی۔ صاف پتا چل گیا تھا کہ کتے ہمارے پیچھے آرہے ہیں۔ اس وقت کسی کو یہ فرصت نہیں تھی کہ وہ اندازہ لگائے کہ کون کسی طرف دوڑ رہا ہے۔ اچانک ہی احمر نے پلٹ کر فائرنگ شروع کردی اور ایک خوں خوار شکاری کتا جو ہمارے سروں پر پہنچ گیا تھا۔ قلابازی کھا کر نیچے گر پڑا۔ لیکن عقب میں کتے اور بھی تھے اور اب ہمارے بالکل قریب پہنچ گئے تھے۔ اب کتے نے بائیں سمت سے مجھ پر چھلانگ لگائی تو میں نے بھی فائر کردیا۔ گولی نشانے پر لگی لیکن اسی وقت دوسرے کتے نے احمر کے شانے کو دبوچ لیا تھا۔ وہ احمر کو دبوچے ہوئے زمین پر گر پڑا۔ ہمارا تیسرا ساتھی آگے بڑھ گیا تھا۔ میں اس صورت حال سے واقف ہونے کے بعد آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ پستول سیدھا کیے ہوئے میں ان دونوں کے سروں پر پہنچ گیا۔ احمر خوں خوار کتے سے بچنے کے لیے اسے پوری قوت سے پیچھے دھکیل رہا تھا اس کی اسٹین گن گر چکی تھی اور کتے نے اس کے شانے میں دانت گاڑ دیئے تھے۔ دونوں میں شدید کشمکش ہورہی تھی۔ میں نے بالکل قریب پہنچ کر کتے کی ایک ٹانگ پکڑی اور اسے پوری قوت سے گھسیٹا اس کے ساتھ ہی میں نے پستول کی نال اس کے حلق پر رکھ کر ٹریگر دبادیا۔ کتا ایک خوف ناک غراہٹ کے ساتھ اچھلا اور احمر اس کی گرفت سے آزاد ہوگیا۔ فائرنگ کا رخ اب ہماری طرف تھا اور گولیاں ہمارے آس پاس چٹانوں کو ادھیڑ رہی تھیں۔

''ادھر اس طرف۔'' احمر نے بائیں سمت اشارہ کیا۔ ہم درے کی پہاڑی دیوار کے بالکل قریب آگئے تھے۔ اس دیوار میں ایک رخنہ نظر آرہا تھا جو بلندی کی طرف چلا گیا تھا۔

''اوپر۔۔۔ اوپر۔۔۔'' احمر کی کرب میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔

''آؤ احمر! فکر مت کرو۔'' میں نے اسے سہارا دیا اور ہم دونوں تیز رفتاری سے اوپر چڑھنے لگے۔ چھوٹے چھوٹے پتھر ہمارے پیروں تلے آکر لڑھک رہے تھے اور توازن قائم رکھنا مشکل ہورہا تھا۔ لیکن جس طرح بھی بن پڑا ہم اوپر چڑھتے رہے۔ ایک عجیب سی سنسناہٹ کانوں میں ابھری تھی۔ نجانے کیسی آواز تھی لیکن دور سے آتی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔ اچانک ہی احمر نے کہا۔

''مائی ڈیئر فرزان! میرا خیال ہے میں مشکل کا شکار ہوگیا ہوں۔ اس وقت تم اپنی جان بچانے کی کوشش کرو۔''

''کیا فضول باتیں کررہے ہو احمر! چلتے رہو فکر مت کرو، موت زندگی کا کھیل میرے لیے اجنبی نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔''

''چلتے رہو۔۔۔ چلتے رہو۔'' میں نے کہا اور احمر اوپر گھسٹنے لگا۔ یہ جان لیوا چڑھائی نجانے کتنی دیر میں مکمل ہوئی تھی۔ گولیوں کی آوازیں ابھی ابھر رہی تھیں۔ ہمارے ساتھیوں کا نجانے کیا حشر ہوا تھا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ پتا نہیں وہ شخص جو گولی کا شکار ہوا تھا کون تھا۔ ڈارکن کے ساتھیوں میں سے کوئی یا ہمارا ساتھی۔ لیکن بہرحال اس وقت اپنی زندگی بچانا سب سے اہم مسئلہ تھا۔ درّے کی دیواریں ہمیں گولیوں سے محفوظ رکھے ہوئے تھیں اور ہم بلندیوں کی جانب بڑھتے چلے جارہے تھے۔ اوپر تیز ہوائیں سفر کررہی تھیں پھر اتنی دیر تک پتھروں پر سفر کرنے کے باوجود ہمیں کوئی خاص تھکن محسوس نہیں ہوئی تھی۔ احمر کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ لیکن بہرحال میں مستعد تھا یا پھر یہ میری فطرت تھی کہ خطرات میں گھرنے کے بعد شخصیت میں سے کوئی اور شخصیت ابھر آتی تھی۔

میں نے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں۔ چٹانوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا لیکن وہ سنسناہٹ کانوں میں گونج رہی تھی۔ وہ کوئی دھوکا نہیں تھا۔ احمر کی آواز

ایک بار پھر ابھری۔

''مائی ڈیئر فرزان! ایک درخواست کر رہا ہوں پوری کرو۔ یہ وقت ضد کرنے کا نہیں ہے تم مجھے اسی جگہ چھوڑو یہاں سے نکل جاؤ۔ یہ ضروری ہے ورنہ میرے ساتھ تم بھی پھنس جاؤ گے۔''

''احمر! مجھ سے وہ نہ کہو جو میں نہیں کر سکتا، سمجھ رہے ہو نا تم بالکل فکر مت کرو۔''

''میری بات مان لو یار! تمہارا احسان ہوگا، میں بہت زخمی ہو گیا ہوں۔ تم سمجھ نہیں پا رہے کتے نے میرا بازو ہی نہیں سینہ بھی ادھیڑ دیا ہے۔''

''فکر مت کرو۔ آؤ یہ جگہ چھوڑ دیں۔ انہیں ہمارے نشانات نہیں ملنے چاہئیں۔'' میں نے احمر کے بدن کا سارا بوجھ اپنے آپ پر سنبھالا اور ایک ایک قدم آگے بڑھنے لگا۔ احمر کے حلق سے اب کراہیں نکل رہی تھیں۔ اس نے پورا وزن مجھ پر ڈال دیا تھا۔ جس طرح بھی بن پڑ رہا تھا میں اسے سنبھالے ہوئے تھا۔ ایک جگہ پاؤں پتھر پر پڑا تو پتھر نے جگہ چھوڑ دی اور لڑھکتا ہوا گہرائیوں میں جانے لگا۔ میں نے خود کو سنبھال لیا تھا۔۔۔ لیکن پتھر کے گرنے سے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ دوسری طرف بہت زیادہ گہرائی ہے۔

شدید ہنگامی صورت حال تھی۔ ایک طرف احمر کی کیفیت خراب ہو رہی تھی دوسری طرف گولیاں بارش کی طرح برس رہی تھیں۔ یہ بات بالکل سامنے آ چکی تھی کہ وہ لوگ جنہوں نے ہم پر فائرنگ شروع کر رکھی تھی پوری طرح ہم پر نگاہیں جمائے ہوئے ہیں اور ہم ان کی صحیح سمت کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ پتا نہیں کون ہیں وہ۔ قبائلی جن کی داستان سنی تھی یا پھر۔۔۔ لیکن آگے سوچنے کا موقع نہیں مل سکا۔ اس بار غالباً تاک کر ہم پر نشانات لگائے گئے تھے۔ احمر خود کو سنبھال ہی رہا تھا کہ اس کی پشت میں لاتعداد گولیاں پیوست ہو گئیں۔ اس نے ایک ہلکی سی آواز نکالی اور زور سے مجھے دھکا دے دیا۔ مقصد غالباً یہ تھا کہ میں گولیوں کی زد میں نہ آؤں۔ لیکن اسے یہ بات معلوم نہیں تھی کہ دوسری طرف گہرائی ہے میرے پاؤں اپنی جگہ سے اکھڑ گئے اور میں ان گہرائیوں میں گرنے لگا۔ ایک لمحے کے لیے میرے ہوش و حواس خراب ہونے لگے، مارا گیا۔۔۔ احمر تو اوپر ہی رہ گیا تھا اور میں نیچے گر رہا تھا۔ تیز ہواؤں کا شور کان پھاڑے دے رہا تھا اور میں کسی بے جان پتھر کی طرح نیچے گر رہا تھا۔ لیکن ایسا ہوتا ہے۔۔۔ بالکل ایسا ہی ہوتا ہے۔ تقدیر جب زندگی بخشتی ہے تو پھر ایسی ہی کہانیاں سامنے آتی ہیں۔ نیچے گرا تو یوں محسوس ہوا جیسے زمین کی گہرائیاں نرم ہو گئی ہوں، پانی کا چھپاکا سنائی دیا تھا اور میں پانی میں بیٹھتا چلا گیا تھا۔ پھر یوں محسوس ہوا تھا جیسے بدن برق رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ اندازہ لگانے میں وقت نہیں ہوئی کہ سنسناہٹ کی جو آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ وہ کسی تیز رفتار ندی کی تھی جو اس بلند بالا پہاڑی کے دامن میں تھی۔ میں ندی میں ہی گرا تھا۔ چند لمحوں تک تو ہوش و حواس قائم نہ رہ سکے۔ لیکن اس کے بعد احساسات جاگے۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور پانی کے بہاؤ کے مخالف سمت میں تیرنے لگا۔ کنارے کا رخ اندازے کی بنا پر ہی کیا تھا ورنہ آنکھوں میں پانی بھر گیا تھا اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ خاصی مشکل سے کنارے تک پہنچا اور آخر کار خشک زمین پر آ گیا۔

چند لمحات اسی طرح زمین پر چت لیٹا رہا۔ احمر میرے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔ جس صورت حال سے گزرا تھا۔ اس کے بعد احمر کی زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ میرا ساتھ چھوڑ گیا تھا اور میری جان بچ گئی تھی۔ آہستہ آہستہ میری نگاہیں داہنی سمت کی ڈھلوان پہاڑیوں پر پڑیں اور اس کے بعد میں اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ سورج کی کرنیں بدن کو چھو رہی تھیں۔ فضا میں پرندے اڑ رہے تھے۔ بمشکل تمام اپنی جگہ سے اٹھا اور خود کو سنبھال کر وہاں سے آگے بڑھنے لگا۔ خطرے کو نظر انداز کر دینا مناسب نہیں تھا۔ تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ اچانک کوئی متحرک چیز نظر آئی اور میں ایک دم

ٹھٹک گیا۔ آنکھوں کو بھینچ بھینچ کر صاف کرنے کی کوشش کی پھر اس شے کو دیکھا لیکن بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ آہستہ آہستہ تمام منظر آنکھوں کے سامنے واضح ہوگیا، کوئی انسانی جسم تھا جو سوکھی لکڑیوں کا ایک گٹھا اٹھائے آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ اندازہ تو ہوگیا کہ وہ کوئی غلط چیز نہیں ہے۔ اس وقت سخت مدد کی ضرورت تھی۔ پتا نہیں یہ حالات آگے چل کر کیا ہوں۔ چنانچہ میں نے تیز تیز قدم اٹھائے اور تقریباً دوڑنے کے سے انداز میں آگے بڑھتا ہوا اس متحرک وجود کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے گردن گھما کر مجھے دیکھا وہ عمر رسیدہ عورت تھی۔ مقامی لباس میں ملبوس لکڑیوں کا گٹھا سر پر اٹھائے ہوئے لیکن یہاں بھی ایسا ہوتا ہے۔ یہ تو جدید ترین ممالک تھے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ روشنیوں کے پیچھے کیا ہوتا ہے۔ وہ لکڑیاں بین کرلے جارہی تھی۔ میرے قدموں کی آہٹ پر رکی اور میری جانب دیکھنے لگی۔ میں اسے دیکھ رہا تھا اور وہ مجھے۔۔۔ اس کے چہرے پر تشویش کے آثار ابھرے پھر اس نے مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور میں نے گردن ہلادی۔ بوڑھی عورت آگے بڑھنے لگی لکڑیوں کا بوجھ بہت زیادہ تھا۔ اچانک میں نے آگے بڑھ کر اس سے کہا۔

''لاؤ یہ لکڑیاں مجھے دے دو یہ تمہاری ہمت سے زیادہ ہیں۔''

وہ کچھ سمجھ نہ پائی پھر جب میں نے دونوں ہاتھ آگے کیے اور لکڑیوں کی طرف اشارہ کیا تو اس نے مسکراتے ہوئے گردن ہلادی، جیسے کہہ رہی ہو کہ اپنا بوجھ وہ خود ہی اٹھانے کی عادی ہے۔ پھر بہرحال میں اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا اور تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے بانسوں کے جھنڈ دیکھے جنہیں عبور کرنے کے بعد دوسری طرف سرسبز کھیت پھیلے ہوئے نظر آرہے تھے اور کھیتوں کے دوسری طرف ایک بستی نظر آرہی تھی۔

آبادی کا اندازہ تو اس عورت کو دیکھ کر ہی ہوگیا تھا۔ بستی کا فاصلہ کافی تھا اور مجھے اس تک پہنچنے سے پہلے دور سے اس کا جائزہ لینے کا موقع مل گیا تھا۔ ماحول جانا پہچانا تھا۔ مسائل ہر جگہ یکساں ہوتے ہیں۔ جدید ترین ممالک میں وہی تمام رخ ملتے ہیں جو ترقی یافتہ ممالک میں نظر آتے ہیں۔ چراغ تلے اندھیرا ہوتا ہے، جہاں دولت کی روشنی ہوتی ہے وہاں انسان چمکتے دمکتے نظر آتے ہیں اور جہاں غربت کے اندھیرے ہوتے ہیں وہاں کا ماحول ایسا ہی ہوتا ہے۔

بستی قریب آگئی۔ شکلیں بدلی ہوئی تھیں انداز شناسا تھا۔ کچی پکی زمین کچے پکے مکانات، کپڑا اور گندگی کے ڈھیر، خوراک کی تلاش میں سرگرداں بھیڑ بکریاں، کوڑے کے انبار، کریدتی ہوئی مرغیاں۔ بوڑھی عورت ایک خستہ حال گھر کے دروازے پر رک گئی۔ سوکھی لکڑیوں کا گٹھا اس نے زمین پر رکھا۔ پھر اس نے دروازہ بجایا۔ ایک بوڑھے آدمی نے دروازہ کھولا تھا۔ پھر لکڑیوں کو رکھنے کے بعد اس نے مجھے دیکھا اور کسی نامانوس زبان میں عورت سے کوئی سوال کیا۔ جواب میں عورت نے بھی اسے جواب دیا۔ بوڑھے نے گہری نگاہوں سے میری جانب دیکھا پھر جھک کر عورت کے ساتھ لکڑیوں کا گٹھا اٹھایا اور دونوں اسے پکڑ کر اندر لے گئے۔ بوڑھی عورت نے نجانے کیوں اپنا بوجھ۔۔۔ اٹھانے کے لیے میرا سہارا نہیں لیا تھا۔ ہوسکتا ہے یہ ان لوگوں کی کوئی روایت ہو اور ہوسکتا ہے بوڑھی نے مجھے اپنا مہمان تصور کیا ہو۔ رسم و رواج اور روایات ہر جگہ اپنا ایک الگ حساب رکھتے ہیں۔ بہرحال جس صورت حال سے گزر رہا تھا۔ اس میں ان لوگوں کا سہارا قبول کرنے میں کوئی دقت نہیں محسوس کررہا تھا۔ بلکہ ضرورت تھی کہ تھوڑا سا موقع ملے سوچنے کے لیے۔

یہ چھوٹا سا مکان، باہر سے جتنا چھوٹا لگ رہا تھا اندر سے اتنا چھوٹا نہیں تھا۔ بوڑھی عورت نے اپنے کام سے فارغ ہونے کے بعد مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میں اس چارپائی پر بیٹھ گیا جس کا انداز ذرا مختلف تھا۔ بوڑھی عورت جھونپڑی کے دوسرے حصے میں

چلی گئی تھی اور اس کا بوڑھا ساتھی مجھ سے تھوڑے فاصلے پر ایک اسٹول پر بیٹھ کر مجھے دیکھنے لگا تھا۔ میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''معزز بزرگ! تمہاری اس مہمان نوازی کا بے حد شکریہ۔ میں اس وقت تمہارے احسان کا بدلہ نہیں اتار سکتا۔''

بوڑھا خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں اندازے لگا رہا تھا کہ اس کے اور عورت کے درمیان کیا رشتہ ہے۔ لیکن مشکل ہی ثابت ہوا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد بوڑھی عورت اندر آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں برتن تھے۔ چائے کے ساتھ گیہوں کی روٹی اور کھیرے کے کٹے ہوئے ٹکڑے تھے۔ کھانا سامنے آیا تو بدن میں تازگی دوڑ گئی۔ میں نے یہ چیزیں قبول کرلیں۔ بھوک کا اندازہ اب ہوا تھا۔ کچھ ہی لمحوں میں، میں نے سب کچھ صاف کرلیا۔ پیٹ بھرا تو ذہن نے بھی کام کرنا شروع کردیا اور بھولے بھالے میزبانوں کا بس اتنا ہی احسان کافی تھا کہ انہوں نے زندگی کی ایک اہم ضرورت پوری کردی تھی۔ اس سے زیادہ انہیں تکلیف دینا میرا خیال ہے مناسب نہیں تھا کیونکہ میں محسوس کررہا تھا کہ وہ خود بھی انتہائی غریب ہیں۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے پھر ان لوگوں سے گفتگو کرکے یہاں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن زبان کا مسئلہ۔۔۔ نہ وہ میری زبان سمجھ سکتے تھے اور نہ میں ان کی۔ میں نے کھڑے ہوکر ان سے واپسی کی اجازت مانگی اور دونوں مجھے رخصت کرنے کے لیے تیار ہوگئے۔

میں باہر نکل آیا۔ بے مقصد ہی۔ بڑی عجیب و غریب کیفیت کا شکار ہوگیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ بہرحال میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر تک سفر کرتا رہا۔ آبادی اب پیچھے رہ گئی تھی اور اس سے آگے ایک چٹانی میدان پھیلا ہوا تھا، میں اس چٹانی میدان میں کافی دور تک آگے نکل آیا اور پھر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ کوئی فیصلہ نہیں کرپا رہا تھا کہ اب کیا کروں۔ وہ لوگ جن میں احمر بھی تھا بچھڑ گئے تھے اور صورت حال میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ یہاں کا ماحول بھی خطرناک تھا۔ یہ بات زیادہ مشکل کا باعث تھی کہ کورسٹیا کے اطراف کے باغی جنگ وجدل میں مصروف تھے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے بھی ان لوگوں میں شمار کرلیا جائے۔ بچنے کے امکانات بھی ختم ہوجائیں گے۔ ویسے آقا نوشیرواں نے غلط منصوبہ بندی کی تھی ایک طرف سے اس نے مجھ پر مکمل طور پر اعتماد بھی کیا تھا اور دوسری طرف اپنے طور پر یہ فیصلہ بھی کرلیا تھا کہ طریقہ کار کیا ہونا چاہیے۔ حالانکہ آقا نوشیرواں کی شخصیت بری نہیں تھی۔ لیکن بہرحال انسان کے کچھ ذاتی معاملات بھی ہوا کرتے تھے۔ مجھے اس لڑکی کا نگراں بنا دیا گیا تھا۔ لیکن اس کے بعد ان لوگوں نے خود اسے اپنی تحویل میں لے لیا تھا اور مجھے اس سے کافی فاصلے پر بھیج دیا تھا۔ یہ ذرا کچھ عجیب سی بات تھی۔

بہت دیر اسی طرح گزر گئی اور میں کوئی فیصلہ کرنے میں ناکام رہا، ان لوگوں سے جدا ہوئے بھی کافی وقت گزر گیا تھا اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ اب حالات نجانے کیا رخ اختیار کرگئے ہوں۔ وہ کس طرح مجھے تلاش کرکے دوبارہ میرے پاس پہنچ سکتے ہیں۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ کچھ عجیب سی تھکن محسوس ہوئی اور میں آنکھیں بند کرکے لیٹ گیا اور اس کے بعد نیند اس طرح آئی کہ مجھے خود بھی اس پر حیرت ہوئی تھی اور یہ بھی اندازہ نہیں ہوسکا تھا کہ کتنی دیر تک سوتا رہا ہوں۔

آنکھ کھلی تو چاروں طرف ہیبت ناک تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ رات ہوگئی تھی اور تاحد نظر تاریکی اور سناٹے کا راج تھا۔ کوئی آہٹ ہوتی تو دل دہشت سے دھڑک اٹھتا۔ ہوائیں سرسراتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ اپنے حال پر ہنسی آگئی۔ یہ کوئی ایسی بات تو نہیں ہے جس کے لیے میں اس قدر خوف زدہ ہوجاؤں، زندگی میں نجانے کیسے کیسے عذاب

برداشت کیے تھے۔ بس ہمیشہ کوئی نہ کوئی مشکل ہی پیش آتی رہتی تھی۔ پھر بلاوجہ اپنے آپ کو اس قدر خوف کا شکار کیوں کیے ہوئے ہوں۔ اپنے لیے اب خود راستہ تلاش کرنا ہوگا۔ جیسا کہ پہلے کرتا رہا ہوں، ہر طرح کے حالات کا سامنا کرنا ہوگا۔ دیکھ لوں گا جو بھی کچھ ہوگا اور اس کے بعد بقیہ رات میں نے سوچوں میں ہی گزاری۔

پھر جب سورج کی کرنیں آسمان سے زمین کی جانب سفر کرنے لگیں تو میں نے خود بھی قدم آگے بڑھا دیئے۔ جو کچھ کھایا پیا تھا وہ ختم ہو چکا تھا اور اب بھوک لگنے لگی تھی لیکن اس کو رفع کرنے کا کوئی طریقہ ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ قدرت نے انسان کو کبھی بھوکا نہیں چھوڑا۔ زیادہ آگے نہیں بڑھا تھا کہ کچھ سبزہ نظر آیا۔ لمبی لمبی بیلیں پھیلی ہوئی تھیں اور اس میں ایک عجیب سا پھل نظر آ رہا تھا۔ شناسا نہیں تھا لیکن اندازہ ہو رہا تھا کہ کھایا جا سکتا ہے اور واقعی کیا لطف آیا اس پھل کو کھانے میں جس میں پانی بھی تھا اور مٹھاس بھی۔ پھر وہاں سے بھی آگے بڑھ گیا البتہ کچھ پھل احتیاطاً توڑ کر ساتھ رکھ لیے تھے۔

دن بھر سفر کرتا رہا اور شام کی جھلکتی ہوئی کلاہٹوں میں ایک بستی دیکھی۔ میرے قدموں کی رفتار تیز ہوگئی، پُررونق بستی نظر آ رہی تھی۔ جس میں زندگی رواں دواں تھی۔ گائے، بھیڑ، بکریاں اس کے اطراف میں چر رہی تھیں۔ آگے بڑھا تو کچھ بازار جیسی چیز نظر آئی۔ یقینی طور پر یہاں کھانے پینے کی اشیا موجود ہوں گی۔ لیکن جیب خالی تھی۔ یہاں بھی کسی ایسے مہربان کو تلاش کرنے لگا جو کم از کم زبان ہی سمجھ سکتے۔ لیکن اس سلسلے میں تقدیر نے ساتھ نہیں دیا۔

پھر اچانک ہی میری نظر کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر پڑی اور دل خوشی سے اچھل پڑا۔ میں نے گھڑی اتاری اور اسے دیکھا، چل رہی تھی اور بالکل ٹھیک حالت میں تھی۔ گھڑی کو ہاتھ میں لیے ہوئے آگے بڑھ گیا اور پھر ایک دکان دار کے سامنے میں نے گھڑی پیش کر دی، اس نے حیرت سے مجھے دیکھا پھر گھڑی کو۔ گھڑی کی خوب صورتی نے اسے متوجہ کر لیا تھا۔ اس نے اسے ہاتھ میں لے کر دیکھا پھر مجھے اور پھر اپنی زبان میں کچھ سوال کیا۔ جس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ لیکن اشاروں کی زبان دنیا کے ہر خطے میں سمجھی جاتی ہے۔ دکان دار نے کچھ کرنسی نکال کر میرے سامنے کی تو میں نے اسے اپنی مٹھی میں جکڑ لیا۔ جب کسی چیز کو فروخت کرنا ہی ہے تو قیمت کیا دیکھنی۔ برے وقت میں اس گھڑی نے میرا ساتھ دیا تھا۔ جب ہاتھ میں مقامی کرنسی آ گئی تو پھر میں کسی ایسی جگہ کی تلاش کے علاوہ اور کیا کام کیا جا سکتا تھا جہاں کھانا مل سکے۔ چنانچہ ایک چھوٹے سے ہوٹل پر پہنچ گیا اور وہاں اشارے ہی سے کھانا طلب کر لیا، سادے چاول اور ایک خاص قسم کی سبزی نے وہ لطف دیا جو بیان سے باہر ہے، کھانا کھا کر طبیعت سیر ہوئی تو رات گزارنے کے لیے ایک سایہ دار درخت کا انتخاب کر لیا اور اس کے نیچے جا کر لیٹ گیا۔ کسی مناسب جگہ کی تلاش بے مقصد تھی اس کے بعد گہری نیند سو گیا تھا۔

دوسری صبح جب میں جاگا تو اپنے سونے کی جگہ سے چند گز کے فاصلے پر کچھ خیمے نظر آئے۔ اچھی طرح یاد تھا کہ رات کو یہ خیمے یہاں موجود نہیں تھے۔ گویا رات ہی کے کسی حصے میں یہ آبادی ہوئی ہے۔ اس کے درمیان لوگ چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے اور یہ دیکھ کر جی خوش ہوگیا کہ وہ لوگ کسی سفید ملک سے تعلق رکھتے تھے۔ لباس وغیرہ اسی انداز کے تھے۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کی طرف چل پڑا۔ سامنے ہی دو مقامی آدمی نظر آ رہے تھے۔ میں ان کے قریب پہنچ گیا اور ان میں سے ایک سے کہا۔

''تم لوگ کون سی زبان سمجھتے ہو؟'' میں نے یہ سوال انگریزی میں کیا تھا تو ان میں سے ایک نے کہا۔

''کیا بات ہے؟''

''کیا تم مقامی باشندے ہو؟''

''ہم کوئی بھی ہیں تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''میں اس جگہ کے بارے میں نہیں جانتا۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ کون سی بستی ہے؟''

''مگر تم کون ہو؟''

''بس ایک بھٹکا ہوا آدمی ہوں۔''

''یہ تو ریسا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

اب بھلا میں اس سے اور کیا سوال کرتا۔ اس نے مجھے بستی کا نام بتا دیا تھا۔ لیکن اس سلسلے میں اپنے ذہن میں کسی نئی بات کو سوچ ہی رہا تھا کہ خیمے سے ایک لڑکی باہر نکل آئی۔ اخروٹی رنگ کے بالوں والی یہ خوب صورت لڑکی نوعمر تھی۔ جینز اور جیکٹ پہنے ہوئے تھی۔ مجھے دیکھ کر رک گئی اور کچھ فاصلے پر کھڑی ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ پھر اس نے وہیں سے سوال کیا۔

''ہے۔۔۔ کون ہو کیا بات ہے؟''

''سوری میڈم! کچھ معلومات حاصل کر رہا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

''او مائی گاڈ! تم انگلش بول سکتے ہو۔''

''جی میڈم!'' میں نے فوراً کہا۔

''پلیز ادھر آؤ۔'' لڑکی نے کہا اور میں اس کے قریب پہنچ گیا۔

''کیا تم انہی علاقوں میں رہتے ہو۔ لیکن تم صورت سے تو مقامی باشندے نہیں معلوم ہوتے۔''

''جی میڈم! ایک بھٹکا ہوا آدمی ہوں۔''

''ہمیں کچھ لوگوں کی ضرورت ہے۔ یہ لوگ جو میرے ساتھ آئے ہیں ان میں صرف دو آدمی ایسے ہیں جو ٹوٹی پھوٹی انگریزی جانتے ہیں۔ باقی سب عجیب و غریب زبان بولتے ہیں۔ کیا تم۔۔۔ اوہ آئی ایم سوری، میں نے تمہیں اپنا نام بتایا اور نہ تم سے تمہارا نام پوچھا۔''

لڑکی خاصی خوش اخلاق معلوم ہوتی تھی اور انسانیت سے پیش آنے والوں میں سے تھی۔ میں نے سوچا چلو ہو سکتا ہے کوئی کام کی بات ہی ہو جائے اس لیے میں نے اپنے انداز میں بڑی نیازمندی رکھی تھی۔ وہ کہنے لگی۔

''میرا نام جینیفر ہے۔ ہم لوگ سیاح ہیں اور ان علاقوں کی سیاحت کے لیے آئے ہیں۔ میرے ساتھ میرے ڈیڈی اور کچھ اور لوگ بھی ہیں ہم ان علاقوں میں آ کر بھٹک گئے ہیں اور ہمیں یہاں کافی مشکلات پیش آ رہی ہیں۔ کیا آپ انگلش کے علاوہ ان مقامی لوگوں کی زبان بھی جانتے ہیں مسٹر۔۔۔؟''

''فرزان۔۔۔۔'' میں نے جواب دیا۔

''تھینک یو مسٹر فرزان! تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ کیا آپ ان علاقوں کے بارے میں معلومات رکھتے ہیں اور کیا ہمیں یہاں کے بارے میں گائیڈ کر سکتے ہیں؟''

''افسوس۔۔۔ میں خود بھی ان علاقوں سے ناواقف ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیا مطلب۔۔۔؟'' وہ تعجب سے بولی۔

''میں بھی ایک ایسا ہی سیاح ہوں۔ جو راستہ بھٹک گیا ہے۔'' میں نے کہا اور وہ مسکرا دی۔

''دلچسپ بات ہے۔۔۔ کیا ہی دلچسپ بات ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ بھی مقامی لوگوں کی زبان نہیں جانتے ہوں گے۔''

''جی ہاں۔ ایسی ہی بات ہے۔''

''تب تو ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہوئے۔ آیئے میں آپ کو اپنے ڈیڈی سے ملواؤں۔'' جینیفر نے کہا اور میں اس کے ساتھ چل پڑا۔

دوسری طرف گھوما تو کافی کی سوندھی خوشبو ناک سے ٹکرائی۔ عجیب سی خواہش دل میں پیدا ہو گئی۔ لیکن بہرحال اس خواہش کو میں نے دل میں ہی دبا لیا۔ دوسری طرف ایک خیمے کے سامنے فولڈنگ کرسیوں پر کئی افراد بیٹھے ہوئے تھے ان میں سے دو عمر رسیدہ آدمی تھے۔ ایک انہی کی ہم عمر عورت تھی۔ تین جوان آدمی تھے۔ جینیفر کے علاوہ چند لڑکیاں اور بھی تھیں۔ تھوڑے فاصلے پر دو نوں جوان آدمی، شاید وہ ناشتا تیار کر رہے تھے۔ کرسیوں پر

بیٹھے ہوئے لوگوں نے چونک کر مجھے دیکھا تھا۔ جینیفر نے کہا۔

''ڈیڈی یہ مسٹر فرزان ہیں۔ ہماری ہی طرح ان علاقوں میں اجنبی۔''

''ہیلو۔'' ان میں سے ایک بوڑھے آدمی نے کہا۔ پھر بولا۔

''میرا نام ہڈسن ہے اور جینیفر میری بیٹی ہے۔''

''مس جینیفر آپ کو میرا نام بتا چکی ہیں۔''

''آؤ بیٹھو۔'' عمر رسیدہ آدمی نے ایک خالی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ پھر وہ باقی لوگ اپنا تعارف کرانے لگے۔

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ مسٹر ہڈسن نے مجھ سے کہا۔

''آپ کو ان علاقوں کی سیر کی کیا سوجھی۔ اصل میں ایسا کیا ہے جس کے لیے لوگ ادھر کا رخ کریں۔ جو لوگ اس طرف آتے ہیں وہ یقینی طور پر کسی نہ کسی جستجو میں آتے ہوں گے۔'' عمر رسیدہ آدمی کے چہرے پر کچھ ایسی متجسس کیفیت تھی جیسے وہ میرے ذہن کی گہرائیوں میں اترنا چاہتا ہو۔ میں نے کہا۔

''میں اپنے گروہ سے بھٹکا ہوا ہوں۔ چند افراد میرے ساتھ اس طرف آئے تھے۔ لیکن وہ حادثات کا شکار ہو گئے اور میں یہاں تنہا بھٹکتا رہ گیا۔ اصل میں مسٹر ہڈسن، یہ علاقے ان دنوں بڑے مخدوش ہیں۔ کورسٹیا کے اطراف کے قبائل نے بغاوت کی ہے اور یہاں آنے والے سیاح بھی اچانک ہی مصیبتوں کا شکار ہو گئے ہیں۔''

''ہمیں بھی تم انہی میں سے سمجھو۔ ہمارا بھی سارا پروگرام اپ سیٹ ہو گیا ہے۔ ویسے تم اگر چاہو تو ہمارے ساتھ بقیہ وقت گزار سکتے ہو۔ سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ہم یہاں پھنس کر رہ گئے ہیں۔ صورت حال کچھ ایسی ہے کہ واپسی کا سفر بھی نہیں اختیار کر سکتے۔ چنانچہ اندازہ یہ ہو گیا ہے اور میرے ساتھیوں کا بھی یہی خیال ہے کہ کچھ وقت انہیں علاقوں میں بھٹکتے ہوئے گزارا جائے اور جب کوئی مناسب صورت حال پیدا ہو تو واپسی کے راستے اختیار کیے جائیں۔ لیکن بہرحال مشکلات کا سامنا تو کرنا ہی پڑے گا۔ البتہ یہ خوشی کی بات ہے کہ یہاں بعض بستیاں ایسی ہیں جہاں بغاوت نہیں ابھری ہے اور نہ ہی مقامی پولیس انہیں پریشان کر رہی ہے۔ خیر چھوڑو، میں تمہیں پیش کش کر چکا ہوں کہ مصیبت زدگان میں شامل ہو جاؤ۔''

''آپ لوگوں کی جو بھی خدمت ہو گی میں خوشی سے سرانجام دوں گا، اگر آپ مجھے اپنے درمیان قبول کریں۔'' میں نے کہا۔ اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ بہرحال ان لوگوں نے مجھے بہت اچھی طرح خوش آمدید کہا تھا اور ناشتے میں اپنے ساتھ شامل کیا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد مسٹر ہڈسن نے کہا۔

''ہم میں سے ہر شخص نے اپنی اپنی ذمہ داریاں سنبھال رکھی ہے۔ آپ بھی اپنے آپ کو ایک ذمہ دار شخص تصور کریں مسٹر فرزان! ہم آپ سے یہ نہیں پوچھیں گے کہ ان علاقوں میں آپ کی آمد کا مقصد کیا ہے، بلکہ جتنا آپ نے بتایا ہے اس پر یقین کر لیں گے۔ بہرحال جب تک ہمیں یہاں سے واپس نکلنے کے مناسب مواقع مہیا نہ ہوں میرا خیال ہے ہمیں آگے بڑھنا چاہیے۔ کیا آپ اس بات سے اتفاق کریں گے؟''

''میں آپ کی ہر بات سے اتفاق کر چکا ہوں مسٹر ہڈسن!''

''اچھی بات ہے۔'' ہڈسن نے جواب دیا۔

بہرحال ان لوگوں کے ساتھ شامل ہو کر عارضی طور پر کچھ سہارے مل گئے تھے اور میں نے ان سہاروں کو قبول کر لیا تھا۔ سبھی اچھے لوگ معلوم ہوتے تھے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ ان کی اصلیت بعد میں کھلے گی۔

ان علاقوں میں آنے کے بعد کورنیان کا سلسلہ شروع ہونے والا ہے۔ لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں

آ رہا تھا کہ میں اب اپنے لیے کیا فیصلہ کروں۔ دو ہی صورتیں تھیں یا تو آقا نو شیرواں وغیرہ کو بھول جاؤں۔ اگر کہیں کسی جگہ ان سے واسطہ ہو جائے تو الگ بات ہے۔ ان لوگوں کے ساتھ وقت گزاروں۔ ایسا تو ہوتا ہی رہا تھا۔ چنانچہ کسی خاص شخص کا تعین کرنے سے کیا فائدہ۔ میں نے ان لوگوں کے پاس کافی ساز و سامان دیکھا تھا۔ پتا نہیں یہ گاڑیاں انہوں نے کہاں سے حاصل کی تھیں۔ دو شاندار جیپیں ان کے پاس تھیں جن میں سامان لادنے کے لیے بہت عمدہ قسم کی ٹرالیاں بھی شامل کی گئی تھیں۔ یہ ٹرالیاں بھی چار پہیوں پر مشتمل تھیں اور ایک بڑا سا بکس بنا ہوا تھا۔ ضرورت کے وقت اس میں تین چار آدمی سما سکتے تھے۔ لیکن ان لوگوں نے بڑی عمدگی سے ان میں اپنا سامان بھرا ہوا تھا، اور ان میں خاص قسم کے ٹائر لگائے ہوئے تھے۔

علاقہ خاصا عمدہ لگ رہا تھا اور سرد ہوائیں اس بات کا اظہار کر رہی تھیں کہ آگے چل کر برفانی میدانوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ بہر حال دوپہر تک یہ لوگ وہیں قیام پذیر رہے۔ جینیفر میرے قریب ہی تھی اور میری ملاقات سے بہت خوش تھی حالانکہ اور لڑکیاں بھی یہاں موجود تھیں لیکن جینیفر کے ان سے زیادہ تعلقات معلوم نہیں ہوتے تھے۔ میں نے بھی اسے بہت زیادہ کریدنا پسند نہیں کیا۔ پھر دوپہر کے کھانے کے بعد یہ خیمے اکھاڑ دیئے گئے اور اس جگہ کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ مسٹر ہڈسن نے مجھے جو کچھ بتایا تھا سمجھ میں تو آتا تھا لیکن اس طرح کے مخصوص علاقوں میں سفر کرنا صرف سیاحت کے طور پر مناسب نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ہو سکتا ہے ان کے دلوں میں بھی کچھ اور ہو۔ لیکن بہر حال مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں بھی ایک جیپ میں سوار ہو گیا اور جیپیں آگے کا سفر طے کرنے لگیں۔

(جاری ہے)

سنہری باتیں

حضرت خدیمؓ بن فاتک کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز پڑھائی اور رخ مبارک لوگوں کی طرف پھیرا تو خلاف معمول بیٹھے رہنے کی بجائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سیدھے کھڑے ہو گئے اور تین بار فرمایا:

''جھوٹی گواہی دینا اور شرک کرنا، دونوں برابر کے گناہ ہیں۔''

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''بتوں سے دور رہو، جھوٹی بات کہنے سے دور رہو، خدا تعالیٰ کے لیے یکسو ہو جاؤ، شرک چھوڑ دو، توبہ اختیار کرو۔''

☆.....☆.....☆

☆ جب مسلمان دعا مانگنا کم کریں گے..... تو مصائب نازل ہوں گے۔

☆ جب صدقات دینا بند کریں گے..... تو بیماریاں بڑھیں گی۔

☆ جب زکوٰۃ دینا بند کریں گے..... تو مویشی ہلاک ہوں گے۔

☆ جب بادشاہ ظلم کریں گے..... تو بارشیں روک لی جائیں گی۔

☆ جب بدفعلیاں عام ہوں گی..... تو اچانک اموات آئیں گی۔

☆ جب لوگ بد اعمال ہو جائیں گے..... تو زلزلے بہ کثرت آئیں گے۔

☆ جب حکم خدا کے خلاف فیصلے ہوں گے..... تو ان پر ان کے دشمن غالب آ جائے گے۔

☆ جب عہد شکنی بہت ہو گی..... تو اللہ تعالیٰ انہیں قتل کے ذریعے آزمائے گا۔

☆ جب ناپ تول میں کمی کی جائے گی..... تو ان پر قحط نازل کیا جائے گا۔☆

پنچ پرمیسر

رنگیارا گھوا

چند ایسے انسانوں کا مطالعہ جن کا ظاہر و باطن مختلف تھا۔ انسان کے ظاہر و باطن کا مطالعہ دلچسپ بھی ہے اور ہولناک بھی! مختلف علوم و فنون اسی مطالعے کا اظہار ہیں اور کہانی کہنا بھی ایک فن ہے۔

وہ تحریریں جو صرف مشرق ہی میں لکھی جا سکتی ہیں انہی میں سے ایک تحریر ہندی زبان سے۔

چندا نے دالان میں کھڑے ہو کر آواز دینے کے لیے منہ کھولا لیکن ہمت نہیں ہوئی، کوٹھری کے اندر سے کھانسنے کی آواز آئی۔ ابھی اندھیرا ہی تھا اور کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا تھا۔ گدھے بھی اندر کی طرف ٹاٹ کی چھت کے نیچے کان سمیٹے بالکل ساکت کھڑے تھے۔ کھپریل پر اوس کی وجہ سے سرخی چھائی ہوئی تھی۔ گلی کی دوسری طرف مسجد میں موذن نے اذان دی تو چندا کی کچھ ڈھارس بندھی اور اس نے آہستہ سے کہا۔ ''بھیا۔''

کنہائی بستر میں کلبلایا، اس نے اپنی اچھی والی آنکھ ملی۔ اسے کیا معلوم نہ تھا! پھر بھی پڑا پڑا بھاری آواز سے بولا۔ ''کون ہے؟'' اور کہتے کہتے وہ خود ہی رک گیا، اگر نہ جانتا تو کیا رات کو دروازہ کھلا چھوڑ کر سوتا! وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ کل سورج نکلے یا نہ نکلے مگر صبح ہوتے ہی چندا ضرور آئے گا۔

دونوں بھائی کشمکش میں تھے۔ اسی وقت

چوہدری مرلی کی بوڑھی کھانسی، سڑک پر سنائی دی۔ چندا کی جان میں جان آ گئی۔ چوہدری مرلی کو تڑکے ہی اٹھ جانے کی عادت تھی۔ اصل میں عادت وادت کچھ نہیں، دن بھر حقہ گڑگڑاتے رہنے سے رات کو کھانسی تنگ کرتی تھی اور پھر الو کی طرح رات بھر جاگا کرتے اور صبح ہوتے ہی لاٹھی ٹھکاتے سڑک سے گلی اور گلی سے سڑک کے چکر لگاتے پھرتے تھے۔ اتنے سویرے کنہائی کا دروازہ کھلا دیکھا اور پھر ایک آدمی کو بھی کھڑے پایا تو انہوں نے پکار کر پوچھا۔ ''کون ہے؟''

چندا تو جیسے منتظر تھا، لپک کر پیر پکڑ لیے۔

''کیوں روتا کیوں ہے۔'' چوہدری نے گھبرا کر پوچھا۔

''رجی کیسی ہے؟''

''اب رجی کہاں، چوہدری دادا!'' چندا ہچکیاں لیتے ہوئے بولا۔ ''رات ہی کو چل بسی۔''

''اور تو نے کسی کو بلایا بھی نہیں۔''

چندا نے جواب نہیں دیا، سسکیاں لیتا رہا۔ گدھے بدستور استغراق کے عالم میں کھڑے رہے۔ ان کے نزدیک آدمی نے سارا بوجھ ان پر لاد کر ان کا اصلی نام خود لے لیا تھا۔

''وہ۔۔۔ کہاں ہے اے کنہائی!'' چوہدری پنچ نے رعب جماتے ہوئے پوچھا۔ ''سنا تو نے اب کاہے کی دشمنی، دشمن تو چلا گیا۔ مردے سے بیر کرنا اچھا لگے گا''۔

کنہائی نے جلدی جلدی دھوتی پر اپنا روئی کا پاجامہ چڑھا کر انگرکھا پہنا اور بگڑی آنکھ پر ہاتھ رکھ کر باہر آ گیا۔

چوہدری نے پھر کہا۔ ''برادری تو جب آئے گی، جب گھر کا آدمی پہلے لاش چھوئے گا۔ پاگل! وہ تو بے چاری چلی گئی، اب روٹھ کر تو کیا لے گا اور پھر کیا وہ تیری ماں نہ تھی۔''

کنہائی نے دو قدم پیچھے ہٹ کر کہا۔ ''یہ بھی ایک ہی کہی دادا! کس کی ماں تھی وہ۔ میری ماں سب کچھ تھی چھنال نہیں تھی۔ اب آیا ہے۔ دیکھا کیسا لاڈلا ہے۔ نہیں آؤں گا، سمجھے! بگھیون کا چھورا ہوں تو نہیں آؤں گا۔''

چوہدری نے بات بگڑتی دیکھ کر غصے سے کہا۔ ''واہ رے کنہائی! تو تو سچ مچ برادری کی ناک بن گیا ہے۔ بھلا پنچ میں ہوں کہ تو۔''

کنہائی سٹپٹا کر جلدی سے بولا۔ ''تو میں نے کوئی غلط بات کہی ہے دادا! اس نے میرے خلاف کیا نہیں کیا! میں نے کن کن مصیبتوں سے اس کے چندا کو جوان بنایا! تاؤ مرے تھے تب میرے باپ کی آنکھ پھوٹ گئی تھی۔ آشنائی کرنے چلے تو بھاوج کے ساتھ! اور اپنی بیاہتا کو چھوڑ دیا۔ جلا جلا کر مارا میری ماں کو! وہ تو میں تھا جو پھر بھی اسے اپنی ماں کے برابر سمجھا۔ اس وقت تو تم سب انجان بن گئے تھے۔ اب طرف داری کرنے کے لیے آ گئے ہو۔ میں نے کیا کیا دکھ جھیلے! گھر چھوڑ دیا، ہر چیز پر ٹھوکر مار دی، اپنی محنت کے بل پر یہ گھر بنوایا، اپنا گدھا لیا، ہر چیز پھر سے جوڑی اور اب ان کا لاڈلا بیٹا بڑا ہوا تو انہوں نے کیسی آنکھیں پھیر لیں! کیا میں وہ دن بھول جاؤں گا۔''

چوہدری لاجواب ہو گئے پھر بھی بولے۔ ''لیکن بیٹا! وہ تیرے باپ کی عورت تھی اور یہ تیرا باپ ہی کا بیٹا ہے، تیرا ہی بھائی ہے۔ دس آدمی نام رکھیں گے۔ چل یہ بھی نہ سہی غیر سمجھ کر کاندھا دے دے! تیری نیکی تیرے ساتھ ہے۔ کوئی بچتا نہیں، اپنے کیے کی سزا سب پاتے ہیں۔''

کنہائی چپ ہو گیا۔ چندا نے اس کے پیروں پر سر رکھ دیا اور رونے لگا۔ ''بھیا اب میری لاج تمہارے ہاتھ ہے۔ چاہے لاج رکھ لو چاہے نہ رکھو! میں تو تمہارا گدھا ہوں، کان پکڑ کر جس طرف چاہو کر دو۔۔۔ وہ بے چاری تو مر گئی اب۔۔۔'' اس کے گرم گرم آنسو کنہائی کے پیروں پر ٹپکنے لگے۔ یکبارگی اس کا دل بھر آیا۔ دونوں نے بغل والے مکان میں جا کر دیکھا۔ رجی بے جان پڑی تھی۔ ایک ہلکی سی چادر

سے اس کا جسم ڈھکا ہوا تھا۔ نہ اسے سردی لگ رہی تھی، نہ بھوک نہ پیاس! کنہائی کے آنسو نکل آئے۔ اس سے بھلا کیا بدلہ لینا ہے! ایک دن سب کا یہی حال ہوتا ہے۔ یہ سوچتا ہوا وہ اس کے پیروں پر سر رکھ کر رونے لگا۔ ''اماں۔''

رجبی جلا دی گئی۔ کنہائی نے اپنے ہاتھ سے آگ دی۔ اس کے پیٹ کا جایا نہ سہی، باپ کا بڑا بیٹا تو وہی تھا۔ برادری کے لوگوں کے منہ سے واہ واہ ہو گئی۔ آخر یہ کام ایسے نیچ کماروں میں پہلے کب ہوئے تھے! کنہائی نے خود چندا کو بھیج کر گنگا میں پھول ڈلوا دیے۔ گناہ کون نہیں کرتا مگر کنہائی تو اس کی آخرت سنوارنے کی دھن میں تھا۔

بارہ دن ہو گئے اور جب تیرھویں دن کنہائی اپنے گھر واپس آیا تو اسے ایسا لگا جیسے اب کچھ نہیں رہا۔ چندا گدھے لے کر مٹی ڈالنے گیا تھا۔ یہی اس کی آمدنی کا ذریعہ تھا۔ بہت ہوا تو گیارہ بارہ آنے اور وہ بھی مٹی کے مول دام ملنے پر مل جاتے تھے۔ گیہوں کی جگہ باجرہ اور چنا سب سے سستا تھا۔ سب لوگ یہی کھاتے تھے اور یہی زیادہ آسانی سے مل بھی جاتا تھا۔ چندا کے پاس حقیقت میں کچھ نہیں تھا۔

رجبی نے اپنے آدمی کے مرنے پر دیور سے شادی کر لی اور اس کی پرانی گرہستی توڑ دی لیکن وہ چٹوری تھی اور حسد سے ہمیشہ اس کی چھاتی پھٹتی تھی۔ وہ بھلا کسی کے کیا کام آتی! مری تو ساٹھ ساٹھ روپے کے دو گدھوں اور چندا کے سوا اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ پرانا مکان رہن رکھ دیا تھا اور شاید اب وہ چھوٹ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ کرائے کے مکان میں دن گزار رہی تھی۔

کنہائی کو دلی اذیت محسوس ہو رہی تھی۔ اندر کوٹھری میں گھس کر اس کا اپنا ہرا چشمہ ڈھونڈا اور آنکھوں پر لگا لیا تاکہ بازار والے اس کے عیب سے واقف نہ ہو سکیں۔ اس کی ایک آنکھ ضائع ہو چکی تھی لیکن پوچھنے پر ہمیشہ وہ یہی کہتا تھا۔ ''دکھنے آئی ہیں دکھنے!'' جوانوں سے اس کا جواب اور ہوتا کہتا۔

''اسکول کی چھوکریوں کو دیکھنے کے لیے پردہ ڈالا ہے، پردہ!'' سب سنتے اور ہنس کر چپ ہو جاتے۔ اس کے بارے میں کئی کہانیاں تھیں کہ وہ ایک پروفیسر کے پاس نوکر تھا جس کی بیوی جوان اور کام چور تھی۔ اس نے کنہائی سے کھانا پکانے کو کہا تو اس نے اپنی نیچی ذات سے فائدہ اٹھانے کے لیے مذہب کی آڑ لی۔ بیوی انگریزی پڑھی لکھی تھی، ایک نہ مانی تب وہ نوکری چھوڑ کر چلا آیا۔ اس کے بعد بھٹک بھٹکا کر سبزی کی دکان کھول لی۔ دکان چل نکلی۔ اب تو اس نے شوقیہ دو ایک گدھے بھی رکھ لیے، بستی میں سامان لادنے کے لیے اور کرائے پر چلانے کے لیے۔

کنہائی تھک کر دکان پر جا بیٹھا۔ دن بھر اس کا دل نہیں لگا۔ ان دنوں اسے پھر گھر بسانے کی خواہش ہونے لگی تھی۔ چندا بائیس سال کا ہو گیا تھا۔ اچانک اسے چندا پر ترس آنے لگا۔ اب تو سچ مچ بیچ کا کانٹا نکل گیا تھا۔ کنہائی نے اپنی محنت کے بل بوتے پر اتنی ترقی کی تھی۔ اس کے دل کی ہلچل صبر کی حدود سے تجاوز کر گئی اور وہ دکان بند کر کے گھر چلا گیا۔

☆☆☆

چندا کے بیاہ کی خاطر کنہائی نے زمین آسمان ایک کر ڈالے چوہدری پنچ مرلی کے گھر جا کر جب اس نے اپنا ارادہ ظاہر کیا تو پنچ اچھل اچھل پڑے، کھانسی کا انبار لگا دیا۔ چوہدرائن نے اپنی ضعیف پلکیں اٹھا کر دیکھا اور گیت گانے کا وعدہ کیا۔ آخر وہ دن بھی آ پہنچا۔ اس دن جیسے گھر کی ہر ایک چیز سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ چندا کا مکان خوب صاف ستھرا کیا گیا تھا۔ مٹکے ایک طرف سلیقے سے رکھ دیے گئے تھے۔ اب چندا کے بچے ہوں گے۔ وہ دیوالی پر دیے بجھیں گے۔ بڑے ہوں گے تو چندا مٹی لادنا چھوڑ دے گا اور چاک سنبھالے گا، پھر ہر چکر پر جھٹکے کے ساتھ کلھڑا اترا کریں گے۔ چوہدری کے گھر کے پیچھے جو باڑا ہے، اس میں بھٹا لگ جائے گا۔

چندا مست ہو کر گا رہا تھا۔ پھاگن کا سلگتا مہینہ تھا۔ برات گلی میں کھانا کھا رہی تھی، اندر عورتیں گانے

گا رہی تھیں۔

کنہائی نے رنگین دوپٹا باندھ رکھا تھا۔ آج اس کے ہاتھ پیروں میں بڑی چستی آ گئی تھی، دوڑ دوڑ کر سب انتظام کر رہا تھا۔ چاروں طرف فضا میں مسرتوں کی بارش ہو رہی تھی۔ مہمانوں کے خچر جن پر وہ چڑھ کر آئے تھے، گنوانوں کی طرح چپ چاپ کھڑے تھے جیسے انہیں انسان کی اس حماقت سے کچھ سروکار نہ تھا۔

پھر ایک روز بہو نے آ کر گھونگھٹ کی دوتہوں میں سے دیکھتے ہوئے کنہائی کے پیر چھوئے۔ چندا کا گھر آباد ہو گیا اور کنہائی اپنے بغل والے مکان میں واپس آ گیا۔

☆☆☆

چندا کی گاڑی جب چلنے سے انکار کرنے لگی تب ہی اس نے گھر کے باہر قدم نکالا۔ محلے کی عورتیں اس زن مرید کو دیکھ کر آوازے کستیں، راہ چلتے اشارے کرتیں اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتیں۔ گلی اور سڑکوں سے نکل کر یہ ذکر اب گھروں کی چار دیواریوں میں بھی پہنچ گیا تھا۔ چندا، پھولو کے سامنے ہار گیا تھا۔ پھولو کو اگر کوئی کمہاری کہہ دے تو ضرور اسے کاجل لگانے کی ضرورت ہے۔ وہ تو پوری جاٹنی معلوم ہوتی ہے، جوانی کا قلعہ! لوگ سوچتے مگر منہ سے کچھ نہ کہتے۔

دن کو بھی چندا اور پھولو زور سے باتیں کرتے اور قہقہے لگاتے جنہیں سن کر لوگ دانتوں تلے انگلی دبا لیتے۔ کنجو خود جوتین شادی شدہ جوان لڑکیوں کی ماں تھی اور تینوں لڑکیاں گانے گانے میں لوہا منواتی تھیں، وہ تک چونک پڑتی تھی کہ شرم و حیا کا تو نام و نشان نہیں رہا۔

لیکن جلد ہی حالات بدل گئے۔ ادھر چندا صبح جاتا تو دن ڈھلے لوٹتا، وہ بھی تھکا ماندہ اور چور چور! پھولو منہ پھلا کر بیٹھ جاتی۔ میاں بیوی میں اکثر پیسوں کے لیے جھگڑا ہوتا۔ چندا کہتا ''میں کوئی راجا تو نہیں ہوں بھی! تو تو پیر پسارے بیٹھی رہے اور میں گلی گلی مارا مارا پھروں۔''

چندا بیڑی سلگا لیتا اور پھولو رونے لگتی۔ ''تو تم مجھے بیاہ کر ہی کیوں لائے تھے۔ زمانے کی عورتوں کے تن پر گہنے ہیں، کپڑے ہیں، گھر میں بستر ہیں اور یہاں روٹیوں کا ہی ٹھکانا نہیں۔''

چندا بات کاٹ کر کہتا۔ ''واہ ری رانی بہو! بستی میں بھی ایسے ہیں، ایک تو نہیں ہے۔ تو بھیا کا طعنہ دیتی ہے لیکن ان کے پیسے دھیلے کا حساب تو مٹی میں گڑتا ہے اور یہاں تو زہر مار کرتی ہے میری کمائی رانڈ۔''

پھولو کہہ اٹھتی۔ ''چلو رہنے دو بھونچی بھانگ کر بڑے بھاری گاہک تمہی ہو، دنیا کا نام دھرنے سے پہلے اپنے آپ کو تو دیکھو۔ شادی تو مفت ہو گئی ورنہ کون اپنی لڑکی دیتا! سینت کی چندن، لالہ تو ہی لگا لے اور اپنے گھر والوں کو بھی لگا دے۔''

''تو جا بیٹھ بھیا کے گھر ہی! کون روکتا ہے تجھے! کتنے ہی مرد پڑے ہیں چلی جا جہاں جی چاہے!'' چندا جھنجلا کر چلا اٹھتا۔

پھولو جھینپ کر کہتی۔ ''ارے دھیرے بولو! تمہیں تو حیا ہے نہ شرم! کوئی سن لے گا تو کیا کہے گا۔''

چندا ہنس پڑتا اور روز کی باتیں یا تو رونے پر ختم ہوتیں یا ہنسنے پر! دونوں کافی دیر تک ایک دوسرے سے نہ بولتے لیکن آدھی رات کو پھر اپنے آپ دوستی ہو جاتی۔

چندا الجھنوں میں پڑا رہا لیکن اس سلسلے میں کنہائی سے کچھ کہنا اس نے اپنی خودداری کے خلاف سمجھا۔ اب اس کے دل میں کنہائی کے خلاف نفرت اور حسد کے ملے جلے جذبات پرورش پا رہے تھے۔ بہت کچھ سوچنے پر بھی وہ ان جذبات کا سبب تلاش نہ کر سکا۔ انہی دنوں کنہائی نے ایک اور گدھا خریدا۔

اس دن جب وہ چندا کو گھر پر سمجھ کر خبر دینے آیا تو چندا تھا نہیں، آنگن کے کونے میں پسینے سے شرابور نیم برہنہ پھولو پسائی کرنے میں مشغول تھی۔ کنہائی نے دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ پھولو نے دیکھا اور اپنا

گھونگھٹ کھینچ لیا لیکن جلدی میں کچھ اچھی طرح ڈھک نہ سکی۔

کہنائی نے چندا کو پوچھا اور پوچھ کر لوٹ آیا۔ چندا نے اس کے گدھا خریدنے کی بات سنی تو تھکن اور غریبی کی جھنجھلاہٹ میں پھر پھولو سے لڑ بیٹھا۔ اس رات پھولو دیر تک روتی رہی۔ اسی طرح ایک ہفتہ اور گزر گیا۔

ایک دن چندا کا مالک مکان کرایہ وصول کرنے آیا تو چندا نے اسے صحن میں چارپائی پر بٹھا کر اس کی خوشامد میں کافی وقت گزار دیا۔ پھولو کچھ دیر تک انتظار کرتی رہی، پھر تھک گئی۔ کچھ دیر بعد ہی وہ باہر سڑک کے نل سے ڈول بھر کر کہنائی کے گھر میں گھس گئی۔ اسے معلوم ہی تھا کہ اس وقت کہنائی گھر میں نہیں دکان پر رہتا تھا۔

غریبوں کے گھر غسل خانے تو ہوتے نہیں اور اوپر کھلی ہوئی چھت پر نہانے سے بابو لوگوں کے لڑکے چھپ کر دیکھتے ہیں۔ وہ آنگن کے ایک کونے میں بیٹھ کر نہانے لگی۔ اس نے سوچا کہ وہ جوئیں تو پھر بھی نکال لے گی، جب تک جیٹھ باہر ہے جلدی جلدی نہا لے۔ اسی وقت نہ جانے کہنائی کہاں سے آن گھسا! اس نے پھولو کو دیکھا اور آنکھوں کے سامنے بجلی سی کوند گئی۔ پھولو اپنے گھٹنوں میں سر دبا کر بیٹھ گئی۔ جب وہ کپڑے پہن کر نکلی تو کہنائی باہر سائبان میں کھڑا انتظار کر رہا تھا۔ پھولو نے دیکھا اور بے اختیار اس کے ہونٹوں پر ایک رنگین مسکراہٹ پھیل گئی۔ سائبان میں زیادہ روشنی نہیں تھی، پھر یہ کہ کہنائی کی آنکھوں پر ہرا چشمہ چڑھا ہوا تھا۔ یوں بھی وہ کم ہی دیکھتا تھا لیکن آدمی تجربے کار تھا۔ اس کا ذہن بات کو کافی دور تک لے گیا۔

''بہو! چندا کہاں ہے۔'' اس نے کہا۔

کہنائی کے لہجے میں بزرگی اور یگانگت تھی اس لیے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں رہی۔ پھولو نے سر جھکا کر گھونگھٹ نکال لیا اور پھر پیر کے انگوٹھے سے مٹی کریدتی ہوئی بولی۔ ''گھر بیٹھے ہیں۔''

کہنائی نے اندر سے دو ککڑیاں لا کر اس کے ہاتھ میں دے دیں اور بولا۔ ''یہ لیتی جا ترکاری بنا لینا۔''

پھولو نے گھونگھٹ میں سے نظر بھر کر کہنائی کو دیکھا، ککڑیاں ڈول میں رکھیں اور مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ کہنائی دیر تک کھڑا سوچتا رہا۔

چندا نے ککڑیاں دیکھتے ہی پوچھا۔ ''یہ کہاں سے لائی؟''

کہنائی نے بھی اپنے آنگن سے چندا کا جملہ سنا اور سانس روک کر انتظار میں کھڑا ہو گیا۔ دیکھیں کیا کہتی ہے۔ وہ سوچ رہا تھا۔

پھولو تنک کر بولی۔ ''پرسوں تمہی نے تو دو آنے دیے تھے۔ تمہاری طرح کیا میں چاٹ جاتی ہوں یا دارو پیتی ہوں! بچ رہے تھے۔ کبھی کھانے کو جی چاہتا ہے اس لیے لے آئی۔''

''بھیا کی دکان سے لائی ہے۔'' اب چندا کے لہجے میں لاپروائی نمایاں تھی۔

''ہاں!'' پھولو نے دھیرے سے کہا۔

''رام رام!'' چندا کی آواز سنائی دی۔ ''یہ بھیا ہیں! اکیلے کا خرچ ہی کیا، کس کے لیے جوڑ جوڑ کر رکھ رہے ہیں۔ کون ہے ان کا۔ نہ کوئی آگے سننے کو نہ پیچھے رونے کو پھر بھی دو ککڑیاں نہ دے سکے۔ پھوٹی آنکھ سے دیکھ کر دام لے لیے۔''

چندا بہت دیر تک بڑبڑاتا رہا مگر پھولو نے کوئی جواب نہ دیا۔ کہنائی مارے غصے کے ہونٹ چبا کر سوچنے لگا۔ کیسی ہے یہ دنیا۔ سب مطلب کے ساتھی ہیں اور ان کم بختوں کا پیٹ تو جہنم ہے، کتنوں کو کھا چکے ہیں بھرتا ہی نہیں۔ ہاتھ پھیلانا ہی سیکھا ہے کبھی ہاتھ الٹا کرنا نہیں آیا۔ اس کی طبیعت عجیب الجھن میں گرفتار ہو گئی۔ ابھی شادی کو تین مہینے بھی نہیں ہوئے تھے کہ بہو نے یہ رنگ دکھایا۔ ٹھیک تو ہے بھوکا مارے گا تو وہ کیوں مرنے لگی! اگر اس میں جوش ہو گا تو دس جگہ کھائے گی۔ ایسی کیا بات ہے لالہ میں جو وہ ستی ہو گی! عورت تو رکھنے سے رہتی ہے۔ کہنائی کے

ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ ناچنے لگی۔

برسات کی اودی گھٹاؤں نے آسمان کو گھیر رکھا تھا۔ صحن کی کیچڑ سے پاؤں بچاتا ہوا کنہائی اندر آ کر بیٹھ گیا۔ اس کا دل آج کھانا پکانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر چراغ جلایا اور پھر چپ چاپ بیٹھ کر اسے دیکھتا رہا۔ چراغ بھی اپنی ایک آنکھ سے چاروں طرف اندھیرے کو دیکھ کر کانپ رہا تھا۔ باہر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ سڑک خاموش تھی۔ کیچڑ کی وجہ سے بہت کم لوگ راستہ چل رہے تھے۔

یکا یک دالان میں کچھ کھڑکھڑاہٹ سی ہوئی۔ کنہائی نے بلند آواز سے پوچھا۔ ”کون ہے بے۔“

ایک مریل کتا لکڑیوں کے پیچھے سے نکل کر بھاگ گیا اور کنہائی جھینپ سا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر باہر گیا، نتھو حلوائی کی دکان سے دودھ پیا اور پھر لوٹ آیا۔

بستر پر لیٹنے کے تھوڑی ہی دیر بعد اس کی نیند کسی کے کھلکھلا کر ہنسنے کی آواز سے ٹوٹ گئی۔ اسے ٹھیس سی لگی اور اس کا دل بھر آیا۔ یقیناً پھولو ہی ہنسی تھی۔ اس نے حیرت سے باہر کی طرف دیکھا۔ کالی رات اپنی گود میں گھٹاؤں کو لیے سنسنا رہی تھی۔ کنہائی نے تصور کی نظر سے چندا اور پھولو کا احاطہ کرنا چاہا۔ اس نے کراہ کر کروٹ بدل لی۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے پڑوس کی عورتیں گا کر چپ ہوئی تھیں۔

رنڈوا تو روئے آدھی رات، سپنے میں آئے کامنی، اس کے مردانہ جذبات کو زبردست دھکا لگا۔ اس نے سوچا، آخر ایسا کیوں ہے۔ لوگ اور برادری والے پیسا ہونے پر بھی اس کی عزت نہیں کرتے۔ چندا جو صرف دس بارہ آنے کی ہی شکل دیکھ پاتا ہے اور اسی میں گرہستی چلاتا ہے، اسے نیوتا بھی ہے اور بلاوا بھی! اس کے لیے گیت بھی گائے جاتے ہیں۔ کیا وہ اکیلا نہیں ہے اس لیے۔ پھر دفعتہً اسے خیال آیا کہ اس کا تو کوئی ہے ہی نہیں، پھر بھلا اس کا بیاہ کون کرتا۔ وہ پریشان ہو کر اٹھ بیٹھا۔ آسمان پر بادل گرج رہے تھے۔ اس نے سوچا، ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے، پینتیسواں برس ہی تو۔ تنہائی کا احساس ناگ بن کر ڈسے جا رہا تھا۔ اسے خیال آیا کہ نہ اس کے دروازے پر شنو کمہار جیسا فرماں بردار لڑکا ہے اور نہ ہی اس کا آنگن لیپا پوتا ہے۔ خود ہی جب وہ بے زار ہو جاتا ہے تو سوچتا ہے کہ گھر صاف کر ڈالے لیکن وہ عورت تو ہے نہیں جو عورتوں کا ایک ہی کام کرتے کرتے اس کی آنکھیں پھوٹ چلی ہیں۔ چولہا پھونکنا تو مردوں کا کام نہیں ہے۔

پھر اسے چندا پر غصہ آنے لگا۔ کیا نہیں کیا اس نے چندا کے لیے۔ کیا تھا اس کے گھر۔ آج میاں چھیلا بنے پھرتے ہیں، مانگ پٹی سنوار کر دو پٹا باندھنا آ گیا ہے۔ شدت جذبات سے اس کے ہونٹ پھڑکنے لگے۔ کنہائی کو یاد آیا کہ اس کے پاس پیسا ہے۔ وہ بھی بیاہ کرے گا۔ چندا تو اس کو لوٹے جا رہا ہے۔ اس کے گدھوں کی لید تک اس کی ملکیت نہیں۔ کیا کرے وہ اس کا۔ روز وہ چڑیل پھولو آتی ہے اور بٹورے جاتی ہے لیکن کون سی دولت جمع کر لے گی، چندا کے پاس ہے ہی کیا۔ کنہائی کو یہ سوچ کر ڈھارس سی ہونے لگی کہ وہ خود کافی عزت دار ہے۔ اس کے پاس دکان ہے۔ ابھی پرسوں ہی اس نے نبو کی ضمانت دی ہے پھر یونہی بھٹکتا ہوا اس کا ذہن پھولو تک پہنچ کر رک گیا۔ اس کے سارے زیور کانسی کے تھے۔ کنہائی چاندی کے مڑھوا سکتا تھا۔ یکا یک اس کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر گھوم گیا جب وہ بغیر کھنکارے چندا کے گھر گھس گیا تھا۔ پھولو بیٹھی چکی پیس رہی تھی۔ جوانی کا وہ عالم یاد آتے ہی کنہائی ہار کر لیٹ گیا۔ اب وہ چندا کی رقابت میں سلگ رہا تھا۔ کل اس کے بچے ہوں گے تو کیا میرا نام چلے گا۔ بڑھاپے میں کوئی پلنگ کسنے والا تک نہ ہوگا، اپنے پھر اپنے ہوتے ہیں۔

بادل آپس میں ٹکرا گئے۔ تیز بارش ہونے لگی۔ سامنے اندھیرے میں پھولو آ کر کھڑی ہو گئی۔ کنہائی کے دل میں پرانی نفرت عود کر آئی۔ جیٹھ سے آنکھیں ملا کر بات کرنا کیا مذاق ہے۔ کیسی بات

بات پر روٹھتی ہے! اس کے باپ کے گھر کچھ ہے ہی نہیں ورنہ بھاگ بھاگ کر میکے پہنچتی۔ عورت رکھنا کوئی آسان کام ہے۔ گدھا لادکر عورت نہیں رکھی جا سکتی۔ میں یوں دونوں میں کب تک سمجھوتا کراتا پھروں گا۔ وہ سوچتا رہا۔

پھولو ابھی تک کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ نہ جانے کب تک کھڑی رہی۔ کنہائی کو نیند آ گئی۔ سونے سے پہلے اس کی زبان سے صرف اتنا ضرور نکلا۔ ''چندا بیٹا! تیرا غرور تو میں توڑوں گا۔ تیری مینا نے میرا گھر تباہ کیا تھا۔

☆☆☆

صبح ہو گئی تھی مگر آسمان پر ابھی تک بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ کبھی کبھی سڑک پر کتوں کے شور سے اس کی گہری خاموشی کا سلسلہ ٹوٹ جاتا تھا لیکن جوں جوں آوازیں دور ہوتی جاتیں، خاموشی پھر طاری ہونے لگتی تھی۔

ہوا ٹھنڈی تھی۔ ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ وقت کافی ہو چکا تھا۔ دفتروں اور نوکریوں پر جانے والے، کیچڑ اور اپنی قسمت کو کوستے ہوئے جا چکے تھے۔ چار سو اداسی چھا گئی تھی۔ کنہائی کی آنکھ کسی کھٹکے سے کھل گئی۔ اس نے سنا، آنگن میں کوئی چل رہا تھا۔ بچھوا کی دھیمی آواز کانوں میں اتر کر دل میں سما گئی۔ وہ ایک دم اٹھ بیٹھا۔ باہر جا کر دیکھا تو پھولو چپ چاپ اس کے گدھوں کی لید جمع کر رہی تھی۔ کنہائی پر نشہ طاری ہو گیا۔ پاس جا کر بڑے رازدارانہ لہجے میں بولا۔ ''چوری کر رہی ہو بہو!''

پھولو نے گھونگھٹ نہیں کھینچا، منہ اٹھا دیا۔ شربتی رنگ کی نشیلی آنکھوں میں رات کا خمار اب تک موجود تھا، آہستہ سے بولی۔ ''چوری کاہے کی جیٹھ جی! وہ تو اندھیرے منہ ہی گدھے لے کر چلے گئے ہیں۔ اب برسات لگ رہی ہے جو ہاتھ لگے اسے بٹور کر اپلے بنالوں گی۔ کچھ تو کام نکلے گا ہی۔''

کنہائی خوش ہو گیا لیکن اس نے خوشی کا اظہار نہیں کیا اور بولا۔ ''تجھے بڑا دکھ ہے بہو!'' یہ بات سوال کی شکل میں نہیں پوچھی گئی تھی، اظہار ہمدردی کے طور پر کہی گئی تھی۔ کنہائی نے یہ الفاظ ایسے یقین کے ساتھ کہے تھے گویا اسے ان پر پورا اعتماد تھا اور وہ اپنی بات کو واپس نہیں لینا چاہتا تھا۔ وار کارگر ہوا۔

پھولو کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے منہ پھیر کر آنسو پونچھ ڈالے۔

کنہائی کہنے لگا۔ ''جو ضرورت ہو مجھ سے مانگ لیا کر! شرمانے کی کوئی بات نہیں! اسے اپنا ہی گھر سمجھ! چندا تو نکھٹو ہے، نرا بے وقوف، سمجھی۔ تیرا ہی سب کچھ ہے۔ کھا پی اور عیش کر! اور میرا کون ہے۔''

''بیاہ کیوں نہیں کر لیتے۔'' پھولو نے اچانک بات کا رخ بدلتے ہوئے پوچھا۔

''بیاہ!'' کنہائی نے اوپر دیکھ کر کہا۔ ''بیاہ کر کے کیا ہوگا! مجھے بھگوان نے سب کچھ دیا ہے، تو فکر نہ کر! میرے ہوتے کوئی تیرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ یہیں رہ تو بھی کوئی ڈر نہیں۔ کنہائی کا نام ساری برادری میں ایک ہے۔ تیرے لیے اس کا سب کچھ حاضر ہے۔''

پھولو نے بھنویں چڑھا کر کہا۔ ''مگر برادری کیا کہے گی۔ ذات والے کیا کہیں گے۔ میرا باپ کیا کہے گا اور تمہارے بھیا کی کون سنے گا۔'' پھولو نے اپنے دل کے سارے خوف اور شکوک ایک بار ہی گنا ڈالے۔

''برادری کچھ نہیں کر سکتی!'' کنہائی نے نڈر ہو کر کہا۔ ''ذات والے اگر حقہ پانی بند کریں گے تو یہ بھی دیکھ لیں گے کہ کنہائی بیڑی سگریٹ پیتا ہے۔ تیرے باپ سے کوئی مطلب ہی نہیں کیونکہ وہ تو ایک بار تجھے بدا کر چکا ہے اور چندا کی کیا حیثیت جو میرے سامنے کھڑا ہو سکے! صرف تجھ میں ہمت ہونی چاہیے۔''

پھولو نے بے اعتباری سے پوچھا۔ ''دھوکا تو نہیں دو گے۔ میں کہیں کی نہ رہوں گی۔''

کنہائی نے ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ''گنگا جل کی قسم میں اور تجھے دھوکا دوں۔ آج سے تو میری اور یہ گھر تیرا ہے۔ اس بھک منگے سے اب تیرا کوئی تعلق نہیں رہا۔

یہاں رہ اور حکومت کر! میں چندا نہیں ہوں کہ مٹی ڈالنے میں بات بات پر لوگوں کے جوتے کھاؤں اور سن کر ٹال دوں۔۔۔ مگر۔۔۔ مگر تو چلی تو نہیں جائے گی؟''

''میرے ایک بالک نہ ہو جو تمہیں دھوکا دوں۔''

کنہائی نے بے قابو ہو کر اس کا ہاتھ زور سے دبا دیا اور کوٹھری میں گھس کر دروازہ بند کر لیا۔ بوندیں پھر پڑنے لگی تھیں۔ آسمان صاف ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ زمین تھک کر گہرے گہرے سانس لینے لگی تھی۔

☆☆☆

بجلی کی طرح یہ خبر ساری بستی میں پھیل گئی۔ چندا نے جب لوٹ کر گھر خالی اور چولہا ٹھنڈا دیکھا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے سوچا کہ شاید پھولو میکے چلی گئی۔ بغیر کسی کے کہے سنے وہ سسرال چل پڑا۔ دو دن بعد جب وہاں سے لوٹا تو قدم بھاری تھے، دل میں نفرت اور غصے کا آتش فشاں کھول رہا تھا۔ ادھر کنجو نے آتے ہی یہ خبر سنائی۔ ''لالہ کہاں چلے گئے تھے روٹھ کر۔ بے چاری بہو کو کس کے حوالے کر گئے تھے۔ کنہائی مدد نہ کرتا تو بھوکوں مر جاتی۔''

چندا کے پیروں تلے سے زمین سرک گئی۔ سیدھا کنہائی کے آنگن میں جا پہنچا۔

پھولو اندر سے بولی۔ ''کیوں آئے ہو؟''

''کیوں آیا ہوں!'' چندا نے تڑپ کر کہا۔ ''حرام زادی تو یہاں بیٹھی ہے اور میں تجھے جہان بھر میں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔''

کنہائی گھر پر نہیں تھا، دکان پر گیا تھا۔ پھولو نے اندر ہی سے کہا۔ ''پھر آنا جب وہ آ جائیں ورنہ لوگ کہیں گے کہ دن دہاڑے غیر مرد گھر میں بیٹھا ہے۔''

چندا کی آواز حلق ہی میں پھنس کر رہ گئی۔ وہ دم بخود ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس پر بجلی گر پڑی ہے۔ پھر وہ اپنے آپ پر قابو پا کر بولا۔ ''چل بھئی، یہاں کیا کر رہی ہے! روٹی سینک دے چل کر۔''

پھولو بے شرمی سے ہنسی اور بولی۔ ''اب میں تمہاری نہیں ہوں سمجھے! جب تمہارے بھیا لوٹیں گے تو ان سے باتیں کرنا۔''

چندا اپنی جگہ سے نہیں اٹھا، پھر کنہائی کے آتے ہی لڑائی شروع ہو گئی۔ جب ہاتھا پائی تک نوبت آ گئی اور کوئی چارہ نہ رہا تو پھولو گھونگھٹ نکال کر دونوں کے درمیان کھڑی ہو گئی۔ شور و غل سن کر بستی کے چھوٹے بڑے سب جمع ہو گئے تھے، بیچ لڑائی کی فضا قائم رکھنے کے لیے خوانخواہ چیخ پکار میں مصروف تھے۔ کنہائی اور چندا بار بار ایک دوسرے پر جھپٹتے تھے۔ چندا جوان تھا اس لیے لوگ اسے پکڑ لیتے تھے۔ اس اثنا میں کنہائی کے وار زیادہ ہو گئے اور بیچ بچاؤ میں چندا زیادہ پٹ گیا۔

بے عزتی سے تلملا کر چندا رونے لگا۔ آنسو دیکھ کر لوگوں کے دل میں رحم پیدا ہونے لگا لیکن عورتوں نے مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ ''کیسا بچوں کی طرح رو رہا ہے۔''

چندا گھر آ کر بڑی دیر تک روتا رہا۔ اسے ساری برادری پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ اٹھا اور چوہدری پنچ مرلی کے دروازے پر جا بیٹھا۔ چوہدری کہیں سے سفیدی کر کے لوٹے تھے۔ ان کے ہاتھ پیروں اور گالوں پر سفید سفید پھینیں دکھائی دے رہی تھیں۔ انہیں معلوم تو تھا ہی، پھر بھی پوچھنے لگے۔ ''کیوں چندا کیسے آیا ہے؟''

چندا کا گلا بھر آیا۔ شرم سے اس کی آنکھیں نہیں اٹھ رہی تھیں۔ وہ کس منہ سے کہتا کہ اس کی موجودگی میں اس کی عورت دوسرے کے پاس جا بیٹھی! اس نے چوہدری جی کے پیر پکڑ لیے۔ چوہدری نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے حقہ سنبھالا اور سنجیدگی سے بولے۔

''تو کچھ کہے گا بھی یا روئے جائے گا۔''

چندا بولا۔ ''دادا ناک کٹ گئی، عزت خاک میں مل گئی۔''

''ارے کیسے۔'' چوہدری نے حیرت سے

پوچھا۔

''بہو تو بھیا کے گھر جا بیٹھی۔''

''وہ کیوں؟''

''کیا بتاؤں!'' چندا بڑے درد بھرے لہجے میں کہنے لگا۔

''غریب آدمی ہوں، صبح ہی گھر سے نکل جاتا ہوں اور شام کو آتا ہوں۔ دن بھر وہ گھر میں رہتی ہے، بھیا بھی رہتے ہیں، پھسلا لیا بے چاری کو! مٹھائی وٹھائی کھلاتے رہے، چٹانے والے کو پیسوں کی کیا کمی۔''

چوہدری نے سر ہلا دیا، کہا کچھ نہیں۔

چندا نے پھر کہا۔ ''دادا پنچ پرمیسروں کے رہتے غریبوں میں دھرم کا ایسا ناس ہوگا۔''

''تو پنچایت بلائے گا۔'' چوہدری نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''بڑا خرچہ لگے گا اور پھر ہارنے پر جرمانہ الگ دینا پڑے گا۔''

''ہاروں گا کیسے چوہدری! میں کیا جھوٹ کہہ رہا ہوں۔ وہ میری عورت ہے اور بیاہتا ہے۔ میں تو الٹے روپے لوں گا۔ میرے جیتے جی وہ دوسرے کے پاس جا بیٹھی ہے اور چھوٹے کی بڑے بھائی کے گھر بیٹھنے کی کوئی ریت بھی نہیں۔''

چوہدری نے پھر بھی جواب نہیں دیا، آہستہ سے اتنا بولے۔ ''جیسے تیری مرضی۔''

چندا اٹھ کر چلا آیا۔ راستے میں اسے یاد آیا کہ خرچ کو پیسا کہاں ہے! دو مہینے سے تو گھر کا کرایہ نہیں دیا تھا۔ اس نے سوچا کہ ایک گدھا بیچ دے گا جس سے پنچایت بھی ہو جائے گی اور کرایہ بھی ادا ہو جائے گا اور پھر تو کنہائی کو روپے بھرنے ہی پڑیں گے۔ پھولو بھی نہیں رہے گی۔ اپنی مرضی کا خرچ ہوگا اور جو پھولو واپس آ گئی تو کنہائی کو جرمانہ دینا پڑے گا۔ اب کے تو حرام زادی کو جوتے کی نوک تلے رکھوں گا، ایسا کہ وہ بھی یاد کرے گی۔ میں نے دلار کر کر کے بگاڑ دیا ہے اسے۔'' وہ سوچتا رہا۔

اِدھر کنجو اور دوسری عورتوں میں ٹھٹول بازیاں ہو رہی تھیں۔

لاجونتی نے کہا۔ ''اے بہنا! ایک آنکھ والا کیوں کر بیٹھی، دو آنکھوں سے ایسی کیا دشمنی تھی۔''

''روپے کی شان ہے بیٹی! روپے کی!'' چمپی ناک پر انگلی رکھتی ہوئی بولی۔

کنجو اپنے گیارھویں بچے کو دودھ پلا رہی تھی جو اپنے سب سے بڑے بھائی سے قریب قریب ستائیس سال چھوٹا تھا۔ وہ اپنے آپ مسکرائی اور کچھ گنگنانے لگی۔

سب جانتے تھے کہ پھولو بدمعاش ہے لیکن چندا کی مفلسی اس کے آڑے آ رہی تھی۔ شام ہو چکی تھی۔ ساری بستی اندھیرے کی چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں چراغ جل رہے تھے۔ لوگ کھانے پینے سے فارغ ہو کر اپنے اپنے صحنوں میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے وہی پرانے قصے، کسی کی شادی، کسی کا جہیز! ان چار دیواریوں میں ہونے والی گفتگو کا یہ سب سے محبوب موضوع ہوا کرتا ہے۔ بحث کرتے کرتے سب اپنے کچے مکانوں میں چپ چاپ سو جاتے اور ان کے گدھے خاموش کھڑے رہتے، کبھی سوتے، کبھی جاگتے! دراصل ان کے سونے جاگنے کا راز کھلتا ہی نہیں تھا۔

چوہدری پنچ نے کنہائی کے گھر قدم رنجہ فرمایا۔ ٹھیک اسی وقت کنہائی کوٹھری سے نکل رہا تھا، فوراً آگے بڑھ کر بولا۔ ''آؤ دادا آؤ!'' یہ کہہ کر بیٹھنے کے لیے پیڑھا رکھ دیا گیا۔ پھولو نے فوراً حقہ بھرا اور گھونگھٹ برابر کرتی ہوئی حقہ سامنے رکھ گئی۔ چوہدری نے کن انکھیوں سے اس کی وضع قطع، صورت شکل دیکھی اور حقے کا کش لیتے ہوئے سارا معاملہ سمجھ گئے۔ کنہائی نے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور پھر اٹھ کر اندر سے ایک بوتل نکال لایا۔

چوہدری نے ہنس کر کہا۔ ''ارے اس کی کیا ضرورت ہے۔''

کنہائی بولا۔ ''بات ہی کیا ہے دادا! تم کوئی

لیر تھوڑا ہی ہو۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ٹھرے کی بوتل کھول دی۔ چوہدری نے کلھڑ میں منہ لگایا اور کہنے لگے۔ ''اب تو مہنگی ہوگئی ہے، ہوگئی ہے نا۔''

''لڑائی کا زمانہ ہے نا دادا!'' کنہائی نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اب کون مہنگا نہیں ہوگیا۔ میں نہیں ہوا کہ تم نہیں ہوئے! اب تو موت کا خرچ بھی اتنا نہیں رہا جتنا کہ زندگی کا ہوگیا ہے۔''

دونوں ہنسنے لگے۔ انہیں ہلکا سا نشہ چڑھ چکا تھا اور اب کھوپڑی میں گھوڑے کی ٹاپیں لگنے لگی تھیں۔

''دادا! اب تمہارا ہی بھروسا ہے۔''

جھومتے ہوئے چوہدری بولے۔ ''تجھے کاہے کا فکر۔''

کنہائی نے خوشی میں فوراً خالی کلھڑ بھر دیا اور چوہدری کے ''ہاں ناں'' کرتے کرتے آدھی بوتل خالی ہوگئی اندر باہر چار سو اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔

☆☆☆

پنچایت بڑے زور شور سے ہوئی۔ چاروں طرف وہی ایک ذکر تھا۔ بستی کے سارے کمہار جمع ہو گئے تھے۔ چوہدری چبوترے پر آ بیٹھے۔ حقہ ہاتھوں ہاتھ گھومنے لگا۔ پہلا کش چوہدری نے لگایا اور ایک طرف سرکا دیا۔ ایک طرف کنہائی کھڑا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر سفید انگرکھا، صاف دھوتی اور شام ہو جانے کے باوجود آنکھوں پر چشمہ لگا ہوا تھا۔ پاس ہی پھولو گھونگھٹ نکالے بیٹھی ہوئی تھی۔ دوسری طرف چندا تھا۔ میلی دھوتی، پھٹا کرتہ اور بوسیدہ ٹوپی، مشین سے کٹے بالوں پر چپکی ہوئی تھی۔ چندا نے ساٹھ کا گدھا چالیس میں بیچ دیا تھا۔

چوہدری نے سنجیدگی سے پوچھا۔ ''تم نے کیا کیا۔''

چندا بولا۔ ''پنچ پرمیسر سین! چوہدری مہاراج نے پوچھا ہے کہ میں نے کیا کیا ہے! اس کا جواب دیتا ہوں۔ بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی کی عورت رکھ لی۔ وہ اس کی لڑکی کے برابر ہے۔''

''رکھ لی ہو، یہ ہم میں کوئی عیب نہیں!'' چوہدری نے ٹوکتے ہوئے کہا۔ ''اونچی ذاتیں بڑی بھاوج کو ماں سمان سمجھتی ہیں مگر ہمارے ہاں تو یہ قاعدہ نہیں۔ یہ برہمن اور کھتری ذاتوں کی رسم ہے، ہم تو نیچ کہے گئے ہیں۔ اچھا اور کہہ ڈال۔''

چندا کا پہلا ہی وار خالی گیا۔ وہ بے بس ہوگیا، پھر بھی اس نے دوسری گزارش کی۔ ''وہ میری زندگی میں دوسری جگہ گئی ہے، مجھے اس کا عوض ملنا چاہیے۔''

چندا بیٹھ گیا۔ پنچوں کے سر ہلے، سرگوشیاں ہونے لگیں اور ایک ہلچل سی مچ گئی۔

چوہدری نے پھر کہا۔ ''کنہائی! بولو تم نے لڑکی کو گھر میں کیسے ڈال لیا۔''

کنہائی نے آہستگی سے کہا۔ ''چوہدری مہاراج! انصاف کریں! گھر میں بھوکی عورت آئی، اس کا آدمی اسے روٹی تک نہ دے سکا۔ میں نے یہ سوچ کر کہ گھر کی عورت دربدر کی ٹھوکریں کھائے گی، اس سے کہا، یہیں رہ جا! تیرا ہی گھر ہے مجھے کون سا چھاتی پر لاد کر لے جانا ہے۔''

چوہدری نے کہا۔ ''پنچ سنیں اور پھولو کہے کہ کنہائی نے ٹھیک کہا۔ کیا چندا کے گھر تجھے کھانا نہیں ملتا تھا۔''

پھولو نے اقرار کیا۔

چوہدری نے کہا۔ ''پنچ بتائیں عورت اسی وقت تک رہے گی جب تک مرد اسے روٹی دے گا، بھوکی تو نہیں مرے گی۔''

کنہائی نے پھر کہا۔ ''پھولو سے شادی کے بعد چندا نے وعدہ کرنے کے باوجود اسے زیور بھی نہیں دیے۔''

چندا گرج پڑا۔ ''میں نے کوئی وعدہ خلافی نہیں کی، یہ سب جھوٹ ہے۔''

چوہدری نے اسے روک کر کہا۔ ''پھولو! بتا کس نے ٹھیک کہا۔'' پھولو نے پھر اشارے سے کنہائی کی بات کو ٹھیک ثابت کیا۔ چندا خون کا گھونٹ پی کر چپ ہوگیا۔

چوہدری نے کہا۔ ''بات اور صاف ہوگئی جیسے بڑے کی چھوٹے نے کی ویسے چھوٹے کی بڑے نے کی! زیور نہیں دیے، وعدہ خلافی کی اور روٹی بھی نہیں دی تو پھر وہ کیوں چندا کے ساتھ رہتی! پنچ بتائیں کس کا قصور ہے؟''

پنچ پھر مشورہ کرنے لگے۔

چندا نے اٹھ کر کہا۔ ''پنچ پرمیسر کی دہائی! چوہدری بھگوان کے اوتار ہیں۔ جیسی روکھی سوکھی میں نے کھائی، اسے بھی کھلائی۔ گھر گرہستی میں عورتیں مرد کے پیچھے چلتی ہیں۔ اس میں میری کیا غلطی ہے۔'' پنچ پھر سوچنے لگے۔

خاموشی ہونے پر چوہدری نے کہا۔ ''چندا روپے مانگتا ہے کہ اس کی عورت دوسری جگہ چلی گئی۔ اگر اس نے دوسری شادی کر کے پھولو کو چھوڑا ہوتا تو جب تک پھولو اپنا دوسرا ٹھکانا نہ کر لیتی، اس وقت تک اس کے روٹی کپڑے کا خرچ چندا کو دینا پڑتا۔ قاعدے کے مطابق چندا کو روپے ملنے چاہیں! وہ خود غریب ہے۔ جیسا اس نے کھایا وہی کھلایا۔ باپ نے بیٹی دیتے وقت کیوں نہیں سوچا! اب رہی یہ بات کہ پھولو رضامند نہیں ہے تو اسے فاقہ کرنے پر مجبور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جو پرورش کو دے وہی زندگی بھر کا ساتھی ہے۔''

ایک بار پھر ہلچل مچ گئی۔ چوہدری نے جیسے ہاتھ دھو لیے تھے۔ انہیں تو اب فیصلہ سنا دینا رہ گیا تھا۔

پھولو ابھی تک خاموش کھڑی تھی۔ بازی کمزور پڑ رہی تھی۔ یہ چیز اس کے لیے ناقابل برداشت تھی! اس سے تو وہ بدچلن ثابت ہو جائے گی، ساتھ چھوڑ دیا تو بے جا نہیں کیا مگر یہ روپے دینا تو سخت بے عزتی ہے۔ اس نے بھری پنچایت میں آگے بڑھ کر کہا۔ ''چوہدری بھگوان ہیں، پنچ پرمیسر ہیں۔ عورت مرد کی ہے مگر جو مرد بھی نہ ہو، عورت اس کی نہیں ہو سکتی۔''

سب سکتے میں آ گئے۔ پنچایت اٹھ گئی اور چندا پر پچیس روپے جرمانہ ہوا جو اس نے غصے میں وہیں پھینک دیا اور ہار کر گھر لوٹ آیا۔ اسے کہیں منہ دکھانے کی گنجائش نہیں رہی۔ اب اس کی شادی بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ بھری پنچایت میں پھولو نے اس کی ٹوپی اتار کر پیروں میں مچل ڈالی تھی۔ یہ ایسی بات تھی جس میں پھولو کی بات آخری فیصلہ تھی۔

کنہائی پھولو کو لے کر لوٹ آیا۔ رات کو کنہائی اور چوہدری نے ٹھرے کی بوتل کھولی اور دونوں نے جی بھر کر پی۔ جب رات زیادہ گزر گئی تو چوہدری لڑکھڑاتے ہوئے چلے گئے۔ پھولو خاموش بیٹھی نہ جانے کیا سوچ رہی تھی اور کنہائی نشے میں چور آنگن میں اوندھے منہ پڑا تھا۔

☆☆☆

دوسرے دن شام کو مکان دار نے چندا کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ چندا نے چپ چاپ ہاتھ پر کرایہ دھر دیا۔ وہ جھوم رہا تھا اور اس کے منہ سے دارو کی بدبو آ رہی تھی۔ مکان دار خاموشی سے لوٹ گیا۔

چندا لوٹ کر پھر پینے لگا اور بکنے لگا۔ ''بیٹا کنہائی! چھنال تو چھنال ہی رہے گی۔ تیری بہار بھی کتنے دن کی ہے۔ اب گرہستی گلے میں پڑی ہے۔ دو دن بعد تیری بھی شان دیکھوں گا، ہاتھ پاؤں ڈھیلے نہ ہو جائیں تو کہنا لیکن میں اب مزے کروں گا۔ چٹانے کو میرے پاس بھی پیسے ہو جائیں گے، سمجھا! بھگوان سمجھے گا تجھ سے پاپی کمینے کو۔''

وہ دیر تک بکتا رہا زور زور سے سنا کر بکتا رہا۔ کنہائی نے سنا اور شک آمیز نگاہ سے پھولو کی طرف دیکھا۔ اس کا دل اندر ہی اندر کانپ اٹھا۔ پھولو شاید سمجھ گئی۔ کنہائی کی چندری کے آنچل میں بیس روپے بندھے ہوئے تھے۔ پانچ پنچایت میں لگ گئے تھے۔ اس نے وہ بیسوں روپے چندا کے آنگن میں پھینک دیے اور زور سے بولا۔ ''جھوکا مت مر! تیرے دھن سے میں بن نہیں جاؤں گا۔ اپنے چٹانے کو بڑا مکھی کا چھتا لگا رکھا ہے نا۔''

کنہائی نے سنا، روپے چندا کے آنگن میں گرے اور بکھر گئے مگر چندا اس وقت نشے میں مدہوش پڑا تھا۔ اسے کچھ معلوم نہ ہوا۔ پھولو آگے بڑھ آئی اور کنہائی کی طرف دیکھا۔ ایک بے اختیار ہنسی اس کے بند بند کو گدگداتی ہوئی ہونٹوں پر آ کر چپک گئی۔

پھولو نے کنہائی کی گردن میں بانہیں ڈال دیں۔ کنہائی نے اندر ہی اندر محسوس کیا کہ پھولو بہت جوان تھی اور وہ زوال پر تھا۔ اس کی سماعت میں وہ الفاظ گونج رہے تھے جو پھولو نے چندا کے لیے بھری پنچایت میں کہے تھے۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے پھولو نے وہ الفاظ چندا کے بجائے اس کے لیے کہے تھے۔ ''عورت مرد کی ہے مگر جو مرد بھی نہ ہو، عورت اس کی نہیں ہو سکتی۔''

لوگوں کو جرائم اور کردہ گناہوں کی سزائیں ملتی تو دیکھی گئی ہیں، مگر بعض لوگوں کو تقدیر کی عدالت، قسمت کے کٹہرے میں کھڑا کرکے دنیا کی سب سے بڑی سزا سنا دیتی ہے اور وہ بھی ناکردہ گناہوں کی پاداش میں۔

تقدیر کا فیصلہ

آر۔ کے۔ ثناگر

اپنوں کی بے حسی پر مشتمل ایک معاشرتی کہانی

اس زمین پر بڑے بڑے مجرم اور منافق دندناتے پھرتے ہیں اور انہیں احساسِ جرم تک نہیں ہوتا، بلکہ تفاخر سے مزید اکڑ کر چلتے ہیں، اس کا تو پھر جرم بھی کوئی نہیں تھا، پھر بھی قصوروار ٹھہری تھی۔

اسے تو تقدیر کا فیصلہ سہنا پڑا تھا کیونکہ یہ اس کے اپنے اختیار میں تو نہ تھا کہ اس کا رنگ کالا تھا اور نہ ہی ایک خوب صورت وجیہہ شخص سے رشتہ جوڑنے میں اس کی منشا شامل تھی۔ اس کو بھی وہ اپنی زندگی میں، اپنی خوش قسمتی اور تقدیر کا انعام سمجھتی آ رہی تھی جو کہ اس کے بے قصور ہونے کے باوجود اس کی سزا بن گیا تھا۔ یہاں تو گورے چہروں کے پس منظر میں کالے حسن لیے لوگ تفاخر سے گردن اکڑا کر چلتے ہیں اور وہ خوبیوں کو اپنی ذات کا حصہ بناتے ہیں، نمائش پرست دنیا کی آئیڈیل ازم کی تلاش میں سرگرداں سوسائٹی کی بھینٹ چڑھ گئی۔ وہ اپنے وجود کی روشنیوں کو دکھا ہی نہیں سکی تھی اور سیاہ ذہنیت کا

شکار ہوگئی تھی۔

وہ دو ہی بہنیں تھیں۔ زاہرہ اور مائرہ ان کا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔ زائرہ بڑی تھی اور خوب صورت تھی۔ کھلتی گندمی رنگت پر بڑی بڑی کالی آنکھیں بہت خوب صورت تھیں۔ اس کے نقش بھی خدا نے فرصت میں بنائے تھے شاید۔ مگر زائرہ کی پیدائش پر کچھ ایسی پیچیدگیاں ہوئیں کہ اماں مستقل بیمار رہنے لگی تھیں۔ وہ اتنی جلدی دوسرے بچے کی پیدائش کی متحمل نہیں تھیں، مگر سال بھر بعد ہی مائرہ کے دنیا میں آنے کے آثار پیدا ہوئے تو اماں کی طبیعت مزید خراب رہنے لگی۔ اماں بیمار تھیں، دوائیوں کا استعمال کرتی تھیں شاید اسی وجہ سے جب مائرہ نے جنم لیا تو وہ بہت کمزور تھی اور رنگت میں بھی بچوں والی معصومیت اور گلابی رنگت عنقا تھی۔ اماں نے ذرا بھی خوشی یا دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا بلکہ اسے دیکھ کر منہ پھیر لیا تھا۔ جب لیڈی ڈاکٹر نے کہا تھا کہ بچی بہت کمزور ہے تو بھی اماں کو شاید افسوس نہیں ہوا ہوگا۔ ہاں البتہ جب اس کی صحت ذرا بحال ہوئی تھی اور ہاتھ پاؤں چلانا شروع کردیے تھے تو اماں نے ایک دن پریشانی کے عالم میں ابا سے کہا تھا۔

''دیکھتے ہو کیسی چوہیا سی ہے۔ رنگ بھی دبتا سا ہے۔ لڑکی ذات ہے۔ مجھے تو ابھی سے پریشانی لگ گئی ہے۔''

وہ جیسی بھی تھی اماں کی بیٹی تھی۔ ان کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔ پھر اولاد تو جیسی بھی ہو کالی کلوٹی، بدصورت، والدین کے وجود کا حصہ ہوتی ہے۔ وہ بھی بہرحال اماں کے وجود کا حصہ تھی اور انہیں اس کی بہت فکر تھی۔ ابا جو اماں کی بیماری اور نازک حالت کے پیش نظر اس پر توجہ ہی نہیں دے سکے تھے۔ غور سے اس کمزور ننھے سے وجود کو دیکھنے لگے، پھر اماں کے بیمار شکستہ چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے تسلی دی۔

''تم فکر نہیں کرو اللہ بہتر کرے گا۔ تم اپنی دوائی تو باقاعدگی سے لے رہی ہو نا۔''

''ہاں وہ تو لے رہی ہوں، مگر کوئی فرق ہوتا نظر نہیں آتا۔ شاید میں بچ نہ سکوں زائرہ کے ابا!''

''پاگل ہوئی ہے کیا۔ ایسی باتیں نہ کیا کرو۔ میرا خیال نہیں تو ان بچیوں کا ہی خیال کرو۔ ان میں دل کو بہلا لیا کرو۔ ان کو تمہاری بہت ضرورت ہے۔ مجھے امید ہے تم بہت جلد صحت یاب ہو جاؤ گی۔''

ابا رڈر سے گئے تھے۔ اماں کی ناامیدی سے گھبرا کر ان کا دھیان بچیوں کی جانب موڑنا چاہا، پھر ایسا ہوا کہ اماں کی بیماری میں تو تھوڑا بہت افاقہ ہو، مگر وہ مستقل مریضہ بن گئی تھیں مگر مائرہ کی صحت اب آہستہ آہستہ بحال ہو رہی تھی۔ جب وہ چارپائی پر لیٹے ہاتھ پاؤں چلاتے ہوئے اماں، ابا کو پہچان کر مسکراتی تو اس کی گہری سانولی رنگت پر آنکھیں جگمگانے لگتیں۔ مگر زائرہ کی خوب صورتی کے سامنے وہ دب سی جاتی تھی۔ جب وہ ذرا بڑی ہوئیں اور دونوں مل کر باہر کھیلنے جاتیں تو دیکھنے والے فوراً کہتے۔

''کتنی پیاری بچی ہے۔''

مائرہ خاموش کھڑی رہتی۔

''زائرہ کی آنکھیں کتنی خوب صورت ہیں۔'' کوئی کہتا۔

زائرہ تھی بھی بھولی بھالی۔ ایک ہی نظر میں سب کو متوجہ کرلینے والے بچوں میں سے۔ اماں دونوں کے کپڑے ایک جیسے بناتیں، مگر سب ہی صرف زائرہ کے کپڑوں کی تعریف کرتے۔

''ارے واہ بھئی! آج تو زائرہ نے بہت خوب صورت کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔''

محلے کی کوئی عورت دیکھتی تو فوراً زائرہ کو گود میں اٹھا لیتی اور پیار کرتی۔

زائرہ چھ سال کی اور مائرہ ساڑھے چار کی تھی، جب بڑے ابا یعنی مائرہ کے تایا اسی شہر میں شفٹ ہوگئے۔ انہوں نے شہر کی معروف مارکیٹ میں گاڑیوں کے اسپیئر پارٹس کی اپنی دکان بنالی تھی۔ جو کہ اچھی خاصی چل نکلی تھی۔ تایا جب اس شہر میں آئے تھے چند دن گھر ٹھہرے اور اسی قیام کے دوران

تایا نے اپنے دونوں بیٹوں امیر اور جہانگیر کے لیے زائرہ اور مائرہ کا رشتہ مانگ لیا۔ تائی زائرہ کے لیے تو راضی تھیں۔ البتہ مائرہ کے رشتے کے سلسلے میں کچھ ہچکچائیں، مگر تایا نے تمام خدشات کو بالائے طاق رکھ کر بھائی کی دونوں بیٹیوں کے لیے دست سوال دراز کیا۔

ابا اور اماں کو بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ تایا اپنا کاروبار شروع کررہے تھے اور اپنا گھر بھی انہوں نے آتے ہی شہر میں خرید لیا تھا اور پھر اپنے تو اپنے ہی ہوتے ہیں۔ اپنوں میں دولت کی ناپ تول نہیں کی جاتی جب تایا نے بھائی بن کر زائرہ کے ساتھ مائرہ کو بھی اپنی بیٹی بنانا چاہا تو ابا نے بھی بخوشی و رضا سر خم کردیا تھا، تایا اپنے گھر تشت ہوئے تو قرآن خوانی کی تقریب میں خاندان والوں کے درمیان زائرہ اور مائرہ کی کنٹھی انگلیوں میں چھوٹی چھوٹی انگوٹھیاں پہنا کر گویا اس منگنی کا باقاعدہ اعلان کردیا گیا۔

اماں بہت خوش تھیں، انہیں مائرہ کی بہت فکر تھی کہ معمولی نقوش کے ساتھ اس کی رنگت بھی گہری سانولی تھی مگر اپنوں نے اس عیب کو چھپالیا تھا۔ اب تو تایا کا کاروبار خوب چمک رہا تھا۔ انہوں نے ابا کو بھی معقول تنخواہ پر اپنی دکان پر بٹھالیا ملازموں کی نگرانی کے لیے۔ اب گھر میں بھی معاشی تحفظ ہوگیا تھا کیونکہ اس سے قبل ابا نے کپڑے کی دکان بنائی تھی، مگر سرمایہ کی کمی کاروبار کی نامی کا سبب بن گئی تھی۔ وہ پریشان رہتے تھے، کچھ عرصہ کے لیے کریانہ کی دکان بھی بنائی تھی، مگر کچھ حاصل نہ ہوا تھا۔ چند دن کاروبار چلتا اور پھر ٹھپ بھی ہوجاتا تھا۔ پھر اماں کی بیماری پر بھی کافی خرچ ہوتا رہتا تھا۔ اس وقت بے وقت کی بیماری میں اماں بچت کی اسکیم کیسے بنا سکتی تھیں۔ انہیں تو اس بیماری کے باعث اپنی بچیوں کی ذمہ داری میں بھی غفلت برتنی پڑتی تھی جو ابا کی طبیعت پر بھی گراں گزرتی تھی اور ان کا دھیان گھر کی طرف لگا رہتا تھا، اماں کی بیماری اور بچیوں کی غیر مناسب پرورش کی جانب لگا رہتا تھا۔ جبکہ کاروبار کے استحکام کے لیے تو سرمایہ اور توجہ دونوں ضروری ہوتی ہیں۔ جب یہی دونوں عنصر غیر حاضر ہوں تو پھر نہ تو کاروبار چل سکتا ہے اور نہ ہی مرد ذہنی سکون حاصل کرسکتا ہے۔

ابا بھی ہر وقت ٹینشن میں رہنے لگے۔ پھر انہوں نے گھر کے کام کاج اور بچیوں کی چھوٹی موٹی ضروریات کا خیال رکھنے کے لیے ملازمہ رکھ لی، اب کسی حد تک گھر کی جانب سے انہیں تسلی ہوئی تو معلوم ہوا کہ کاروبار خرچ اور آمدنی کے توازن کے ساتھ نہیں چل رہا تو انہیں مزید پریشانی کا سامنا کرنا پڑا مگر اب تایا کے ساتھ کاروبار میں شریک ہونے سے وہ مطمئن اور آسودہ حال تھے، پھر بھائی کی آمد سے ان کو کافی ڈھارس بندھی تھی، ان کے ساتھ مل بیٹھنے سے وہ اپنے دکھ سکھ بانٹ لیتے تھے۔

اب انہیں بچیوں کی جانب سے بھی تسلی ہوگئی تھی۔ جب وہ گھر آتے دونوں صاف ستھری فراکوں میں ملبوس پریوں کو دیکھ کر خوش ہوجاتے دونوں اپنے ابا کو دیکھ کر ان کی ٹانگوں سے لپٹ جاتیں، وہ انہیں گود میں اٹھا کر سینے سے لگا لیتے اور پیار کرتے۔ دونوں میں ان کی جیسے جان تھی اور دونوں سے ایک جیسا پیار کرتے تھے۔ ایک جیسی چیز دیتے تھے اور ایک جیسا رویہ اور سلوک روا رکھتے اور رکھتے بھی بھلا کیوں نہیں آخر وہ دونوں ان کی بیٹیاں تھیں، اولاد تھیں اور اولاد کیسی بھی ہو والدین کو پیاری لگتی ہے۔ یہ دونوں تو معصوم ننھی بچیاں تھیں، اس لیے دونوں کے لیے باپ کی شفقت کا پیمانہ ایک ہی مقدار میں تھا۔ اس لیے بھی مائرہ کو باپ سے زیادہ لگاؤ تھا وہ باپ کو زیادہ پسند کرتی تھی کہ وہ دوسرے لوگوں کی طرح زائرہ کو اس پہ ترجیح نہیں دیتے تھے۔ اسے بھی اتنا ہی پیار کرتے تھے جتنا زائرہ کو کرتے وہ تمام دن شدت سے شام کا انتظار کرتی تھی جب ابا آکر اسے اپنی مہربان بانہوں میں سمیٹ لیتے تھے۔

اب جبکہ تایا اسی شہر میں شفٹ ہوچکے تھے۔ دونوں بہنوں کے رشتے بھی طے ہوچکے تھے اور ابا کو معقول تنخواہ بھی مل جاتی تھی تایا سے۔ اب وہ مطمئن

تھے۔ کاروبار کی فکر نہیں تھی۔ انہوں نے دونوں بچیوں کو اسکول داخل کروادیا۔ تایا بھی ان کی پڑھائی کی حمایت میں تھے۔ پھر بدلتے حالات اور معاشرے کے رویوں کا تقاضا بھی یہی تھا۔ اب وہ دور کہاں تھا۔ جب لڑکیوں کو محض گھرداری سکھائی جاتی تھی۔ مگر یہ دور بھی نہیں تھا کہ ان جیسے دوسرے گھروں کی تمام بچیاں اسکول جاتی ہوں۔

امیر اور جہانگیر بھی تعلیم حاصل کررہے تھے۔ تایا نے ابا سے دونوں بچیوں کو اسکول داخل کروانے کو کہا۔ ابا خود بھی یہی چاہتے تھے۔ سو وہ اسکول جانے لگیں۔ محلے کی ساری لڑکیاں اسکول نہیں جاتی تھیں مگر زائرہ اور مائرہ جب سے صبح صبح سفید صاف ستھرے یونی فارم میں کندھوں پر بیگ لٹکائے اسکول جانے لگیں تو تمام سہیلیاں انہیں رشک سے دیکھتیں۔

زائرہ جب میٹرک میں آئی اور مائرہ نویں کلاس میں تھی جب تائی نے اماں سے زائرہ کی شادی کی بات کی۔ ابا نے تایا سے بات کی وہ چاہتے تھے کہ دو سال اور انتظار کرلیا جائے اور دونوں بیٹیوں کو ایک ساتھ رخصت کردیا جائے۔ مگر تائی نے یہ کہہ کر کہ جہانگیر ابھی پڑھ رہا ہے، بات ختم کردی۔

امیر ایف۔ اے کرنے کے بعد تایا کے ساتھ دکان چلا رہا تھا۔ امیر اور جہانگیر دونوں بھائی خوب صورت تھے بلکہ جہانگیر تو امیر سے زیادہ خوب صورت تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی شخصیت اور لباس کا بہت خیال رکھتا۔ ویسے تو امیر بھی کم نہیں تھا۔ اکثر مائرہ کے گھر آتا رہتا اور مائرہ کو تنگ کرتا۔

''مائرہ تمہیں کپڑوں کی دھلائی اور استری کی اچھی طرح پریکٹس کرلینی چاہیے۔ جہانگیر اپنے کپڑوں پہ چھوٹا سا داغ پسند نہیں کرتا۔ فوراً دوسرے کپڑے بدل لیتا ہے۔''

''اچھا تو آپ تو جیسے بڑے مست ملنگ ہیں۔ ہر وقت تو تیار رہتے ہیں خوشبو میں نہائے ہوئے۔''

وہ جواباً چوٹ کرتی۔ جو خود اچھے خاصے صاف ستھرے کلف لگے کپڑوں میں ملبوس ہوتے۔

''نہیں بھئی۔۔۔ ہم تو بڑے صابر و شاکر بندے ہیں جو ملے گا بلکہ جو دیا جائے گا پہن لیا کریں گے اور پھر دکان پر ہی تو بیٹھنا ہوتا ہے۔''

پھر ذرا رازداری سے اس کی جانب جھک کر کہتے۔

''دراصل ابھی کپڑے بدل کر ادھر ہی آرہا ہوں۔ کپڑے بدل کر پہلا خیال اسی طرف آنے کو آتا ہے۔'' بات کرتے ہوئے وہ کن انکھیوں سے ذرا فاصلے پر بظاہر کتاب کھولے زائرہ کی طرف ہی دیکھتے رہتے۔

''وہ کیوں بھائی۔'' مائرہ حیرانگی ظاہر کرتی۔

''بے وقوف ہو تم، سمجھا کرو نا۔'' زائرہ نے مسکراہٹ دباتے ہوئے چہرہ چھپانے کی غرض سے کتاب سامنے کرلی۔ امیر ہر تیسرے دن کسی بہانے ادھر موجود ہوتا۔ جبکہ جہانگیر کبھی کبھار ہی آیا کرتا۔ وہ پھر بھی خوش رہا کرتی تھی اور جہانگیر کو پسند بھی کرتی تھی۔ وہ سوچا کرتی اگر ہماری بچپن میں منگنیاں نہ ہوئی ہوتیں، تب بھی امیر بھائی زائرہ کو اور میں جہانگیر کو ضرور پسند کرتے۔ یہ اور بات ہے کہ امیر بھائی زائرہ کو یا جہانگیر مجھے پسند کرتا یا نہیں۔ اپنی سوچ پر وہ خود ہی ہنس دیتی۔

جہانگیر تھا ہی اس قابل کہ اسے چاہا جاتا۔ وہ خود کو اس حوالے سے بہت خوش قسمت تصور کرتی تھی۔ اسے ہی سوچا کرتی اور پسند کرتی تھی۔ ایک بار اس کی ایک سہیلی نے بڑے عجیب انداز میں اس سے پوچھا تھا۔

''ہائے مائرہ! تمہارا منگیتر تو بہت خوب صورت اور اسمارٹ ہے کیا وہ بھی تمہیں پسند کرتا ہے؟''

ایک سایہ سا مائرہ کے چہرے پر لہرا گیا۔ ایک لمحہ کو تو اس کی سانولی رنگت مزید سانولی ہوگئی۔ وہ صاف پہچان گئی تھی کہ وہ اس کی شکل اور رنگت پر چوٹ کررہی تھی۔

''پتا نہیں۔'' آہستگی سے کہہ کر اس نے بات تو

نعم کردی تھی، مگر تب سے کبھی کبھار وسوسے اس کے دماغ میں جگہ بنانے لگے تھے۔

اس سے قبل تو وہ ویسے بھی کم عمر تھی۔ اتنا شعور نہیں تھا۔ اتنا جانتی تھی جہانگیر کا نام اس کے نام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ وہ صرف اسی بات کو دھیان میں رکھتی تھی اور مگن رہتی تھی۔ اسے خود پر اعتماد تھا۔ پھر لائق بھی تھی پڑھائی میں زائرہ سے بہت بہتر تھی۔ لڑکیوں کو اس کی کم شکل اور رنگت پر چوٹ کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ اس کی قابلیت اور کچھ زائرہ کی خوب صورت اور اس کی بہن ہونے کے ناتے لڑکیاں اس پر کافی توجہ دیتی تھیں۔

مگر اب وہ امیر بھائی کی زائرہ میں دلچسپی اور ان کے گھر میں بار بار چکر لگانے سے چاہت کے رنگ پہچاننے لگی تھی۔ ویسے بھی محبت کا یہ فطری تقاضا ہوتا ہے کہ جس کو چاہا جائے دل اسے بار بار دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کی توجہ چاہتا ہے۔ مگر جہانگیر جو پہلے کبھی کبھار آجاتا تھا، اب تو تایا اور تائی کے ساتھ بھی نہیں آتا تھا۔ وہ وسوسوں کا شکار ہونے لگتی کہ شاید جہانگیر مجھے ناپسند کرتا ہے، مگر ساتھ ساتھ دل کو بہلا بھی لیتی تھی کہ آخر کو وہ اس کا تایا زاد بھی ہے۔ اگر اسے ناپسند کرتا تو کہہ دیتا کسی نے زبردستی تو نہیں کی تھی، بے شک بات بچپن میں طے کی گئی تھی، جب انہیں اس رشتے کا مفہوم بھی معلوم نہیں تھا مگر اب وہ باشعور تھے۔ اپنی پسند اور ناپسند کا اظہار کر سکتے تھے۔ مگر جہانگیر نے اب تک ایسا کبھی نہیں کیا تھا۔

زائرہ کے میٹرک کے امتحان شروع ہوئے تو اماں نے اس کی شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ امتحان کے فوراً بعد اس کی شادی کی تاریخ طے کر دی گئی تھی۔ وہ بھی خوش تھی، ابا بھی مطمئن کہ ایک بیٹی کے فرض سے سبک دوش ہو رہے تھے۔ گو کہ ان کا ارادہ دونوں کو ایک ساتھ رخصت کرنے کا تھا مگر بھاوج کی ضد کہ ابھی جہانگیر کو بہت پڑھنا ہے۔ امیر تو کاروبار کی طرف لگ گیا ہے تو اس کا گھر بھی بسا دیا جائے۔ ابا کو بھی خدشہ ضرور ہوا، مگر بھائی اور بھاوج نے انکار تو نہیں کیا تھا، انہیں بھائی پر بہت اعتماد تھا اور بھروسا تھا خون کے رشتوں پر۔

گھر میں شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ خوشی کی آہٹیں سنائی دے رہی تھیں، مگر تقدیر کے فیصلے پوشیدہ ہوتے ہیں اور لوگوں کو ہمیشہ سے ان ہی کے تابع ہونا پڑتا ہے۔ اپنی مرضی اور منشا انسان ہر معاملے میں نہیں اپنا سکتا۔ گیلی ریت پر کھڑے سمندر کی سطح پر اٹھتی پرسکون لہروں کے اندر چھپے طوفان کو ہم نہیں پہچان سکتے۔

اماں جو اب ٹھیک تھیں، اچانک ان کی طبیعت بگڑ گئی۔ زائرہ اپنا آخری پیپر دے کر خوشی خوشی گھر آئی تو صحن میں امیر کو متفکر کھڑے پایا۔ اسے دیکھتے ہی وہ اس کی جانب لپکا۔

''ایک بری خبر ہے۔''

اس کا دل انجانے خدشوں سے دھڑکنے لگا۔ وہ ایک ٹک امیر کے چہرے پر کسی طوفان کی آمد سے قبل کا خوف ناک اور وحشت زدہ منظر دیکھ رہی تھی۔

''چچی کو ہسپتال لے گئے ہیں۔''

''کیوں۔ کب؟'' بہت آہستہ اس کے لب ہلے تھے۔

''میں تمہاری وجہ سے یہاں رکا تھا۔ تم کپڑے بدل لو، ہم بھی وہیں چلتے ہیں۔'' اسی وقت دھڑ سے بیرونی دروازہ کھلا تھا اور تایا لب بھینچے آنکھوں میں بے یقینی کا تاثر لیے اندر داخل ہوئے۔

''ہم ابھی آنے والے تھے۔'' امیر نے کہا۔

''اس کی ضرورت نہیں اب۔'' انہوں نے سر جھکا لیا۔

''وہ ہسپتال سے اور اس دنیا سے بہت دور چلی گئی ہیں۔''

''کیا۔۔۔؟''

یہ سب بہت غیر متوقع اور غیر یقینی تھا۔ گھر میں جب خوشی کی آہٹیں، شادیانوں کی گونج سنائی دے رہی تھی، ایسے میں موت کا ہولناک نقارہ بجا دیا گیا تھا۔ جس نے خوشی کی، سکون کی تمام نشانیوں کو اپنی

لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اب وہاں کچھ بھی نہیں تھا سوائے بے یقینی کے۔ ہر آنکھ میں ایک سوال تھا۔ ایسا کیوں ہوا؟ مگر اس کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔

ابا بہت نڈھال سے ہوگئے تھے۔ بیٹیوں کو کیا سنبھالتے۔ ان کو کیا سہارا دیتے۔ ابا کو اماں سے بہت محبت تھی۔ دکھ سکھ میں دونوں نے ایک دوسرے کا ساتھ بہت ہمت اور حوصلے سے دیا تھا۔ کسی کی زبان پر حرف شکایت نہیں آیا تھا کبھی، دونوں کی محبت اور ہم آہنگی پورے خاندان میں مشہور تھی۔

اماں جب زائرہ کی پیدائش پر بیمار ہوئی تھیں تو ابا بہت خوف زدہ رہنے لگے تھے۔ مائرہ کی پیدائش پر تو اماں کی حالت بہت نازک تھی اور ابا بالکل ہی بے یقین سے تھے۔ ہر طرف سے غافل ہوکر اماں کی تیمارداری کرتے اور ان کی صحت و تندرستی کی دعائیں کیا کرتے اور شاید ان ہی کی دعاؤں کا اثر تھا کہ وہ اب تک بیماری کا بہت حوصلے سے مقابلہ کرتی آرہی تھیں، ابا بہت شکر ادا کرتے اپنے رب باری تعالیٰ کا مگر اب جب ان کا وقت آیا تھا اپنی بیٹیوں کی خوشی دیکھتیں اپنی آنکھوں کے سامنے ہنسی خوشی انہیں رخصت کرتیں خود ہی دنیا سے رخصت ہوگئیں۔

یہ سانحہ بہت بڑا تھا۔ سب ہی ایک دوسرے کو تسلی دینے کی کوشش میں اپنے حوصلے جمع کرنے کی تگ و دو میں تھے۔ مگر وقت بہت بڑا مرہم ہے، زخم کی چبھن نہ بھی جائے جلد تو ہموار ہو ہی جاتی ہے۔ کاروبار دنیا کو اپنے انداز اور رفتار سے چلنا ہی تھا۔ سو سب کا متفقہ فیصلہ تھا کہ زائرہ کا خاموشی سے نکاح اور رخصتی کردی جائے۔ پھر بھی سنبھلنے میں دیر تو لگتی ہے۔

دو ماہ بعد زائرہ کا امیر سے نکاح کردیا گیا۔ ابا ابھی تک حواسوں میں نہیں تھے۔ بے یقینی کی فضا میں معلق تھے۔ سب انتظام تایا نے ہی کروایا۔ مائرہ اب اکیلی رہ گئی تھی۔ نڈھال اور شکستہ و ناامید ابا کے ساتھ۔ اس نے انہیں بھی سنبھالنا تھا اور خود کو بھی۔ ابھی تو نجانے کتنی آزمائشیں تھیں اس کے لیے مگر اسے صرف ابا کا خیال تھا۔ ہمہ وقت ان ہی کی فکر رہتی۔ زائرہ بھی کم پریشان نہ تھی۔

ابا کو تو چپ کی مہر لگ گئی تھی۔ زائرہ کی خواہش تھی۔ مائرہ کا نکاح بھی ہوجاتا، پھر ابا کسی ایک بیٹی کے ساتھ رہ سکتے تھے۔ اس نے دبی زبان سے اس کا اظہار بھی کیا۔ مگر تائی اماں نے اس کے مشورے اور خواہش کو قابل قبول نہیں سمجھا تھا۔

سب آہستہ آہستہ سنبھلتے جارہے تھے۔ اب تو ابا بھی دکان کا چکر ایک آدھ بار لگا لیتے تھے۔

تایا بھی اس بات سے مطمئن تھے کہ دکان پر آجانا ہوگا تو زندگی کے دیگر امور میں بھی دلچسپی اور توجہ دینے لگیں گے۔

مائرہ میٹرک سے فارغ ہوئی تو ابا نے تایا سے اس کی رخصتی کی بات کی۔ تایا بھی متفق تھے۔

''ہاں میں بھی یہی چاہتا تھا۔ میں گھر میں بات کروں گا اور تمہاری بھاوج سے تیاری کرنے کو کہوں گا۔''

ابا مطمئن ہوگئے اور خود بھی رخصتی کے انتظامی و مالی امور کی انجام دہی کے پیمانوں پر سوچنے لگے۔ وہ سوچ رہے تھے کسی دن زائرہ کو بلوا کر کہیں گے۔ ماں کے ٹرنک کھول کر دیکھے جو کچھ ان کی ماں نے اس کے لیے جمع کر رکھا تھا وہ نکال کر دیکھ لے اور باقی چیزوں کے بارے میں بھی بہن کے ساتھ مل کر کچھ کرے۔

اس خیال کے ساتھ وہ پھر سے افسردہ ہونے لگے۔ اماں کی یاد پھر سے آنے لگی۔ اسے کیسے بیٹیوں کی ایک ایک چیز بنانے کا خیال رہتا تھا۔ انہیں خود تو کچھ معلوم نہیں تھا کہ کیا، کیا دینا ہے۔ ان کے پاس جو کچھ تھا، ان ہی دو بیٹیوں کا تھا اور سب کچھ انہوں نے بیوی کے ہاتھ میں دے رکھا تھا۔ وہ کل مختار تھیں گھر کی۔ کیسے ان کے جانے کے بعد سب کچھ بکھر گیا تھا۔

تیسرے دن زائرہ خود ہی آگئی اپنے دو سالہ بیٹے ٹیپو کے ساتھ، ابا خوش ہوئے کہ چلو وہ خود ہی آگئی ہے۔''

''بیٹا اب کچھ دن تمہیں ادھر ہی رہنا ہوگا۔''

''ہاں ابا میں خود بھی کچھ دن مائرہ کے ساتھ

چاہتی ہوں۔'' وہ چپ چپ سی تھی۔ ابا کو تشویش ہوئی۔

''کوئی بات تو نہیں ہوئی تیری تائی کے ساتھ لڑائی وڑائی یا ناراضی؟''

''نہیں ابا۔۔۔ آپ تو خوامخواہ پریشان ہوجاتے ہیں۔'' مسکرا کر اس نے ان کو مطمئن کر دیا۔

اگلے دن جب ابا نے زائرہ سے مائرہ کی شادی کی بات کی۔

''تمہارے تایا نے گھر میں بات کی ہوگی۔ کس تاریخ تک ان کا ارادہ ہے؟ ہم نے بھی تو آخر تیاری کرنی ہے۔''

''پتا نہیں ابا! مجھے تو نہیں معلوم۔ دراصل تائی ابھی جہانگیر کی شادی نہیں کرنا چاہتیں۔ اب وہ دوسرے شہر کے کالج میں پڑھتا ہے نا! وہیں رہتا ہے۔''

زائرہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھی۔ اس کے لہجے کی ٹوٹ پھوٹ اور جھکی نظروں سے مائرہ اور ابا نے بہت کچھ سمجھ لیا تھا، مگر خاموش ہی رہے۔ زائرہ بھی چند لمحوں کے لیے چپ ہوگئی، پھر ان دونوں کی غیر معمولی خاموشی سے گھبرا کر جلدی سے بولی۔

''ابا! آپ فکر کیوں کرتے ہیں ہماری مائرہ کون سی بوڑھی ہو رہی ہے اور پھر ہماری مائرہ کے لیے اور بھی بہت سے رشتے مل سکتے ہیں۔ اگر وہ نہیں چاہتے۔''

تھوڑے فاصلے پر بیٹھی مائرہ نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔ ابا بھی بے یقینی سے اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔ اسی لمحے دوسرے کمرے میں سویا ہوا ٹیپو جاگ گیا اور چیخ چیخ کر رونے لگا تھا۔ زائرہ کو باپ، بیٹی کی خاموشی، مگر خوف ناک سوالوں سے بچنے کا موقع میسر آ گیا۔ وہ جلدی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی اور ٹیپو کے پاس لیٹ کر اسے تھپکنے لگی۔

ابا چند لمحے یوں ہی بیٹھے رہے اور پھر اٹھ کر باہر صحن میں بچھی چارپائی پر لیٹ گئے۔ مائرہ کے وسوسے یقین کے لبادے پہنتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کے گرد منڈلانے لگے۔ وہ خوف زدہ ہو کر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھ گئی۔

زائرہ کہہ رہی تھی کہ ہماری مائرہ کے لیے بہت اچھے رشتے مل جائیں گے مگر کوئی زائرہ سے تو پوچھتا۔ بچپن سے لے کر اب تک جس کو اپنا سمجھتی آئی تھی۔ جس کے حوالے سے نجانے کتنے خواب پلکوں نے سنبھال رکھے تھے، چھپا کر رکھے تھے سب خواب اس نے مگر اب ٹوٹ کر کس قدر چبھن دے رہے ہیں آنکھوں میں۔ اب بھلا وہ کیونکر کسی دوسرے کے بارے میں سوچ سکتی تھی۔ اس کے لیے تو سب کچھ جہانگیر ہی تھا۔ جو ایک لمحے میں اس کے خیال کا ہاتھ جھٹک کر بہت دور کھڑا ہو گیا تھا۔

ابا نے تایا سے جواب طلبی کی تو انہوں نے بھی سر جھکا لیا کہ پہلے تو تائی شاید کسی مصلحت کے باعث خاموش ہو گئی تھیں، مگر اب انہوں نے میاں سے صاف کہہ دیا تھا۔

''میرے جہانگیر کو مائرہ پسند نہیں۔ میں اپنے بیٹے پر زبردستی نہیں کرنے دوں گی۔ پھر میرا جہانگیر پڑھ رہا ہے۔ پھر نوکری کرے گا میں تو پڑھی لکھی لڑکی لاؤں گی بیاہ کر۔''

''مائرہ ان پڑھ نہیں ہے۔ میٹرک کیا ہوا ہے اور پھر بچپن سے ان دونوں کی بات طے ہے۔''

تایا نے آہستہ آواز سے احتجاج کیا کیونکہ وہ خود بھی کسی حد تک جان چکے تھے کہ نہ تو ان کی بیوی اس رشتے پر رضامند ہے اور نہ ہی ان کا بیٹا۔

''آج کل میٹرک کو کون پوچھتا ہے۔ پھر مائرہ کا رنگ بھی کالا ہے۔ میرے اتنے خوب صورت بیٹے کے ساتھ وہ کیا جچے گی۔ تم خود ہی سوچو۔ تمہاری بھتیجی خوش نہیں رہ سکے گی۔'' تائی نے آخر میں مصالحانہ رویہ اختیار کیا۔

غم ایک دفعہ پھر صورت حال بدل کر ابا کے گلے لگا تھا۔ وہ کیا کر سکتے تھے، مجبور تھے۔ کسی پر زبردستی نہیں کر سکتے تھے۔ زائرہ اپنے گھر جا چکی تھی۔ وہ اپنی ایک بیٹی کا گھر دوسری کی خاطر برباد نہیں

کر سکتے تھے۔ پھر زائرہ نے بھی اپنی بے چارگی ظاہر کر دی تھی۔ بھلا کیا وہ نہیں چاہے گی کہ اس کی بہن اسی گھر میں بیاہ کر آئے۔ دونوں بہنیں ایک ساتھ مل کر رہیں۔ وہ تو اسی انتظار میں تھی مگر اسے ساس اور دیور کی پسند اور مرضی پر اختیار نہیں تھا۔

پہلے وہ اس کی تائی تھیں، اسے تو وہ پسند بھی کرتی تھیں، وہ خوب صورت اور کھلے رنگ کی جو تھی۔ پھر امیر بھی اسے پسند کرتا تھا۔ اس کا رشتہ طے کرنے میں تائی کی اپنی بھی منشا شامل تھی۔ مائرہ کی بات دوسری تھی، اپنے خوبرو بیٹے کے سامنے مائرہ انہیں بالکل چاند میں بدنما داغ کی مانند لگتی۔ پھر کس طرح اپنے بیٹے کو داغ لگا سکتی تھیں۔ ان کا بیٹا خود بھی بڑے شہر جا کر بہت بدل گیا تھا۔ اس کے خواب اور ارادے بدل گئے تھے۔ اس کی منزل مائرہ نہیں بلکہ کامیابیوں و کامرانیوں کی چمکتی دمکتی روشنیاں تھیں۔ مائرہ تو سیاہ اندھیرا تھی۔ ایسے میں زائرہ اگر اپنے گھر میں بہن کی حمایت میں کوئی بات کرتی بھی تو تائی اماں ایک دم سے روایتی ساس کے روپ میں سامنے آجاتیں، زائرہ کے لیے حالات کو سنبھالنا بہت مشکل ہو جاتا۔ اپنا گھر بھی پرایا لگنے لگتا۔ سو وہ بھی مجبور تھی۔

ابا کو شاید پرانی روایات اور بھائی کے عہد پر ابھی تک یقین تھا، اس یقین اور حوصلے کی بنا پر وہ خود بھاوج سے ملنے گئے۔ وہ صحیح طرح ملی ہی نہیں۔ وہ بات کرنے کا بھی حوصلہ نہیں کر پا رہے تھے، مگر بیٹی کا مستقبل ان کے سامنے تاریک ہو رہا تھا۔ بات کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ انہیں کوئی راستہ نظر بھی نہیں آرہا تھا کیونکہ بھائی کی جانب سے ناامیدی کے بعد جب ایک دو جگہ بات چلانے کی کوشش بھی کی تھی تو ان کا دماغ ہی چکرانے لگا تھا۔ برادری میں بھی لوگ کہتے ہیں۔

''بھائی صاحب! آپ نے برا کیا جو بچپن سے ہی لڑکی کی بات ٹھہرا دی۔ ٹھکرائی ہوئی لڑکی کو تو ویسے بھی لوگ مشکوک نظروں سے دیکھتے ہی اور پھر شکل صورت میں بھی لڑکی پوری نہیں اتری۔''

ابا پہلے ہی حالات کے ستائے ہوئے تھے۔ ا
کی وفات کے بعد خود کو بے بس اور اکیلا تصور کر
لگے تھے۔ ایک بھائی کا سہارا تھا۔ اس نے بھی د
بجانا شروع کر دیا تھا، ابا کے کھوکھلے وجود کی بنیاد
کمزور پڑنے لگی تھیں۔ وہ ہمہ وقت متفکر رہنے لگے۔

مائرہ نے ایک، دو بار ابا کو دبی زبان میں تس
دینے کی کوشش کی۔

''ابا میں آپ کے پاس رہوں گی۔ کہیں اور نہیں
جاؤں گی، مجھے آپ کی خدمت کرنا ہے اور بس۔''

مگر ابا جہاندیدہ تھے۔ عمر گزار چکے تھے، جان
تھے ایسا ہو نہیں سکتا۔ وہ سوچتے ان کے بعد اس
مستقبل کیا ہوگا۔ اس کا آسرا کون بنے گا۔ پتا نہیں م
مسئلہ اتنا گمبھیر تھا یا نہیں یا کوئی اور بات تھی جس نے ا
کے دماغ پر اثر ڈالنا شروع کر دیا تھا وہ اکثر باتیں
بھول جاتے یا پھر چار دن قبل کہی گئی بات کا جواب
چار دن بعد مائرہ سے پوچھنے لگتے، یا پھر کہتے۔

''مائرہ میرے کپڑے نکالو مجھے کہیں جانا ہے۔''

مائرہ کپڑے استری کر دیتی وہ پہن کر بال بنا کر
جاتے اور پھر تھوڑی دیر بعد واپس آجاتے۔ مائرہ
کے استفسار پر کہتے۔

''مجھے کہیں نہیں جانا۔ میں بھلا کس سے ملنے
جاؤں گا بیٹی! کون میرا بیٹھا ہوا ہے کہیں۔'' مائرہ کو
تشویش ہونے لگتی مگر چونکہ ایسا کبھی کبھی ہی ہوتا تھا
اور مائرہ اس کیفیت کو ابا کی بے جا سوچ و بچار اور تفکر
پر محمول کرتی تھی۔

اور اب بہت سوچ و بچار کے بعد ابا نے بھاوج
سے بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مائرہ سے پہلے مشورہ
کیا ہوتا تو وہ صاف انکار کر دیتی۔ مگر ابا نے بات کرنا
ضروری سمجھا، اس میں کوئی حرج بھی نہیں تھا ان کے
خیال میں۔ بچپن کی بات طے تھی اور اب انہیں
جواب طلبی کا حق تھا، مگر تائی نے صاف کہہ دیا۔

''بھائی صاحب! برا مت مانیے گا مگر سچ تو یہ
ہے کہ آج سے دس بارہ سال قبل بھی ہم ہی تھے کہ

مائرہ کے لیے ہامی بھرلی تھی ورنہ مائرہ جیسی لڑکی کو۔۔۔'' وہ ایک لمحہ کو چپ ہوئیں۔

''اب بچے جوان ہیں، ہم ان پر اپنی مرضی نہیں تھوپ سکتے۔ وہ اپنا برا بھلا خود سمجھتے ہیں۔''

''لیکن یہ ناانصافی ہے جب میری بیٹی پسند ہی نہیں تھی تو کیوں لیا تھا رشتہ۔'' ابا غم وغصہ سے چیخنے لگے۔

''کیا تھا تو کون سا اب ہم پر نماز، روزے کی طرح فرض ہوگیا ہے۔ ارے میں کہتی ہوں کہیں اور بات چلا کر دیکھ لو۔ کون پوچھے گا کالی کلوٹی کو۔ کون کرے گا شادی۔ ایک میرا ہی بیٹا رہ گیا ہے قربانی کے لیے۔ ہائے رہا کیا اسے ہمارے لیے زندہ رکھا تھا۔ اس سے بہتر تو تھا کہ مرجاتی پیدا ہوتے ہی۔ بیمار تھی تب ہی ختم ہوجاتی۔ پتا نہیں کس کی بددعا لگی تھی اور ہماری گلے پڑگئی۔'' وہ ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بڑبڑا رہی تھیں۔

ابا سکتے میں آگئے۔

''ہاں مرجاتی تو اچھا تھا۔'' وہ اپنے ہی خیال میں سر ہلانے لگے، پھر خاموشی سے اٹھ کر گھر آگئے۔

بعض لوگ جب بولنے پر آتے ہیں تو اپنے ہی الفاظ کے زہریلے پن کا اندازہ نہیں لگاتے کہ وہ کس انداز میں زہریلی برچھیاں مقابل کے سینے میں اتار رہے ہیں۔ وہ دل کی سطح پر پڑنے والی دراڑوں سے بے خبر ہوتے ہیں۔ کسی کے دل پر پڑنے والی چوٹ کی شدت سے انجان ہوتے ہیں۔

مائرہ کمرے سے نکلی تو ابا سر جھکائے چارپائی پر نڈھال سے بیٹھے تھے۔

''ابا۔۔۔!'' اس نے آہستگی سے پکارا۔

انہوں نے اس پکار پر سر اٹھایا اور ٹکٹکی باندھے اس کے تلخیوں کی سیاہی سے مزید سیاہ ہوتے چہرے کو سمجھنے لگے۔ پھر بے خودی کی کیفیت میں اجنبی لہجے میں بڑبڑانے لگے۔

''ہاں تُو مرجاتی تو اچھا تھا۔ تُو عذاب ہے میرے لیے، کون کرے گا تجھ سے شادی، کون کرے گا تجھ سے شادی۔''

''ابا یہ۔۔۔'' بے یقینی کے عالم میں اس کے لبوں نے بے آواز جنبش کی۔

مگر ابا تو جیسے بغیر دھیان دیے کہہ رہے تھے۔

''تُو مرجاتی۔۔۔ مرجاتی۔'' پھر وہ رونے لگے۔ بے تحاشا روتے روتے تھک گئے تو وہیں چارپائی پر لیٹ گئے۔

مائرہ کے لیے وہ رات بہت بڑا عذاب تھی۔ ایک کڑا امتحان تھی۔ وہ کیا تھی۔ باپ کے کمزور بوڑھے کندھوں کا بہت بھاری بوجھ۔ ابا اس کی وجہ سے پریشان رہتے ہیں، اب تو وہ اپنے دماغ پر اپنی سوچ پر اپنی گرفت بھی کھو رہے تھے۔

وہ تمام رات سوچتی رہی اور لمحہ لمحہ مرتی رہی۔

صبح دن چڑھے ابا کی آنکھ کھلی، کروٹ بدل کر انہوں نے دیکھا تو پورے گھر پر ایک غیر معمولی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ معمول کے مطابق مائرہ چولہے کے قریب ناشتا نہیں بنا رہی تھی مگر ایک لمحہ کو ابا کو لگا وہ صحن میں چل رہی ہے۔ پھر لگا وہ چولہے کے قریب بیٹھی ان کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے، پھر نیند سے بےدار ہوتی آنکھوں کو پورا کھول کر دیکھا۔

مائرہ کہیں بھی نہیں تھی۔

وہ اٹھ کر اندر آئے۔ وہ چارپائی پر بے خبر پڑی سو رہی تھی۔ ایک بازو چارپائی سے نیچے لٹک رہا تھا۔ وہ جلدی سے آگے بڑھے اور اسے جھنجھوڑا، مگر وہ واقعی کہیں نہیں تھی۔ صرف اس کا بے جان وجود تھا۔ جو نفرتوں اور ٹھکرائے جانے کے تیروں سے زخمی تھا۔

جو تیر اس کے وجود میں پیوست ہوئے تھے۔ وہ ابا کے وجود سے ٹھکرا کر آئے تھے، اس لیے وہ بہت جاں گسل تھے۔ وہ سہہ نہ سکی تھی۔ اس سے زیادہ آسان اپنی ہی سانسوں کی ڈوری کو توڑنا شاید اسے سہل لگا تھا۔

اور شام کو جب مائرہ کا جنازہ اٹھا سب دیکھ رہے تھے۔ آنسوؤں کی جھڑی میں ابا کے لب زخمی مسکراہٹ کے ساتھ بےخودی کے عالم میں بڑبڑا رہے تھے۔

''وہ مرگئی۔ اچھا ہوا۔ کون کرتا اس سے شادی، اچھا کیا چلی گئی۔''

دسویں قسط

لاوارث

غزالہ جلیل راؤ

انسان کسی بھی علاقے سے تعلق رکھتا ہو' کسی بھی ملک میں رہتا ہو' جہاں اس سے پیار کرنے والے ہوتے ہیں' وہیں اس سے نفرت کرنے والوں کا وجود بھی اس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ اس کو زمانے کے گرم و سرد سے بچانے والے' اس کو سایہ فراہم کرنے والے اس کے لیے جان نچھاور کرنے والے ہر جگہ' ہر علاقے میں اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ وہیں اس کے خلاف سازشیں کرنے والے' اس کی راہوں میں کانٹے بچھانے والے' اس کی زندگی کے دشمن بھی اس کے دوستوں کے روپ میں اس کے وجود کا حصہ بن کر رہتے ہیں۔

ایک ایسے ہی نوجوان کا قصہ' اس کے باپ کا پتا نہیں تھا..... لیکن اس کو ایک نیک فطرت شخص کا سایہ میسر آگیا تھا..... اس نے اسے ایک نئی زندگی دی تھی..... لیکن اس کی زندگی کے دشمن بھی اس کے ساتھ ساتھ ہی موجود تھے۔

قارئین عمران ڈائجسٹ کے لیے ایک سلسلہ وار انوکھی داستان

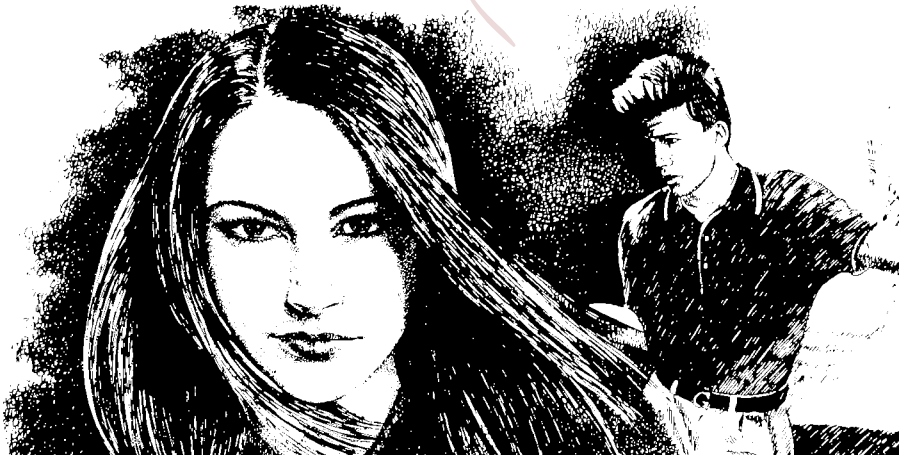

''نفیسہ صاحبہ! ایک خاتون کی حیثیت سے آپ میری نگاہوں میں بہت بلند ہیں اتنی کہ آپ کے حصول کی آرزو کی جاسکتی ہے، آپ کو پانے کا تصور نہیں کیا جاسکتا اگر تقدیر کسی طور آپ کو میری زندگی میں داخل کردے تو میں سمجھوں گا کہ مجھے زندگی بھر کی صعوبتوں کا صلہ مل گیا۔''

''گویا۔۔۔ گویا۔۔۔'' نفیسہ مسرت بھرے لہجے میں بولی۔

''ہاں نفیسہ۔۔۔! میں اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ میں آپ کو دل و جان سے پسند کرتا ہوں لیکن اب تک میری اس پسند میں آپ کے حصول کا احساس شامل نہیں ہوا تھا۔ آج سے میری بدنصیبی مجھے یہ دن بھی دکھادے گی میں آپ کے لیے ترسوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ مجھے نہیں حاصل ہوسکتیں تاہم اگر میرے اور آپ کے درمیان یہ دھاگے بندھ ہی چکے ہیں تو میں انہیں توڑنا نہیں چاہتا۔''

''عاقل۔۔۔! ہم پورے خلوص اور پوری سنجیدگی سے ایک دوسرے کی زندگی میں شامل ہونے کی کوشش کریں گے۔ باقی معاملات تقدیر پر چھوڑ دیں گے۔ ہم اس سلسلے میں کوئی ایسا عامیانہ قدم نہیں اٹھائیں گے جو ہماری شخصیتوں کو رسوا کردے لیکن اپنے طور پر جس حد تک جدوجہد ہوسکی کریں گے۔ لائیے اپنا ہاتھ مجھے دیجیے میں آپ کو یہ یقین دلانا چاہتی ہوں کہ میں آپ کو سچے دل سے پسند کرتی ہوں۔'' شیری سر کھجانے لگا تھا یہ نیا کھیل تو خود بخود شروع ہوگیا تھا جو اسے شروع کرنا چاہیے تھا۔

''ارے ہاں۔۔۔! پتا نہیں کیوں اب تک یہ بات سمجھ میں نہیں آئی ٹھیک تو ہے۔''

عاقل بابر علی صاحب کا ایک ادنیٰ سا ملازم ہے اس کی بیٹی کو مصوری سکھانے والا ماسٹر۔ ایک گھٹیا درجے کا انسان اور اگر اس گھٹیا درجے کے انسان کو بابر علی صاحب اپنا داماد قبول کرنے پر مجبور ہوجائیں تو ان کی ذہنی اذیتوں میں ایک اور اضافہ ہوگا اور میرا مقصد اس کے علاوہ اور کیا ہے۔ وہ پیچھے کھسکنا شروع ہوگیا۔ بعد کے مناظر میں وہ دخل اندازی نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن کھسک کر وہ اپنی رہائش گاہ کی طرف واپس نہیں گیا تھا بلکہ عاقل کی رہائش گاہ میں داخل ہوگیا تھا۔

عاقل کی امی سکون کی نیند سو رہی تھیں۔ ان دنوں ان کی طبیعت پھر کچھ خراب ہوگئی تھی اور ڈاکٹر کا علاج ہو رہا تھا۔ وہ عاقل کے کمرے میں جا بیٹھا۔ جس کا دروازہ ایسے کھلا ہوا ہی ملا تھا۔ کمرے میں تاریکی پھیلی ہوئی تھی اور شیری نے وہاں روشنی کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی تھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اسے قدموں کی چاپ سنائی دی اور چند لمحات کے بعد عاقل نے کمرے میں روشنی کردی لیکن روشنی ہوتے ہی اس کی نگاہ شیری پر پڑی اور وہ بری طرح اچھل پڑا۔ ایک لمحے کے لیے اس کے بدن میں کپکپی سی دوڑ گئی تھی۔

''آپ، آپ۔۔۔''

''ہاں۔۔۔ کیوں اتنی زیادہ حیرت کی بات تو نہیں ہے۔''

''نن۔۔۔ نہیں، حیرت کی بات نہیں۔ میرا مطلب ہے آپ کب سے یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔''

''زیادہ دیر نہیں گزری۔''

''مم۔۔۔ مگر اس وقت آپ۔۔۔''

''کمال ہے عاقل! تم تو اس طرح پریشان ہو رہے ہو جیسے تم کوئی عزت مآب حسینہ ہو اور میں حسن کا چور۔ بھائی تم سے ملنے آیا تھا۔ تم موجود نہیں تھے۔ میں نے سوچا کہ یہیں کہیں باتھ روم وغیرہ میں گئے ہو گے واپس آجاؤ گے۔ اس لیے انتظار کرنے بیٹھ گیا۔ اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔'' شیری نے کہا اور عاقل نے سکون کی گہری سانس لی۔

''کہاں گئے تھے؟'' شیری سپاٹ لہجے میں بولا۔ جس میں کوئی تجسس، کوئی تشویش نہیں تھی۔ عاقل صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے شیری کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ شیری چند لمحات اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔

''کچھ الجھے ہوئے سے ہو، کیا بات ہے۔''

''نہیں نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے بس آپ ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا کوئی کام تھا مجھ سے۔''

''گویا تمہاری خواہش یہ ہے کہ میں چلا جاؤں کسی کام کے بغیر یہاں نہیں آ سکتا۔''

''آپ غلط نہ سمجھیں شیری صاحب! شیری صاحب! دراصل میں صحیح الفاظ کا انتخاب نہیں کر پا رہا۔''

''اور میں تمہاری اس گھبراہٹ کی وجہ تم سے نہیں پوچھوں گا۔ بہرحال جس مقصد کے تحت آیا ہوں وہ تمہیں بتا رہا ہوں غور سے سنو۔'' شیری نے کہا اور عاقل ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''کوٹھی میں دو نئے افراد کا اضافہ ہو رہا ہے۔''

''جی ہاں۔۔۔! مجھے علم ہے۔''

''تم اس وقت وہاں موجود نہیں تھے لیکن میں نے ان پر بابر علی صاحب کی خصوصی توجہ دیکھی ہے۔''

''کون ہیں وہ؟'' عاقل نے کہا۔

''بقول بابر علی صاحب۔۔۔ ان کے عزیز ترین دوست کے بچے۔''

''پھر تو یہ توجہ فطری ہے، اس میں کوئی تشویش کی بات ہے۔'' عاقل سوالیہ انداز میں بولا۔

''ہاں ہے۔''

''مجھے سمجھایئے۔''

''بابر علی صاحب اپنی ذات سے بھی سرسری رویہ اختیار کرنے کے عادی ہیں وہ کبھی کسی کے لیے ضرورت سے زیادہ مخلص نہیں ہوتے۔ شاید تم نے اپنے بچوں کے ساتھ بھی ان کا رویہ محسوس کیا ہو۔''

''پھر آپ کے خیال میں توجہ کس لیے ہو سکتی ہے؟''

''میں وثوق سے کوئی بات نہیں کہہ سکتا عاقل! کیونکہ کوئی ثبوت نہیں ہے میرے پاس لیکن بابر علی صاحب سے میں محتاط رہنا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے یہ لوگ کسی خاص مقصد کے تحت یہاں آئے ہوں۔ یہ شبہ ہے میرا عاقل! ممکن ہے غلط ہو۔ لیکن ذہن میں رکھنے میں کیا حرج ہے تم یوں سمجھ لو میری چھٹی حس نے مجھے ہوشیار کیا ہے اور میں اس لیے پیش بندی کر رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، لیکن بابر علی صاحب انہیں کس مقصد کے تحت لا سکتے ہیں۔''

''عاقل! اس گھر میں صرف میری شخصیت ایسی ہے جو بابر علی صاحب کے لیے ناپسندیدہ ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ مجھے ایک لمحے کے لیے یہاں برداشت نہیں کر سکتے اس کی وجہ تم جانتے ہو۔''

''بدقسمتی سے نہیں جانتا۔''

''پورا گھر مجھے صرف پسند ہی نہیں کرتا ہے میرے اشاروں پر چلتا ہے۔ میں نے بابر علی صاحب کی ترتیب دی ہوئی لکیریں مٹا دی ہیں اور کچھ نئے خطوط ترتیب دیے ہیں اس گھر میں۔ ماشاءاللہ سارے بچے اب نئے خطوط پر سفر کر رہے ہیں اور بابر علی صاحب اس بات کو ناپسند کرتے ہیں۔ گھر کے دوسرے افراد تو وہ سنبھال لیتے ہیں لیکن معاملہ حیدر علی کا ہے۔ ان کے سامنے بابر علی صاحب کی نہیں چلتی اور حیدر علی صاحب اس گھر میں میرا وجود برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں بابر علی صاحب میرا طلسم توڑنے کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں، سمجھ رہے ہو۔''

''اوہ۔۔۔ آپ کا خیال ہے کہ بابر علی صاحب آپ سے اس قدر نفرت کرتے ہیں کہ آپ کے خلاف کوئی سازش بھی کر سکتے ہیں۔'' عاقل نے تعجب سے پوچھا اور شیری کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے پھر اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

''ہاں عاقل۔۔۔! یہ بات میرے سینے میں محفوظ ہے اور یقین کرو کہ بے مقصد نہیں ہے۔''

''میں مانتا ہوں شیری صاحب! آپ بے حد سمجھ دار انسان ہیں۔ آپ نے ضرور اس سلسلے میں کچھ محسوس کیا ہوگا۔ بہرطور میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ مجھ سے کیا کام ہے، بے تکلفی سے

فرمایئے۔'' عاقل نے کہا۔

''دیکھو عاقل! مجھے اس بات کا بہرطور خیال رکھنا ہے کہ بدر، صفدر، اکبر، نفیسہ اور انیسہ وغیرہ بابر علی صاحب کے بچے ہیں۔ وہ بہت عرصے سے ذہنی کھٹن کا شکار تھے لیکن ان کے ذہن کی گہرائیوں میں یہ احساس ضرور پرورش پا رہا تھا کہ جو کچھ ان پر گزر رہی ہے مناسب نہیں ہے۔ نیا وقت کچھ اور چاہتا ہے۔ نئے ادوار کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ بابر علی صاحب انہیں اس کی اجازت نہیں دیں گے۔ بس یوں سمجھو کہ وہ کسی کے دھکیلنے کے منتظر تھے۔ ان کے اندر خود اتنی جرات نہیں پیدا ہو پائی تھی، میں نے انہیں وہ جرات دلا دی۔ اب ان میں سے ہر شخص اپنے شوق کی تکمیل کی طرف گامزن ہے اور تم یہ بھی دیکھ رہے ہو گے عاقل! کہ میں نے ان میں سے کسی کو بھی جوئے یا شراب کی عادت نہیں ڈالی۔ کوئی ایسا کام نہیں کیا جو مستقبل میں ان کی شخصیت کو ختم کر کے رکھ دے۔ نفیسہ اگر مصوری سے شغف رکھتی ہے تو بہرطور میں نے تجرباتی طور پر اس کے شوق کی تکمیل کر ڈالی۔''

''تجرباتی طور پر۔۔۔۔''

''ہاں یار۔۔۔! بعض باتیں میرے ذہن میں بھی بری طرح کھٹکتی رہتی ہیں۔''

''مثلاً شیری صاحب!'' عاقل نے دلچسپی سے پوچھا۔

''نفیسہ کی مصوری۔۔۔ جس کے تم استاد ہو۔''

''جی ہاں! میں آج تک اس بات پر نادم ہوں کہ ایک ایسے فن کا استاد بن گیا ہوں، جس کی الف۔۔۔ ب سے مجھے واقفیت نہیں ہے۔''

''عاقل فن مصوری بلاشبہ ایک ٹھوس حقیقت ہے تصویروں کی زبانی، کائنات کے حسن کو اجاگر کرنا، ماضی، حال اور مستقبل کی باتیں کرنا بڑے بڑے فن کاروں کا کام تھا۔ انہوں نے اپنے فن میں کمال حاصل کیا۔ اجنتا ایلورا تشکیل پائے، مونا لیزا کی تخلیق ہوئی اور نجانے کیا کیا۔ لیکن نئے گروہ نے فن مصوری کا ستیاناس مار دیا۔ یہ نیا گروہ خود ساختہ تھا۔ اس نے فن مصوری کی نئی زبان تخلیق کی۔ جس نے جو چاہا بنا دیا اور دوسروں کو اسے تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن میرے اپنے خیال میں یہ مجبور ہونے والے بھی وہ تھے جو فن مصوری کو حاصل کرنے میں ناکام رہے اور انہوں نے ''من تیرا حاجی بگویم تو میرا حاجی بگو'' والی مثل کے مصداق خود کو ایک دوسرے سے منوایا اور اس کے بعد کچھ وہ بھی سامنے آئے جو اپنی زبان ملکوں کے ذریعے دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ چنانچہ تجریدی آرٹ کی تخلیق ہوئی۔ ضرورت مندوں نے اسے سمجھا اور سراہا۔ میں نے آج تک اس فن کو تسلیم نہیں کیا اور اس لیے اس کا مذاق اڑانا میں اپنا حق سمجھتا ہوں۔ تم محسوس نہ کرنا نفیسہ ایک باقاعدہ فن کارہ بننے میں تو شاید آدھی عمر گنوا دیتی۔ لیکن دولت مند باپ کی بیٹی ہے۔ لمحوں میں فن کار بن گئی اور اس کا استاد تم جیسا آدمی رہا اور اب اس کی تصاویر کی نمائش ہو گی۔ تم دیکھنا اس نمائش میں کیا کیا تماشے ہوتے ہیں۔ میں نے نفیسہ کا مذاق نہیں اڑایا بلکہ تجریدی آرٹ کا مذاق اڑایا ہے۔ تم دیکھنا کیسی کیسی تعریف و توصیف ہوتی ہے اس کی اور لوگ اس کے برش کے کمال کو کیا کیا رنگ دیتے ہیں۔ یہ ایک الگ بات ہوئی۔ میرے کہنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ میں نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا ان لوگوں کو جو ان کے لیے مستقبل میں تکلیف دہ ہو۔ ہاں ان کے شوق کی تکمیل ہو گئی۔ اس میں کیا حرج ہے۔ صفدر گویا بن گیا ہے، بھلا بابر علی صاحب کو کیا تکلیف ہے اس سلسلے میں وہ اپنا کام کریں۔ بدر اگر غریبوں کے لیے کلینک کھول دیتا ہے تو بھئی اس کا ثواب تو مجھے بھی ملے گا۔ میں اس چیز کو اپنا حق سمجھتا ہوں اور کچھ نہ کچھ ثواب اس سلسلے میں بدر اور ان کے خاندان کو بھی ملے گا۔ بتاؤ میں نے کیا برا کیا۔ یہ سب کچھ جو میں کر رہا ہوں اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو بابر علی صاحب کو تکالیف کا شکار بنا دے۔ لیکن ان کا طلسم ٹوٹا ہے اور وہ میرے مخالف ہو گئے ہیں۔ حیدر علی صاحب کا سہارا

اگر مجھے حاصل نہ ہوتا تو یقین کرو، میرا نام ونشان تک اس عمارت میں نہ ہوتا۔ لیکن اب مجھے یہ شبہ ہے، یقین سے تو نہیں کہہ سکتا، بابر علی صاحب میرے خلاف کوئی نیا قدم اٹھانا چاہتے ہیں۔''

''اور اس کا ذریعہ یہ دونوں بن سکتے ہیں۔'' عاقل نے پوچھا۔

''ہاں سو فیصدی۔ مجھے بابر علی صاحب کے برتاؤ پر ایک خاص بات نظر آئی تھی۔ انہوں نے بڑے محتاط انداز میں گفتگو کی جبکہ وہ اس فطرت کے آدمی نہیں ہیں۔ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں پھٹ سے کہہ دیتے ہیں۔ اپنے بچوں کے دوستوں کو وہ بلاشبہ عزیز رکھتے ہوں گے لیکن سب کو ہدایت کی گئی ہے کہ ان کی ضرورت کا خیال رکھیں اور عمارت میں ان کو مکمل آزادی دی جائے۔ اس کے علاوہ عاقل صاحب! میں جلد ہی یہ معلومات حاصل کرلوں گا کہ یہ لوگ کون سی تعلیم حاصل کرنے والے ہیں۔ یہ مشکل کام نہیں ہوگا میرے لیے۔ آپ سے جو کچھ چاہتا ہوں اس کی مکمل تفصیل یہ ہے کہ ان بچوں کو میں اس سلسلے میں اپنا راز دار نہیں بنا سکتا بلکہ آپ میرے لیے ان لوگوں کے خلاف جاسوسی کریں گے۔ کوٹھی میں ان کے معاملات پر نگاہ رکھیں گے اور ان کی دیگر حرکات و سکنات سے مجھے مطلع کریں گے۔''

''میں۔۔۔؟'' عاقل حیرت سے بولا۔

''جی ہاں آپ۔''

''لیکن کیسے شیری بھائی۔۔۔! میں تو یہاں اس کوٹھی میں اتنا متعارف بھی نہیں ہوں۔ میری پہنچ تو صرف نفیسہ کے نگارخانے تک ہے بس۔''

''نہیں عاقل! تم خود ہی محتاط رہتے ہو۔ اگر تم کچھ اور قدم آگے بڑھاؤ تو میرا خیال ہے کوٹھی میں تمہاری مکمل پذیرائی ہوگی اور پھر نفیسہ تو تمہاری بہت عزت کرتی ہے۔ مقصد یہ کہ ان دونوں پر نگاہ رکھنے کے لیے تم ہر قدم اٹھاؤ گے اور یہ کام میں تمہارے سپرد کررہا ہوں۔''

''آپ مطمئن رہیں۔ اگر آپ نے یہ ڈیوٹی میرے سپرد کی ہے تو میں اسے پوری محنت اور جاں فشانی سے انجام دوں گا۔''

''شکریہ، اسی لیے میں یہاں آیا تھا۔ کل سے تم اپنے کام کا آغاز کردینا۔ فرصت شرط ہے۔ اپنا گھر روزانہ اگر نہ بھی جاؤ تو کوئی ہرج نہیں ہے۔ وہاں کا معاملہ ہم سنبھال لیں گے۔ لیکن، یہاں ذرا بات ذہن میں رکھنا۔'' شیری نے کہا۔

''بہت بہتر۔۔۔ آپ نے بہت اچھا کیا جو یہ بات مجھے بتادی۔ میں کوشش کروں گا کہ کوٹھی میں ان لوگوں کے سامنے نہ آؤں اور اگر آؤں بھی تو جس حد تک ممکن ہو بچنے کی کوشش کروں۔'' عاقل نے جواب دیا۔

''بس ٹھیک ہے تم اپنا کام جاری رکھو اور ہاں اب ہمارا اگلا قدم نفیسہ کی تصویروں کی نمائش ہے۔''

''ایک بات بتایئے شیری صاحب۔''

''پوچھیے۔''

''میں اس نمائش سے بڑا خوف زدہ ہوں۔''

''کیوں بھئی خیریت، بھلا اس نمائش سے تم کیوں خوف زدہ ہو؟''

''شیری صاحب! یہاں تو ان تصویروں کو سمجھنے والے آپ موجود ہیں اور ان کی تشریح بھی کردیتے ہیں۔ جب یہ منظر عام پر پیش ہوں گی تو یقیناً انہیں دیکھنے کے لیے وہ لوگ بھی آئیں گے جو کم از کم اس فن سے تھوڑے بہت واقف ہیں۔ وہ ان تصویروں کے بارے میں کیا کہیں گے۔ نفیسہ کی جان تو بچ جائے گی کیونکہ وہ ایک بڑے باپ کی بیٹی ہے اور لوگ اس کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے غور کریں گے۔ لیکن اگر اس کے استاد کے بارے میں کسی نے سوال کرلیا تو میں کیا کہوں گا۔''

''میں کیا مرجاؤں گا۔'' شیری نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور عاقل ہنس پڑا۔

''گویا آپ وہاں بھی، وہاں بھی۔۔۔''

''دیکھو عاقل! میں نے جو کچھ کہا ہے اپنے تجربے کی بنیاد پر کہا ہے۔ ارے تم دیکھتے تو رہو۔ تم

اس کی تصاویر مکمل کرادو اور اس کے بعد اس دنیا کا تماشا دیکھو۔'' عاقل مسکراتا رہا پھر شیری نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''اچھا دوست! تم میری سپرد کی ہوئی ذمہ داری سنبھال لو۔ مجھے یقین ہے کہ تم پوری تندہی سے اپنا کام انجام دوگے۔''

''آپ مطمئن رہیں شیری صاحب! میری خوش بختی ہے کہ آپ نے کوئی کام میرے سپرد تو کیا۔ بالکل مطمئن رہیے۔ ان دونوں کو میں اچھی طرح چیک کروں گا۔'' عاقل نے جواب دیا اور شیری اس سے مصافحہ کر کے باہر نکل آیا۔ عاقل کے چہرے پر پہلے تو خوف کے آثار چھائے رہے تھے۔ کیونکہ وہ چند ہی لمحات قبل نفیسہ کے پاس سے واپس آیا تھا۔ لیکن جب شیری نے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی اور آرام سے ساری صورت حال ٹل گئی تو اس نے سکون کی گہری سانس لی تھی۔ وہاں سے نکلنے کے بعد شیری اس نئے مسئلے میں الجھ گیا تھا اور اپنے بستر پر لیٹ کر بھی وہ اس موضوع پر کافی دیر تک غور کرتا رہا۔ عاقل کی نفیسہ میں دلچسپی اور نفیسہ کا عاقل سے التفات بھی اس کے مقصد کی چیز تھی۔ اس التفات کو ہوا ملنی چاہیے اور اس کا انجام بہتر ہونا چاہیے۔ اس نے سوچا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

تھوڑی دیر تک وہ مسکراتا رہا اور پھر آہستہ آہستہ اس کے دانت مضبوطی سے ایک دوسرے پر جم گئے۔ بابر علی صاحب آپ کو۔۔۔ آپ کو اپنی زندگی کے بدترین دور سے گزرنا پڑے گا سمجھے آپ، آپ کو ایسے حالات سے گزرنا پڑے گا کہ آپ نے کبھی اس کا تصور بھی نہ کیا ہوگا۔

ندیم اور وسیم نے اپنے کام کا آغاز کر دیا تھا۔ دونوں چالاک نوجوان تھے۔ سب سے پہلے تو انہوں نے یہ کوشش کی کہ اس عمارت میں موجود نوجوانوں سے دوستی کریں۔ حیدر علی صاحب ہر ایک کو منہ لگانے کے عادی نہیں تھے۔ انہوں نے ابھی تک ان لڑکوں پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ اول تو زیادہ تر وہ اپنا گھر کے معاملات میں ہی الجھے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کا بہترین مشغلہ یہ تھا کہ عمدہ قسم کے جاسوسی ناول اور کہانیاں حاصل کریں، انہیں پڑھیں یا پھر شیری سے سنیں۔ کیونکہ شیری کے سنانے کا انداز بے حد دلچسپ ہوتا تھا۔ حیدر علی صاحب کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اس ماحول میں کھو گئے ہوں۔ شیری کی یہ خوبی انہیں بے حد پسند تھی اور اس کی اس خوبی کی وہ بارہا تعریف کر چکے تھے۔ باقی رہیں بیگم صاحبہ تو ان کی توجہ ان دونوں کو حاصل تھی کیونکہ شوہر کی ہدایت تھی اور وہ شوہر کی ہر بات کی نفی کرنے کی عادی نہیں تھیں۔

نفیسہ اپنے معاملات میں مصروف تھی۔ اس کی دنیا مصوری تک محدود تھی اور اب تو اس کے ساتھ ساتھ ایک نیا مشغلہ بھی اسے حاصل ہو گیا تھا۔ یعنی عاقل کا تصور، وہ عاقل کو اپنے ذہن میں آئیڈیل بنا چکی تھی اور اب اس کی پوری توجہ عاقل کی جانب تھی۔ تنہائیوں میں وہ عاقل کو اپنے مستقبل کا ساتھی تصور کرتی تھی اور اس کے ساتھ زندگی گزارنے کے تصور کو خاکوں کی شکل دیتی تھی۔ اس طرح اسے بڑا سکون محسوس ہوتا تھا۔

بدر، دادا ابو کی حمایت حاصل کرنے کے بعد مطمئن ہو گیا تھا۔ وہ روزانہ دن کو گیارہ بارہ بجے ''اپنا گھر'' پہنچ جاتا اور وہاں کے معاملات میں دلچسپی لیتا۔ شیری نے بھی وہاں اس کے لیے مصروفیات پیدا کر دی تھیں۔ یعنی اپنا گھر کی عظیم الشان عمارت میں کلینک کا مسئلہ۔ چنانچہ اس سلسلے میں شیری نے نقشہ نویس کو ہدایات جاری کر دی تھیں اور بدر اپنی پسند کا نقشہ بنوا رہا تھا۔ اس کا زیادہ تر وقت وہیں گزرتا تھا۔

باقی رہ گیا صفدر، تو وہ اپنے ریاض میں مصروف تھا۔ اکبر ابھی چھوٹا تھا اور انیسہ اپنے معاملات میں مصروف تھی۔ یوں بھی اس پر ابھی کوئی برا اثر نہیں پڑ سکا تھا۔ بس اس کی چند فرینڈز تھیں جن میں وہ گم رہتی، شیری نے بھی اس پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔

چنانچہ ان لوگوں نے بھرپور پلاننگ کر کے بدر

پڑ ڈورے ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ بدر بہت کم ان کے ہاتھ لگتا تھا۔ لیکن بہرحال یہ اب ان کی ذمہ داری تھی کہ وہ ان کے سارے معاملات کو بھرپور نگاہوں سے دیکھیں اور بابر علی صاحب کی مرضی کے مطابق عمل کریں۔

ان دونوں کو ایک ہی کمرا دیا گیا تھا۔ جو انتہائی کشادہ اور بہترین قسم کے فرنیچر سے آراستہ تھا۔ تقریباً ایک ہفتہ انہیں یہاں آئے ہو چکا تھا اور اس ایک ہفتے میں انہیں جو زندگی ملی تھی، اس نے انہیں بہت متاثر کیا تھا۔ وسیم نے ایک رات ندیم سے کہا۔

''ندیم یار! زندگی کا یہ رخ بھی ہے۔ تم نے دیکھا یہ اہلِ ثروت کس طرح آسائشوں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ دنیا کا کوئی غم ان کے نزدیک نہیں پھٹکا جو سوچا وہ ہو گیا اور ایک بدبخت ہماری زندگی تھی کہ ملازمت حاصل کرنے کے لیے ہی اتنے پاپڑ بیلنے پڑے۔ میں تو کچھ اور سوچ رہا ہوں۔''

''کیا۔۔۔؟'' ندیم نے پوچھا۔

''بھائی ہماری جو یہاں ڈیوٹی لگائی گئی ہے۔ وہ تو ہمیں انجام دینی ہی ہے۔ ہمیں اس کی تنخواہ ملے گی اور اس کے بعد جب ہمارا یہاں کا کام مکمل ہو جائے گا تو پھر دفتروں میں ٹکریں کرنا پڑے گی۔ کیا کوئی ایسی ترکیب نہیں ہو سکتی کہ ہم بھی زندگی کی ان لطافتوں سے دائمی طور پر منسلک ہو جائیں۔''

''دیکھ وسیم! میرے سامنے بڑے بڑے جملے نہ بولا کر۔ صاف کہہ کیا کہنا چاہتا ہے۔'' ندیم نے الجھتے ہوئے کہا۔

''کوئی ایسی ترکیب، کوئی ایسا کھیل جو ہمیں بابر علی صاحب کی نگاہوں میں اتنا بلند کر دے کہ وہ ہمارے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگیں۔''

''مطلب کیا ہے صاف، صاف کہو۔''

''کمال کے آدمی ہو یار! بابر علی صاحب کی دو بیٹیاں ہیں۔''

''تو پھر۔۔۔؟''

''نفیسہ اور انیسہ! دونوں اچھی شکل وصورت کی مالک ہیں۔ بلکہ انہیں ایک طرح سے خوب صورت کہا جا سکتا ہے اور پھر ایک ایسے دولت مند باپ کی بیٹیاں ہیں جو انہیں بہت کچھ دے گا۔ اتنا کچھ کہ اس کے بعد ان کے شوہروں کو کسی اور چیز کی ضرورت نہ رہے گی۔''

''اوہ، اوہ۔۔۔ تو تمہارا خیال ہے، تمہارا خیال ہے۔۔۔''

''ہاں! لیکن نہایت محتاط انداز میں۔ اتنے محتاط انداز میں کہ خود اپنے آپ کو بھی خبر نہ ہو سکے۔'' وسیم نے گہرے لہجے میں کہا اور ندیم کسی سوچ میں گم ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک حسین مستقبل کے خواب لہرانے لگے تھے۔ پھر وہ چونک پڑا۔

''وسیم شامت آئی ہے تمہاری۔''

''کیا مطلب۔۔۔؟''

''یہاں جس مقصد کے لیے آئے ہو اسے پورا کر لو۔ اپنی روزی برقرار رکھو۔ تم نے فوراً ہی بلندیوں کی پرواز شروع کر دی۔''

''پرواز تو میرا خیال ہے ہر ذی روح کا حق ہے۔ ہم نے جو کچھ سوچا ہے وہ ناجائز تو نہیں ہے۔ ہم کسی سے کوئی فریب نہیں کرنا چاہتے، کوئی ایسا جرم نہیں کرنا چاہتے جو قانون کے قابل توجہ ہو۔ زندگی کے لیے بہتر راستوں کی تلاش کون پسند نہیں کرتا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے محترم! لیکن جس مقصد کے لیے آپ کو بھیجا گیا ہے وہ تو پورا کر لیں کم از کم ہم ان لوگوں میں بے شک گھل مل جائیں گے۔ اتنی دوستی کر لیں گے ان سب سے کہ اس کے بعد یہ ہمارے لیے بے چین رہیں۔ لیکن یہ سب کچھ کرنے کے لیے ابھی ہمیں اس سمت سفر کرنا ہوگا جس سمت ہم آئے ہیں اور جو ہمارے یہاں آنے کا مقصد ہے۔ عزیزم! اس کوٹھی میں رہنے کے لیے سب سے پہلے بابر علی صاحب کا اطمینان ضروری ہے۔ اس سلسلے میں کام کرو۔ اگر کسی کو بھنک پڑ گئی کہ ہمارے ذہنوں میں کیا ہے تو دوسرے دن کان پکڑ کر نکال دیئے جائیں گے۔ چنانچہ آپ ابھی اپنی یہ کوشش اپنے تک محدود

رکھیں اور انہیں اپنے ذہن میں بھی جگہ نہ دیں۔ پہلے بابر علی صاحب کے دل میں گھر کرو، اس کے بعد اس گھر میں تمہاری گنجائش کسی نہ کسی طور نکل ہی آئے گی۔''

''ہاں بات تو درست ہے۔ میں فوری طور پر تو کسی کام کے لیے نہیں کہہ رہا۔'' وسیم نے کہا۔

''سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں یہاں آئے ہوئے ایک ہفتہ ہوگیا ہے۔ بابر علی صاحب نے اب تک ہم سے صرف تین ملاقاتیں کی ہیں۔ آخری ملاقات میں ہمارے اور ان کے درمیان کیا گفتگو ہوئی تھی یاد ہے تمہیں۔''

''ہاں! انہوں نے کافی کھل کر بات کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ سب سے پہلے یہ معلومات حاصل کی جائیں کہ ان لوگوں کے ذہنوں میں یہ جڑیں کہاں سے پہنچیں۔ ویسے اتنا اندازہ تو میں نے لگالیا ہے ندیم کہ ان سب کا روح رواں شیری ہے۔ تم نے دیکھا نہیں بیگم صاحبہ کس طرح شیری۔۔۔ شیری پکارتی رہتی ہیں۔ دادا ابو کس طرح شیری، شیری کہتے رہتے ہیں اور یہی حالت ان سب کی ہے۔ میرا خیال ہے شیری اس مسئلے میں ایک نمایاں کردار ادا کر رہا ہے۔ پہلے تو یہ اندازہ لگانا ہے کہ اس کی یہاں آمد کن حالات کے تحت ہوئی اور کیسے ہوئی؟''

''میرا خیال ہے اس سلسلے میں دادا ابو سے ابتداء کرنی چاہیے۔'' ندیم بولا۔

''میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔''

''وہ کیا۔۔۔؟''

''میرا خیال تھا کہ پہلے بابر علی صاحب کے بچوں کے ذہنی رجحان کا اندازہ لگایا جائے۔ یعنی بدر، صفدر اور نفیسہ! تین نام ہیں نا ابھی ہمارے سامنے۔ باقی دو تو فہرست سے خارج ہیں۔''

''ہاں۔''

''تو پھر یوں کرتے ہیں کہ تم دادا ابو کو ٹٹولو اور میں بدر کو۔'' وسیم نے کہا اور ندیم کسی گہری سوچ میں گم ہوگیا۔ پھر بولا۔

''ٹھیک ہے، کل میں دادا ابو سے ایک خصوصی ملاقات کروں گا۔''

''اور میں بدر سے۔ بدر دن کو گیارہ بجے گھر سے نکل جاتے ہیں میں ان کا تعاقب کروں گا اور اتفاقیہ طور پر ان سے باہر ہی ملاقات کرنے کی کوشش کروں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' دونوں کے درمیان یہ بات طے ہوگئی۔ دوسرے دن دونوں اپنے اپنے مشن پر نکل گئے۔

وسیم، بدر کے تعاقب کے سلسلے میں گھر سے باہر نکل گیا تھا۔ وہ بدر کو راستے میں ہی کہیں پکڑنا چاہتا تھا۔ ندیم تیار ہوکر دادا ابو کی رہائش گاہ کی جانب چل پڑا۔

حیدر علی صاحب اس وقت برآمدے میں کرسی ڈالے ایک جاسوسی ناول پڑھ رہے تھے۔ ندیم کو اپنی جانب آتے دیکھا تو ناول پر نشان لگایا اور حیران نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے۔ ندیم ان کے قریب پہنچ گیا تھا۔

''جی، کیا خدمت ہے میرے لیے۔'' حیدر علی صاحب نے پروقار انداز میں پوچھا۔

''بس دادا ابو! آپ کی خدمت میں سلام کرنے کے لیے حاضر ہوا تھا۔''

''وعلیکم السلام۔۔۔ اور کوئی بات۔'' دادا ابو نے پوچھا اور ندیم کو احساس ہوگیا کہ بے ڈھب آدمی ہے۔ ذرا مشکل سے ہی سنبھالنا پڑے گا۔

''بس یونہی دادا ابو! آپ کتاب پڑھ رہے تھے۔ کتابوں سے عشق ہے۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ آپ کو کس قسم کی کتابیں پسند ہیں۔''

دادا ابو نرم لہجے میں بولے اور ندیم ان کے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ دادا ابو نے ناول اٹھا کر پیچھے رکھ لیا تھا۔

''پہلے تو میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تمہیں کس قسم کی کتابوں سے شغف ہے؟''

''بڑے بڑے ادیبوں کی بہت سی تخلیقات

پڑھی ہیں۔ میں نے ولیم شیکسپیئر، جارج برنارڈ شا، گوئٹے اور اسی قسم کے دوسرے مصنفین کو اچھی طرح پڑھ چکا ہوں۔''

''گڈ۔۔۔کیا حاصل کیا تم نے ان سے؟''

''انسانی اقدار، تہذیب اور معاشرے کے بہتر اصول۔''

''تو ان اصولوں کو کہاں جمع کیا ہے تم نے؟''

''جی، میں نہیں سمجھا دادا ابو!''

''میرا مطلب ہے یہ سارے اصول مل کر اب تک تمہیں کیا کچھ دے چکے ہیں؟''

''کچھ نہیں دادا ابو! بس زندگی کا ایک لائحہ عمل بنایا ہے، کس طرح جینا ہے، کس طرح مستقبل میں اپنا مقام بنانا ہے۔''

''تو ٹھیک ہے میاں! مقام بناؤ، یہ لوگ تمہارے مددگار ہیں۔ ان سے امداد حاصل کرو۔ دوسروں کی کرید میں کیوں رہتے ہو۔'' حیدر علی صاحب نے کہا۔

''اوہ نہیں دادا ابو! بس ہم ذوق کی تلاش کسے نہیں ہوتی۔''

''میرا ذوق تمہیں پسند نہیں آئے گا میاں۔'' دادا ابو طنزیہ انداز میں بولے۔

''کیوں نہیں دادا ابو! آپ بتایئے تو سہی آپ کس قسم کی کتابیں پسند کرتے ہیں۔'' حیدر علی صاحب نے جاسوسی ناول اٹھا کر ندیم کے سامنے رکھ دیا اور ندیم کے چہرے پر خوشی کے اثرات پھیل گئے۔

''ہنری سلا سر! کمال ہے دادا ابو! یہ میرا پسندیدہ رائٹر ہے۔''

''خوب، خوب۔۔۔اس سے تم نے کیا حاصل کیا میاں!'' دادا ابو نے پوچھا۔

''کچھ نہیں دادا ابو! زندگی صرف جمود میں نہیں گزرتی انسان فطری طور پر تبدیلیوں کا طالب ہوتا ہے اور فکشن بدن کو وہ حرارے مہیا کر دیتا ہے جو میرے خیال میں ذہنی سفر کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔''

''اچھی باتیں کر رہے ہو اور کچھ کہو۔'' دادا ابو آہستہ سے بولے۔

''کچھ نہیں دادا ابو! بس میں یہ عرض کر رہا تھا کہ مجھے بھی ناولوں کا شوق ہے۔ آپ مجھے بتائیں کون کون سے ناول آپ کو پسند ہیں۔ وہ میں آپ کو مہیا کر دوں گا۔''

''الحمد اللہ۔۔۔! اس کے لیے میرے پاس معقول بندوبست ہے۔''

''تو دادا ابو! کبھی کبھی مجھے آپ کے ذخیرے سے کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔''

''ادھار دیا جا سکتا ہے۔ دیانت داری سے واپس کرنا شرط ہے۔'' حیدر علی صاحب نے کہا۔

''یقیناً۔۔۔ یقیناً، میں آپ کی کتاب کی عزت بہت ضروری سمجھتا ہوں۔''

''تو آؤ۔۔۔! کتاب چاہیے نا تمہیں۔''

''جی اگر عنایت ہو جائے تو۔'' دادا ابو اپنی جگہ سے اٹھ کر اندر داخل ہو گئے۔ ندیم بھی ان کے ساتھ تھا۔ حیدر علی کا رخ اپنی لائبریری کی جانب تھا۔ ندیم نے دو کتابیں پسند کی تھیں۔

''لے جاؤ، انہیں پڑھ کر واپس کر دینا اور اگر تمہارے ہاتھ کوئی عمدہ چیز لگ جائے تو وہ مجھے فراہم کر دینا۔ اس طرح اگر کتاب پر کوئی نشان نہ پڑا تو تمہیں مستقل ملتی رہیں گی۔''

''جی! ویسے دادا ابو! آپ کے اس ذوق کا کوئی اور بھی شریک ہے یہاں۔ میرا مطلب ہے ان بچوں میں سے بھی کسی کو پڑھنے کا شوق ہے۔''

''ہاں ہے۔۔۔! لیکن ان بچوں میں نہیں، بلکہ میرا اپنا بچہ یعنی شیری۔۔۔''

''اوہ شیری صاحب کی شخصیت واقعی اتنی پیاری ہے کہ دل چاہتا ہے ان کے پاس سے اٹھا ہی نہ جائے۔ لیکن بڑے مصروف انسان ہیں۔''

''ہاں میاں! رزق حلال کھانے کا شوقین ہے۔ حالانکہ کون اسے مجبور کر سکتا ہے کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف کچھ کرے۔ لیکن دیکھو، بے پناہ مصروف

رہتا ہے۔ ایسے لوگ کم ہی ہوتے ہیں۔''

''ویسے دادا ابو! شیری کوئی رشتہ دار ہیں آپ کے؟''

''دیکھو بھئی، ادب کی کتابوں میں تم نے پتا نہیں کیا کچھ پڑھا ہوگا رشتوں کے بارے میں۔ لیکن میری اپنی سوچ ذرا مختلف ہے۔ ان تمام چیزوں سے میں رشتوں کا تعلق ذہن سے سمجھتا ہوں۔ بہت سے لوگ ہمارے اتنے قریب عزیز ہوتی ہیں جیسے بھائی، بہن، چچا، تایا، ماموں، لیکن ان کی فطرت کچھ اس قسم کی ہوتی ہے کہ ہم ذہنی طور پر ان سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتے۔ ہم انہیں رشتہ دار کہنے کے لیے مجبور تو ہوتے ہیں لیکن دل سے سمجھنے کے لیے ذرا مشکل پیش آتی ہے۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کچھ بھی نہیں ہوتے لیکن ان کی جگہ دل کی جڑوں میں ہوتی ہے۔ شیری میرا ایسا ہی رشتہ دار ہے۔''

''واہ دادا ابو! کیا حسین الفاظ میں آپ نے اپنے احساسات کی تشریح کی ہے۔ شیری کی شخصیت بلاشبہ ایسی ہی ہے کہ اسے اتنا ہی چاہا جائے، لیکن وہ عام لوگوں سے بے تکلف نہیں ہوتا۔''

''مصروف آدمی ہے۔ ظاہر ہے ان بے تکلفیوں کے لیے وقت کہاں سے نکالے۔'' دادا ابو نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ اس کے علاوہ آپ کا ان سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔''

''اس سے زیادہ کوئی رشتہ ہو بھی نہیں سکتا۔'' دادا ابو نے جواب دیا۔

''وہ بچپن ہی سے آپ کے ساتھ ہیں؟''

''کاش ہوتا۔۔۔ کاش! اس نے اتنا وقت کہیں اور نہ ضائع کیا ہوتا۔'' دادا ابو بولے۔

''گویا بچپن سے نہیں ہیں۔''

''نہیں، تھوڑے عرصے پہلے آیا تھا میرے پاس۔ کچھ ایسا دل کو لگا کہ وہ دل ہی میں جا بیٹھا۔''

''دادا ابو! آپ کی محبت جس کو حاصل ہو جائے وہ کم خوش نصیب نہیں ہوتا۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ شیری صاحب میں ایسی کون سی خوبیاں ہیں۔''

''دیکھو میاں! ہم پرجائی نہیں ہیں۔ بس ایک کو اپنا لیا سو اپنا لیا۔ پہلے اہلیہ تھیں جو زندگی کے ہر دکھ سکھ کی راز دار اور شریک اور اب اپنا یہ بیٹا ہے، یعنی شیری۔ تمہاری گنجائش صرف اس حد تک نکل سکتی ہے کہ ملتے رہا کرو۔ بچے ہو اور اگر کتابوں سے شوق ہے تو پھر تھوڑا تھوڑا یہ سلسلہ بھی چلتا رہے گا۔ بس اب جاؤ، میں نے ناول ایسی جگہ چھوڑا ہے جہاں بڑا سسپنس ہے۔ پہلی بار میں نے تم سے یہ اخلاق برت لیا ہے۔ شاید آئندہ نہ برت سکوں۔ ہاں اگر کوئی کتاب میرے ہاتھ میں نہ ہو تو بے تکان آ جانا۔''

''آپ کی اتنی ہی محبت اور اتنی ہی توجہ میرے لیے کافی ہے۔'' ندیم نے کہا اور وہاں سے رخصت ہو گیا۔ دونوں کتابیں اس کے ہاتھ میں تھیں اور وہ مسکرا رہا تھا۔ اس نے زندگی میں شاید ایسی کوئی کتاب کبھی کھول کر بھی نہ دیکھی ہو۔ لیکن دادا ابو کی توجہ حاصل کرنے پہ پہلا نسخہ اس کے ہاتھ آ گیا تھا۔ اس کے بعد اب اسے دوسرا کام انجام دینا تھا۔ کم از کم دادا ابو سے تو راہ و رسم ہو ہی گئی تھی اور یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ دادا ابو کو شیری کتنا پسند ہے۔ گویا دادا ابو کی توجہ حاصل کرنے کا یہ نسخہ یقیناً شیری کو بھی معلوم ہوگا اور اگر اس سلسلے میں شیری سے آگے بڑھ جایا جائے تو لطف ہی آ جائے گا۔ چنانچہ اس سلسلے میں اس نے اپنے دل میں کچھ منصوبے ترتیب دے لیے تھے۔

دوسری طرف وسیم ایک چوڑی سڑک پر بدر کا منتظر تھا۔ اسے کافی دیر بدر کا انتظار کرنا پڑا۔ ساڑھے دس بجے اس نے بدر کی خوب صورت اسپورٹس کار سڑک پر آتے دیکھی اور وہ سڑک کے کنارے آ کھڑا ہوا۔ اتفاق سے سڑک سنسان ہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ دو چار قدم آگے بڑھا اور پھر سیدھا ہو گیا۔ بدر کی کار اس کے نزدیک پہنچ گئی تھی۔ بدر نے اسے دیکھا۔ تھوڑا سا آگے نکل گیا تھا لیکن پھر کار ریورس کر کے وسیم کے نزدیک آ گیا۔

''ارے آپ کہاں وسیم صاحب انیں بت۔۔۔''
[illegible]ر نے پوچھا۔
''بس یونہی اکتا کر باہر نکل آیا تھا۔ سوچا کچھ [illegible]روں، لیکن سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا، کیا جائے۔ یہ ایک دو ماہ گزارنا بڑا مشکل مرحلہ ہے۔''

''آیئے، آیئے جا کہاں رہے تھے آپ؟''

''میں نے عرض کیا نا بس یونہی آوارہ گردی [illegible]رنے نکل آیا تھا۔''

''تو گاڑی لے لی ہوتی گھر سے۔ دو گاڑیاں تو [illegible]التو کھڑی رہتی ہیں ہمیشہ۔'' بدر نے کہا۔ وسیم اس کے برابر آ بیٹھا تھا۔

''بس دراصل آپ لوگوں کی محبت کے بوجھ تلے اس طرح دب گئے ہیں کہ مزید تکلیف دیتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی ہے۔''

''کیا مطلب۔۔۔''

''میرا مطلب ہے گاڑی وغیرہ کا معاملہ۔ چچا جان تو اس طرح ہم لوگوں کو گلے سے لگائے ہوئے ہیں جیسے ہم انہی کی اولاد ہوں۔''

''ڈیڈی سادہ دل اور مخلص آدمی ہیں۔ جس سے محبت کرتے ہیں ٹوٹ کر کرتے ہیں۔ چنانچہ براہ کرم آپ ایسی باتیں مت سوچا کریں۔ جب آپ ہمارے گھر میں ہیں تو گھر کے فرد کی حیثیت ہی سے رہیں، جب تک بھی آپ کا قیام ہے آپ ہمارے ہاں کسی قسم کی تکلیف نہ اٹھائیں۔''

''زندگی میں ہم نے بھی بہت کچھ دیکھا ہے بدر صاحب! بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی ہے۔ لیکن بعض لوگ یوں لگتے ہیں جیسے آسمان سے براہ راست اترے ہوں۔ آپ یقین کیجیے ہم دونوں بھائی اس گھرانے سے اس قدر متاثر ہیں کہ الفاظ میں اسے بیان نہیں کر سکتے۔ آپ لوگ بے حد سچے اور مخلص انسان ہیں۔'' وسیم نے کہا اور بدر ہنسنے لگا۔

''چھوڑیئے وسیم بھائی! ان باتوں کو۔ آپ خود اچھے انسان ہیں، اس لیے دوسروں کو بھی اچھا سمجھتے ہیں۔ اچھا سنیں۔۔۔! اگر کوئی خاص مصروفیت نہیں [illegible] تو [illegible] آپ میرے ساتھ [illegible] نویس کے پاس جانا ہے۔ تھوڑی دیر وہاں رہیں گے پھر ہم آپ کو ''اپنا گھر'' لے جائیں گے۔''

''اپنا گھر، یہ کیا ہے۔'' وسیم نے سوال کیا۔

''یہ ایک طویل تفصیل ہے جو میں آپ کو بتا دوں گا لیکن یہاں نہیں۔ پہلے ہم نقشہ نویس کے پاس پہنچ کر اپنا کام کر لیں۔ اس کے بعد کسی ریستوران میں بیٹھ کر کافی پئیں گے۔ پھر میں آپ کو ''اپنا گھر'' لے چلوں گا۔''

''ضرور۔۔۔ ضرور، مجھے یہ نام ہی بڑا دلچسپ لگ رہا ہے۔'' وسیم نے کہا۔ وہ بدر کو پوری طرح شیشے میں اتار رہا تھا۔

نقشہ نویس کے پاس تھوڑی دیر صرف ہوئی۔ کلینک کا نقشہ تیار ہو چکا تھا جو نقشہ نویس نے بدر کے حوالے کر دیا۔ وہاں سے وہ لوگ ایک خوب صورت ریستوران میں آ بیٹھے۔ بدر نے کافی منگوائی اور تھوڑی دیر کے بعد وہ کافی کے گھونٹ لے رہے تھے۔

''ہاں تو یہ ''اپنا گھر'' کیا چیز ہے، اب آپ مجھے بتایئے۔''

دادا ابو نے زندگی کے آخری ایام انسانوں کی فلاح و بہبود کے لیے صرف کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور یہ ''اپنا گھر'' اس سلسلے کی ایک عظیم الشان عمارت ہے۔ یہ عمارت دراصل ایک خیراتی ادارہ سمجھا جا سکتا ہے۔ جبکہ دادا ابو کے سامنے اس قسم کا کوئی تصور نہیں ہے۔ وہ اسے اپنی ضرورت اور ذمہ داری محسوس کرتے ہیں۔ اس عظیم الشان عمارت میں دفاتر ہوں گے۔ رہائش گاہیں ہوں گی۔ دارالامان ہوگا، اور ایسی ہی دوسری چیزیں، یہاں ان معذوروں کو رکھا جائے گا جو زندگی کے بوجھ کو سڑکوں پر گھسیٹتے پھرتے ہیں اور وہ اس لیے مجبور ہیں کیونکہ معاشرے میں انہیں کوئی پناہ گاہ نہیں ملتی۔ ایسے تمام لوگ ''اپنا گھر'' میں زندگی کی دلچسپیوں سے بہرہ ور ہو سکیں گے۔ انہیں وہاں مفت رہائش اور خوراک فراہم کی جائے گی۔ ابھی تو

اپنا گھر ایک عمارت میں ہے اور اس عمارت میں ان معذور افراد کے لیے جتنی گنجائش نکل سکتی ہے نکالی جائے گی۔ لیکن اس کی بے شمار برانچیں ہوں گی۔ دادا ابو کا پروگرام ہے کہ شہر میں بہت سے ایسے مکان حاصل کیے جائیں گے جو ان معذوروں کی رہائش گاہ کے لیے ہوں گے اور ان کی معذوری کو دیکھتے ہوئے ان کے لیے زندگی کے لوازمات فراہم کیے جائیں گے۔ اس کے علاوہ ہمارے ملک کا ایک بہت بڑا طبقہ ہے جو نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ ایسے نوجوان جو بے روزگار ہوتے ہیں۔ تعلیم یافتہ ہوتے ہیں لیکن انہیں زندگی میں کوئی سہارا نہیں ملتا۔ بے سہارا ہونے کی وجہ سے ان کی تمام صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ فکر معاش کا مسئلہ انہیں جینے نہیں دیتا اور وہ معاشرے میں کوئی نمایاں کام انجام نہیں دے پاتے۔ کوئی کسی دفتر میں کلرک بن جاتا ہے، کوئی دکان دار بن جاتا ہے اور معمولی سی زندگی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ ''اپنا گھر'' میں ایسے لوگوں کو ابتدائی طبی امداد دی جائے گی یعنی ان کے لیے سوچا جائے گا۔ ان کی ضروریات اپنا گھر کے وسائل سے پوری کی جائیں گی اور انہیں موقع دیا جائے گا کہ وہ جس فیلڈ میں آگے بڑھنے کے اہل ہیں، اس میں انہیں داخل کیا جائے۔ ملکی طور پر اور ملک سے باہر وہ اپنی صلاحیتوں کو آزمائیں گے اور اس کے بعد ملک و ملت کے لیے ایک مفید انسان بن جائیں گے۔ دارالامان میں ایسی محتاج اور معذور لڑکیوں کو جگہ دی جائے گی جو اپنی زندگی کانٹوں میں گھسیٹ رہی ہیں۔ میں غالباً صحیح طور پر اس کی تشریح نہیں کر سکا ہوں۔ بہر حال یہ ''اپنا گھر'' ہے۔''

''خدا کی پناہ! ایسا عظیم ادارہ میرا خیال ہے میں نے اس کے بارے میں اخبارات میں تفصیل بھی پڑھی تھی۔''

''ہاں، دادا ابو نے ایک پریس کانفرنس کو اپنے خیالات سے آگاہ کیا تھا۔''

''تو اس میں حکومت بھی کچھ امداد کر رہی ہے۔''

''ہاں۔۔۔! لیکن ہم نے اپنے طور پر حکومت کو اس سلسلے میں بہت زیادہ تکلیف نہیں دی ہے۔ بس جو مسئلہ رکتا ہے وہاں ہم اعلا حکام سے رابطہ قائم کر کے اس کا حل تلاش کر لیتے ہیں۔''

''اور یہ آپ کا کلینک۔''

''یہ کلینک دراصل ایک چیلنج ہے۔ میں اپنے ڈیڈی کی بے پناہ عزت کرتا ہوں۔ بلاشبہ انہوں نے ہمارا مستقبل تعمیر کرنے میں بے حد مدد کی ہے۔ لیکن خدا کے فضل و کرم سے ہمارے پاس بے پناہ دولت ہے اور دولت کے یہ انبار تجوریوں میں بے کار پڑے رہیں تو ان سے کسی کو کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ دولت ہمیشہ سرکولیشن میں رہنی چاہیے۔ ہر ایک کے پاس تھوڑی تھوڑی ضرور پہنچنی چاہیے۔ میں اگر ایک اعلا پائے کا کلینک قائم کر کے دولت گھسیٹنا شروع کر دیتا تو اس سے کیا فائدہ ہوتا۔ سوائے اس کے کہ ہمارے بینک بیلنس میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا۔ ہماری تجوریاں کچھ اور بھر جاتیں۔ میں اس سے متفق نہیں تھا وسیم بھائی! چنانچہ ڈیڈی نے کہا کہ تم خود ہی اپنے پیروں پر کھڑے ہو۔ وہ اس سلسلے میں میری کوئی مدد نہیں کریں گے۔ جبکہ پہلے وہ میرے لیے ایک کلینک تعمیر کرانے کے لیے تیار تھے۔ چنانچہ اب دادا ابو نے ''اپنا گھر'' میں میرے لیے کلینک بنوانے کا فیصلہ کر لیا ہے اور یہ اس کا نقشہ۔''

''گویا اس ''اپنا گھر'' میں طبی امداد بھی فراہم کی جائے گی۔''

''جی ہاں! غریبوں کو وہ تمام سہولتیں مہیا کی جائیں گی جو بڑے بڑے ہسپتالوں میں ہیں اور ان کی پہنچ وہاں تک نہیں ہے جن کی وجہ سے انہیں حادثات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ وہ بہترین مشینوں پر اپنا ٹریٹ منٹ نہیں کرا سکتے۔ کیونکہ اس کے لیے انہیں وافر سرمایہ درکار ہوتا ہے۔ اپنا گھر میں جدید ترین پیمانے پر ان نادار لوگوں کو طبی سہولتیں فراہم کی جائیں گی جو اس کے اہل نہیں ہوتے۔''

''اور اس کے اخراجات ''اپنا گھر'' برداشت کرے گا۔''

''جی ہاں! لیکن اپنا گھر کو چلانے کے لیے سرمایہ کہاں سے فراہم ہوگا؟''

''ہم ابھی تو اپنے طور پر یہ سب کچھ کر رہے ہیں اور شاید طویل عرصے تک کرتے رہیں گے۔ لیکن اس کے بعد اپنا گھر کے اپنے کچھ اور معاملات بھی ہیں جو یقیناً شیری بھائی اور دادا ابو کے ذہن میں ہوں گے۔ اتنے بڑے ادارے کو چلانے کے لیے بلاشبہ بہت بڑی رقم درکار ہوگی۔ ممکن ہے مخیر حضرات اس سلسلے میں اس ادارے کی مدد کریں گے۔ حکومت بھی کچھ گرانٹ ضرور دے گی۔ باقی فی الحال تو ہم اپنی جیب سے ہی خرچ کر رہے ہیں۔''

''بہت بڑا سرمایہ درکار ہوگا اس عمارت کی تعمیر کے لیے۔'' وسیم نے پوچھا۔

''تم خود دیکھ لو چل کر۔ عمارت اتنی وسیع ہے کہ اس میں ہزاروں افراد کے لیے گنجائش نکل سکتی ہے۔''

''باخدا دادا ابو جنت کما رہے ہیں۔ میں تو ان سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔''

''ہاں بس اب جو کچھ بھی ہے میں نے تمہیں اس کی تفصیل بتادی ہے۔''

''میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ ویسے بدر صاحب! اس اپنا گھر کی تحریک کہاں سے پیدا ہوئی۔ کون سا خیال دادا ابو کے ذہن میں آیا جس نے انہیں اس طرف راغب کیا۔''

''میں بتاؤ آپ کو یہ جو ہمارے شہریار بھائی ہیں نا یہ ایک ایسی ہمہ گیر شخصیت ہیں کہ تم تصور نہیں کر سکتے وسیم! شیری بھائی علم و عمل کا سمندر ہیں۔ تمہیں یقیناً حیرت ہوگی کہ انہوں نے میڈیکل کی تعلیم میں مجھے بے پناہ مدد دی ہے۔ کون سا شعبہ ہے جس سے ان کی واقفیت نہیں ہے۔ دادا ابو تو ان پر جان چھڑکتے ہیں۔ اپنا گھر انہی کے ذہن کی تخلیق ہے اور انہوں نے ہی دادا ابو کو اس کی تحریک دلائی تھی۔ انہوں نے ہی اس کا منصوبہ پیش کیا تھا۔ دادا ابو بس اس منصوبے پر عمل کر رہے ہیں۔'' بدر نے جواب دیا۔ وسیم کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی۔ یہ معلومات یقیناً بابر علی صاحب کے لیے دلچسپ ہوں گی۔ گویا کام تسلی بخش طور پر جاری ہے۔

بدر خاموش ہو کر وسیم کی شکل دیکھنے لگا۔ دفعتاً وسیم کو اپنی خاموشی کا احساس ہوا اور وہ جلدی سے بولا۔

''واقعی! تب تو یہ شہریار بہت عظیم انسان ہے۔ دادا ابو نے انہیں ملازم رکھا ہوا ہے۔''

''یہ جملے کبھی دادا ابو کے سامنے کہہ بھی مت دینا۔ شیری بھائی کی حیثیت قطعاً ایک ملازم کی نہیں ہے۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ ہمارے ہاں سے تنخواہ بھی لیتے ہیں یا نہیں۔ وہ اس گھر ہی کے فرد ہیں۔''

''ہاں ہونا بھی چاہیے۔ ایسی شخصیت کو بھلا کون اپنے آپ سے دور رکھنا پسند کرے گا۔'' وسیم نے گہرے لہجے میں کہا۔

کافی پینے کے بعد وہ دونوں ریستوران سے اٹھ گئے اور بدر اسے لے کر ''اپنا گھر'' پہنچ گیا۔ وسیم نے بہرطور اپنے طور پر خصوصی معلومات حاصل کر لی تھیں۔ رات کو جب دونوں بھائی اپنے بیڈ روم میں یکجا ہوئے تو دونوں نے اپنی کارروائی کی تفصیل سے ایک دوسرے کو آگاہ کیا۔

''گڈ۔۔۔! گویا بدر کو کلینک کی تعمیر کے لیے آمادہ کرنے والا بھی شیری ہی ہے۔''

''ہاں۔۔۔ اور حیدر علی صاحب کے ذہن میں ''اپنا گھر'' کا خاکہ پیدا کرنے والا بھی یہی شخص ہے۔''

''یار ایک بات ہے، جو کچھ تم نے بتایا ہے وہ ہے تو بہت عظیم الشان۔ شیری کا ذہن اس کے مقصد سے بہت آگے کی سوچتا ہے۔'' ندیم نے پرخیال لہجے میں کہا۔

''تمہاری کیا رپورٹ ہے؟''

''میں نے حیدر علی صاحب کو ٹٹولا ہے اور ان سے راہ و رسم بھی پیدا کر لی ہے۔ بڑا عجیب شوق ہے انہیں ایک۔۔۔ اور وہ شوق ہے جاسوسی ناول پڑھنے کا۔ جاسوسی کہانیوں میں وہ بہت دلچسپی لیتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ شیری نے انہیں ان کی اس کمزوری پر پھانسا ہے۔ اس کے بعد اس نے اس طرح اپنے پنجے گاڑ لیے ہیں کہ حیدر علی صاحب اب اس کے شکنجے سے نہیں نکل سکتے۔''

''ایک بات کا پتا چلانے کی خاص طور سے کوشش کرو ندیم!''

''کیا۔۔۔؟'' ندیم نے سوال کیا۔

''یہ شیری یہاں سے رقمیں کس طرح مار رہا ہے۔ ظاہر ہے بے مقصد تو ان لوگوں میں نہیں گھسا ہو گا۔ مسئلہ یہ ہے کہ اس کی کمائی میں سے کچھ حصہ ہمارا بھی ہونا چاہیے۔''

''ہوں ابھی نہیں۔ ذرا دیر میں یہ کام ہو گا۔ میں حیدر علی کو شیشے میں اتار لوں۔ ویسے آج ہم نے جو کچھ کیا ہے، وہ بہت کافی ہے۔ اب اس کی رپورٹ کس طرح بابر علی صاحب کو دی جائے۔''

''میرا خیال ہے رپورٹ ہم تیار کر لیتے ہیں تحریری طور پر اور پھر وہ لفافہ بابر علی صاحب کے سپرد کر دیا جائے گا۔''

''بس ٹھیک ہے۔ آؤ رپورٹ تیار کریں۔ اب اس وقت یہاں کسی کے آنے کا امکان نہیں ہے۔''

''کل کا کیا پروگرام ہے؟''

''کل میرا خیال ہے۔ میں صفدر کو دیکھوں گا۔'' ندیم نے کہا۔

''اور میں نفیسہ کو۔۔۔!'' وسیم بولا اور دونوں مسکرانے لگے۔ اس کے بعد وہ رائیٹنگ ٹیبل پر رپورٹ کی تیاریاں کرنے لگے۔

☆☆☆

نفیسہ اپنے نگار خانے میں مصروف تھی۔ بڑے بڑے کینوس بورڈ پر لگے ہوئے تھے ان پر خاکے ترتیب پا چکے تھے اور اب ان خاکوں میں رنگ بھرا جا رہا تھا۔

عاقل کی ذمہ داریاں کچھ زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ وہ کئی گھنٹے نفیسہ کے ساتھ اس کے نگار خانے میں صرف کرنے لگا تھا۔ دونوں میں جب سے ذہنی رابطہ قائم ہوا تھا ان کی یگانگت اور بڑھ گئی تھی۔ کبھی کبھی عاقل کا دل چاہتا کہ نفیسہ کو روک دے۔ اس سے کہے کہ وہ مصور نہیں ہے اور نفیسہ جو کچھ کر رہی ہے وہ ٹھیک نہیں ہے۔ اسے بالکل امید نہیں تھی کہ وہ تصویریں جو نفیسہ بنا رہی ہے کوئی مقام حاصل کر سکیں گی۔ شیری نے ہر چند کہ اسے یقین دلایا تھا لیکن عاقل کے دل کو اطمینان نہیں ہوتا تھا۔ وہ نفیسہ کے سامنے جب بھی آتا اس اضطراب کا شکار رہتا، لیکن اس میں اتنی جرات نہیں پیدا ہوئی تھی کہ وہ نفیسہ کو حقیقت سے آگاہ کر سکتا۔ یہ حقیقت معلوم کر کے نفیسہ کا ذہن بری طرح بھٹک جاتا۔ عاقل بھی اس کے ذہن سے اتر جاتا اور شاید وہ مصوری سے بھی بد دل ہو جاتی۔ عاقل کے وہ لمحات بھی نفیسہ کو گراں گزرتے جو اس نے مصوری کے استاد کی حیثیت سے نفیسہ کے ساتھ گزرے تھے۔ وہ خود بھی ایک جھوٹا انسان تصور کیا جا سکتا تھا اور کیا نفیسہ اس جھوٹے انسان کے لیے دل میں وہ جگہ رکھ سکتی تھی جو پیدا ہو گئی تھی۔

ان الجھنوں کا شکار تھا عاقل، لیکن بہر طور وہ نفیسہ کو کام کرا رہا تھا۔ یہ کام ایسا تھا جو خود اس کی سمجھ سے باہر تھا اس کا دل چاہتا تھا کہ مصوری کی کتابیں پڑھے۔ حقیقتوں کو تلاش کرے اور ان حقیقتوں کے خطوط پر نفیسہ کے فن کو استوار کر لے۔ وہ اس کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ اس کے دل میں کبھی کبھی یہ خوف بھی جاگزیں ہو جاتا تھا کہ ان احساسات کا انجام بہتر نہ ہو گا۔

اس وقت بھی دونوں ہی مصروف تھے۔ نفیسہ نے صرف عاقل کے زیر ہدایت کام کیا تھا۔ جو کچھ کر رہی تھی، وہ خود ہی کر رہی تھی۔ ایک تصویر مکمل ہونے کو تھی۔ عاقل خاموش بیٹھا نفیسہ کو یہ کام کرتے دیکھ

رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں یہ ایک بے مصروف عمل تھا۔ لیکن بہرطور یہی عمل اس کے یہاں آنے کا باعث بنا تھا۔ اس لیے کیا کہتا۔

تصویر کو آخری ٹچ دے کر مکمل کر دیا گیا۔ نفیسہ تھکے تھکے انداز میں اس کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔

''کیا خیال ہے عاقل صاحب! آپ میری اس کاوش سے مطمئن ہیں؟''

''ایں۔۔۔ ہاں بہت زیادہ۔'' عاقل نے الجھے ہوئے انداز میں کہا۔

''کیا بات ہے کچھ سوچ رہے ہیں؟''

''ایں۔۔۔ ہاں کچھ نہیں، کچھ خاص بات نہیں۔''

''عام بات بھی اگر آپ سوچیں تو مجھے اس سے مطلع کر دیا کریں۔'' نفیسہ نے ناز بھرے انداز میں کہا اور عاقل نے گہری سانس لے کر دونوں آنکھیں بند کر لیں۔

''عاقل کیا بات ہے! پلیز بتاؤ تو سہی۔۔۔''

''یقین کرو نفیسہ! کوئی خاص بات نہیں۔ وہ رات کو دراصل پوری نیند نہیں لے سکا تھا۔ اسی کی طبیعت کچھ گڑبڑ چل رہی ہے نا اس لیے رات کو سو نہ سکا اور دیر تک جاگنا پڑا۔''

''اوہ، اچھا! پہلے کیوں نہ بتایا، آج یہ کام ہی نہ کرتے۔'' نفیسہ نے محبت بھرے انداز میں کہا۔

''نہیں۔۔۔ نہیں، ایسی کوئی خاص بات بھی نہیں ہے۔ تمہارے پاس آ کر تو طبیعت کو خاصی فرحت حاصل ہو جاتی ہے۔'' اسی وقت دروازے پر کسی کا سایہ لہرایا اور دونوں چونک کر دروازے کی جانب دیکھنے لگے۔

''دخل در معقولات کوئی معقول چیز نہیں ہے۔ لیکن بہرطور ہم جیسے لوگ بھی اس دنیا میں ہوتے ہیں۔'' باہر سے وسیم کی آواز سنائی دی۔ پھر اس نے کہا۔

''اندر آنے کی اجازت چاہتا ہوں۔''

''آئیے۔۔۔ آئیے وسیم صاحب! تشریف

مسکراہٹیں

''میں نے سنا ہے کہ تمہاری بیوی بہت خطرناک ڈرائیونگ کرتی ہے۔'' ایک دوست نے دوسرے کہا۔

''درست ہے۔'' دوسرے نے اطمینان سے کہا۔

''جس وقت وہ ڈرائیونگ کرتی ہے چوراہے کی سرخ بتی بھی اسے دیکھ کر زرد پڑ جاتی ہے۔''

☆☆☆

چار ڈاکو ریل کے مسافروں کو لوٹ رہے تھے۔ ایک ڈاکو نے ایک مسافر سے پوچھا۔

''تمہارے پاس کیا ہے۔؟''

مسافر نے جلدی سے کہا۔ ''بھائی! آہستہ بولو' میرے پاس تو ٹکٹ بھی نہیں ہے۔''

☆☆☆

ایک صاحب کمرے میں داخل ہوئے تو انہوں نے اپنی بیوی کو ٹیلی فون کا ریسور ٹی وی سے لگاتے دیکھا تو بہت حیران ہوئے۔

بیوی بولی ''حیران کیوں ہو رہے ہیں۔ ممی کے ٹی وی پر آواز نہیں آ رہی بس ڈیڑھ گھنٹے کا پروگرام ہے صرف۔''

لائیے۔'' عاقل سنبھل کر بولا اور وسیم اندر آ گیا۔

''سبحان اللہ۔۔۔ سبحان اللہ! بھئی اب کیا کہا جائے اس گھر کے بارے میں۔ میں سمجھتا ہوں یہ دنیا کا نواں عجوبہ ہے۔''

''آپ کس طرح سمجھتے ہیں یہ بات۔'' عاقل نے سوال کیا۔

''میں عجوبہ کسی غلط معنوں میں نہیں کہہ رہا۔ یہاں لوگوں کا انداز فکر اتنا منفرد ہے عام لوگوں سے کہ بڑا رشک آتا ہے اس گھر کو دیکھ کر۔''

''کمال ہے۔'' عاقل نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

''تشریف رکھیے۔''

''اگر اجازت ہو تو ان تصویروں کو دیکھ لوں۔''

''اب آپ آ ہی گئے ہیں تو ایک نگاہ ڈال لیجیے ان پر۔ حالانکہ یہ عام نگاہوں کے لیے نہیں تھیں۔'' نفیسہ نے جواب دیا۔

''ہاں فن کار اپنے فن کو بڑا محبوب رکھتا ہے۔ لیکن آپ یقین کیجیے ہم تو ان پر محبت بھری نگاہ ڈالیں گے۔ ویسے عاقل صاحب! سنا ہے آپ محترمہ نفیسہ کے استاد ہیں۔''

''بڑی جلدی آپ کو یہاں کے بارے میں بے شمار معلومات حاصل ہوگئیں۔''

''کیوں نہ ہوتیں، یہ ہمارے چچا جان کا گھر ہے۔ میں آپ سے فن مصوری کے بارے میں کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں محترمہ نفیسہ!''

''بہتر یہ ہے کہ آپ اس وقت یہ گفتگو نہ کریں۔ آپ تشریف لائے ہیں ان تصویروں کو دیکھیں اور اس کے بعد ہمیں اجازت دیں کہ ہم اپنا کام جاری رکھ سکیں۔''

''اوہو! مصروف تھے آپ لوگ۔ معذرت خواہ ہوں۔ اگر ایسی بات ہے تو میں چلتا ہوں۔''

''نہیں، نہیں! اب ایسی بات بھی نہیں ہے۔ آپ اگر تفریحاً ہی یہاں آئے ہیں تو کوئی حرج نہیں۔ بیٹھیے اور اگر گفتگو ہی کرنا چاہتے ہیں تو نفیسہ نہ سہی، میں حاضر ہوں۔''

''ہاں، ہاں عاقل صاحب! دراصل تجریدی آرٹ میری سمجھ میں کبھی نہیں آیا۔''

''تب تو آپ کو اس موضوع پر بات ہی نہیں کرنی چاہیے کیونکہ یہاں سمجھانے کا وقت کسی کے پاس نہیں ہے۔ اہلِ نظر خود ہی حقیقتوں کو پرکھ لیتے ہیں۔ اگر انہیں بتانا پڑے تو حقیقتوں کا حسن گم ہو جاتا ہے۔'' عاقل نے جواب دیا۔

''آپ کے پاس خوب صورت الفاظ کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ کاش! ہم بھی انہی لفظوں میں بول سکتے۔''

''ضروری نہیں ہے کہ آپ بھی ہنس کی چال چلنے کی کوشش کریں۔'' نفیسہ نے منہ بنا کر کہا۔ لیکن وسیم ڈھیٹ آدمی تھا۔ اس کے اس طنز کو سہ گیا۔

''ہاں ہر شخص کو اہم مقامات حاصل نہیں ہوتے۔ ہم نے سوچا کہ چونکہ ہمیں بھی اس گھر میں اتنی زیادہ اہمیت دے دی گئی ہے سو سب ہی سے ملاقات کرلیں۔ اس لیے آپ کے پاس آ گئے، لیکن لگتا یوں ہے کہ ہماری آمد ناگوار گزری ہے نفیسہ صاحبہ!''

''ہاں ہر ضروری کام میں کسی کی مداخلت پسندیدہ نگاہوں سے تو نہیں دیکھی جا سکتی۔'' نفیسہ نے جواب دیا۔

وسیم پر بھرپور چوٹ تھی۔ وہ اس چوٹ کو برداشت نہیں کرسکا اور بولا۔

''یوں لگتا ہے جیسے ان تنہائیوں میں میری مداخلت بہت ہی ناگوار گزری ہے آپ حضرات کو۔ لیکن یہ خلش دل میں لے کر یہاں ہماری پذیرائی نہیں ہوئی۔

''ارے، نہیں نہیں بیٹھیے! بھئی نفیسہ! یہ غلط بات ہے۔ آپ وسیم کی پذیرائی کریں۔ اپنے فن کے بارے میں گفتگو کریں۔''

''میں صرف ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں آپ سے نفیسہ صاحبہ!''

''جی فرمایئے۔''

''آپ کو یہ احساس کیسے ہوا کہ آپ مصور ہیں۔''

''اس کا جواب کسی دن اخبار میں پڑھ لیجیے گا۔ میری تصویروں کی نمائش ہونے والی ہے۔''

''اچھا، بہت خوب۔۔۔ کب تک؟'' وسیم نے سوال کیا۔

''وقت کا اعلان بھی اخبارات میں کیا جائے گا۔'' نفیسہ نے جواب دیا۔

''بہتر ہے! ویسے آپ کے بارے میں بہت کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ آج سے روزانہ اخبار پڑھنا شروع کردوں گا۔ اجازت دیجیے۔'' وسیم نے کہا اور باہر نکل گیا۔

یہاں سے وہ بہت ذلیل وخوار ہو کر نکلا تھا اور اس کے ذہن میں انتقام کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ نفیسہ اور عاقل نے اس کی اچھی خاصی بے عزتی کی تھی۔ وہ اس بے عزتی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ دفعتاً وہ چونک پڑا۔

عاقل اور نفیسہ۔۔۔ نفیسہ اور عاقل۔ ویری گڈ۔۔۔ ویری گڈ۔ لیکن کیا رپورٹ میں واضح الفاظ میں اس گٹھ جوڑ کے بارے میں کچھ لکھا جائے یا احتیاط برتی جائے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ ندیم سے اس موضوع پر گفتگو کی جائے گی اور اس کے بعد ہی نفیسہ اور عاقل کے بارے میں رپورٹ تیار کی جائے گی۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد وہ مطمئن ہو گیا۔

بابر علی صاحب کے دونوں جاسوس ابھی تک تو کامیابی سے اپنا کام انجام دے رہے تھے۔ لیکن آنے والا وقت شاید ان کے لیے بہتر نہیں تھا۔

ندیم کو بھی اپنے مشن میں کسی قدر کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ پروگرام کے مطابق اسے صفدر کے بارے میں اندازہ لگانا تھا۔ چنانچہ وہ صفدر کے علاقے میں داخل ہو گیا جو اوپری منزل پر تھا۔ صفدر گٹار کے تاروں پر کوئی دھن سیٹ کر رہا تھا۔ ندیم کو داخل ہوتے دیکھ کر اس کے ہاتھ رک گئے۔

''واہ۔۔۔ صفدر صاحب! میں اس لیے نہیں آیا۔ براہ کرم نغمہ جاری رکھیے۔ فن کار کو اپنے فن سے زیادہ عزیز کوئی شے نہیں ہوتی۔ مجھے تو گٹار کی آواز اس طرف گھسیٹ لائی ہے۔''

''آپ کو موسیقی سے دلچسپی ہے ندیم صاحب!''

''عاشق ہوں موسیقی کا۔ آپ صرف دلچسپی کی بات کر رہے ہیں۔''

''خوب۔۔۔ تب تو آپ سے ہماری خوب گھٹے گی۔ ویسے کس قسم کی موسیقی آپ کو پسند ہے؟''

''ہر قسم کی۔''

''میرا مطلب ہے مغربی یا مشرقی۔'' صفدر نے پوچھا۔ ندیم چالاک آدمی تھا۔ ایک لمحہ میں اندازہ لگا لیا کہ اس جگر کو مشرقی موسیقی کی الف۔ ب بھی نہ معلوم ہو گی۔ ایک بھی ساز مشرقی نظر نہیں آ رہا تھا یہاں اس لیے جلدی سے بولا۔

''ہر دور اپنی روایت رکھتا ہے صفدر صاحب! مشرقی موسیقی میں ٹھہراؤ تھا۔ جھیل کا سا سکوت اور گہرائی تھی۔ لیکن یہ اُس وقت کی بات ہے جب انسانی زندگی میں بھی ٹھہراؤ تھا اور اب زندگی جھیل کا سکوت نہیں بلکہ طوفانی سمندر کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ یہ دور طوفانی تیزی کا ہے۔''

''واہ، واہ! کیا بات کہی ہے ندیم بھائی! ایک منٹ میں یہ جملے نوٹ کر لوں کبھی کام آئیں گے۔'' صفدر نے کہا اور ندیم کے جملے اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیے۔

''یہ بات خود تمہارے ذہن میں نہیں تھی صفدر!''

''مم۔۔۔ میرے ذہن میں۔'' صفدر اٹک کر بولا۔

''ہاں تھی، تھی۔۔۔''

''یقیناً ہو گی۔۔۔ ورنہ تم اتنے بڑے فن کار نہ بن سکتے۔''

''بالکل، بالکل۔۔۔!'' صفدر گردن ہلا کر بولا۔

''یہ ملک فن کا قدر دان نہیں ہے۔ لیکن تم جیسے فن کار کو بیرونی دنیا ہاتھوں ہاتھ لے گی۔''

''اچھا۔۔۔'' صفدر نے دانت نکال کر پوچھا۔

''بالکل، اس موضوع پر سوچو۔''

''ضرور سوچوں گا۔''

''ویسے صفدر! تم نے مغربی موسیقی کا سبق کس سے لیا؟''

''شیری بھائی سے۔'' صفدر نے اطمینان سے جواب دیا۔

''شیری بھائی سے۔۔۔ کیا وہ موسیقی سے شغف رکھتے ہیں؟''

''وہ تو علم وعمل کا سمندر ہیں، کون سا موضوع

ہے جس پر اتھارٹی نہیں۔'' صفدر عقیدت سے بولا۔

''کمال ہے یہ شیری صاحب کیا کیا ہیں، ہم ابھی تک نہیں سمجھ سکے۔''

''کوئی نہیں سمجھ سکا۔ شیری بھائی ہر فن مولا ہیں

''یقیناً ایسا ہی معلوم ہوتا ہے لیکن تمہارے لیے انہوں نے کیا کیا۔''

''بس کچھ نہیں۔ ایک دن اچانک انہیں میرے اندر چھپا ہوا فن کار نظر آ گیا۔ کہنے لگے صفدر اگر تم فن موسیقی میں کمال حاصل کرنا چاہو تو تمہارے اندر وہ صلاحیتیں موجود ہیں۔ بس اس کے بعد انہوں نے مجھے بڑے بڑے موسیقاروں کے بارے میں ساری تفصیلات بتانا شروع کر دیں۔ ان کے گانے اور ان کے فن موسیقی کے بارے میں انہوں نے مجھے مکمل ریکارڈ فراہم کیا۔ آلرے، ہیپر ن بائرن لائی شوکا اور نجانے کون کون سے موسیقاروں کی زندگی میرے سامنے پیش کی۔ مجھے ان کے ریکارڈ فراہم کیے۔ اور میں فن کار بن گیا۔''

''اور یہ داڑھی اور بال؟''

''ہر فن کار کی شناخت ہوتی ہے۔'' صفدر نے جواب دیا۔

''تم اپنے فن کا یہ مظاہرہ باہر بھی پیش کر چکے ہو۔''

''ہاں ایک بار پیش کیا تھا۔''

''کب۔۔۔؟''

''بدر بھائی کی کامیابی کے جشن میں، ورنہ اس سے قبل بس گھریلو فن کار رہا ہوں۔''

''گویا شیری نے تمہیں فن کار بنایا۔''

''بے شک۔۔۔ بے شک، یہ ساری حیثیت مجھے میرے استاد محترم یعنی شہریار نے دی ہے۔''

''سبحان اللہ۔۔۔ سبحان اللہ! واقعی صفدر! مان گئے شیری صاحب کو۔ وہ تو اس گھر کا حلیہ ہی بدلنے پر تلے ہوئے ہیں۔''

''بلاشبہ اس میں کیا شک ہے۔'' صفدر نے جواب دیا۔

''اچھا بھئی چلتے ہیں۔ ہمارے لائق بھی کبھی کوئی خدمت ہو تو ہمیں بتا دینا۔''

''جی شکریہ! اگر کبھی ضرورت پیش آئی تو ضرور بتا دوں گا ندیم بھائی!'' صفدر نے کہا اور ندیم وہاں سے بھی نکل آیا۔ اس نے اپنا کام بخوبی انجام دے لیا تھا۔

☆☆☆

بیگم صاحبہ نے شیری کو طلب کیا تھا۔ شیری دست بستہ ان کے سامنے پہنچ گیا۔ بیگم صاحبہ نے مسکراتی نگاہوں سے اس کا استقبال کیا تھا پھر بولیں۔

''آؤ بیٹے! بیٹھو۔ ایک ضروری مسئلے میں تم سے بات چیت کرنا تھی۔''

''جی فرمایئے۔'' شیری نے انکساری سے کہا۔

''وہ شیری میاں! یہ بات اب بار بار کہتے ہوئے اچھی نہیں لگتی کہ تم اس گھر میں میرے لیے کیا حیثیت رکھتے ہو۔ تمہیں خود ہی اس کا احساس ہوگا۔ دل کی بات کہنے کے لیے تم سے زیادہ معتبر اور کوئی شخصیت نظر نہیں آتی۔''

''یہ عنایت ہے آپ کی۔ شیری کے لہو کا ایک ایک قطرہ آپ کے لیے وقف ہے۔ حکم دیجیے۔''

''میں جانتی ہوں بیٹے! میں جانتی ہوں۔ خدا تمہارے لہو کو اپنی جگہ سلامت رکھے۔ پچھلے چند دنوں سے میں الجھن میں ہوں بیٹے!''

''جی فرمایئے۔''

''وہ ان کے، میرا مطلب ہے بابر علی صاحب کے بچپن کے ایک دوست تھے۔ بارہ بنکی کے رہنے والے تھے۔ وہاں چھوٹا موٹا کاروبار کرتے تھے۔ یہاں آئے، ہاتھ پاؤں مارے اور دولت مند بن گئے۔ اب وہ شہاب احمد کہلاتے ہیں۔ شہاب احمد کے چھ بیٹے ہیں۔ پتا نہیں کہاں بابر علی صاحب سے ملاقات ہوگئی، ایک دفعہ ملنے کو آئے تھے۔ گھر دیکھ گئے۔ پتا نہیں ان کے ہاں کے حالات کیسے ہیں۔ بہرصورت دو تین بار ان کی بیگمات بھی آ چکی ہیں۔

وہی پرانے طرز کی ہیں۔ دولت نے چولا نہیں بدلا۔ بدن کا لباس جوں کا توں رہے تو کوئی ہرج نہیں ہے۔ لیکن ذہن بھی ویسے کا ویسا ہے۔ تم نفیسہ اور عیسہ کو بھی دیکھ چکے ہو۔ میں یہ نہیں کہتی کہ ہم لوگ بڑے ماڈرن اور بہت ہی اچھے ماحول کے ہیں۔ لیکن بہرطور اتنے قدیم بھی نہیں رہے کہ بالکل ہی سڑے بسے نظر آئیں۔ جب کہ شہاب احمد کے ہاں کی خواتین بہت ہی پرانے طرز کی ہیں۔ شہاب احمد اپنے بیٹے وہاب احمد کا رشتہ نفیسہ کے لیے چاہتے ہیں۔ کئی دفعہ اس سلسلے میں اشارے دے چکے ہیں۔ اس بار کچھ خاص ہی توجہ دی جارہی ہے۔ کل شاید وہ آنے والے ہیں۔''

''اوہ۔۔۔ نفیسہ کے رشتے کے لیے۔''

''ہاں بیٹے۔۔۔! اول تو میں بھی ابھی نفیسہ کی شادی نہیں کرنا چاہتی۔ میری بچی کی عمر ہی کیا ہے۔ ابھی سے شادی کے جھمیلوں میں پھنس جائے گی۔ پتا نہیں کیا کیا تبدیلیاں آئیں۔ میرا تو جی بھی نہیں بھرا اپنی بچیوں سے ابھی۔ میں ابھی شادی وادی نہیں کرنا چاہتی۔ لیکن بابر علی ہر وہ کام کرنا پسند کرتے ہیں جو مجھے پسند نہ ہو۔ ان پر بیٹی کے ہاتھ پیلے کرنے کی دھن سوار ہے۔ مجھ سے دو تین بار بات کی انہوں نے اس سلسلے میں۔ ابتدا میں تو میں نے کھلے الفاظ میں کہہ دیا کہ بھئی یہ شہاب وہاب کا چکر میں نہیں جانتی۔ ابھی نفیسہ کی عمر ہی کیا ہے جو شادی کے لیے پریشان ہوا جائے۔ لیکن پچھلے دنوں انہوں نے ذرا سخت زبان استعمال کی اور کہنے لگے کہ یہ ذمہ داری باپ کی ہوتی ہے۔ تم تو گھر میں بیٹھی ہوئی ہو۔ ابھی چھوٹی عمر ہے رشتے آرہے ہیں۔ ایک دن ایسا آئے گا کہ رشتے آنا بند ہو جائیں گے اور ہم سب مصیبت کا شکار ہو جائیں گے۔ چنانچہ شہاب احمد کو دیکھ لیا جائے۔ اگر ان کا بیٹا ہمارے معیار پر پورا اترتا ہے تو پھر کیا ہرج ہے۔ اب تم سوچو انہوں نے تو ہٹلر شاہی چلادی۔ لیکن بیٹے! بیٹی کا معاملہ ہے اور پھر نفیسہ کوئی جاہل لڑکی تو نہیں ہے کہ ماں باپ نے جس سے پلو باندھ دیا بندھ گئی۔ وہ تو کردے گی ہنگامہ۔ اس مسئلے کو حل کرنا ہے۔ جس کے لیے میں نے تمہیں تکلیف دی ہے۔'' بیگم صاحبہ نے کہا۔ اسی وقت بیگم صاحبہ کے عقب سے کتے بھونکنے کی آواز ابھری اور بیگم صاحبہ اچھل پڑیں۔

شیری نے بھی چونک کر دیکھا۔ صوفے کے پیچھے سے اکبر کا سر جھانکتا ہوا نظر آرہا تھا۔ پھر وہ ہنستا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

''ڈر گئیں نا ممی۔۔۔! ڈر گئیں نا!''۔۔۔ وہ باہر نکل آیا۔

''اکبر فضول کی حرکتیں نہ کیا کرو۔ آرام سے بیٹھ جاؤ۔ دیکھتے نہیں ہم بات کررہے ہیں۔''

''جی۔'' اکبر تھوڑے فاصلے پر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ تھی۔ شیری بھی مسکرانے لگا۔ بیگم صاحبہ نے پھر سلسلہ گفتگو اسی سنجیدگی سے شروع کیا۔

''تو میں کہہ رہی تھی شیری! کہ یہ مسئلہ تمہیں ہی حل کرنا ہے۔ ہمارا تم سے بڑا محسن اور کوئی نہیں ہے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ وہاب کو نہ دیکھو۔ میں تو بس یہ کہہ رہی تھی کہ جس طرح کی ان کے ہاں کی عورتیں ہیں اسی طرح کے اگر وہاب بھی ہیں تو بابا نفیسہ تو اسے کبھی منہ نہ لگائے گی اور خوامخواہ کے لیے الجھنیں پیدا ہو جائیں گی۔'' بیگم صاحبہ نے کہا۔

''مجھے کیا کرنا ہے، آپ جو حکم دیں۔''

''بھئی دیکھو! اب یہ لوگ کب آتے ہیں۔ میں نے پہلے ہی سے یہ بات تمہارے کانوں میں ڈال دی ہے تاکہ تم ہوشیار ہو جاؤ۔ شہاب اور وہاب احمد دونوں یہاں آرہے ہیں۔ ابھی ان کے آنے کی تاریخ طے نہیں ہوئی۔ بس بابر علی صاحب نے مجھے دھمکی دی ہے کہ وہ آرہے ہیں۔ میں تو اسے دھمکی کہوں گی۔ شیری جن لوگوں سے دل نہ ملے، جو لوگ کبھی ذہن میں نہ اتریں ان کی آمد بھلا کب دلچسپی کا باعث ہوسکتی ہے اور پھر وہ بھی اس سلسلے میں بظاہر وہاب صرف یہاں مہمان کی حیثیت سے آئیں گے

لیکن در پردہ یہ بردکھاوا ہوگا۔ چنانچہ اب ان کی لگام تمہارے ہاتھوں میں ہوگی۔ دیکھنا، پرکھنا، طبیعت کا اندازہ کرنا اور پھر مجھے صحیح رپورٹ دینا۔ میں ایک بار پھر یہ کہہ رہی ہوں کہ میں تمہارے علاوہ کسی پر بھروسا نہیں کرسکتی جو کرنا ہے تمہیں ہی کرنا ہے سمجھے تم۔''

''جی آپ مطمئن رہیں۔ آپ کا شکریہ کہ آپ نے مجھ سے یہ بات کہہ دی۔ آپ بالکل مطمئن رہیے۔ میں وہاب احمد کو پاؤں کے ناخن سے لے سر کے بالوں تک تلاش کرلوں گا اور دیکھوں گا کہ وہ کیا شے ہیں۔''

''جیتے رہو۔۔۔ خدا تمہیں زندگی میں کبھی کسی الجھن کا شکار نہ بنائے۔ تم نے تو یہاں آکر ہمارے مسائل حل کرکے رکھ دیے ہیں۔ کوئی بھی بات ذہن میں الجھے یہ اطمینان ہو جاتا ہے کہ اپنا شیری موجود ہے۔ پھر الجھن کیسی۔''

''بیگم صاحبہ! یہ آپ کی نوازش ہے۔'' شیری نے کہا اور اس وقت کہیں زور سے بلی چیخی اور دونوں پھر چونک پڑے۔ شیری کی نگاہیں اکبر کی جانب اٹھ گئی تھیں۔ اکبر بے تعلقی سے چھت کی جانب دیکھ رہا تھا۔

''بھئی اکبر! یہ آوازیں آخر کہاں سے آرہی ہیں۔''

''خدا جانے شیری بھائی! آپ تو بہت بڑے جاسوس ہیں، تحقیقات کیجیے۔'' اکبر نے جواب دیا اور بیگم صاحبہ دانت پیس کر اسے دیکھنے لگیں۔

''یہ اپنی شرارتوں سے باز نہیں آتا۔ ارے کسی نے تحفہ بھجوایا ہے اسے دکھا شیری بھائی کو دکھا۔''

''کیسا تحفہ ممی۔۔۔! مجھے تو پتا بھی نہیں۔'' اکبر نے آنکھیں مٹکائیں۔

''کوئی بات نہیں بیگم صاحبہ! ہم خود اکبر سے رابطہ قائم کرلیں گے۔'' شیری نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بس شیری! اسی کے لیے میرا ذہن الجھ رہا تھا۔ رات ہی کو بابر علی صاحب نے مجھ سے بات کی تھی اور میرا ذہن الجھ رہا تھا اور اسی وقت سے میں سوچ رہی تھی کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے تم سے اس سلسلے میں بات کرلوں۔''

''آپ مطمئن رہیے۔ آپ نے میری ڈیوٹی لگا دی۔ اب آپ اپنے ذہن کو بالکل آزاد چھوڑ دیجیے۔''

''خدا تمہیں خوش رکھے شیری!'' بیگم صاحبہ نے پرخلوص لہجے میں کہا

''اجازت۔۔۔!'' شیری نے پوچھا اور بیگم صاحبہ نے گردن ہلا دی۔

''آئیے اکبر! اب ذرا آپ سے دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ یہ بلی اور کتے آپ نے کہاں سے پکڑے ہیں۔ ہمیں بھی تو معلوم ہو۔'' شیری، اکبر کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل آیا۔

اکبر بابر علی صاحب کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ شرارت اس کی رگ رگ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ابھی تک شیری کی نگاہ اس پر نہیں پڑی تھی۔ پہلے وہ دوسرے ہی معاملات نمٹانا چاہتا تھا۔ وہ اکبر کو لیے اپنے کمرے میں آگیا۔

''بھئی شیری بھائی! ہمیں نہیں معلوم کہ یہ آوازیں کہاں سے آرہی تھیں۔ آپ سے ممکن ہو سکے تو آپ معلوم کرلیں۔''

''ہوں۔'' شیری نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا اور پھر اس کی بچلی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ اکبر ہنس پڑا تھا۔

''آپ بہت چالاک ہیں شیری بھائی! آپ بہت چالاک ہیں، واقعی آپ بہت چالاک ہیں۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر جیب سے وہ دو چھوٹے چھوٹے چوکور ٹکڑے نکال کر شیری کے سامنے رکھ دیے جو ایک ہی ساخت اور ایک ہی ڈیزائن کے بنے ہوئے تھے۔

''یہ کیا ہے اکبر صاحب!''

''ٹیپ ریکارڈر، بہت ہی اعلا پائے کا ٹیپ ریکارڈر اور وائرلیس اس پر ہر طرح کی آوازیں

ریکارڈ ہو جاتی ہیں شیری بھائی! میں نے بلی اور لتے کی آوازیں ریکارڈ کی تھیں اور آپ نے دیکھا کہ اتنا سا ٹیپ ریکارڈ ہے لیکن اس کی آواز کتنی تیز ہے۔''

''واہ! یہ تو کمال کی چیز ہے بھئی، لیکن یہ دو کیوں ہیں؟''

''بس یہ دونوں ملا کر ایک سیٹ بنتا ہے۔ اس کی عجیب وغریب خصوصیات ہیں۔''

''وہ کیا۔۔۔؟''

''یہ۔۔۔ یہ دیکھیے یہ اس میں کیسٹ لگا ہوا ہے۔'' اکبر نے اس ننھے سے ٹیپ ریکارڈر سے ایک بہت ہی چھوٹا سا کیسٹ نکال کر شیری کے سامنے رکھ دیا۔

''یہ کیسٹ پورے ایک گھنٹے کا ہے اور اسے آن کرنے کا یہ بٹن ہے جسے اگر آن کر دیا جائے تو یہ ٹیپ ریکارڈر آن ہو جاتا ہے۔ آپ اسے آن کر کے چھوڑ دیجیے۔ اگر یہ کہیں دور رکھا ہوا ہے تو آپ کو اس دوسرے سیٹ پر اس پر ہونے والی آوازیں سنائی دیتی رہیں گی۔ بشرطیکہ آپ دوسرے سیٹ کا یہ والا بٹن آن کر دیں۔'' اکبر نے ایک اور ننھے بٹن کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''گویا اس بٹن کو آن کرنے کے بعد دوسری طرف ریکارڈنگ بھی ہوتی رہے گی اور یہ گفتگو جو ریکارڈ ہو رہی ہو گی آپ کو تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر سنائی بھی دیتی رہے گی۔ اس طرح یہ وائرلیس بھی ہے اور ٹیپ ریکارڈر بھی۔''

شیری کی آنکھیں تعجب سے پھیل گئی تھیں۔ اس کے ذہن میں کچھ بجلیاں سی چمکیں اور وہ اکبر کو دیکھنے لگا۔

''کمال ہے اکبر! کہاں سے آئی یہ چیز آپ کے پاس؟''

''میرے انکل ہیں، میں نے ان سے فرمائش کی تھی۔ انہوں نے یہ ٹیپ ریکارڈر مجھے جرمنی سے بھیجا ہے۔ کل ہی تو اس کا پارسل موصول ہوا تھا مجھے۔ میں نے بہت ساری آوازیں ریکارڈ کی ہیں۔''

''بڑی ہی نایاب چیز ہے یہ اکبر! اور میں آپ کو ایک بات بتاؤں۔''

''جی شیری بھائی!''

''اس ٹیپ ریکارڈر کے ساتھ آپ بہت بڑے جاسوس بن سکتے ہیں۔ کیا خیال ہے آپ کا۔ جاسوسی سے آپ کو کوئی دلچسپی ہے؟''

''کیوں نہیں، میں نے ٹیلی ویژن پر بہت سی جاسوسی فلمیں دیکھی ہیں۔ بڑا لطف آتا ہے۔ آپ کو یہ فلمیں پسند ہیں شیری بھائی!''

''کمال ہے بھئی، مجھے پسند ہی صرف جاسوسی فلمیں ہیں اور کوئی فلم تو میں دیکھتا ہی نہیں ہوں۔ لیکن اکبر کیوں نہ آپ بھی جاسوسی شروع کر دیں۔''

''جاسوسی۔۔۔'' اکبر نے حیرت بھری نگاہوں سے شیری کو دیکھا۔

''ہاں! میں نے کہا نا کہ اس ٹیپ ریکارڈر کو حاصل کرنے کے بعد تو آپ بہت بڑے جاسوس بن سکتے ہیں۔ یہ چیزیں عام لوگوں کے پاس کہاں ہوتی ہیں۔''

''ہاں یہ تو ہے۔ اب میں سب کی آوازیں ریکارڈ کر سکتا ہوں۔''

''تو پھر ٹھیک ہے آج سے آپ جاسوس اعظم اور ہم آپ کے اسسٹنٹ۔'' شیری نے کہا۔

''نہیں۔۔۔ نہیں، شیری بھائی! بڑے تو آپ ہیں۔ میں آپ کا اسسٹنٹ بنوں گا۔''

''بھئی سوچ لیں۔ اگر آپ چیف بننا چاہیں تو چیف بن جائیں۔ اسسٹنٹ بننا چاہیں تو اسسٹنٹ بن جائیں۔ لیکن کام آپ کو بڑی ہوشیاری سے کرنا ہوگا۔''

''شیری بھائی! چیف آپ ہیں اور چیف! آپ حکم دیں۔ آپ کا اسسٹنٹ ایسی عمدہ جاسوسی کر کے دکھائے گا کہ آپ کو لطف ہی آ جائے گا۔''

''ہوں، لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیے مسٹر اکبر کہ جاسوسی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ جاسوس کو اپنے چہرے کے تاثرات پر ہمیشہ کنٹرول ہونا چاہیے تاکہ

اس کی شکل دیکھ کر کبھی اس کے بارے میں یہ اندازہ نہ لگا پائے کہ وہ کب کیا کرنا چاہتا ہے۔ یہ چالاکی ہی جاسوسی کو کامیابی سے ہمکنار کر سکتی ہے۔''

''میں نے پہلا سبق نوٹ کر لیا۔ آپ مطمئن رہیے۔ آپ کا یہ جاسوس آپ کی ہدایت کے مطابق ہی کام کرے گا۔'' اکبر نے جواب دیا۔ اپنے اس ننھے سے کھلونے سے اسے ایک اور تفریح ہاتھ آئی تھی۔ اس سے اچھی بات اس کے لیے اور کون سی ہو سکتی تھی۔

''تو اکبر ہم آپ کو پہلی ڈیوٹی سپرد کرتے ہیں۔ آپ کو پوری طرح ندیم اور وسیم پر نگاہ رکھنی ہوگی۔ یہ لوگ جب اپنے کمرے میں تنہا ہوں تو آپ چالاکی سے ان کی گفتگو ریکارڈ کر لیجیے اور ہمیں اس سلسلے میں مکمل رپورٹ پیش کی جائے۔''

''او کے چیف! بہت جلد یہ کام انجام دے دیا جائے گا۔'' اکبر نے جواب دیا۔

''گڈ، ویری گڈ! ہماری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔'' شیری نے کہا اور اکبر گردن ہلا کر شیری کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ شیری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ واقعی اگر اکبر نے اپنا یہ کام سلیقے سے انجام دیا تو ندیم اور وسیم کی شخصیت کھل کر سامنے آجائے گی۔ اگر کوئی خاص ہی بات ہے تو پھر ان لوگوں کو بھی چیک کر لیا جائے گا۔ پھر اس کے ذہن میں شہاب اور وہاب دوڑنے لگے۔ نفیسہ کے معاملے میں کسی شہاب وہاب کے جھگڑا ملوث نہیں ہونا چاہیے۔ معصوم اور شریف النفس عاقل، نفیسہ کی جانب متوجہ ہو گیا ہے اور نفیسہ خود اسے چاہنے لگی ہے۔ تو اب ان دونوں کا یہ رابطہ ختم نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ اگر ممکن ہو سکے تو عاقل اور نفیسہ کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیا جائے خوا اس میں کتنا ہی وقت لگے۔ لیکن فیصلہ کن بات یہ ہے کہ شادی ہوگی تو ان دونوں کی ہوگی کوئی اور نفیسہ پر قابو نہیں پا سکے گا۔ اگر یہ بات شیری کے علم میں نہ آئی ہوتی تو کوئی ہرج نہیں تھا۔ بابر علی صاحب کہیں بھی نفیسہ کی شادی کر دیتے، ہاں اگر نفیسہ خود اس کی مدد کی طالب ہوتی تو دوسری بات تھی۔ لیکن اب تو شیری بھی خود اسے اپنا فرض سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس نے دل میں یہ فیصلہ کر لیا یہ بیل منڈھے نہیں چڑھنے دے گا۔ آؤ تو سہی شہاب، وہاب، دیکھیں تو سہی تم کیا چیز ہو۔ وہ مسکراتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔

رات کو دس بجے ندیم اور وسیم یکجا ہوئے تھے۔ آج انہیں فائنل رپورٹ تیار کرنا تھی اور یہ رپورٹ وہ بابر علی صاحب کو پیش کرنا چاہتے تھے۔ ان کے فرشتوں کو بھی اس بات کا احساس نہیں تھا کہ دو ننھی منھی پراسرار آنکھیں صبح سے ان کی کھوج میں ہیں اور مسلسل ان کے پیچھے لگی ہوئی ہیں۔ چنانچہ رات کو جب وہ دونوں یکجا ہوئے اور اس سلسلے میں گفتگو کا آغاز کرنے بیٹھے تو اسی وقت اکبر کافی کی ٹرے لیے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔ دروازہ چونکہ کھلا ہوا تھا اس لیے دونوں اکبر کو دیکھ کر چونک پڑے تھے۔

''ارے اکبر آپ۔۔۔ آپ۔۔۔؟''

''جی انکل کیا بات ہے۔'' اکبر نے تعجب سے پوچھا۔

''میرا مطلب ہے کہ یہ تکلیف آپ نے کیوں کی، ملازم کہاں چلا گیا تھا۔''

''بشیر سے میں نے ایک چیز منگوائی تھی۔ وہ کافی لے کر آرہا تھا۔ میں نے اس سے کہا کافی میں پہنچائے دیتا ہوں۔ تم میرے لیے ٹافیوں کا پیکٹ لا دو۔'' اکبر نے کہا۔

''بہت بہت شکریہ آپ کا۔ آپ نے ہمیں شرمندہ کر دیا۔'' وسیم نے محبت بھرے انداز میں کہا۔

''کوئی بات نہیں انکل! گھر کے کام بچوں کو خود بھی کرنے چاہئیں۔'' اکبر بڑے مہذب لہجے میں بولا۔

''آپ عظیم شخصیت کے مالک ہیں۔ شکریہ رکھ دیجیے کافی۔'' وسیم نے کہا۔

اکبر نے کافی کی ٹرے ان کے سامنے رکھی اور پھر ایک ایک پیالی ان کے سامنے سرو کر دی۔ اس

کے بعد وہ ٹرے اٹھا کر واپس پلٹ پڑا۔ لیکن اس دوران اس کا ہاتھ اپنا کام کر چکا تھا۔

چھوٹا ٹیپ ریکارڈر سیٹ اسی میز کے نیچے ایک مخصوص خانے میں پہنچ گیا تھا جس کے گرد وہ دونوں بیٹھے تھے۔ اس کے بعد اکبر کمرے سے باہر نکل گیا۔

''دروازہ بند کر دو کہیں کوئی اور نہ آ جائے۔'' ندیم نے وسیم سے کہا اور وسیم نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔

''کیا رپورٹ ہے وسیم!''

''ندیم بس یوں سمجھ لو کہ لطف ہی آ گیا۔ میرا خیال ہے ہم نے زبردست کارنامہ انجام دیا ہے۔''

''ویری گڈ۔۔۔ ویری گڈ۔ پھر شروع ہو جاؤ۔'' ندیم بولا۔

''میں نے سب سے پہلی ملاقات بدر سے کی تھی۔ بدر بلاشبہ ڈاکٹر بن چکا ہے۔ لیکن فطری طور پر انتہائی معصوم شخصیت کا مالک ہے۔ اس کے ذہن میں پہلے کوئی بات نہیں تھی یعنی جس طرح بابر علی صاحب چاہتے تھے۔ اس طرح وہ عمل کرنے کا خواہش مند تھا۔ کلینک کھولتا اور بابر علی صاحب کے لیے دولت کے ڈھیر لگا دیتا۔ لیکن شیری نے اس کے ذہن میں تبدیلیاں پیدا کیں۔ شیری ہی نے اسے یہ راستہ دکھایا کہ دولت مندوں کے بجائے غریبوں کا علاج کر کے دعائیں سمیٹی جا سکتی ہیں۔ دولت مند تو اپنا علاج کہیں بھی کرا لیتے ہیں لیکن غریبوں کے لیے جدید علاج معالجے کی تمام سہولتیں موجود نہیں ہیں۔ کیوں نہ بدر ایک ایسے کام کی داغ بیل ڈالے جو نادار لوگوں کے حق میں ہو اور بدر کو یہ بات بھا گئی۔ چنانچہ اس نے اپنے جشن کے دوران شیری ہی کے ایما پر یہ اعلان کیا کہ وہ کلینک کو غریبوں کے لیے وقف کر دے گا۔ ظاہر ہے بابر علی صاحب اس کے حق میں نہیں تھے لیکن شیری نے بدر کے ذہن میں یہ بات اس طرح بٹھا رکھی تھی کہ وہ بابر علی صاحب سے بھی لڑ گیا اور نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔''

''ویری گڈ۔۔۔ ویری گڈ! بدر نے اس بات کا اعتراف کیا؟''

''ہاں، بالکل کھلے انداز میں اس نے کہا کہ شیری اس کا راہنما ہے۔ ویسے یہ چیز ذرا اونچی لگتی ہے ندیم! اس بات کو ذہن میں رکھنا۔''

''شیری نا۔۔۔'' ندیم نے پوچھا۔

''ہاں سوفیصدی وہی۔'' وسیم نے جواب دیا۔

''کس لحاظ سے کہہ رہے ہو؟''

''بھئی سارے معاملات میں اس کی کارکردگی نظر آتی ہے۔ سارا گھر اس کے اشاروں پر چل رہا ہے۔ کیا یہ بات حیرت انگیز نہیں ہے۔''

''سوفیصدی ہے۔ اگر نہ ہوتی تو بابر علی صاحب ہمارا انتخاب کیوں کرتے۔''

''ہاں۔۔۔ ہاں، ٹھیک ہے تو بدر کو یہ تمام ہدایات شیری ہی کی جانب سے ملی ہیں اور اب ''اپنا گھر'' میں بدر کے لیے ایک علیحدہ حصہ مخصوص کر دیا گیا ہے۔ نقشہ تیار ہو چکا ہے اور کلینک کی تعمیر بہت جلد شروع ہو جائے گی۔ اپنا گھر اپنے وسائل سے بدر کو وہ تمام چیزیں مہیا کرے گا جو اس کی ضرورت ہوں گی۔ یہ تھا بدر کا معاملہ، میری دوسری شکار محترمہ نفیسہ تھی۔''

''اوہ۔۔۔ محترمہ نفیسہ کو کیسا پایا'' ندیم نے پوچھا۔

''نفیسہ کو میں نے اس کے نگار خانے میں جا کر ٹٹولا۔ بڑی بداخلاقی سے میرے ساتھ پیش آئی۔ عاقل بھی اس کے ساتھ ہی موجود تھا۔ بہرطور یہ بات یہاں بھی مکمل طور پر ثابت ہو گئی کہ نفیسہ کو اس کے فن کا احساس دلانے والے بھی حضرت شیری ہی تھے۔ عاقل کو ان کے استاد کی حیثیت سے متعین کیا گیا۔ لیکن ندیم ایک بہت ہی دلچسپ اور دلکش مرحلہ جو میرے سامنے آیا وہ یہ ہے کہ عاقل صاحب نفیسہ کو صرف فن مصوری ہی کی تعلیم نہیں دے رہے بلکہ عشق و محبت کا کھیل بھی جاری ہے۔''

''کیا۔۔۔؟'' ندیم اچھل پڑا۔

(جاری ہے)

آئینہ

ایک اسٹیج ڈرامہ جو کئی لوگوں کے لیے آئینہ ثابت ہوا جس نے کئی سماجی شخصیات کے سوئے ہوئے ضمیروں کو جھنجھوڑ ڈالا۔

زبیر احمد

ایک اسٹیج ڈرامہ کا قصہ جو آپ کی اصلاح کا باعث بھی بن سکتا ہے

وہ جو کہتے ہیں کہ نظام کی تبدیلی سے کچھ نہیں ہوتا۔۔۔ نظام کو چلانے والوں کی تبدیلی سے ہی تبدیلی آتی ہے تو یہی حال جناح گورنمنٹ بوائز ہائی اسکول کا تھا۔ یہ اسکول تو وہی تھا برسوں کا پرانا۔۔۔ بس اس کے ہیڈ ماسٹر کی تبدیلی سے اس کی ساری پرانی باتیں یکسر بدل گئی تھیں۔ نئے ہیڈ ماسٹر صاحب جنید جمشیدی نے آتے ہی تبدیلیاں لانا شروع کر دی تھیں۔ اسکول میں چارج لیتے ہی انہوں نے پورے اسٹاف کو سامنے بٹھا کر کہا۔

''آپ تمام لوگ ساری پرانی باتوں کو بھول جائیں اب یہ اسکول نئے نظام کے تحت چلے گا۔''

''تو کیا آپ کوئی نیا فارمولا لے کر آئے ہیں جناب!'' حساب کے ٹیچر نے پوچھا۔

''جی نہیں۔۔۔ فارمولا تو وہی پرانا ہے۔'' وہ بولے۔ ''مگر اسے فراموش کر دیا گیا تھا۔ میں اسی بھولے ہوئے فارمولے کو نئے سرے سے چلانے

آیا ہوں۔'' انہوں نے خاموش ہو کر اساتذہ کی طرف دیکھا کہ کوئی اور سوال کرتا ہے یا نہیں۔ جب کسی نے کچھ پوچھا نہیں تو جنید جمشیدی نے اپنی بات آگے بڑھائی۔

''میں سب سے پہلے آپ لوگوں سے یہ درخواست کروں گا کہ اپنے ذہنوں سے یہ بات نکال دیجئے کہ یہ گورنمنٹ اسکول ہے۔۔۔ اس لیے یہاں ہر طرح کی بے ضابطگی چل سکتی ہے۔ گورنمنٹ ہائی اسکول سمجھ کر میں اس کی سابقہ کارکردگی کی تحقیق و تصدیق نہیں کروں گا۔ بس میں یہ چاہوں گا کہ آج کے دن سے آپ تمام لوگ بالکل بدل جائیں۔ جماعتوں میں بالکل وقت پر پہنچیں۔۔۔ کسی بھی پیریڈ کا ایک منٹ بھی ضائع نہ کریں۔ وقت مقررہ پر طلبہ کا کورس مکمل ہونا چاہیے۔ خود محنت کیجئے۔۔۔ طلبہ سے محنت کروایئے۔ میں ہر ماہ ہر کلاس کا جائزہ لوں گا کہ انہیں کیا پڑھایا گیا۔۔۔ اور طالب علموں نے کیا پروگریس کیا۔ جس ٹیچر نے تین مہینے کے اندر اندر اپنی کمزوریاں دور نہیں کیں۔۔۔ میں اس اسکول سے اس کا تبادلہ بہت دور دراز کے اسکول میں کرادوں گا۔''

جنید صاحب نے ہر کلاس میں جا کر طالب علموں سے بھی ملاقات کی اور ان سے کہا۔ ''آج کے بعد سے آپ لوگ اس حال میں اسکول نہیں آئیں گے۔ مکمل یونی فارم میں ہر طالب علم کو اسکول آنا پڑے گا۔ یونی فارم صاف ستھرا استری کیا ہوا اور شوز پالش شدہ ہونا چاہئیں۔ کلاس لگنے سے پانچ منٹ پہلے کلاس میں موجود ہونا چاہیے۔ جس نے وقت کی پابندی نہیں کی، اسے کلاس میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ملے گی۔ اپنا ہوم ورک ہمیشہ کیا کریں۔۔۔ ماسٹر صاحبان سے مکمل تعاون کریں۔ شرارتیں ضرور کریں مگر کلاس روم سے باہر۔ آپ کے والدین آپ لوگوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے اسکول بھیجتے ہیں اس لیے ان کی توقعات پر پورے اتریں۔ انہیں مایوس نہ کریں۔۔۔ آپ لوگوں کے جو بھی مسائل ہوں، اپنے ٹیچر سے بتائیں یا مجھ سے کہیں۔ میں انہیں دور کرنے کی کوشش کروں گا۔''

ایک مہینے کے بعد جناح گورنمنٹ بوائز اسکول کے ٹیچروں اور طالب علموں کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی اسکول ہے جو ایک عرصہ سے عام سرکاری اسکولوں کی طرح چل رہا تھا۔ اب تو اس میں مہنگے پرائیویٹ اسکولوں جیسی بہت سی باتیں شامل ہو گئیں تھیں۔ بس ہڈحرام قسم کے اسٹاف کا جینا ذرا دشوار ہو گیا تھا کیوں کہ انہیں ایک ایک لمحہ کا حساب دینا پڑتا تھا، اسکول بھی ہر طرف سے صاف ستھرا نظر آتا تھا اور بچوں کی تعلیم کا معیار بھی تیزی سے بہتر ہوتا جا رہا تھا۔

جنید جمشیدی صاحب کی آمد کا ایک سال مکمل ہوا تو جناح گورنمنٹ بوائز ہائی اسکول کا حلیہ ہی بدل گیا تھا۔ کہنے کو یہ گورنمنٹ بوائز ہائی اسکول تھا مگر کسی اچھے پرائیویٹ اسکول سے اس کی کارکردگی کسی طرح کم نہیں تھی۔ اس میں پڑھنے والے بچے بھی خوش تھے اور ان کے والدین بھی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کا ایک سال مکمل ہوا تو طالب علموں کا ایک وفد ہیڈ ماسٹر صاحب سے ملا۔

''ہاں۔۔۔ بتاؤ بچو! کس لیے آئے ہو۔ کیا کام ہے؟''

''سر! ہم ایک درخواست لے کر آپ کے پاس آئے ہیں۔'' وفد کے لیڈر نے بڑے ادب سے کہا۔

''ہاں ہاں کہو کیا بات ہے؟''

''سر! ہم یہاں۔۔۔ اس اسکول میں۔۔۔ ایک ہفتہ منانا چاہتے ہیں۔''

''ہفتہ۔۔۔ کیسا ہفتہ بھئی؟''

''تعلیمی اور تفریحی ہفتہ۔''

''اچھا اچھا۔۔۔ ضرور منائیں بھئی آپ لوگ۔ مگر جو کچھ کریں۔۔۔ خود کریں، اسکول کے پاس فی الحال اتنا فنڈ نہیں کہ اس سلسلے میں آپ لوگوں کو اس سے کچھ دیا جا سکے۔ ہاں اخلاقاً میں مکمل طور پر

آپ لوگوں کے ساتھ ہوں۔ ویسے میں ذاتی طور پر جو کچھ آپ لوگوں کے لیے کرسکا، ضرور کروں گا۔ آپ لوگ اپنے ماسٹر صاحبان سے بھی مکمل مدد لے سکتے ہیں۔''

اس ہفتے کے دوران یوں تو سبھی پروگرام اچھے تھے۔ حسن قرات اور نعت خوانی کے مقابلے، بیت بازی کا مقابلہ، کرکٹ میچ۔ مگر سب سے اچھا پروگرام اسٹیج ڈرامے کا تھا۔۔۔ اور یہ ہفتے کا آخری پروگرام تھا۔ جنید صاحب بہت خوش تھے کہ بہتر تعلیم و تربیت نے ان کے طالب علموں کی نہ صرف تعلیمی صلاحیتوں کو بڑھایا ہے بلکہ ان میں خود اعتمادی بھی پیدا کی ہے۔ اس ہفتے کا سب کچھ انتظام انہوں نے خود کیا تھا۔ سارا خیال ان کا تھا، ان کو عملی جامہ پہنانے میں ساری محنت ان کی تھی۔ انہوں نے تو ان طالب علموں کو اسی لیے فری ہینڈ دیا تھا کہ ان کی صلاحیتوں کو آزمائیں اور انہیں بے حد خوشی تھی کہ وہ اس آزمائش میں پورے اترے تھے۔

ہفتے کے کامیاب انعقاد کے بعد اگلے روز اسکول میں چھٹی تھی۔ اس کے اگلے روز اسکول کھلا تو تمام لوگ بہت خوش تھے۔ جنید صاحب کچھ ضروری کاغذات کا مطالعہ کررہے تھے کہ چپراسی نے علاقے کے ناظم صاحب کے آنے کی اطلاع دی۔

اتنے میں ناظم صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ جنید صاحب نے کھڑے ہوکر ان کا استقبال کیا مگر ان کا ستا ہوا چہرہ دیکھ کر فکر مند ہوگئے کہ ان کے چہرے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں۔ وہ انتظار کرنے لگے کہ گفتگو کی شروعات وہی کریں مگر جب وہ بدستور منہ لٹکائے بیٹھے رہے تو انہیں خود بولنا پڑا۔

''جی۔۔۔ فرمایئے۔۔۔ میرے لیے کیا حکم ہے۔''

''کیا فرماؤں جناب۔'' ناظم صاحب نے بڑے کھردرے انداز میں کہا۔ ''آپ نے تو میری بڑی عزت افزائی کی اپنے بچوں کے ذریعہ۔''

''جی۔۔۔ کیا فرمایا جناب نے۔۔۔ میں کچھ سمجھا نہیں۔''

''آپ کے بچوں نے جو ڈرامہ اسٹیج کیا تھا۔''

''جی ہاں کیا تھا۔''

''اس ڈرامے میں تو انہوں نے مجھے ننگا کردیا۔''

''نہیں ناظم صاحب! خدانا خواستہ اس میں تو کوئی ایسی بات نہیں۔''

''کیسے نہیں تھی جناب! وہ جو ڈرامے کا ایک کردار لوگوں سے وعدہ کرتا ہے میں تم لوگوں کے لیے یہ کردوں گا۔۔۔ وہ کردوں گا۔۔۔ مگر کسی کے لیے کچھ نہیں کرتا، کیا آپ کے بچوں نے اس کردار کے سہارے مجھے نشانہ نہیں بنایا ہے۔''

''ٹھہریئے۔۔۔ میں ڈرامہ لکھنے اور اسے ڈائریکٹ کرنے والے لڑکوں کو بلاتا ہوں۔''

''بلایئے۔''

اور جب دونوں لڑکے آئے تو جنید صاحب نے ناظم صاحب کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ ''یہ ناظم صاحب ہیں اس علاقے کے۔''

''جی، ہمیں معلوم ہے۔''

''تم لوگوں کی شکایت لے کر آئے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ تم لوگوں نے اپنے ڈرامہ کے ذریعہ ان کی بے عزتی کی ہے۔''

دونوں لڑکوں نے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھا۔ پھر انہوں نے جنید صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''سر! ڈرامہ تو آپ نے بھی دیکھا ہے۔۔۔ آپ ہی فرمایئے اس میں ایک لفظ بھی ایسا تھا جس میں ناظم صاحب کے بارے میں کچھ کہا گیا ہو۔''

''یہ کہتے ہیں۔۔۔ اس ڈرامے میں ایک کردار ہے جو لوگوں سے وعدے کرتا ہے مگر پورے نہیں کرتا۔۔۔ وہ ان کا کردار ہے۔۔۔ اس کردار کے ذریعہ انہیں رسوا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کیا اس کردار کو لکھتے وقت ان کا خیال تمہارے ذہن میں تھا۔''

''نہیں سر! ہمیں تو ان کے اس پہلو کے

بارے میں کوئی علم نہیں۔ نہ ہی یہ ان کا کردار ہے۔۔۔ ایسے لوگ تو ہر جگہ موجود ہوتے ہیں جو بہت سی باتوں کے وعدے کر لیتے ہیں لیکن انہیں کبھی پورا نہیں کرتے۔ ہم نے تو اپنے ناظرین کو بس کردار کے ذریعہ یہ سبق دینے کی کوشش کی ہے کہ وعدہ کرو تو پورا کرو۔ ہمارے مذہب نے بھی وعدہ خلافی کو گناہ قرار دیا ہے۔''

جنید صاحب نے بھی ناظم صاحب کو بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ اس کردار سے آپ کا کوئی تعلق نہیں مگر وہ مطمئن نہیں ہوئے اور یہ بڑبڑاتے ہوئے کہ۔۔۔ ''ہمیں ہمارا پورا کوٹہ ملتا ہی نہیں۔۔۔ ہم پبلک کی تمام ضرورتیں کیسے پوری کریں۔۔۔'' چلے گئے۔

ناظم صاحب کے جانے کے بعد انہوں نے دوبارہ فائل کی طرف توجہ دی تھی۔ چپراسی نے آکر اطلاع دی۔ ''سر علاقے کے تھانے دار صاحب آئے ہیں۔''

''بلاؤ۔''

اور پھر جیسے ہی کمرے میں آنے والے نے قدم رکھا، ہیڈ ماسٹر صاحب بولے۔ اوہو! ایس ایچ او صاحب، خیریت تو ہے جناب!''

''خیریت کہاں جناب!'' ایس ایچ او کرسی پر براجمان ہوتے ہوئے بولے۔ ''اب لوگ تھانے پولیس پر بھی حملہ آور ہوں گے تو خیریت کہاں ہوگی، کیسے ہوگی؟''

''جی۔۔۔ یہ کیا فرما رہے ہیں آپ۔'' انہوں نے حیرانی سے کہا۔ ''تھانے پولیس پر لوگ بھلا کیسے حملہ آور ہو سکتے ہیں؟''

''ماسٹر جی! گولی سولی۔۔۔ اور بم دھماکوں ہی سے حملہ نہیں کیا جاتا۔۔۔ بولی سے بھی حملہ کیا جاتا ہے جو آپ کے لڑکوں نے کیا ہے۔''

''ہمارے لڑکوں نے۔۔۔! مجھے بتایئے وہ کون لڑکے تھے جنہوں نے تھانے جا کر آپ لوگوں کی توہین کی۔''

''ماسٹر جی! آپ کے لڑکوں نے تھانے جا کر نہیں۔۔۔ یہیں آپ کے اسکول میں آپ کے تمام مہمانوں کے سامنے ہماری بے عزتی کی ہے۔ ہم تو اسی وقت انہیں ہتھکڑی لگا کر تھانے لے جاتے۔۔۔ مگر ہمیں آپ کی عزت کا خیال تھا۔ اس لیے اب آپ سے شکایت کرنے آئے ہیں۔''

''باخدا ہم کچھ نہیں سمجھے۔ کون لڑکے تھے۔۔۔ کس نے آپ کو یا آپ کے عملے کو برا بھلا کہا۔''

''بھولے نہ بنو ماسٹر جی! کیا تمہیں معلوم نہیں وہ کون لڑکا تھا۔۔۔ وہ لڑکا وہ تھا جس نے اسکول کے اسٹیج کیے جانے والے ڈرامے میں ماموں کا کردار ادا کیا تھا اور ایسا ڈنڈا لے کر (تھانے دار نے اپنے ڈنڈے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا) اپنے بھانجے بھتیجوں کو ڈنڈا دھمکاتا رہتا تھا۔ ایک ایک کو تمہارے والدین کے آگے لائن حاضر کر دوں گا اور پھر ان سے ٹافیاں اور چیونگم رشوت لے کر انہیں معاف کر دیتا تھا۔''

جنید صاحب نے ایک لمبا سانس لے کر کہا۔ ''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے تھانے دار جی! وہ تو ایک عام سا کردار ہے۔۔۔ اکثر گھروں میں ایسے ماموں یا چچا ہوتے ہیں۔''

''ہوتے ہوں گے۔۔۔ مگر آپ کے بچوں نے تو ہمیں۔۔۔''

جنید صاحب نے اپنے طور پر تو ایس ایچ او کو سمجھانے کی پوری کوشش کی مگر وہ غصے میں بھرے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور اپنا ڈنڈا میز پر مار کر بولے۔ ''ہمارے متھے تال لگنے کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔۔۔ سمجھے آپ۔'' اور تنتناتے ہوئے باہر نکل گئے۔

''کیا مصیبت ہے بھئی۔'' انہوں نے خود کلامی کے انداز میں کہا اور وہ ایک بار پھر فائل کی طرف رجوع ہونے ہی والے تھے کہ ان کے کمرے میں ایک خاتون گھستی چلی آئیں۔ چپراسی ان کے پیچھے

پیچھے یوں آرہا تھا جیسے اس کے روکنے کے باوجود نہ رکی ہوں۔

''آپ مجھے جانتے ہیں۔'' خاتون نے بغیر کسی تمہید کے ہیڈ ماسٹر سے پوچھا۔

''نہیں۔''

''میں مسز سجاد حیدر شیروانی، ایک انجمن کی صدر ہوں۔''

''آپ سے مل کر مسرت ہوئی۔'' جنید صاحب بولے۔ ''بتایئے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔''

''میں آپ کے اسکول کے لڑکوں کی شکایت کرنے آئی ہوں۔''

''کیا کیا ہے لڑکوں نے؟''

''کیا نہیں کیا ہے۔۔۔ میری اور میری انجمن کی کارکن خواتین کی عزت کا ڈھنڈورا پیٹا ہے۔''

جنید صاحب نے غور سے مسز شیروانی کو دیکھا پھر سمجھ گئے۔

''آپ اسٹیج ڈرامے کے حوالے سے کوئی شکایت کرنے آئی ہیں؟''

''جی ہاں۔''

''تو کیا شکایت ہے آپ کو اس ڈرامے سے۔''

''اس ڈرامے میں ماں کا جو کردار ہے۔''

''جی ہاں۔۔۔ ایک کردار تو ہے ماں کا۔۔۔''

ہیڈ ماسٹر نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''ہے کیا۔۔۔! خاص طور پر ہمیں بدنام کرنے کے لیے شامل کیا گیا ہے۔ ہماری ممبرز نے ہم سے شکایت کی ہے کہ جناح گورنمنٹ بوائز ہائی اسکول کے طالب علموں نے انجمن کے کام اور اس کی کارکنوں پر کیچڑ اچھالا ہے۔۔۔ میں آپ پر آپ کے اسکول پر اور آپ کے طالب علموں پر ہتک عزت کا دعوا کروں گی۔''

''مگر۔۔۔ مگر میڈم! ہمارے ڈرامے کی ماں نے تو کسی کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔''

''کوئی ضروری ہے کہ کوئی ہمارا نام لے کر ہمیں گالی دے۔ اس ماں نے ہم جیسی سماجی کارکنوں کا مذاق اڑایا ہے۔۔۔۔''

''اگرچہ حقیقتاً ایسی کوئی بات نہیں ہے۔۔۔ لیکن پھر بھی آپ ایسا تصور کرتی ہیں تو میں آپ سے معذرت خواہ ہوں۔''

''بہت خوب۔۔۔ اچھی ستم ظریفی ہے۔ پہلے معزز خواتین کی توہین کرتے ہیں پھر سوری کہہ دیتے ہیں۔''

مسز شیروانی جیسے ہی ان کے کمرے سے باہر نکلیں انہوں نے گھنٹی بجائی۔ گھنٹی کی آواز سن کر چپراسی کمرے میں داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی وہ بولے۔ ''ڈرامے کے رائٹر اور ڈائریکٹر کو بلا کر لاؤ۔''

''سر! آپ کا مطلب ہے نویں جماعت سے انور شاد اور دسویں سے نبیل خان کو بلا کر لاؤں۔''

''ہاں ہاں انہی کو۔''

چند منٹوں کے بعد دونوں لڑکے موجود تھے۔

''بھئی تمہارے ڈرامے نے تو میرا صبر و سکون غارت کردیا ہے۔'' وہ انہیں دیکھتے ہی بولے۔

''جی۔۔۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔''

''ارے بھئی! جس طرح ناظم صاحب شکایت لے کر آئے تھے۔۔۔ اسی طرح اب تک کئی لوگ آچکے ہیں۔ اس ڈرامے سے جانے اور کتنے لوگوں کو شکایت ہوگی۔۔۔ میں تو آنے والوں کو سمجھا سمجھا کر تھک گیا ہوں۔ اب تم ہی لوگ ان سے نبٹو۔ اسٹاف روم میں اپنی عدالت لگاؤ جو بھی شکایت لے کر آئے۔۔۔ اسے جواب دو۔''

پھر انہوں نے چپراسی کو بلا کر کچھ ہدایات دیں۔ تھوڑی دیر بعد اسٹاف روم میں ڈرامہ کے مصنف انور شاد اور ہدایت کار نبیل خان بیٹھے تھے۔ چپراسی تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ایک ایک کر کے کئی مہمانوں کو وہاں بٹھا گیا۔ ذرا دیر بعد ان میں سے

ایک نے کہا۔

''ہیڈ ماسٹر صاحب کو بلائیں۔۔۔ہم دن بھر تو ان کے انتظار میں یہاں بیٹھے نہیں رہ سکتے۔''

''آپ لوگ کس سلسلے میں ہیڈ ماسٹر صاحب سے ملنا چاہتے ہیں۔'' انور شاد نے پوچھا۔

''ان سے کچھ شکایت کرنی ہے۔''

''جو ڈرامہ یہاں اسکول میں اسٹیج کیا گیا تھا۔۔۔اس کے بارے میں؟'' نبیل خان نے سوال کیا۔

''ہاں۔۔۔اسی کے بارے میں۔''

''تو اپنی شکایتیں آپ لوگ ہم سے کیجئے۔اس ڈرامے کا ہیڈ ماسٹر صاحب سے کوئی تعلق نہیں۔ میں اس ڈرامے کا مصنف ہوں اور یہ اس کے ہدایت کار ہیں۔''

''ہم اس معاشرے اور سوسائٹی کے معزز لوگ ہیں۔'' مہمانوں میں سے ایک نے کہا۔''آپ لوگوں کو اس ڈرامے کے ذریعہ ہمارا خاندان لڑاتے ہوئے شرم نہیں آئی۔''

''آپ لوگ ابھی بچے ہو۔'' دوسرا بولا۔

''بچوں کو بچوں ہی کی طرح رہنا چاہئے، اپنے بڑوں اور بزرگوں کی پگڑی نہیں اچھالنی چاہئے۔''

''سب سے پہلے تو ہم آپ لوگوں کا۔۔۔ اور آپ سے پہلے آنے والوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ ہماری اس حقیر سی پیش کش کو آپ لوگوں نے بغور دیکھا اور اس سے متاثر ہوئے۔ اگرچہ ہمارے ماسٹر صاحبان نے تکنیکی طور پر اسے ایک کمزور ڈرامہ قرار دیا ہے۔۔۔مگر ہماری ابتدائی پیش کش کے حوالے سے اس کی تعریف کی۔'' انور شاد اتنا کہہ کر رکا تو اس کی بات نبیل خان نے آگے بڑھائی۔

''آپ لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ اس کے ذریعہ آپ لوگوں اور آپ کے کرداروں پر تنقید کی گئی۔۔۔ان کے کرداروں کے ذریعہ آپ لوگوں کا مذاق اڑایا گیا ہے تو ہم اس سلسلے میں آپ لوگوں سے معذرت نہیں کریں گے۔۔۔کہ ہم نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ ہمارے کرداروں میں آپ لوگوں کو اپنا عکس نظر آیا ہے۔۔ یہ ہماری کامیابی ہے۔۔۔کہ کہانیوں اور ڈراموں اور فلموں کا مقصد ہی یہی ہوتا ہے کہ معاشرے کے لوگوں کو آئینہ دکھایا جائے۔۔۔اور اس آئینے میں انہیں اپنا عکس نظر آئے۔ آپ لوگوں کا ضمیر ابھی زندہ ہے کہ اس ڈرامے اور اس کے کرداروں نے آپ لوگوں کو متاثر کیا۔ اگر کچھ باتیں آپ لوگوں کو بری لگی ہیں تو ان کو پیش نظر رکھ کر اپنی اصلاح کر لیجیے۔ اگر آپ لوگوں نے ایسا کر لیا تو ہمیں اور زیادہ خوشی ہوگی کہ ہمارے تفریحی پروگرام نے ایک بڑا تعمیری کام سرانجام دیا ہے۔''

مسکراہٹیں

ایک آدمی نے ایسی عورت سے شادی کی جو اس سے پہلے چھ شوہر کر چکی تھی اور وہ آدمی اس کا ساتواں شوہر تھا۔

ایک دفعہ وہ بیمار ہوا اور اس کے بچنے کی کوئی امید نہ رہی، بیوی اس کے سرہانے بیٹھ کر رونے لگی۔

بیوی: ''سرتاج..... آپ مجھے کس کے سہارے چھوڑ کر جا رہے ہیں؟''

شوہر: ''آٹھویں شوہر کے سہارے۔''

☆☆☆

دو میاں بیوی کار میں سفر کر رہے تھے۔ بیوی نے شوہر سے پوچھا۔''کیا آپ ایک ہاتھ سے کار ڈرائیو کر سکتے ہیں؟''

شوہر نے سینہ پھلا کر کہا۔''ہاں! ہاں، کیوں نہیں۔''

بیوی نے اطمینان سے جواب دیا۔''تو پھر آپ دوسرے ہاتھ سے اپنی ناک صاف کیوں نہیں کر لیتے؟''

چشم تر

اسرار احمد

ہارون الرشید کا دور اسلامی تاریخ میں فن و حرفت کے حوالے سے سنہرا دور کہلاتا ہے اس کے دور میں اہلِ علم اور صاحبِ کمال افراد کو عروج حاصل تھا وہیں بہت سے فتنے بھی مختلف شکلوں میں سر گرم تھے، مگر اس کے باوجود کچھ لوگ احسان مندی اور انسانی قدروں کے امین بھی تھے۔

تاریخ کے جھروکوں سے ایک فن کار کا احوال، وہ برامکہ کے احسان کا اسیر تھا

جعفر برمکی کے زوال کے بعد ہارون الرشید نے فضل بن ربیع کو اپنا وزیر اعظم مقرر کیا۔

فضل بن ربیع نے بھی جعفر کی طرح اپنا دربار آراستہ کرنے کے لیے اہل علم اور صاحب کمال افراد کی قدر دانی کی۔ ان میں جعفر کے دربار میں حاضری دینے والے بھی شامل تھے۔ فضل ان لوگوں کی خاطر و مدارات اتنی کرتا کہ اس کے اپنے درباری برا مان جاتے لیکن فضل تنہائی میں ان لوگوں کو سمجھاتا کہ اگر جعفر کے باکمال درباریوں کی عزت افزائی نہ کی گئی تو پھر وہ مایوس ہوکر میرے خلاف سازشوں میں مصروف ہوجائیں گے اور ان میں ایسے بھی لوگ شامل ہیں جو امیر المومنین سے بہت زیادہ قریب بھی ہیں۔ اس لیے ان کی تالیفِ قلب ضروری ہے۔ ان مصاحبین میں اپنے زمانے کے نامور موسیقار ابو محمد اسحاق موصلی سرفہرست تھے۔ ابو محمد اسحاق موصلی کے ناز نخرے کا یہ حال تھا کہ اگرچہ ہارون نے صرف جعفر

بلکہ آل برامکہ کا تذکرہ بھی ممنوع قرار دے دیا۔ یہاں تک کہ ان کا تذکرہ کرنے والوں کی زبان اڑانے کا حکم بھی تھا لیکن اسحاق موصلی اس مستثنیٰ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ فضل بن ربیع کو بھی اسحاق موصلی کی خاطر عزیز تھی اور وہ اس کی پذیرائی کے لیے غیر معمولی اہتمام کیا کرتا تھا۔

اسحاق موصلی کے ایک دوست اور فضل بن ربیع کے ایک مصاحب احمد بن سلیمان نے بیان کیا کہ ایک بار فضل بن ربیع نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ اس کے بعد علویہ اور مخاؤں کو بھی بلایا۔ جب محفل جم گئی تو فضل نے اپنے ایک خاص قاصد کو رقعہ دے کر اسحاق کے پاس بھیجا اور اسے بھی اپنے پاس طلب کیا۔ اسحاق نے جواب بھجوایا کہ وہ ایک ضروری کام میں مصروف ہے، وہ جلد ہی حاضری دے گا لیکن اس کا کھانے کے لیے انتظار نہ کیا جائے ہم لوگوں نے فضل کے دستر خوان پر موجود ہر نعمت سے بھرپور استفادہ کیا۔ کھانے کے بعد جب نبیذ لائی گئی تو اسحاق بھی اپنے خادم خاص کے ساتھ حاضر ہوگیا۔ خادم کے ساتھ نبیذ کی صراحی بھی تھی۔ اس نے صراحی ایک گوشے میں رکھ دی۔ اسحاق نے خادم کو حکم دیا کہ دور چلایا جائے۔ جب سب نبیذ کے سرور میں مبتلا ہوئے تو علویہ نے فضل کا پسندیدہ راگ سنانا شروع کردیا۔

اچانک اسحاق نے اپنا دایاں ہاتھ بلند کیا اور کہا۔

''علویہ! یہ راگ تم سے سنبھالا نہیں جارہا ہے۔ میں اس کی اصلاح کروں گا۔''

یہ سننا تھا کہ علویہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور جو کچھ اس کے منہ میں آیا وہ بولتا گیا۔ جب وہ ذرا تھما تو اسحاق نے کہا۔ ''میرے عزیز! میں تمہاری سبکی نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ میں تو فنکارانہ خلوص کے ساتھ تمہاری غلطی کی اصلاح کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے کہ تمہارے بارے میں مشہور ہے کہ تم سُر میں کوئی غلطی نہیں کرتے اور اگر میری یہ تنقید تمہیں بری لگی ہے تو پھر میں معذرت چاہتا ہوں۔''

علویہ کا جی اس پر ٹھنڈا نہ ہوا۔ ''جی نہیں آپ نے جو کچھ کہا ہے ہرگز اس کا وہ مقصد نہیں تھا بلکہ بات کچھ اور تھی، اچھا تو یہ بتایئے کہ وزیر محترم نے آپ کو صبح کے وقت طلب کیا تھا، لیکن شاید آپ اپنی شان دکھانے کے لیے عمداً تاخیر سے آئے ہیں اور اپنی شان دکھانے کی ضد میں آپ وزیر محترم کے احسانات بھی فراموش کر بیٹھے۔ اس پر طرہ یہ کہ نبیذ کی صراحی بھی ساتھ لائے حالانکہ دستر خوان پر کھانا اور نبیذ یہاں موجود تھے لیکن آپ نے یہ ظاہر کیا کہ گویا وزیر محترم کا دستر خوان آپ کے دستر خوان سے کم تر اور وزیر موصوف کا نبیذ آپ کے نبیذ سے قیمتی ہے۔ اگر وزیر فضل بن ربیع کے بجائے جعفر برمکی نے طلب کیا ہوتا تو آپ وہاں سر کے بل جاتے۔''

فضل بن ربیع یہ جلی کٹی باتیں حیرت سے سنتا رہا۔ اسے علویہ سے ایسے تلخ ردعمل کی توقع نہیں تھی۔ اس نے اس محفل کو مزید تلخی سے بچانے کے لیے بولنا چاہا تو اسحاق نے بولنا شروع کیا۔ ''جہاں تک تاخیر سے آنے کا تعلق ہے وزیر محترم بخوبی جانتے ہیں کہ میں کسی معقول وجہ کے بغیر تاخیر سے نہیں آیا۔ وہ چاہیں تو میں تنہائی میں اس کی وجہ ضرور بتاؤں گا لیکن تم لوگوں کے سامنے مداخلت کی ہرگز ضرورت نہیں۔ رہ گیا میری شان کا معاملہ تو بھلا میں وزیر محترم کو اپنی شان کیا دکھاؤں گا؟ میں ان کا ممنون کرم ہوں اور ان کے سایہ عاطفت میں ہوں۔ نبیذ کے بارے میں بھی وزیر موصوف کو علم ہے کہ میں ایک خاص خوشبو والی نبیذ استعمال کرتا ہوں کیونکہ اس کے بغیر میں اچھی طرح گا نہیں سکتا اور میں یہی سوچ کر اپنی پسندیدہ نبیذ کی صراحی اپنے ہمراہ لایا ہوں تاکہ میں بھی اس محفلِ عیش و سرور میں اپنا حصہ ادا کرسکوں۔ بے شک میں نے تمہیں ٹوکا لیکن اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ تمہاری اصلاح ہوجائے ورنہ مجھے کیا پڑی ہے کہ میں ٹوکتا پھروں، اب میں وہی تمہارے والا راگ گاتا ہوں۔ اس سے وزیر محترم کو حاضرین کو اور تمہیں بھی معلوم

ہو جائے گا کہ تم نے غلطی کہاں کی تھی۔ اس محفل کو اور وزیر موصوف کو مجھ سے برگشتہ کرنے کے لیے تم نے برامکہ کا ذکر چھیڑا ہے اور ان سے میری وابستگی پر طنز کیا ہے۔ قسم ہے رب کائنات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ میں نے امیر المومنین کے سامنے بھی برامکہ کی مدح میں بہت کچھ کہا ہے اور امیر المومنین نے بڑے تحمل کے ساتھ میری باتیں سنی ہیں۔ میں برامکہ کا پروردہ اور ممنون احسان ہوں اور میں ان کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں وہ ان کے احسانات کے مقابلے میں ایک ذرّہ بھی نہیں ہوگا۔''

پھر اسحاق، فضل سے مخاطب ہوا۔

''سنیے برامکہ کے صرف ایک احسان کا میں آپ سے تذکرہ کرتا ہوں اور اس احسان کی ان احسانات کے مقابلے میں جو وہ مجھ پر اور دوسروں پر کیا کرتے تھے کوئی اہمیت نہیں۔'' یہ کہہ کر اسحاق نے کہا۔

''یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب میں والد محترم کے ہمراہ اپنے غلاموں اور کنیزوں کے ساتھ رہا کرتا تھا لیکن جیسا کہ اس طبقے کی روایت ہے جب میرے اور والد کے غلاموں اور کنیزوں کے درمیان آئے دن چپقلش ہوتی رہی اور انہوں نے میرے والد سے میرے غلاموں اور کنیزوں کے رویے کی شکایت کی تو ان کا رویہ بھی بدلا بدلا سا لگا۔ میں نے مجبوراً ایک علیحدہ مکان کرائے پر حاصل کرلیا اور اس میں منتقل ہوگیا۔ یہ مکان بھی بہت کشادہ تھا لیکن اس کے لائق میرے پاس ساز و سامان نہیں تھا۔ میں فکرمند ہوا کہ میں نے مکان تو لے لیا ہے لیکن جب لوگ یہاں آئیں گے اور بے سروسامانی کا عالم دیکھیں گے تو کیا کہیں گے، انہی خیالات سے نجات پانے کے لیے میں اپنے گدھے پر سوار ہو کر گھر سے باہر نکل پڑا لیکن فکر نے اب بھی میرا ساتھ نہیں چھوڑا، گدھا اپنی چال چل رہا تھا۔ مجھے یہ بھی احساس نہیں تھا کہ میں کس طرف جا رہا ہوں۔ یہاں تک کہ گدھا حسین خالد برمکی کے دروازے پر پہنچ گیا تو مجھے پتا چلا کہ گدھا مجھے کہاں لے آیا۔ اس کے غلام میری طرف لپکے۔

''آپ کہاں جا رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''میں وزیر یحییٰ برمکی سے ملنا چاہتا ہوں۔''

غلام نے اطلاع دی۔ میں اپنے دل میں بہت شرمندہ بھی تھا کیونکہ میں نے وزیر کے دربار میں حاضری کے شایان شان لباس نہیں پہنا ہوا تھا۔ اس خیال میں غلطاں میں یحییٰ کے سامنے پہنچ گیا۔

یحییٰ نے مجھے دیکھا تو مسکرایا۔ ''ابو محمد تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟''

میں نے ادب سے کہا۔ ''اگر اجازت ہو تو سچ کہوں۔''

''ضرور ضرور۔۔۔''

میں نے اسے اپنی ساری روداد سنا دی۔ یحییٰ نے کہا۔ ''سچ کہتے ہو۔ کیا تمہاری فکر اب بھی باقی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''نہ صرف باقی ہے بلکہ پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئی ہے۔ کیونکہ۔۔۔''

یحییٰ نے مجھے بات پوری نہیں کرنے دی۔ اس نے مجھے تسلی دی۔ پھر غلام کو حکم دیا کہ میرے لیے خلعت لائی جائے۔ میں نے لباس تبدیل کیا۔ پھر دسترخوان بچھانے کا حکم دیا۔ میں نے خوب ڈٹ کر کھایا۔ پھر نبیذ لائی گئی، میں نے جام پر جام پیے۔ یحییٰ بھی پیتا رہا۔ پھر میں گانا سناتا رہا۔ یحییٰ نے اسی دوران قلمدان لانے کا حکم بھی دیا اور اس نے چار رقعے لکھے۔ میں نے خیال کیا کہ میرے لیے انعام و اکرام کا حکم بھی کسی رقعے میں ہوگا۔ پھر اس نے اپنے ایک خادم خاص کو بلایا اور رقعے اس کے حوالے کردیے۔ خادم خاص چلا گیا اور میں نے انعام و اکرام کی لالچ میں پورا زور لگا کر گانا شروع کردیا۔ میں گاتا جاتا تھا اور دل ہی دل میں انعامات کی فہرست بھی بناتا جا رہا تھا۔ شام ہوگئی لیکن انعام کی کوئی جھلک نہیں دکھائی دی۔ یحییٰ نے تکیے سے ٹیک لگائی اور سو گیا۔ میں مجبوراً اٹھا اور سر جھکائے اپنے مکان کی طرف واپس چل پڑا۔ جب مکان کے

قریب پہنچا تو میرا غلام آگے بڑھ کر کہنے لگا۔ ''کہاں جارہے ہیں آپ۔''

''مکان اور کہاں۔'' میں نے جواب دیا۔

''مکان کیسا مکان؟'' غلام حیرت سے بولا۔ ''مکان تو فروخت ہو چکا ہے، مکان خریدنے والے آپ کے منتظر ہیں تاکہ وہ مکان کا قبضہ حاصل کرسکیں۔''

میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ''ابھی زوال کا وقت ختم نہیں ہوا۔ کرائے کا مکان بھی چھن گیا۔ اب اس وقت نیا مکان کس طرح حاصل کروں گا۔'' میں اسی پریشان خیالی کے عالم میں مکان میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ یحییٰ کا خادم خاص بیٹھا ہوا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور ادب کے ساتھ کہنے لگا۔ ''اپنے گھر میں تشریف آوری مبارک ہو۔'' میں خوش خوش اندر داخل ہوا تو اس نے یحییٰ کا فرمان سنایا۔

''ابو محمد اسحاق موصلی کے لیے پانچ لاکھ درہم سے وہ مکان اور اس سے ملحقہ تمام عمارتیں خرید لی جائیں بلکہ اس کے اردگرد اور بھی کوئی جائیداد ہو تو وہ بھی خرید لی جائے۔''

خادم خاص نے دوسرا فرمان سنایا۔ یہ فرمان اس نے اپنے بڑے بیٹے فضل کے نام بھیجا تھا۔

''میں نے اسحاق موصلی کے لیے پانچ لاکھ درہم دیے ہیں، اتنی ہی رقم تم بھی دو تاکہ وہ اپنے مکان میں اپنی مرضی سے توسیع و ترمیم کرسکے۔''

تیسرا فرمان جعفر کے نام تھا۔

''میں نے اسحاق موصلی کو پانچ لاکھ درہم دیے ہیں تاکہ اس کے قیام کے لیے مکان اور گزارے کے لیے دوسری املاک خریدی جائیں۔ تمہارے بھائی فضل نے بھی اتنی ہی رقم دی ہے اب تم بھی اسے پانچ لاکھ درہم دو تاکہ وہ اپنے لیے ساز و سامان خرید سکے۔''

چوتھا فرمان یحییٰ نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے احمد کے نام لکھا تھا۔

''میں نے اسحاق موصلی کو پانچ لاکھ درہم دیے

مسکراہٹیں

''واہ بھئی واہ..... ماشاء اللہ کیا ترقی کی ہے، تمہارے گھر میں پہلے تو یہ سب کچھ نہیں تھا۔'' پہلا دوست بولا۔

''مثلاً کیا؟'' دوسرے دوست نے پوچھا۔

''یہ بڑا سا ریفریجریٹر، ایئر کنڈیشن، رنگین ٹی وی، وی سی آر، واشنگ مشین یہ نئے ماڈل کی فوڈ فیکٹری، سونی کا ڈیک یہ خوبصورت فینسی لائٹس۔''

''بس یار ایک چیز کی کمی ہے۔''

دوسرے دوست نے کہا ''وہ کیا؟''

''ہمارے علاقے میں بجلی آجائے۔''

ہیں اور اتنی ہی رقم تمہارے دونوں بھائیوں نے بھی دی ہے۔ اب تم بھی اسے پانچ لاکھ درہم دو تاکہ وہ جب تک اس کی املاک سے اس کی آمدنی شروع نہ ہو وہ اپنے اخراجات چلا سکے۔''

خادم خاص نے مجھ سے کہا کہ یہ ساری رقم میں اپنے ساتھ لایا ہوں۔ تین لاکھ درہم میں، میں نے یہ مکان اور اس سے ملحقہ تمام املاک خریدی ہے جس کی دستاویزات آپ ملاحظہ کرسکتے ہیں۔ ان میں یہ وضاحت سے تحریر ہے کہ یہ سب کچھ آپ کے لیے خریدا گیا ہے اور آپ ہی اس کے مالک ہیں۔''

اس کے بعد میں والد سے بھی زیادہ شان و شوکت سے زندگی بسر کرنے لگا۔

یہ داستان سن کر فضل بن ربیع شدت تاثر سے رو پڑا۔ پھر فضل نے اسحاق کو قسم دے کر کہا۔ ''وہی راگ سنا جو قبل ازیں علویہ نے گایا تھا اور جس پر یہ سارا بکھیڑا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔''

اسحاق کا گانا سن کر علویہ کی بھی آنکھیں کھلیں اس نے اپنی غلطی محسوس کی۔ وہ اٹھا اور اس نے اسحاق کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور کہا۔ ''آپ ہمارے استاد ہیں، ہم میں سے ہر ایک کو ٹوکنے اور اس کی غلطی کی اصلاح کرنے کا آپ کو حق ہے۔''

ضمیر کا مسئلہ

انور

میں کافی دنوں سے دیکھ رہا تھا کہ ایک چوبیس، پچیس سال کی دوشیزہ کندھے پر بیگ لٹکائے روزانہ ہمارے دفتر میں آتی اور معطر معطر خوشبوئیں بکھیر کر چلی جاتی۔ اس کی خوب صورتی، اور روزانہ نئی سے نئی پرفیوم کی خوشبو ہمیں اِدھر اُدھر دیکھنے کی دعوت دیتے تھے۔

ایک باضمیر سرکاری ملازم کی کہانی اُس کی اپنی زبانی

اوکاڑہ میں، میں حسبِ معمول اپنے دفتری امور میں مصروف تھا۔ میں ادنیٰ سا ملازم تھا اور باقاعدہ میں ایک خصوصی سیل کا انچارج تھا۔ میرے اختیارات کا دائرہ صوبہ پنجاب تھا۔ تمام محکمے، تمام سرکاری ادارے کے سربراہان کی باز پرس کا مکمل ریکارڈ میرے پاس تھا۔ ایم این اے حضرات اور ایم پی اے حضرات کے اثاثوں اور ان کے شب و روز کی سرگرمیاں بھی میرے دفتر میں موجود تھیں۔ تمام اضلاع کے ڈپٹی کمشنرز صاحبان اور ایس پی صاحبان کے ذریعے جائز کاموں کی رفتار اور جانچ پڑتال کا ریکارڈ بھی ہوتا تھا اور جب بھی میرے پاس کوئی سائل پہنچتا تھا میں اس کی بات کو وقت نکال کر سنتا اور اس کا حل نکالتا تھا۔ آج کل آپ کسی دفتر میں چلے جائیں، بغیر رشوت کے آپ بات کی تہ تک بھی نہیں جاسکتے۔ چہ جائیکہ کام کی پیش رفت ہو۔ میرے دفتر کے ساتھ میرے سینئر باس کا دفتر تھا اور اس کے ساتھ

کٹو آفیسر کا دفتر تھا۔ میں اپنے ان آفیسرز ان کی Appointment جو لکھ رہا ہوں، پ کو سمجھانے کے لیے ہیں۔ ویسے تو انہیں کچھ اور کہا جاتا ہے۔ بہر حال یوں تو بے شمار مسائل کے حل کے لیے لوگ جوق در جوق آتے تھے یا ہم خود بلاتے تھے اور ہر روز دفتر میں تانتا بندھا رہتا استقبالیہ گیٹ پر جو سیکورٹی کے اہلکار ہوتے تھے، اکثر بے یار و مددگار سائیلان کو براہ راست میرے اس بذریعہ فون اجازت لے کر بھیج دیتے تھے اور انہیں دفتر میں بلا کر ان کا مسئلہ حل کر دیتا تھا۔

میں کافی دنوں سے دیکھ رہا تھا کہ ایک چوبیس، یس سال کی دوشیزہ کندھے پر بیگ لٹکائے روزانہ ہمارے ایگزیکٹیو کے دفتر میں آتی اور معطر معطر خوشبوئیں بکھیر کر چلی جاتی۔ شروع شروع میں تو کسی نے اس پر دھیان نہ دیا کیوں کہ روزانہ کا یہ معمول میں اِدھر اُدھر سوچنے کا گمان ہی نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اس کی خوب صورتی، اس کی ادائیں اور روزانہ نئی سے نئی پرفیوم کے ہولے ہمیں اِدھر اُدھر دیکھنے کی دعوت دیتے تھے۔ میں ان دنوں اپنی فیملی کے ساتھ ایک سرکاری مکان میں رہائش پذیر تھا اور اسی سال میں نے حج کی سعادت بھی حاصل کی تھی۔ اگر میں ان دنوں فیملی کے ساتھ نہ ہوتا یا حج کی سعادت نصیب نہ ہوتی تو شاید میں کوئی غلط فیصلہ کر جاتا۔ جس انسان کا ضمیر زندہ ہوتا ہے، وہ کبھی غلط فیصلے نہیں کرتا اور میں نے بھی ضمیر کے کہنے کے مطابق فیصلہ کیا۔ آپ اس خاتون کو ثریا سمجھ لیں، ثریا روزانہ اپنے کسی کام کے سلسلے میں بن سنور کے آتی اور آدھ یا پون گھنٹہ ہمارے ایگزیکٹیو کے دفتر میں بیٹھ کر چائے وغیرہ پینے کے بعد واپس چلی جاتی۔ ہمیں یہ علم نہ ہو سکا کہ وہ کسی کام کے لیے آتی ہے اور اس کا کیا مسئلہ ہے۔ بہت سے لوگ اپنی درخواستیں فائلوں میں ڈال کر کبھی اس دفتر جاتے کبھی دوسرے دفتر جاتے۔ میرے پاس وہ فائلیں آتی تھیں جب اس پر چند ایک ذمہ دار لوگوں کے دستخط ثبت ہو جاتے تھے اور پھر ان کے متعلقہ محکمہ جات کے نام آرڈرز جاری کرنے ہوتے تھے۔

میرے دفتر سے جاری ہونے والے آرڈرز کی تکمیل اور تعمیل ہوتی تھی اور واپسی اس کی رپورٹ حوالہ کے تحت ہمارے دفتر میں آئی تھی۔ ہم اس کی خوشبو کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ ہمیں اس کے آنے سے قبل خوشبو سے پتا چل جاتا تھا کہ وہ ملکہ معظمہ آج آ رہی ہے۔ پھر ہم لوگ اسے آتے جاتے دیکھنے لگے۔

کیوں نہ دیکھتے ہم آدم کی اولاد ہیں اور گندم بھی کھاتے ہیں۔ اس کی طرف دیکھنا بلکہ بار بار دیکھنا یہ ہمارا فطری عمل تھا اور ہم اس سے نظریں چرا نہیں سکتے تھے۔ جب بھی وہ گیٹ پر آتی تو سیکورٹی کے اہل کار بغیر پوچھے، تصدیق کیے اس کی وزیٹر سلپ بناتے اور وہ سیدھا ٹک ٹک کرتی اندر چلی جاتی۔ ہمارے ایگزیکٹیو صاحب کے وسیع و عریض دفتر میں بڑے اونچے اونچے خوب صورت پردے لگے ہوئے تھے۔ بہت وسیع و عریض ٹیبل پر خوب صورت دولی سبز رنگ کپڑا شیشے کے نیچے سجا ہوا تھا اور ٹیبل پر تین، چار فون، رنگ برنگی پینسلیں، مارکر، پیپر ویٹ موجود تھے۔ دائیں بائیں صوفے سیٹ بچھے تھے اور اندر داخل ہونے والا لازماً "میٹ" پر اپنے پاؤں صاف کر کے جھاڑ کے آگے بڑھتا تھا۔ اس دفتر میں روزانہ ایئر فریشنر کے اعلا کوالٹی کے اسپرے ہوتے تھے۔ ٹیبل پر اکثر خوب صورت پیالیاں چھنکتی رہتی تھیں اور مہمانوں کی تواضع جاری رہتی تھی۔ ان مہمانوں کی لسٹ میں ثریا کا اضافہ ہو گیا تھا اور اس نے خدا جانے کتنی بار چائے پی ہو گی یا اس کی خاطر تواضع ہوئی ہو گی جب دس پندرہ دن سے زائد عرصہ گزر گیا تو پھر اس نے قدرے وقفے سے آنا شروع کر دیا۔ انہی دنوں میرے پاس دو مشہور گلوکاراؤں کی درخواستیں بھی برائے حصول پلاٹ آتی تھیں۔ میں ان کی درخواستیں پڑھ کر ہنستا تھا کہ انہوں نے کس انداز میں اپنی کہانیاں رقم کی تھیں کہ پاکستان کے کسی بھی حصے میں، شہر میں کوئی ذاتی جائیداد یا مکان یا پلاٹ نہیں ہے لہٰذا پلاٹ الاٹ فرمایا

جائے۔ بلکہ کرائے کے مکانوں میں رہائش رکھنے کا ذکر ہوتا تھا۔

اس ثریا نے بھی اپنی درخواست میں اس قسم کے جملے درج کیے تھے کہ وہ بھی کرائے کے مکان میں رہائش پذیر ہے اور مہنگائی کے دور میں گزارا مشکل ہے۔ آج بھی وہی مہنگائی ہے اور آج بھی وہی حال ہے ایک روز وہ حسب معمول خوشبو بکھیرتی، پرس کندھے پر لٹکائے ایگزیکٹو کے دفتر میں داخل ہوگئی۔ آج کافی وقفے کے بعد آئی تھی۔ بقول دفتری چپراسی وہ ہنستی مسکراتی اندر داخل ہوئی، دعا سلام ہوئی۔ چند لمحے اندر ٹھہری، ابھی چائے کے آرڈر کی تعمیل نہیں ہوئی تھی کہ چوڑیوں کے کھنکنے کی آوازیں آئیں، جیسے کچھ ریزہ ریزہ ہوئی ہوں۔ کھسر پھسر اور مزاحمت کی آوازیں بھی آئیں مگر تھوڑی دیر کے بعد وہ ہانپتی ہوئی پرس ہاتھ میں پکڑے کپڑوں کی سلوٹیں درست کرتے ہوئے باہر نکلی اور آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی لیے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے میرے دفتر میں داخل ہوئی۔ آج وہ پہلی بار میرے دفتر آئی تھی، ایگزیکٹو نے اس کا کوئی پیچھا نہ کیا اور نہ ہی اس نے چپراسی سے پوچھا کہ وہ کدھر گئی۔ جونہی وہ میرے کمرے میں آئی اس کے دائیں بائیں چند تماش بین لوگ اکٹھے ہوگئے جنہیں میں نے بھگا دیا کہ تم لوگ اپنا اپنا کام کرو۔ تماش بین کو میں نے اِدھر اُدھر کرنے کے بعد اس کی حالت دیکھی تو وہ واقعی دیدنی لگی۔ بال بکھرے ہوئے، کپڑوں کی سلوٹیں اور آنکھوں میں نمی تیرتی نظر آئی۔ لرزتی ہوئی زبان سے اس نے کہا۔

''کیا ان دفتروں میں ایسا ہی کام ہوتا ہے۔۔۔ اور لڑکیوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔''

اس کے یہ جملے میرے ضمیر پر ہتھوڑے کی طرح برسے۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ دوڑائی تو مجھے اس پر بے پناہ ترس آیا اور اسے میں نے اس کے سوالوں کا جواب دینے کے بجائے سامنے والی کرسی پر بٹھایا اور اس کا ایک بار پھر سرسری سا جائزہ لیا۔ واقعی وہ بے انتہا خوب صورت تھی۔ وہ ایشوریا رائے لگی، کوئی ۲۵،۲۴ سال عمر ہوگی۔ دراز قد، گوری رنگت، گول اور خوب صورت چہرہ لمبے بال۔ گویا اس کے ایک ایک اعضا کی تعریف نہ کرنا مجھے انسانیت کی توہین لگی۔ میں نے اس سے پہلا سوال کیا۔

''آپ کو کون سا کام تھا۔'' ٹشو پیپر سے آنکھوں کی نمی صاف کرتے ہوئے بولی۔

''جی تین ماہ قبل میں نے جو درخواست دی تھی، پلاٹ کی الاٹمنٹ کے لیے اس کا پتا کرنے آئی تھی مگر آپ کے وہ (اس نے اپنی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے) روزانہ مجھے کل آنے کے لیے کہتے رہے کہ کل آجاؤ کل الاٹمنٹ لیٹر مل جائے گا۔ آج کل کرتے کرتے۔۔۔'' اس کے بعد وہ رک گئی اور اس نے دوسری آنکھ کو ٹشو سے دوبارہ صاف کیا۔

میں نے پوچھا۔ ''پھر کیا ہوا؟''

''آپ کے سامنے بیٹھی ہوں۔ آپ میرا حال دیکھ سکتے ہیں، یہ تو خدا کا شکر ہے کہ میں نے خود کو اس کے حوالے نہیں کیا۔ یہ کوئی شرافت و انسانیت ہے کہ انسان دھوکے سے بلائے اور اس کی عزت لوٹنے کی کوشش کرے۔''

یہ جملہ سن کر مجھے تسلی ہوئی کہ وہ بے آبرو ہو کر نکلی تو ہے مگر عزت گنوا کر نہیں آئی۔ بہرحال میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''محترمہ! آپ اس کاغذ پر اپنا نام اور کوائف درج کردیں اور دوبارہ یہاں اس کام کے لیے اور پراگریس معلوم کرنے کے لیے نہ آئیں۔ آپ کے گھر کے ایڈریس پر آپ کو الاٹمنٹ لیٹر مل جائے گا۔ بشرطیکہ آپ کی فائل اگر موجود ہے تو۔۔۔'' اتنی دیر میں اس نے پانی مانگا۔ چپراسی کو میں نے پانی لانے کو کہا۔ پانی پینے کے بعد اس نے اپنا نام اور اپنے کوائف اس کاغذ پر لکھ دیئے۔ ڈرتے ڈرتے کہنے لگی۔

''پلیز میرا ایڈریس کسی کو مت دینا۔'' خدا جانے اس نے میرے اوپر کیسے بھروسا کرلیا۔ اس

کے بعد وہ اٹھنے لگی، میں نے تکلفاً پوچھا کہ ''چائے منگواؤں۔'' کہنے لگی۔

''بہت شکریہ۔ اگر آپ نے میرا کام کردیا تو میں آپ کا یہ احسان ساری عمر نہیں بھولوں گی۔'' دائیں بائیں تماش بین ابھی تک منڈلا رہے تھے۔ وہ میرا شکریہ ادا کر کے اٹھ کھڑی ہوئی اور اللہ حافظ کہہ کر اس نے کپڑے دوبارہ درست کیے اور کندھے پر پرس رکھ کر میرے دفتر سے باہر نکل گئی اور کمرا معطر معطر کرگئی۔

تھوڑی دیر کے بعد میرے چند ایک ساتھی میرے دفتر آئے اور اس حادثہ کے بارے میں پوچھنے لگے کہ یہ خاتون کیا کہہ رہی تھی۔ میں نے بتایا کہ بھئی آپ لوگوں نے سب کچھ سن تو لیا ہے۔ پھر یہ چکا کس لیے۔ خدا تعالیٰ ایسی ضرورت مند اور کمزور لڑکیوں کو محفوظ رکھے۔ ہمارے ایگزیکٹیو نے جو کام کیا، وہ آپ لوگوں نے سن لیا، کچھ مسکرائے۔ کچھ نے تھوتھو کی۔ بہرحال بات آئی گئی ہوگئی اور میں نے پہلا کام وہی کیا۔ اپنے روزمرہ والے کام کو روک کر میں نے اسٹیل والی فائلز کی الماری کھولی اور اس میں سے اس نام کی فائل تلاش کرنی شروع کردی۔ بہرحال چند بنڈل جھاڑنے پھونکنے کے بعد جب میں نے انہیں باہر نکالا تو مجھے اس کی فائل واقعی مل گئی۔ وہ کیس واقعی ایگزیکٹیو کے علم میں تھا۔

باقی فائلیں میں نے ترتیب سے واپس رکھ دیں اور اس کی فائل کو شروع سے کھول کر ورق گردانی کی تو اندازہ ہوا کہ تین ماہ قبل اس نے اس وقت کے گورنر صاب کو حصول پلاٹ کے لیے درخواست دی تھی۔ وہ شادی شدہ تھی اور اس کے دو چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ خاوند سے ذاتی اختلاف کی وجہ سے وہ ایک کرائے کے مکان میں رہتی تھی۔ شاید اس کی ماں بھی اس کے ہمراہ تھی۔ اس کی درخواست کرائمز برانچ پولیس کے تھروتصدیق ہوکر آچکی تھی اور اب اس پر الاٹمنٹ آرڈرز ہونے تھے۔ کرائمز برانچ کے پولیس آفیسر نے اس کے حق میں اپنے ریمارکس لکھ دیئے تھے اور سفارش واضح درج تھی لہٰذا میرے لیے اب کام مشکل نہ تھا اور اگر مشکل ہوتا بھی تو میں نے ہر حال میں اس کی مدد کرنی تھی لہٰذا میں نے اس کا کام کردیا اور پانچ مرلہ کا پلاٹ اس کے نام الاٹ کردیا اور متعلقہ دفتروں میں اس آرڈر کی کاپیاں ارسال کردیں۔ اس کا کام کیسے کیا! میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔

بہرحال ایک ہفتہ کے بعد وہ مسکراتے مسکراتے اسی طرح خوشبوئیں بکھیرتی استقبالی دروازے سے اندر داخل ہوئی اور سیدھی میرے پاس آئی۔ اس روز وہ بہت خوش تھی اور ہمارے دفتر کے عاشق مزاج لوگ پروانوں کی طرح شمع پر دن دیہاڑے اندر آئے اور ارد گرد گھومنے لگے۔ اندر آتے ہی کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں نے سارے کام فوراً چھوڑ دیئے اور اسے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کیا تو خود ہی کہنے لگی۔

''میں تو بیٹھ گئی ہوں، شکریہ۔''

میں نے اسے کہا۔ ''آپ یہاں دوبارہ کیوں آئیں۔ میں نے آپ کو منع کیا تھا، وعدہ خلافی ہوگئی نا؟'' کہنے لگی۔

''جی ہاں، واقعی وعدہ خلافی ہوگئی۔ مگر آپ میری بات تو سنیں کہ میں یہاں کیوں آئی۔''

میں نے چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ ''جی مجھے علم ہے کہ آپ کیوں آئیں۔'' ابھی وہ کچھ کہنے والی تھی کہ میں نے انگلی کے اشارے سے اسے منع کردیا کہ وہ راز سے پردہ نہ اٹھائے۔ وہ میرا مقصد سمجھ گئی اور کہنے لگی۔

''اوہ۔ اوکے، میں معذرت چاہتی ہوں لیکن پلیز آپ میری بات تو سنیں کہ میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔''

میں نے کہا کہ ابھی آپ پانچ منٹ صبر کا مظاہرہ کریں، میں آپ کی بات بعد میں سنوں گا۔ میں نے چپراسی کو چائے لانے کو بھیجا اور ساتھ ایک بسکٹ کا پیکٹ کا بھی اشارہ کردیا۔ چپراسی چائے لینے

کے لیے چلا گیا۔ اس نے فائلز کو ایک طرف رکھتے ہوئے پوچھا۔

''جی آپ نے کیا کہنا تھا۔'' کہنے لگی۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نے اپنے محسن کا نام ہی نہیں پوچھا جس نے نہ صرف میری مشکلیں آسان کیں بلکہ زندہ رہنے کا سامان پیدا کر دیا۔''

''اس چٹ پر میرا نام درج ہے اور سامان تو سارے اوپر والا پیدا کرتا ہے۔ انسان تو محض وسیلہ ہوتا ہے۔''

''پھر بھی۔۔۔ آپ نے اتنا احسان کیا کہ شاید میں زندگی بھر نہ بھول سکوں۔ بہر حال زندگی نے وفا کی تو میں یہ آپ کا احسان اتاروں گی۔'' میں نے تکلفاً اپنا چہرہ دوسری طرف کر دیا۔

اس نے مجھ سے پہلا سوال پھر دوہرایا۔ ''آپ نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔''

میں نے برجستہ کہا۔ ''مجھے خادم کہہ سکتی ہیں۔ خدمت کرنے والے کو خادم ہی تو کہتے ہیں۔'' اس نے دوبارہ اصرار کیا، میں نے اپنا نام بتا دیا۔ اتنی دیر میں چائے آ گئی۔ میں نے اسے چائے پلائی۔ چائے کا کپ لیتے ہوئے اس نے صدق دل سے تھینک یو کہا۔ چائے کی پیالی واپس رکھتے ہوئے بولی۔

''آپ نے جس انداز میں میرا حوصلہ بڑھایا، میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں بیان کروں۔'' بغیر وقفہ کے کہنے لگی۔

''میرا نام اور ایڈریس میری درخواست پر موجود ہے۔ دوبارہ کہنے یا بتانے کی ضرورت نہیں۔ ایک ادنیٰ سی خواہش لے کر آئی تھی۔ آپ نے آنے کی وجہ بھی نہیں پوچھی۔'' میں نے کہا۔

''وجہ میں جانتا ہوں، بہر حال اپنی زبان سے اگر کہنا چاہیں تو کہہ دیجئے۔''

''ایک تو میں نے آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا۔ مجھے گھر کے پتا پر آپ کی طرف سے بھیجے گئے آرڈر موصول ہو گئے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ پانچ مرلہ کا پلاٹ الاٹ کرنے کے بجائے سات، دس مرلہ کا پلاٹ الاٹ کر دیتے تو اور خوشی ہوتی۔''

میں نے کہا۔ ''ابھی آپ خوش نہیں ہیں؟''

''نہیں، نہیں۔ خوش ہوں۔ میں تو اپنا اظہار کر رہی تھی۔ اب میں آپ کو دعوت دینے آئی ہوں کہ پلیز آپ میرے غریب خانہ پر تشریف لائیں تاکہ میں آپ کی خدمت کر سکوں۔ یعنی پارٹی کر سکوں۔''

میں نے جواباً کہا۔ ''معصوم اور بھولی حوا کی بیٹی۔ ہم کسی کے کام کر کے پارٹیاں کھانے کے لیے نہیں بیٹھے۔ نہ ہی ہمارے پاس اتنا وقت ہوتا ہے کہ ہم لوگوں کے گھروں میں جا کر پارٹیاں کھائیں۔ یہاں دفتر سے جب نکلتے ہیں تو اور بھی بہت سی زندگی کی مصروفیات ہوتی ہیں۔''

میری تمہید اور انکار سننے کے بعد گویا اس کے جذبات یکدم دب گئے اور چہرے پر واقعی مایوسی چھا گئی۔

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''نہیں، آپ مایوس نہ ہوں۔ میں وعدہ نہیں کرتا، بہر حال کوشش کروں گا۔ جب بھی فرصت ملی، میں آپ کے گھر آؤں گا۔ آپ کا ایڈریس میرے پاس موجود ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔''

اسے شاید تھوڑی سی ڈھارس بندھی اور کہنے لگی۔ ''چلو جیسے آپ کی مرضی۔ آپ آئے تو یہ آپ کی ذرہ نوازی ہوگی ورنہ ایک آس اور امید کے ساتھ زندہ رہوں گی کہ شاید کب میرا محسن میرے گھر آئے۔''

میں نے اس کا یہ جملہ سن کر قدرے اپنے سر کو ہلایا اور کہا۔ ''اِن شاء اللہ۔'' وہ اجازت لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے بھی احتراماً اپنی سیٹ چھوڑ دی اور وہ اپنا پرس کندھے پر رکھ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

ملنے کی تم کوشش کرنا وعدہ کبھی نہ کرنا کہ وعدہ تو ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کی ملاقات کے دوران ہی میرے ضمیر نے مجھے بار بار اس عہد پر قائم رکھا کہ کبھی بھی تم اس کے گھر مت جانا۔ یہ جو نیکی کر چکے ہو، اس کو بھول جانا اور اس کا بدلہ اس دنیا میں لینے کی ضرورت نہیں اور میں نے بھی دوبارہ اس کی فائل کھول کر اس کا ایڈریس ذہن نشین ہی نہ کیا۔ جیسے وہ مجھے قطعی ملی ہی نہ تھی۔

کالے لوگ

محمد سلیم اختر

منہ بولے رشتے تو حقیقی رشتوں سے بھی زیادہ نازک اور حساس ہوتے ہیں۔ لیکن اُس نے سچ اور خلوص سے جوڑے گئے رشتہ کی قدر ہی نہیں کی----

دھوکہ اور فریب پر مبنی ایک شخص کی سچی داستان

میں ان دنوں ایک پرائیویٹ کمپنی میں پارٹ ٹائم جاب کرتا تھا۔ تین بجے سرکاری دفتر سے چھٹی کر کے گھر پہنچتا اور ایک گھنٹہ آرام کرنے کے بعد کام پر روانہ ہو جاتا۔ رات دس بجے کے بعد میری گھر واپسی ہوئی تھی۔ مجھے سرکاری ملازمت کرتے ہوئے ابھی دو سال ہی ہوئے تھے کہ ابا جان ایک حادثہ میں انتقال کر گئے۔ ابا جان کی بے وقت موت نے ہمارے گھر میں صف ماتم بچھادی۔ جہاں خوشیاں ہر پل رقص کرتی نظر آتی تھیں، وہاں اب غموں نے ڈیرے ڈال لیے۔ میں تمام بہن بھائیوں سے بڑا تھا، اس لیے گھر کا سارا بوجھ مجھ پر آن پڑا۔ یہ میرے لیے ایک کڑا امتحان تھا جس میں مجھے کامیابی حاصل کرنی تھی۔ میں نے یہ عہد کر لیا کہ میں اپنی خواہشات اور ارمانوں کا گلا گھونٹ دوں گا مگر بہن بھائیوں کو دکھی اور پریشان نہ ہونے دوں گا۔

سرکاری دفتر سے ملنے والی تنخواہ اب ناکافی

تھی۔ اس لیے میں نے پارٹ ٹائم جاب کرلی تھی تاکہ گھر کی دال روٹی آسانی سے چلتی رہے۔ میں نے اپنے آپ کو مشین بنالیا۔ آرام کا لفظ میں بھول گیا اور اپنی خواہشات کو دفن کرڈالا۔

اس پرائیویٹ کمپنی کا دفتر میرے گھر سے کافی دور تھا۔ میں پھر بھی بچت کی خاطر پیدل آتا اور جاتا تھا۔ یہ میرا روزانہ کا معمول تھا۔ ان دنوں مال روڈ پر پلازہ سینما نیا نیا تعمیر ہوا تھا۔ اس لیے وہاں پر رش بہت ہوتا تھا، میں جب رات کو چھٹی کر کے اس سینما کے سامنے سے گزرتا تو وہاں شائقین کا بہت ہی رش نظر آتا۔ میرا جی کئی بار مچلا کہ میں بھی کسی روز اس خوب صورت سینما میں فلم دیکھوں۔ مگر میں کبھی بھی اپنی اس خواہش کو عملی جامہ نہ پہنا سکا اور صرف سینما کی بلڈنگ اور اداکاروں کی بڑی بڑی تصویریں دیکھ کر جی بہلاتا رہا۔

مال روڈ پر پلازہ سینما سے ایک کلومیٹر آگے جا کر ایک سڑک دائیں جانب مڑتی ہے، جو میرے گھر کی طرف جاتی ہے۔ اس روز موسم دوپہر سے ہی ابر آلود تھا اور وقفہ وقفہ سے ہلکی ہلکی بارش بھی ہو رہی تھی۔ اس لیے رات کو مجھے دفتر سے نکلتے ہوئے دیر ہوگئی۔ میں پلازہ سینما کے سامنے پہنچا تو آخری شو شروع ہو چکا تھا۔ میں جوں ہی اپنے گھر کی جانب جانے والی سڑک پر مڑنے لگا تو کسی لڑکی کی ''بچاؤ، بچاؤ'' کی آوازوں نے مجھے اپنی جانب متوجہ کرلیا۔

میں نے مڑ کر چوک کی جانب دیکھا تو مجھے دو تین غنڈے لڑکی کو گاڑی میں بٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے نظر آئے۔ لڑکی مسلسل مزاحمت کر رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ وہ مدد کے لیے بھی پکار رہی تھی۔ سڑک پر اس کے علاوہ نہ کوئی گاڑی نظر آرہی تھی اور نہ ہی ان کے علاوہ کوئی اور انسان۔ اتنی بے حسی اور درندگی دیکھ کر لمحہ بھر کو میرے خون کی گردش تیز ہوگئی مگر پھر بھی میں نے پرائی آگ میں کودنے سے پرہیز کرنا ہی بہتر جانا اور آگے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ میں چند ہی قدم چلا تھا کہ اس لڑکی کی آواز پھر سنائی دی۔ وہ خدا اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام پر مدد مانگ رہی تھی۔ ایک بار پھر میرے قدم نہ چاہنے کے باوجود بھی رک گئے۔ میں واپس پلٹا اور اگلے چند لمحوں میں ان تک جا پہنچا۔ نہ جانے قدرت نے اس وقت میرے جسم میں اتنی طاقت کیسے بھر دی تھی کہ میں عقاب کی مانند ان غنڈوں پر جھپٹ پڑا۔ میرا جسم فولاد بن گیا، میں نے ان تینوں کو دھن کر رکھ دیا۔ وہ غنڈے اس اچانک افتاد سے گھبرا گئے۔ مگر پھر بھی میں ایک تھا اور وہ تین۔ مگر غیرت ایمانی اور سچائی کے جذبے نے میرے اندر آگ بھر دی تھی۔ انہوں نے مجھ پر کئی وار کیے مگر میں سہہ گیا۔ بالآخر وہ گاڑی میں بیٹھ کر بھاگ گئے تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ میں نے ذرا دیر ستانے کے بعد اس لڑکی کی طرف دیکھا تو وہ ابھی تک ایک طرف سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ میں اس کی طرف بڑھا تو وہ سسکتے ہوئے بولی۔

''آپ۔۔۔ آپ تو میرے لیے فرشتہ بن کر آئے ہیں۔ میں آپ کا یہ احسان عظیم زندگی بھر نہ بھول پاؤں گی۔''

''چھوڑیے ان باتوں کو۔ آیئے میں آپ کو آپ کے گھر چھوڑ آؤں۔'' میں نے اس کے روایتی الفاظ کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

اس نے مجھے اپنے گھر کا ایڈریس بتایا اور پھر سر جھکا کر میرے ساتھ چل پڑی۔ شکل وصورت اور لباس کی تراش خراش سے وہ کسی ماڈرن اور امیر گھرانے کی لڑکی لگ رہی تھی۔ میں نے تمام راستے میں اس سے کوئی بات نہ کی۔ اس نے بھی زبان نہ کھولی۔ کوشش کے باوجود بھی اتنی دیر گئے ٹیکسی نہ مل سکی، اس کا گھر زیادہ دور نہ تھا۔ اس لیے ہم جلد ہی اس کے گھر پہنچ گئے۔ اتنی بڑی اور شان دار کوٹھی دیکھ کر میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ مجھے ساتھ لے کر کوٹھی کے اندر داخل ہوئی تو کئی نوکر دوڑتے ہوئے آئے۔ وہ میرے سامنے ہی اپنے ڈرائیور پر برس پڑی۔ اس نے اسے خوب جی بھر کر برا بھلا کہا۔ وہ گاڑی لے کر سینما کیوں نہیں آیا۔

اس نے معذرت بھرے انداز میں کہا۔ ''بی بی جی! گاڑی ابھی تک ورکشاپ میں ہے اور ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئی۔''

مگر اس لڑکی نے کوئی دلیل نہ مانی اور کہنے لگی۔ ''کل سے تمہاری چھٹی ہے۔ اپنا بوریا بستر اٹھاؤ اور کل جاؤ اس گھر سے۔''

ڈرائیور معافی مانگنے لگا۔ اس نے ڈرائیور کی ایک نہ سنی۔ میں اب واپس جانا چاہتا تھا مگر اس نے واپس نہ آنے دیا اور کہنے لگی۔

''آپ کچھ دیر ٹھہر جائیں۔ پھر چلے جانا۔''

میں اس کی خواہش رد نہ کر سکا اور اس کے ہمراہ اس کے کمرے میں پہنچا۔ اس کا کمرا کیا تھا، ایک مکمل نگار خانہ تھا جہاں تمام دیواروں پر مختلف فلمی اداکاروں اور اداکاراؤں کی تصاویر آویزاں تھیں۔ ایک ٹیپ ریکارڈر، ایک بڑا سا ڈیک اور سیکڑوں کی تعداد میں آڈیو کیسٹیں پڑی تھیں۔ بے شمار فلمی میگزین بک ریک میں سجے تھے۔ اس کے علاوہ بھی عیش و آرام کی ہر چیز وہاں موجود تھی۔ میں حیرت بھری نظروں سے کمرا کی ہر چیز کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ لڑکی بھی کیا چیز ہے۔ اس کے ماں باپ کہاں ہیں، میں نے اتنی آزاد خیال لڑکی اس سے قبل نہ دیکھی تھی۔ مجھے اس سے نفرت ہونے لگی اور دل میں یہ خیال جاگزیں ہو گیا کہ میں نے اس کی مدد کر کے کوئی نیکی نہیں کی ہے۔ میں ان ہی سوچوں اور خیالوں میں گم تھا کہ اس کی آواز نے چونکا دیا۔ وہ بولی اور کہنے لگی۔

''میرا نام بینا ہے۔ میں اپنے محسن کا نام جاننا چاہتی ہوں۔''

''مجھے زاہد کہتے ہیں۔'' میں نے جواباً کہا اور ساتھ ہی کہا۔

''میں معذرت کے ساتھ یہ پوچھنا چاہوں گا کہ یہ سب کیا ہے۔'' میں نے کمرے کی دیواروں پر نظریں گھماتے ہوئے کہا۔ ''آپ اتنی دیر گئے کہاں سے آ رہی تھیں اور یہ جو کچھ ہوا، کیوں ہوا؟''

بینا نے گردن اوپر اٹھائی اور چند لمحے چھت کو دیکھتی رہی۔ جب اس نے گردن نیچے کی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھیں ساون بھادوں بن گئیں۔ اس اچانک تبدیلی پر حیران تھا کہ اب وہ سسکیاں بھرنے لگی تھی۔ میں نے اسے دلاسا دیا۔ بالکل ایسے جیسے بچوں کو دلاسا دیا جاتا ہے مگر اس کی آنکھیں تو کسی چشمے کی مانند بہہ رہی تھیں۔ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی اور کہنے لگی۔

''زاہد صاحب! میں نہایت ہی امیر ماں باپ کی اولاد ہوں۔ دولت میرے گھر کی باندی ہے، مجھے کسی بھی چیز کی کمی نہیں ہے۔ میں ابھی دو سال ہی کی تھی کہ میری ماں مر گئی۔ ابا جان نے میری خاطر دوسری شادی نہیں کی اور مجھے بہت پیار دیا۔ اس وقت ہم بہت زیادہ امیر نہ تھے مگر آہستہ آہستہ ابا جان ترقی کرتے گئے۔ یہاں تک کہ اب دوسرے ملکوں میں بھی ہمارا کاروبار پھیلا ہوا ہے۔ مگر اس دولت نے مجھ سے باپ کا پیار بھی چھین لیا ہے۔ ابا جان تو ہمیشہ دوروں پر ہی رہتے ہیں، مہینہ میں چند دن وہ گھر پر گزارتے ہیں۔ میری زندگی صرف نوکروں، مالی اور آیا تک محدود ہو کر رہ گئی۔ ابا جان جب گھر آتے ہیں تو میں ان کو دیکھ کر خوشی سے پھول کی مانند کھل جاتی ہوں کہ ابھی وہ بڑھ کر مجھے سینے سے لگائیں گے۔ میری پیشانی کو بوسہ دیں گے۔ ڈھیروں پیار کریں گے مگر میری تمام خوشیاں نوحوں میں ڈھل جاتی ہیں۔ میرے اندر اور باہر خزاں ڈیرے ڈال لیتی ہے۔ میری آنکھوں میں موسم برسات اتر آتا ہے کیوں کہ وہ آتے ہی کہتے ہیں ''ہیلو بینا! کیسی ہو۔'' اور اس کے بعد تحفوں کا انبار میرے حوالے کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں تو میں رو پڑتی ہوں۔ مجھے وہ تحفے پھنکارتے ہوئے ناگ لگنے لگتے ہیں اور میں ان کو اسٹور میں پھینک کر رونے لگتی ہوں۔ یہ ایک

دن کی بات نہیں ہے۔

زاہد صاحب! یہ میرا ہمیشہ کا معمول ہے کہ جب تک میں فلم نہ دیکھ لوں، مجھے نیند ہی نہیں آتی۔ مجھے فلمی اداکاروں سے لگاؤ ہے اسی لیے میں نے اپنا کمرا ان کی تصاویر سے سجا رکھا ہے۔ میں اپنے آپ کو امیر ترین اور ماڈرن ترین لڑکیوں میں شمار کرتی ہوں۔ فلمیں دیکھ کر میں اپنا غم وقتی طور پر بھول جاتی ہوں۔ ان ہی سے مجھے سکون ملتا ہے اور یہ ہی میری زندگی کا حصہ ہیں۔ میرے چاہنے والے بے شمار ہیں، ہر کوئی میری محبت کا دم بھرتا ہے اور مجھ پر جان لٹانے کو تیار ہے مگر میں جانتی ہوں کہ ان میں سے کسی کو بھی مجھ سے سچی محبت نہیں ہے۔ ان سب کو میری دولت سے غرض ہے، سب میرے جسم کے طلب گار ہیں، مگر میں نے عہد کر رکھا ہے میں کبھی بھی ان کے جھانسے میں نہیں آؤں گی۔ اس بھری دنیا میں مجھے کوئی بھی مخلص اور ہمدرد انسان نہیں ملا جو مجھے جان سکے، پہچان سکے اور میری روح کی پاس کو بجھا سکے۔

جمال بھی میرے چاہنے والوں میں سے ایک ہے۔ مگر مجھے اس سے نفرت ہے۔ اس لیے میں نے کبھی اس کو گھاس نہیں ڈالی۔ اس واقعہ میں بھی اس کا ہاتھ ہے۔ وہ عرصہ سے میرے پیچھے پڑا ہوا تھا، وہ مجھے صرف اور صرف اپنے بستر کی زینت بنانا چاہتا ہے مگر میں نے عہد کر رکھا ہے کہ کبھی بھی اس کو اس کے مقصد میں کامیاب نہ ہونے دوں گی۔ آج بھی میں فلم دیکھنے ہی گئی ہوئی تھی۔ ابا جان کراچی گئے ہوئے ہیں۔ ایک گاڑی ان کے پاس ہے، دوسری میرے پاس ہے۔ مگر وہ کل سے خراب پڑی ہوئی ہے۔ فلم دیکھنا میری مجبوری ہے، میں نے ہر حال میں فلم دیکھنا تھی۔ ڈرائیور دوپہر کا ورکشاپ گیا ہوا تھا اور شام تک واپس نہیں آیا تھا اس لیے میں ٹیکسی میں سینما چلی گئی اور ڈرائیور کے لیے پیغام چھوڑ گئی کہ وہ ساڑھے نو بجے مجھے سینما سے آکر لے جائے۔ میں فلم دیکھ کر باہر نکلی تو نہ گاڑی تھی اور نہ ڈرائیور۔ مجھے بہت غصہ آیا، میں نے کچھ دیر اس کا انتظار کیا مگر وہ پھر بھی نہ آیا۔ ادھر بارش بھی ہو رہی تھی، اب سینما کی حدود میں کوئی ٹیکسی بھی نہ رہی۔ ان لوگوں نے مجھے لفٹ دینا چاہی مگر میں نے انکار کر دیا۔ کیوں کہ میں جان گئی تھی کہ ان کے تیور ٹھیک نہیں ہیں۔ میں عجیب حالات سے دوچار ہوگئی تھی کہ اب کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔ کیسے جاؤں۔ بالآخر میں پیدل ہی چل پڑی۔ میں جب اس چوک پر پہنچی تو ان لوگوں نے اچانک میرے آگے گاڑی روکی اور مجھے زبردستی گاڑی میں بٹھانا چاہا تو میں نے شور مچا کر مدد کے لیے پکارنا شروع کر دیا۔ ایک دو گاڑیاں قریب سے گزر گئیں مگر کسی نے بھی میری فریاد نہ سنی اور خدا نے میری سن لی۔ آپ رحمت کا فرشتہ بن کر آگئے اور میں بال بال بچ گئی۔ اگر آج آپ نہ آتے تو میں برباد ہو جاتی اور کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتی۔ مجھے آج احساس ہوا ہے کہ کچھ لوگ آج بھی ہیں جن کے سینے میں دل ہیں جو دوسروں کا درد محسوس کرتے ہیں۔ آپ نے آج میری آنکھیں کھول دی ہیں، میں اندھیروں میں بھٹک رہی تھی، آپ نے مجھے روشنی کی کرن صرف دکھائی ہی نہیں بلکہ میری اجاڑ زندگی میں روشنی کی ایک کرن بن کر آئے ہیں۔''

بینا بولتی جا رہی تھی اور میں سن رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے تشکر کے سائے لہرا رہے تھے وہ بلاوجہ ہی مجھ سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہوگئی تھی۔ بینا کے پیار بھرے جذبات اور احساسات اس کے چہرے پر آویزاں تھے۔

پھر اگلے ہی لمحے میرے ضمیر نے مجھے ملامت کرنی شروع کر دی کہ احسان کر کے اس کے صلہ کی آس نہیں لگانی چاہیے۔ یوں یکدم میری سوچوں میں تبدیلی آگئی۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کرنے لگا کہ کسی کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا انسانیت کی توہین ہے۔ اسے اس

وقت سچے، مخلص اور ہمدرد انسان کی ضرورت ہے۔ ایک غیرت مند بھائی کی ضرورت ہے۔ اگر اس کو باپ کی سچی شفقت ملی ہوتی تو وہ یوں نہ بھٹک رہی ہوتی۔ اگر اس کا کوئی بھائی بھی ہوتا تو وہ زمانے کے سرد اور گرم سے محفوظ رہتی۔ میں نے لمحوں میں ایک فیصلہ کیا اور پھر اپنے دونوں ہاتھ اس کے سر پر رکھتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

''بینا! آج سے میں تمہارا بھائی اور تم میری بہن ہو۔ اب کوئی بھی ناپاک ہاتھ تمہاری طرف نہیں بڑھے گا۔ کوئی بھی غلیظ نگاہ تمہاری طرف نہیں اٹھے گی۔ آج کے بعد تم بھی مجھے اپنا بھائی ہی سمجھو گی۔ میں نے بھائی بن کر ہی تمہاری مدد کی ہے، جو کچھ تم نے سوچا تھا وہ نہ ہوگا۔ اپنی سوچ بدل لو اور یہ سمجھ لو کہ تم جو زندگی ہار کر جیت کر ہی رہی ہو، آج ہار گئی ہو۔ آج ہار کے دیکھو گی تو تمہیں اس میں بھی ایک انوکھا لطف آئے گا۔''

بینا نے نگاہیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا ہے، اس کی پیشانی پر سوچوں کی لکیریں نمایاں ہوگئیں۔ پھر بینا نے واقعی ہار مان لی۔ وہ سسکنے لگی اور میں انوکھا رشتہ جوڑ کر گھر لوٹ آیا۔ امی میرے دیر سے آنے کی وجہ سے بہت ہی پریشان تھی۔ میں نے ان کو تمام حقیقت بتا کر مطمئن کر دیا۔ انہوں نے میرے اس جذبہ کی تعریف کی اور شاباشی بھی دی کہ میں نے مردوں والا کام کیا ہے۔

بینا کو میں اپنے گھر کا پتا سمجھا آیا تھا۔ اس لیے وہ ایک ہفتہ بعد اپنے ابو کے ہمراہ ہمارے گھر آ گئی۔ ہم نے اپنی حیثیت کے مطابق ان کی تواضع کی۔ بینا کے والد غفار صاحب میرے ساتھ بہت ہی شفقت سے پیش آئے۔ وہ اس رشتہ پر بہت خوش تھے جو میں نے بینا سے استوار کیا تھا۔ انہوں نے ہم سب کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی

مسکراہٹیں

خاتونِ خانہ سب گھر والوں کے لیے میز پر کھانا لگا رہی تھی کہ ان کا دس سالہ بچہ چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ سجائے گھر میں داخل ہوا۔

''کہاں تھے بیٹا، اتنی دیر سے کیا کر رہے تھے؟'' ماں نے پیار سے پوچھا۔

''ممی! میں پوسٹ مین بنا ہوا تھا۔'' بچے نے فخریہ لہجے میں کہا۔

''لیکن بیٹا! تم پوسٹ مین کیسے بن گئے، تمہارے پاس تو ڈاک نہیں تھی۔'' ماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ڈاک کا انتظام ہوا تب ہی تو مجھے پوسٹ مین بننے کا خیال آیا، میں آج صبح آپ کے کاٹھ کباڑ والے کمرے میں آپ کے پرانے ٹرنک کی تلاشی لے رہا تھا اس میں کپڑوں کے نیچے مجھے گلابی رنگ کا ایک بنڈل ملا جس پر سبز ربن بندھا ہوا تھا، میں وہ سارے خط ایک ایک کر کے محلے کے سب گھروں میں گیٹ سے اندر ڈال آیا ہوں۔'' بچے نے فخر سے بتایا۔

☆☆☆

ایک دیہاتی جوان لڑکی پر عاشق ہوگیا۔ بڑی منت سماجت کے بعد لڑکی سردار جی سے ملاقات پر راضی ہوئی۔ آدھی رات کو کھیتوں میں ملنے کا ٹائم سیٹ ہوا۔

وقت مقررہ پر وہ لالٹین ہاتھ میں پکڑے کھیتوں میں جانے لگا تو باپ نے روکا اور پوچھنے لگا۔ ''آدھی رات کو کدھر جا رہے ہو؟''

دیہاتی نے ''ایک سچ سو سکھ'' فارمولے پر عمل کرتے ہوئے کہا۔ ''ابا! آج میری ایک لڑکی کے ساتھ ملاقات ہے اس سے ملنے جا رہا ہوں۔''

بوڑھے باپ نے بیٹے کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''اوئے لڑکی سے ملنے جا رہے ہو اور لالٹین ساتھ لے کر جا رہے ہو۔ پورے گاؤں کو پتا چل جائے گا۔ میں جب جوانی میں تمہاری ماں سے چھپ کر ملتا تھا تو کبھی لالٹین پاس نہیں رکھی۔''

جوان دیہاتی نے قریب چارپائی پر سوئی ماں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ابا! لالٹین نہ لے جانے کا نقصان تو دیکھ، اندھیرے میں تو پھر ایسی ہی چیزیں ملتی ہیں۔''

اور چلے گئے۔

ایک دن میں بھی امی اور بہن بھائیوں کو ساتھ لے کر بینا کے گھر گیا۔ اس کے بعد بھی میں کبھی کبھار ان لوگوں سے ملنے چلا جاتا تھا۔ بینا نے واقعی اپنے آپ کو بدل ڈالا تھا اور وہ واقعی ایک مشرقی لڑکی بن گئی تھی۔ اس کے کمرا سے فلمی اداکاروں کی تصویریں اور ٹیپ ریکارڈ ہٹادیا گیا تھا۔ اس نے میری ہر بات مانی اور اس پر عمل کیا تھا جس وجہ سے میں اس سے بڑا خوش تھا۔ وہ مجھے بڑا بھائی سمجھ کر نہ صرف میرا احترام کرتی تھی بلکہ میری ہر بات بھی مانتی تھی۔

بینا اور اس کے والد کا اصرار تھا کہ میں ان سے کچھ رقم لے کر کوئی کاروبار کرلوں مگر میرا ضمیر یہ گوارا نہ کرتا تھا کیوں کہ بھائی بہنوں کو دیا کرتے ہیں، لیا نہیں کرتے۔ یہ بات بینا اور اس کے باپ کو بھی بخوبی معلوم تھی کہ ان کا کسی قسم کا بھی احسان لینے کے لیے تیار نہیں ہوں مگر اس کے باوجود زیادہ دیر کام کرنے سے بینا کو دکھ پہنچاتا تھا اور وہ میری اس حالت پر کڑھتی تھی۔ واقعی اس نے سگی بہن ہونے کا حق ادا کردیا تھا مگر میں بہت خوددار قسم کا انسان تھا۔ میں کسی کا بھی کسی بھی قسم کا احسان لینے کو تیار نہ تھا۔

پھر دونوں باپ بیٹی نے یہ ترکیب سوچی کہ میں فارن چلا جاؤں۔ غفار صاحب کے دفاتر مشرق وسطیٰ میں بھی تھے، جب انہوں نے اپنی ہی کمپنی کا ویزا دے کر مجھے دبئی جانے کا کہا تو میں انکار نہ کرسکا۔ کیوں کہ میں نے وہاں کام کرنا تھا اور تنخواہ لینی تھی۔ اس میں احسان والی بات نہ تھی۔ اس لیے میں نے ہاں کردی۔ میرے تمام کاغذات غفار صاحب نے ہی تیار کروائے جبکہ میرے ذاتی استعمال کا تمام سامان بینا نے خریدا۔ حتیٰ کہ میرے کپڑے بھی۔ میں بینا کا خلوص اور محبت دیکھ کر انکار نہ کرسکا۔ ایئرپورٹ پر سب لوگوں نے مجھے الوداع کیا۔

غفار صاحب نے بتایا تھا کہ میرے آدمی تمہیں لینے کے لیے ایئرپورٹ پر موجود ہوں گے، وہ تمہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دیں گے۔ میں نے فون پر ان لوگوں کو بتادیا کہ ایرپورٹ پر خلیل نامی شخص موجود ہوگا۔ میں تمام سامان اس کے حوالے کردوں۔

ہوائی جہاز آسمان کی وسعتوں میں محو پرواز تھا اور میں مستقبل کے حسین تانوں بانوں میں کھویا ہوا تھا کہ اب میری بہنوں کی شادیاں اچھے گھروں میں ہوجائیں گی۔ میرے بھائی اب اعلا تعلیم حاصل کرسکیں گے۔ میں اپنی والدہ کو حج بھی کراسکوں گا۔ اب تمام پریشانیاں ختم ہوجائیں گی۔۔۔ تین گھنٹوں کے بعد جہاز دوبئی ایئرپورٹ پر تھا۔ کسٹم حکام نے جب میرے سامان کی تلاشی لی تو اس میں مٹھائی کے ایک ڈبا میں ہیروئن پائی گئی اور میں منشیات کی اسمگلنگ کے جرم میں گرفتار کرلیا گیا۔ میں نے لاکھ قسمیں کھائیں، ان کی منتیں کیں کہ میرے ساتھ دھوکا کیا گیا ہے مگر انہوں نے میری کوئی دلیل نہ مانی کیوں کہ پاؤڈر میرے ہی سامان سے میرے سامنے ہی برآمد ہوا تھا۔ مجھے اسی روز جیل بھیج دیا گیا، میری بے گناہی کا یقین کسی نے بھی نہ کیا۔ عدالت نے مجھے آٹھ سال کی سزا سنادی اس روز میں بہت رویا تھا اور پچھتایا بھی تھا کہ کاش بینا میری زندگی میں نہ آئی ہوتی تو اتنی بڑی ذلت اور رسوائی مقدر نہ بنتی۔ غفار صاحب کی حقیقت مجھ پر واضح ہوگئی تھی کہ وہ اتنا امیر کیوں ہے۔ اتنی دولت اس کے پاس کہاں سے آئی ہے۔ مجھے بینا پر بھی، بہت غصہ آیا کہ جو کچھ ہوا ہے، اس کی ذمہ دار صرف اور صرف بینا ہے۔ میں پرائی آگ میں کودا تھا اور آج وہی آگ میرے اپنے دامن تک آگئی ہے۔ میں اعتماد اور خلوص کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ شارجہ اور دبئی کی جیل میں کئی پاکستانی اور انڈین تھے، جو

میری ہی طرح اعتماد اور خلوص کے ہاتھوں ڈسے ہوئے تھے۔ میں نے جیل سے کئی خط غفار اور بینا کو لکھے مگر ان کی طرف سے جواب نہ ملا۔ انتظار کی گھڑیاں طویل ہوتی گئیں۔

آٹھ سال میرے لیے آٹھ صدیاں بن گئیں۔ زندگی عذاب ہوگئی۔ آٹھ سال میں نے روتے تڑپتے اور بلکتے ہوئے گزارے میں ہر دن اور ہر رات سسکتا رہا۔ اپنی تقدیر اور بے بسی کا ماتم کرتا رہا کہ میں اس قابل تو نہ تھا۔ میرے جذبے سندر اور سچے تھے تو پھر تقدیر نے مجھے اتنی کڑی سزا کیوں دی ہے۔ میں نے کون سا جرم کیا تھا کہ مجھے بلاوجہ یہ سزا ملی ہے۔ میں پل پل عذاب میں مبتلا رہا۔

آٹھ سال بعد جب میں واپس پاکستان کی سرزمین پر آیا تو خوشی سے میری آنکھیں چھلک پڑیں۔ میں بے اختیار ہو کر سجدہ میں گر گیا اور اپنے وطن کی مٹی کو چومنے لگا۔ میں اب خالی ہاتھ تھا۔ میرے پاس سوائے تن کے کپڑوں اور چند درہم کے کچھ اور نہ تھا۔ میں جب اپنے گھر پہنچا تو دروازے پر تالا لگا ہوا دیکھ کر میں ایک بار پھر پریشان ہوگیا۔ میں نے کسی سے کچھ نہ پوچھا اور خالہ کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہاں مجھے اپنے بہن بھائی مل گئے، وہ مجھے دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ جب انہیں یہ یقین ہوگیا کہ میں ان کا بھائی زاہد ہی ہوں اور زندہ بھی ہوں تو وہ دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئے۔ ہم دیر تک گلے مل کر روتے رہے۔ امی مجھے ابھی تک نظر نہ آئی تھیں۔ میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں اور پھر خالہ سے پوچھا۔ ''امی کہاں ہیں؟''

''زاہد بیٹے! وہ تمہارا انتظار کرتے کرتے بہت دور چلی گئی ہیں۔''

امی کی وفات کی خبر سن کر میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ سب نے مجھے دلاسا دیا اور پھر میں قبرستان چلا گیا اور امی کی قبر سے لپٹ کر رونے لگا۔

میں نے وہاں ہی قسم کھائی کہ میں غفار کو زندہ نہ چھوڑوں گا کیوں کہ اس نے نہ صرف میری ماں مجھ سے چھینی ہے بلکہ میری زندگی کے آٹھ قیمتی سال بھی برباد کیے ہیں۔ اب میں اس سے اس کی زندگی چھین لوں گا اور بینا سے پوچھوں گا کہ کیا بہنیں ایسی ہوتی ہیں۔ منہ بولے رشتے تو حقیقی رشتوں سے بھی زیادہ نازک اور حساس ہوتے ہیں۔ تم نے اس رشتہ کی قدر ہی نہیں کی۔

☆☆☆

میں جب بینا کے گھر پہنچا تو وہاں کسی اور کے نام کی تختی لگی دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ ان لوگوں سے معلوم کرنے پر پتا چلا کہ غفار صاحب عرصہ ہوا کوٹھی فروخت کر گئے تھے۔ میں نے ان لوگوں کو بہت تلاش کیا مگر ان کا سراغ نہ ملا۔ تھک ہار کر میں خاموش ہوگیا اور اپنے بہن بھائیوں کو ساتھ لے کر گھر آ گیا اور پھر سے سروس کی تلاش شروع کردی۔ بڑی مشکل سے مجھے اسی پرائیویٹ کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ میں نے پھر سے دن رات ایک کر ڈالا اور ایک ایک کر کے تمام بہن بھائیوں کی شادی کر ڈالی۔ سب سے آخر میں، میں نے بھی شادی کرلی اور پرسکون زندگی گزارنے لگا۔ کبھی کبھی بینا بہت یاد آتی تو میں سوچتا کہ ممکن ہے وہ بھی اپنے باپ کے مکروہ اور غلیظ دھندے میں شریک ہو۔ مگر میرا دل یہ کہتا کہ وہ اپنے باپ کی اصلیت نہیں جانتی ہوگی کہ وہ تو اس ملک کا دشمن ہے۔ وہ قاتل ہے میرے جیسے کئی معصوموں کے ارمانوں کا۔۔۔

اس سانحہ کو بیس برس گزر گئے ہیں۔ میری اولاد بھی جوان ہوگئی ہے۔ مگر میں ابھی تک بینا کو نہیں بھول سکا۔ نہ جانے وہ دونوں باپ بیٹی زندہ بھی ہوں گے یا نہیں۔ یقیناً وہ مکافاتِ عمل کی بھینٹ چڑھ گئے ہوں گے۔

ڈبل کراس

نہلے پہ دہلا اور سیر کو سوا سیر ضرور ٹکراتا ہے۔ ایسے ہی دو پیار کرنے والوں کی کہانی جس میں سے ایک سیر تھا تو دوسرا سوا سیر۔

روشن آراء

سسپنس اور حیرت سے بھرپور ایک اچھوتی کہانی

میں اپنے دفتر کے ایک کام سے ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کے لیے صبح دس بجے نکلی تھی۔ جب میں دفتر ایک بجے پہنچی تو اس وقت سارے دفتر میں زبردست سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ پورا اسٹاف ٹولیوں کی صورت میں کھسر پھسر میں مصروف تھا۔ میں حیران تھی کہ آخر کیا بات ہوگئی ہے۔

ہوا یہ تھا دفتر کے کیشیر ارشد کمال جو معمر شخص تھے۔ بارہ بجے ایک لاکھ ساٹھ ہزار روپے بینک میں جمع کرنے کے لیے نکلے تھے کسی نے انہیں لوٹنے کی کوشش کی۔ وہ پارکنگ لاٹ کی طرف جارہے تھے جو دفتر کی عمارت سے چند گز کے فاصلے پر تھا۔ یہ شاہراہ جو درمیان میں تھی وہ بے حد مصروف ترین تھی لیکن اس وقت ٹریفک سڑک پر بہت کم ہوتا تھا کیوں کہ ادھر رہائشی عمارتیں بھی واقع تھیں۔ یہاں صرف دو بلند و بالا عمارتیں تھیں جن میں مختلف کمپنیوں کے دفاتر تھے۔ اس پارکنگ لاٹ پر دفتر کی گاڑیاں کھڑی کی جاتی تھیں۔ جب وہ پارکنگ میں دفتر کی گاڑی کے پاس پہنچے تو ایک بدمعاش نے جو پارکنگ لاٹ میں کسی گاڑی کی آڑ میں کھڑا تھا تیزی سے نکل کر ان کا راستہ روک لیا۔ ایک کھلا ہوا چاقو اس کے ہاتھ میں تڑپ رہا تھا۔ اس نے چاقو ان کے سینے پر رکھا دوسرے ہاتھ سے بریف کیس چھین لیا اس لمحے ان پر خوف سے سکتہ سا چھا گیا۔ وہ نہ تو شور مچا سکے اور نہ ہی انہوں نے مزاحمت کی۔ ڈاکو کے بھاگنے پر انہیں ہوش آیا تو انہوں نے چیخنا چلانا شروع کردیا۔ ان کے چیخنے چلانے پر کچھ لوگوں نے اس بدمعاش کا تعاقب کیا تو وہ بریف کیس پھینک کر بھاگ نکلا۔ ارشد کمال بریف کیس کے ساتھ واپس دفتر پہنچے تو ان کا خوف و دہشت سے برا حال تھا۔ کتنی ہی دیر تک ان کے حواس قابو میں نہیں آئے تھے۔

وہ کوئی پانچ برسوں سے بینک میں دفتر کی رقم جمع کرانے جارہے تھے۔ آج تک ان کے ساتھ ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ شہر میں اس قسم کی وارداتیں آئے دن ہوتی رہتی تھیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں تھی چونکہ ان کے ساتھ پہلی بار یہ واقعہ پیش آیا اس لیے وہ کچھ زیادہ ہی ڈر گئے تھے۔ دوسرے دن سے انہوں نے رقم بینک لے جانے سے انکار کیا تو ان کا تبادلہ کر کے نگہت کو کیشیر بنا دیا گیا۔ اس نے بی کام کیا ہوا تھا۔ اس کا تعلق لاہور سے تھا۔ وہ کراچی آ کر ملازمت کررہی تھی۔ وہ بہت تجربہ کار اور ذہین لڑکی تھی۔

طے یہ ہوا کہ روزانہ نگہت کے ساتھ کوئی لڑکی

بریف کیس لے کر بینک جائے گی البتہ اس کام کے لیے دفتر کی گاڑی استعمال نہیں کی جائے گی۔

جب لڑکیاں ان کے کمرے سے نکل کر اپنی اپنی میزوں پر آئیں تو نسرین نے جسے دفتر میں کام کرتے ہوئے صرف تین مہینے ہو رہے وہ اس سے سرگوشی میں بولی۔

''نگہت تم نے بڑی بھاری ذمے داری قبول کی ہے۔ تمہارے ساتھ بھی ارشد کمال صاحب جیسا واقعہ پیش آسکتا ہے۔''

''جو بھی واقعہ پیش آتا ہے آنے دو۔'' نگہت نے سرگوشی میں آہستگی سے جواب دیا۔ ''میرا کیا جاتا ہے۔ اس میں سراسر کمپنی کا نقصان ہوگا اور پھر یہ عہدہ اور ذمے داری منیجر صاحب نے سونپی ہے۔ میں نے اپنی طرف سے کوئی پیش کش نہیں کی۔''

''تم نے اتنی بڑی ذمے داری قبول کرنے سے انکار کیوں نہیں کر دیا۔'' نسرین بولی۔ ''تم نے دانستہ بہت بڑا خطرہ مول لیا ہے۔''

''اس لیے کہ اس میں ترقی ہوئی ہے اور تنخواہ میں بھی اضافہ ہوا ہے۔'' نگہت نے کہا۔ ''میں اسے کیسے چھوڑ دیتی۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو۔ ہمیں معاشی حالات کے لیے سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔'' نسرین نے ایک سرد آہ بھری۔ ''ہماری ضروریات اور مجبوریاں بھی بہت ہیں۔ پرسوں افروزہ بتا رہی تھی کہ تمہاری شادی کی بات چیت چل رہی ہے۔ اس کا کیا بنا؟''

''چل رہی تھی لیکن اب چل نہیں رہی ہے۔'' نگہت نے افسردگی سے بتایا۔ ''لڑکے والوں نے اور لڑکے نے بھی مجھے پسند کر لیا تھا۔''

''پھر کیا ہوا۔'' نسرین نے دریافت کیا۔ ''جب لڑکے نے بھی پسند کر لیا تو بات آگے کیوں نہیں بڑھی؟''

''اس لیے کہ میرے پاس جہیز جو نہیں ہے۔'' وہ بولی۔

''ایک لڑکی کی شادی کے لیے کم از کم لاکھوں رقم چاہیے۔'' نسرین کہنے لگی۔

''مجھے ہی دیکھ لو۔ ہر مہینے میرے لیے ایک نہ ایک رشتہ آتا رہتا ہے۔ میرے والدین کے پاس چونکہ صرف چالیس ہزار روپے ہیں۔ اس لیے بات چیت ٹوٹ جاتی ہے۔''

دوسرے دن شام کے وقت نگہت دفتر سے نکلی تو آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کسی بھی لمحے برس سکتے ہیں۔ جو بس اسٹاپ اس کے دفتر کے سامنے تھا وہاں سے اس کے روٹ کی بس نہیں جاتی تھی۔ یہاں سے بس میں سوار ہونے کی صورت میں اسے دو بسیں تبدیل کرنا پڑتی تھیں۔ اس کا بس اسٹاپ دفتر سے نصف فرلانگ پر تھا۔ وہ وہاں تک پیدل ہی جاتی تھی۔ اس وقت تمام دفاتر چھوٹ چکے تھے۔ اس لیے مردوں اور لڑکیوں کا ایک سیلاب بس اسٹاپ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اپنے بس اسٹاپ کی طرف بڑھنے لگی۔ ابھی وہ ذرا آگے ہی بڑھی تھی کہ اس نے محسوس کیا کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ اس نے غیر محسوس انداز سے مڑ کر دیکھا تو اس کا خیال درست ثابت ہوا۔ اس سے چند قدم پیچھے ایک شخص کسی انگریزی فلم کے ہیرو کی طرح وجیہہ اور دراز قد اس کے تعاقب میں چلا آرہا تھا۔ اس کا اندازہ یوں درست ثابت ہوا تھا کہ اس شخص کی نگاہیں اس کے سراپا پر جمی ہوئی تھیں۔ اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ اسے درزیدہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ نگہت نے اپنی نظریں پھیر لیں۔ پھر اس نے چند لمحوں کے بعد کسی بہانے سے پلٹ کر دیکھا تو اس نے اپنے آپ کو اس شخص کی نگاہوں کی گرفت میں پایا۔ اس شخص کو اپنی طرف دیکھتے پایا تو نگہت کے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ اسے اس بات پر سخت حیرت ہو رہی تھی کہ اس سڑک پر اور بھی حسین اور جوان لڑکیاں چل رہی تھیں اور ان میں بے پناہ کشش بھی تھی۔ جب کہ وہ ایک سانولے رنگ کی عام سی لڑکی تھی۔

ابھی وہ بس اسٹاپ سے کچھ ہی فاصلے پر تھی کہ

اچانک بادلوں نے اپنا دامن وا کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ اس نے جلدی سے اپنا تھیلیا نما پرس سر پر رکھ کے اِدھر اُدھر دیکھا۔ شاید قریب میں کوئی ریسٹورنٹ یا سائبان ہو۔ قریب میں کوئی ریسٹورنٹ تو نہ تھا البتہ سو ڈیڑھ سو قدم پر کے ایف سی تھا۔ وہاں پہنچتے پہنچتے وہ پوری طرح بھیگ جاتی۔ وہ جائے پناہ ڈھونڈ ہی رہی تھی کہ کسی نے اس پر چھتری کھول دی تھی۔ اس نے چونک کر حیرت سے دیکھا۔ یہ تو وہی شخص تھا جو اس کے تعاقب میں آرہا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے گھبرائی اس نے سوچا کہ وہ چھتری کے نیچے سے نکل جائے مگر پھر بھیگ جانے کے خیال سے رک گئی۔ اس نے نوجوان کا شکریہ ادا کرنے کے بعد سڑک کا جائزہ لیا۔ دور تک کسی گاڑی کا نشان نظر نہیں آرہا تھا۔ یکا یک بارش نے طوفانی صورت اختیار کر لی اور تیز ہوا کے جھکڑ چلنے لگے۔ یہ دیکھ کر وہ پریشان ہوگئی۔ نوجوان بھی اس کی پریشانی کو بھانپ گیا تھا۔

''میرا خیال ہے یہ طوفانی بارش فوری رکنے والی نہیں۔'' وہ بولا۔ ''آیئے سامنے کے ایف سی میں بیٹھتے ہیں۔ بارش تھمے گی تو آپ چلی جایئے گا۔''

نگہت کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ جاگتے میں کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔ اس کے کانو میں ستار کے دل کش سر بج رہے ہوں۔ اس شخص کی آواز میں کوئی سحر تھا۔ وہ اس سحر کی اسیر بنی اس کے ساتھ چل پڑی۔ وہ خواہش کے باوجود بھی کے ایف سی نہیں گئی تھی۔ وہ اس شاہ خرچی کی اس لیے بھی متحمل نہیں ہو سکتی تھی کہ اس کی تنخواہ اس عیاشی کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ اسے اپنی نصف تنخواہ ہر ماہ اپنی ماں کو بھیجنا پڑتی تھی جو لاہور میں اس کے ماموں کے ساتھ رہتی تھی۔ سات ہزار روپے اس ڈربے کے کرائے میں نکل جاتے تھے۔ جسے اس کی مالکن فلیٹ کہتی تھی۔ باقی رقم میں اسے اپنا گزارہ کرنا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی ایک خالہ اس کے گھر کے قریب رہتی تھی۔ وہ بیوہ تھی۔ وہ اسے بھی ہر ماہ ہزار دو ہزار روپے دیتی تھی۔ کیوں کہ وہ اس کے ہاں چھٹی کا دن گزارتی تھی۔ خالہ اس کے لیے کسی اچھے رشتے کے لیے بھی کوشاں رہتی تھی۔

کے ایف سی میں اس نے ہمیشہ رش دیکھا تھا۔ لیکن وہ بارش کی وجہ سے کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ اتفاق سے ایک کونے والی میز جس کے گرد صرف دو کرسیاں تھیں۔ وہ اس پر جا بیٹھے۔ ہوٹل میں بیٹھے ہوئے مرد، لڑکے، لڑکیاں، عورتیں اور جوڑے بارش کا پورا لطف اٹھا رہے تھے۔ لیکن برگر اور چکن کی دوسری ڈشیں، کولڈ ڈرنکس اور چائے کافی بھی چل رہی تھیں۔

وہ شخص میز پر اسے بٹھانے کے بعد اس کے اور اپنے لیے برگر اور چکن لیگ اور کافی لے آیا۔ اس کے اندازے کے مطابق یہ دو تین ہزار روپے کی تھیں۔ وہ یہ سب دیکھ کر ایک دم سے سٹپٹا گئی۔ پھر اس نے کہا۔

''اس تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے نہ تو کچھ کھانا پینا ہے۔ نہ مجھے بھوک لگی ہے جو آپ اتنا کچھ اٹھا لائے۔''

وہ اتنی ساری چیزیں لے آیا تھا۔ وہ نگہت کی بات سن کر بے اختیار مسکرا دیا۔ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

''مجھ ناچیز کی طرف سے ایک انجانے دوست ساتھی کے لیے شام کا ناشتا اور کافی۔۔۔ شام اور بارش کا لطف دوبالا کرنے کے لیے۔''

''مگر مسٹر۔۔۔!'' وہ سر کو جھٹکا دے کر بولی اور اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''میرا نام کامران ہے۔'' وہ اپنا تعارف مسکراتے ہوئے نپے تلے اور متاثر کن لہجے میں کرانے لگا۔ ''دیکھیے آپ مجھے کوئی فلرٹ نہ سمجھیے۔ میں بارش کی وجہ سے آپ کو پریشان دیکھ کر آپ کی مدد کے لیے آگے بڑھا تھا۔ اگر آپ چاہیں تو ہم دوست بن سکتے ہیں ورنہ یہاں سے اٹھ کر ایک دوسرے کو فراموش کر دیں گے۔''

نگہت کا دل انوکھے خیالات سے دھڑکنے لگا۔ آج تک کسی مرد نے اس سے اس انداز میں گفتگو

نہیں کی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کوئی اس جیسی معمولی شکل صورت کی لڑکی کو دوستی کی پیش کش کر سکتا ہے۔ وہ اس وقت خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کر رہی تھی۔

''میں ایک معمولی سی لڑکی ہوں اور آپ ایک صاحب حیثیت آدمی ہیں۔'' نگہت نے سنجیدگی سے کہا۔ ''پھر۔۔۔''

''میں کوئی امیر کبیر آدمی نہیں ہوں۔'' کامران اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''اس بات کا آپ نے کیسے اندازہ کر لیا۔''

''جب آپ کوئی امیر کبیر آدمی نہیں ہیں تو اتنے بڑے ریسٹورنٹ میں مجھے کس لیے لے آئے۔'' وہ بڑی سادگی سے بولی۔

''اوہ، یہ بات ہے۔'' کامران کے لبوں پر ایک دل کش مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''اصل بات یہ ہے کہ میرا ایک دوست ظفر دو برس کے لیے کینیڈا ملازمت کے لیے گیا ہوا ہے۔ اس فلیٹ کو وہ مجھے رہائش کے لیے دے گیا ہے جو کلفٹن میں ہے۔ یہ فلیٹ مفت میں ملنے سے میری ماہانہ تیس ہزار روپے کی بچت ہوگئی۔ اس لیے میں ذرا ہاتھ کھول کر خرچ کرتا ہوں۔''

''میرا نام نگہت ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں ایک تعمیراتی کمپنی میں کیشیر ہوں اور فیڈرل بی ایریا میں رہتی ہوں۔''

اس کے سامنے ٹرے میں برگر اور چکن بروسٹ رکھا ہوا تھا جسے دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر بھر کر آ رہا تھا۔ یوں بھی اس ریسٹورنٹ میں داخل ہوتے وقت اس کی بھوک چمک اٹھی تھی۔ وہ کے ایف سی میں کھانے کے خواب دیکھتی تھی وہ آج پورا ہو گیا تھا۔

ناشتے کے دوران وہ دونوں ایک دوسرے کو اپنے اپنے بارے میں بتاتے رہے۔ نگہت نے اسے اپنی بیمار ماں کے بارے میں بتایا جو لاہور میں رہتی تھی۔ اپنی خالہ اور اپنے بارے میں بھی بتایا۔ کامران نے اسے بتایا کہ وہ ایک پرائیویٹ جاب کرتا ہے، اس کے علاوہ اسے کمیشن وغیرہ بھی مل جاتا ہے جو بیس پچیس ہزار روپے بن جاتے ہیں۔''

بارش پورے دو گھنٹے تک ہوتی رہی تھی۔ اس دوران وہ بڑی حد تک بے تکلف ہو چکے تھے۔ نگہت نے محسوس کیا کہ کامران نے اسے پسند کر لیا ہے۔ وہ نہ صرف اس کے دل میں بلکہ اس کے من میں بھی آ بیٹھا۔

جب وہ گھر پہنچی تو اس پر محبت کا نشہ طاری تھا۔ اس نے سنگھار میز کے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے آپ کو ہر طرح اور ہر زاویے سے تنقیدی نظروں سے دیکھا۔ اس نے کبھی اس انداز سے اپنے آپ کو نہیں دیکھا تھا۔ لیکن آج بات کچھ اور ہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے بدن کے نشیب و فراز میں اتنی دلکشی ہے کہ ایک مرد کو دیوانہ بنا سکتی ہے۔ گو کہ اس کی رنگت اجلی نہیں ہے لیکن اس کی سانولی رنگت میں نمک ہے۔ اس کا بدن بے حد بھرپور ہے۔

اگلے روز وہ دفتر پہنچی تو اسے بس کی وجہ سے دس منٹ کی تاخیر ہو چکی تھی۔ وہ سارا راستہ کامران کے خیالوں میں کھوئی رہی تھی اور دفتر پہنچی تو کامران اس وقت بھی اس کے دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ اسے اس بات کا بالکل بھی خیال نہیں رہا تھا کہ اس کے ذمے آج ایک اہم کام سونپا جا رہا ہے۔ اس نے رقم وصولی کے کمرے میں افروزہ کو دیکھا جو کمپنی کے گاہکوں سے اقساط کی رقمیں وصول کر رہی تھی۔ پھر اسے یک لخت خیال آیا کہ اسے بینک رقم لے کر جانا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اس کا دل بڑے زور سے دھڑک اٹھا تھا۔

ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے منیجر صدیقی صاحب نے اسے اور غزالہ کو کمرے میں بلا کر تجوری میں سے کل کی وصول شدہ رقم نکالی جو تین لاکھ تیس ہزار تھی۔ وہ دو لاکھ نوے ہزار روپے پانچ سو اور ہزار کے نوٹوں میں تھے۔ چھوٹے نوٹ بینک میں جمع نہیں کیے جاتے تھے کیوں کہ دفتر کے اخراجات اور مزدوروں کو

یومیہ اجرت دینے کے لیے روک لیے جاتے تھے۔ جہاں تعمیراتی کام ہو رہا تھا وہاں مزدوروں کو روزانہ اجرت دی جاتی تھی۔ اس نے اور غزالہ نے مل کر نوٹ گنے۔ اس وقت نسرین منیجر صاحب کے لیے چائے لے کر آئی۔ نگہت نے ایک موٹے کاغذ کے بڑے لفافے میں جس پر کمپنی کا نام چھپا ہوا تھا اس میں نوٹوں کی گڈیاں رکھ لیں۔ کل دو گڈیاں تھیں۔ یہ لفافہ بڑی آسانی سے اس تھیلے نما پرس میں آ گیا اور باہر سے لگتا بھی نہیں تھا کہ اس میں نوٹوں کی گڈیاں رکھی ہوئی ہیں۔ صدیقی صاحب یہ دیکھ کر اور بھی خوش ہو گئے تھے۔ انہوں نے اس سے کہا کہ اللہ کا نام لے کر جاؤ۔

وہ ٹھیک بارہ بجے دھڑکتے دل سے دفتر سے نکلی تو میں، نسرین، افروزہ اور غزالہ نے اسے الوداع کہا اور اس کی ڈھارس بندھائی۔ وہ بظاہر بڑی نارمل اور پرسکون سی دفتر سے نکل کر لفٹ کے پاس آئی مگر اس کا دل سینے میں بری طرح دھڑک رہا تھا اور ایک انجانا سا خوف دامن گیر تھا۔ اپنی زندگی میں وہ کبھی اتنی بڑی رقم اپنے پرس میں لے کر نہیں نکلی تھی۔ جس وقت وہ عمارت سے نکل کر بس اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی اس کی طرف دیکھتی ہوئی ہر آنکھ سے اسے خوف سا آ رہا تھا۔ وہ بڑی محتاط اور چوکنا تھی۔ اس نے پرس کندھے سے لٹکا رکھا تھا۔ مگر ایک ہاتھ سے مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ بس اسٹاپ پر پہنچی تو وہ پسینہ پسینہ ہو چکی تھی۔ کل کی بارش سے موسم خوش گوار ہونے کے بجائے اور گرم ہو گیا تھا اور حبس بھی ہو رہا تھا۔ اسے ہر شخص مشکوک سا لگ رہا تھا۔ وہ بس میں سوار ہو کر بینک کے سامنے اتری اور اس نے بینک میں قدم رکھا تو جان میں جان آئی اور اس نے سکون کا گہرا سانس لیا۔ اس کے سارے بدن میں ایک عجیب سی فرحت دوڑ گئی۔ پھر اس نے بینک سے صدیقی صاحب کو فون کر کے اپنے خیریت سے پہنچنے کی اطلاع دے دی۔

جب وہ واپس دفتر پہنچی تو نہ صرف منیجر صدیقی صاحب بہت خوش تھے بلکہ وہ بھی، جیسے وہ کوئی معرکہ سر کر کے آئی ہو۔ صدیقی صاحب کے خیال میں یہ تجربہ بہت کامیاب رہا تھا اور کوئی بدمعاش یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک لڑکی اپنے پرس میں اتنی بڑی رقم بینک میں جمع کرانے لے جا سکتی ہے۔ نگہت کا حوصلہ بھی بہت بڑھ گیا تھا۔ اس نے لنچ میں مجھ سے اور نسرین سے بڑے غرور سے کہا تھا کہ وہ دس لاکھ کی رقم بھی لے جا سکتی ہے۔ اس کی بات سن کر نسرین مسکرا دی تھی اور میں خاموش رہ گئی تھی۔

شام میں جب وہ ڈیوٹی آف کر کے دفتر کی عمارت سے باہر آئی تو اس نے کامران کو بے چینی سے منتظر پایا۔ اس نے کامران کی آنکھوں میں محبت کا والہانہ انداز دیکھا تو وہ کسی نئی نویلی دلہن کی طرح شرما کر رہ گئی۔ کامران نے ایک انگریزی فلم ٹائی ٹینک کی دو ٹکٹیں بک کی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں سیدھے سنیما ہال پہنچے تو فلم کا وقت ہو رہا تھا۔ وہ انگریزی فلمیں نہیں دیکھتی تھی۔ اس نے اس فلم کی بہت تعریف سنی تھی۔ اب اس فلم کی ایک لمبے عرصے کے بعد دوبارہ نمائش ہو رہی تھی۔ فلم دیکھتے ہوئے ایک بے حد جذباتی رومانوی منظر آیا تو کامران نے اس کے ہاتھ کی پشت پر اپنا ہاتھ رکھا تو اس کی نس نس میں ایک انوکھی اور لطیف لہر دوڑ گئی اور سارے بدن میں خون رقص کرنے لگا۔ اس نے بھی کامران کا ہاتھ بے خودی سے تھام لیا۔ جب وہ دونوں سنیما ہال سے نکلے تو ان کی محبت بھری کہانی کا آغاز ہو چکا تھا۔ کامران نے ایک قریبی باربی کیو میں لے جا کر نہ صرف چکن، تکے کھلائے بلکہ اس سے محبت بھری باتیں بھی کیں اور اس کے حسن و جمال کی تعریفیں بھی کرتا رہا تھا۔

چار دن اور بیت گئے۔ نگہت رقم جمع کرانے کے لیے بینک برابر جاتی رہی تھی۔ اسے کوئی حادثہ پیش نہیں آیا تھا۔ ان چار دنوں میں اس کی ملاقات کامران سے دو مرتبہ ہوئی تھی۔ وہ دونوں فلم دیکھنے کے بجائے سفاری پارک اور ساحل سمندر کی سیر و تفریح کرتے رہے تھے۔ جمعے والے دن کامران

نے ہفتہ کے روز فلم اور ڈنر کا پروگرام بنایا۔ فلم دکھانے کے بعد اسے فلیٹ لے جا کر دکھایا جو اس کے دوست کا تھا۔

کامران نے اس سے دریافت کیا۔ ''تم مجھے اپنی خالہ جان سے ملوانے کب لے جاؤ گی؟''

''تم خالہ سے کس لیے ملنا چاہتے ہو؟'' نگہت نے انجان بن کر پوچھا۔

''اس لیے کہ ان سے تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مانگ لوں۔'' کامران نے جواب دیا۔ ''میں ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ اب میں تمہارے بغیر ایک دن بھی نہیں رہ سکتا۔ معلوم نہیں تم نے مجھ پر کیا جادو کر دیا۔ ساری رات تمہارا خواب دیکھتا رہتا ہوں۔''

''میرے ڈربے نما کمرے کے در و دیوار بھی مجھے کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔'' وہ بھی دل کی بات زبان پر لے آئی۔ تمہارا خیال مجھے سونے نہیں دیتا ہے۔ میں انگاروں پر لوٹتی رہتی ہوں۔ تم آئندہ اتوار کو چل کر میری خالہ سے مل لینا۔

''میں یہ چاہتا ہوں کہ پہلے کوئی فلیٹ کرائے پر لے لوں پھر اس کے بعد تمہاری خالہ سے ملنے چلوں۔'' کامران نے کہا۔

''کیا تم اپنے دوست جیسا لگژری فلیٹ کرائے پر لو گے؟'' نگہت نے تجسس بھرے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں۔'' کامران نے سر ہلایا۔ ''ایسے فلیٹ کا کرایہ دس ہزار روپے ہوتا ہے۔ میں کہاں ایسا فلیٹ لے سکتا ہوں۔ سچ پوچھو تو میں یہ چاہتا ہوں کہ سنگاپور جا کر زندگی گزاروں۔ ہم دونوں وہاں جا کر ملازمت کر کے زندگی گزاریں۔ میں نے سنا ہے کہ سنگاپور جتنا خوب صورت ہے وہاں کی زندگی بھی اتنی ہی خوب صورت ہے۔''

''میں تمہارے ساتھ وہاں جا کر رہنے کے لیے تیار ہوں۔'' وہ بولی۔ ''میں نے بھی سنگاپور کی بہت تعریف سنی ہے۔''

''میری ہونے والی بیگم صاحبہ! وہاں جا کر رہنے کے لیے کم از کم تین لاکھ کی رقم چاہیے۔''

کامران نے کہا۔

''تین لاکھ روپے کس لیے؟'' نگہت نے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس لیے کہ ہوائی جہاز کے ٹکٹ کے لیے رقم چاہیے۔'' کامران بتانے لگا۔ ''چونکہ ہمیں وہاں مستقل رہنا ہے اس لیے ملازمت ملنے تک۔ نوکری فوراً نہیں مل جائے گی۔ اس کے لیے دو ایک مہینے دوڑ دھوپ تو کرنا ہوگی۔''

''ہم تین لاکھ روپے کہاں سے لائیں گے؟'' نگہت کا دل اور چہرہ بجھ گیا۔ ''میرے پاس تو تین ہزار روپے بھی نہیں۔''

ہفتہ کے روز بھی وہ حسب معمول دفتر کی رقم بینک میں جمع کرانے کے لیے نکلی۔ بس میں سوار ہوئی۔ دفعتاً اس کے ذہن میں ایک خیال آیا کہ وہ جو رقم لے جا رہی ہے اگر یہ رقم ہاتھ لگ جائے تو گیارہ تاریخ کو تین سے چار لاکھ روپے کی رقم بھی ہاتھ لگ سکتی ہے۔ کیوں نہ وہ صبر اور انتظار کرے۔ گیارہ تاریخ کو بڑی رقم پر ہاتھ مارا جائے۔ پھر اس رقم سے سنگاپور جایا جا سکتا ہے۔ رقم اڑانے کا صرف ایک بار ہی موقع ملے گا۔ کیوں نہ اونچا ہاتھ مارا جائے۔ ایسا موقع پھر کہاں ملے گا۔

مگر یہ تو چوری ہوئی۔ اس کے اندر کی نگہت بولی تو وہ اسے سمجھانے لگی۔ اس کمپنی نے اسے چار برسوں میں کیا دیا۔ اس کی کیا اسٹاف میں سے کسی کی تنخواہ بڑھائی نہیں گئی۔ جب بھی تنخواہ بڑھانے کا مطالبہ کیا گیا کمپنی نے ایک سو ایک عذر پیش کیے کہ ملک اور کاروبار کے حالات اچھے نہیں ہیں۔ افراط زر کی شرح میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اس نے آمدنی کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ کمپنی زبردست خسارے میں جا رہی ہے وغیرہ وغیرہ۔

ہفتہ کی شام وہ کامران کے ساتھ ایک نئی انگریزی فلم دیکھنے چلی گئی۔ ان دونوں نے ہوٹل میں کھانا کھایا اور کامران کے ساتھ ہی فلیٹ پر چلی گئی۔ اس کا ارادہ رات رکنے اور کمپنی کی رقم اڑانے کا

منصوبہ بنانے کا تھا۔ جب اس نے سنگاپور کو گفتگو کا موضوع بنایا تو کامران نے بڑی بے پروائی سے کہا۔

''نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔ ہمارے پاس تین لاکھ روپے ہوں گے اور نہ ہم سنگاپور جائیں گے۔ لہٰذا تم وہاں کے حسین خواب دیکھنا چھوڑ دو۔''

''اگر تم ہمت اور حوصلہ کرو تو ہمارے پاس تین چار لاکھ کی رقم آسکتی ہے۔'' نگہت اس کی آنکھوں میں جھانکتی ہوئی بولی۔

''وہ کیسے؟'' کامران اس کے چہرے کو نظروں کی گرفت میں لیتا ہوا بولا۔

''وہ ایسے۔۔۔'' نگہت نے ہنس کر کہا اور اسے اپنا منصوبہ بتایا۔ ''یہ کیسا منصوبہ ہے۔ ہے نا شان دار۔ زوردار۔۔۔''

''یہ کام اتنا آسان نہیں جیسا تم سوچ رہی ہو۔'' کامران نے کہا۔ ''اس میں خطرہ ہے۔ اگر میں پکڑا گیا تو میں جیل کی ہوا کھا رہا ہوں گا اور تم میرے لیے بے آب ماہی کی طرح تڑپ رہی ہوگی۔''

''کام ایسا کچھ مشکل نہیں۔'' نگہت بولی۔ ''تم مرد ہو کر بزدلی کی باتیں کر رہے ہو۔''

''آخر تم اتنا بڑا خطرہ کس لیے مول لینا چاہتی ہو۔'' کامران نے حیرت سے کہا۔

''ایک حسین اور خواب ناک زندگی گزارنے کے لیے۔'' نگہت نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ ''میں چاہتی ہوں کہ سنگاپور میں رہ کر وہاں کے ماحول اور آسائشوں سے محفوظ ہوں۔ وہاں جیسی زندگی یہاں بالکل نہیں ہے۔''

''میں خود اس شہر اور یہاں کی زندگی سے عاجز اور بے زار آچکا ہوں۔ کاش ایسا ہوسکتا۔''

نگہت نے اسے تفصیل سے بتایا کہ اسے کیا کرنا ہوگا۔ کامران کو کلوروفام میں بھیگا ہوا رومال ساتھ رکھنا تھا۔ نگہت نے اسے بتایا تھا کہ اس کا دفتر عمارت کی نویں منزل پر واقع ہے۔ وہ ٹھیک بارہ بجے اس لفٹ سے نیچے جاتی ہے، جو صرف ڈائریکٹروں کے لیے مخصوص ہے۔ وہ آٹھویں منزل سے اس لفٹ پر سوار ہوجائے۔ اسے کلوروفام والا رومال سونگھا کر بے ہوش کردے۔ اس کے بے ہوش ہوتے ہی اس کے پرس سے نوٹوں والا لفافہ نکال لے اور پانچویں منزل پر اتر کے وہ عقبی حصے کی طرف چلا جائے۔ وہاں جو لفٹ ہوگی اس سے نیچے جاکر سیدھے گھر چلا جائے۔ پھر وہ شام کے وقت اس کے فلیٹ پہنچ جائے گی۔ یہ ایک سیدھا سادا اور آسان منصوبہ ہے۔

بدھ کے روز اس منصوبے پر بڑی خوش اسلوبی سے عمل کیا گیا تھا۔ مجھے بھی اس کا بنایا ہوا منصوبہ بے حد سیدھا سادا اور بے عیب لگا تھا۔ کامران نے اسے دبوچ کر کلوروفام والا رومال سونگھا کر بے ہوش کردیا اور اس کے پرس میں سے وہ لفافہ نکال لیا۔ جس میں ایک لاکھ اسی ہزار کی رقم تھی۔ وہ لفافہ لے کر پانچویں منزل پر اتر گیا اور پھر وہ عقبی حصے کی طرف چلا گیا۔ پھر عقبی حصے کی لفٹ سے نیچے آگیا۔

جب نگہت کو ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو منیجر صدیقی صاحب کے کمرے میں ایک کوچ پر لیٹا پایا۔ کمرے میں صدیقی صاحب، جنرل منیجر کے علاوہ سب انسپکٹر اور اس کا ایک ماتحت بھی موجود تھا۔ سب انسپکٹر نے اسے کوئی ایک گھنٹے تک اپنے فضول سوالات سے پریشان کیا اور اسے شاید اور پریشان کرتا اگر حوالدار آکر اسے یہ نہ بتاتا کہ عقبی حصے کے لفٹ مین نے پانچویں منزل سے لفٹ میں ایک دراز قد اور باریش جوان آدمی کو ایک پھولے ہوئے لفافے کے ساتھ گراؤنڈ فلور پر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

نگہت دل میں بہت مسرور تھی کہ اس کا منصوبہ بے حد کامیاب رہا۔ کامران بڑے سکون و اطمینان سے لفافہ لے جانے میں کامیاب ہوگیا۔ جس وقت وہ منیجر کے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگی تو صدیقی صاحب نے اس کا پرس اس کی طرف بڑھا دیا۔ جب وہ اپنے کیبن میں پہنچی تو نسرین اپنی میز پر نہیں تھی۔ وہ ڈائریکٹر خٹک صاحب

کے کمرے میں شاید کوئی فائل لے کر گئی ہوئی تھی۔

نگہت کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اپنی اس کامیابی کی خوشی میں ناچنے لگے، قہقہے لگائے، کیوں کہ اس لیے بھی اسے بے انتہا خوشی ہو رہی تھی کہ اس نے اپنی کمپنی سے تنخواہ نہ بڑھانے کا انتقام بمعہ سود لے لیا تھا۔

دفتر کی چھٹی سے ذرا دیر پہلے نسرین میک اپ کرنے کے لیے پاؤڈر روم گئی تو اس نے برق سرعت سے اپنی میز کی دراز سے لفافہ نکال کر اپنے پرس میں رکھ لیا۔ اس لفافے میں ایک لاکھ اسی ہزار کی رقم تھی۔ کامران جو لفافہ لے گیا تھا اس میں وہ جعلی نوٹ تھے جو بچے کھیلنے کے لیے خریدتے ہیں وہ چشم تصور میں کامران کا چہرہ دیکھ رہی تھی جو غصے سے سرخ ہو رہا تھا اور اس کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔

اس نے گھر پہنچ کر لفافہ ایسی جگہ چھپا دیا کہ اس کے سوا اسے کوئی بھی وہاں سے نکال نہیں سکتا تھا اور نہ ہی کسی کا خیال جا سکتا تھا۔ پھر وہ اپنے گھر سے سیدھی کامران کے فلیٹ پر پہنچی۔ کامران اسے دیکھتے ہی برس پڑا۔

''آخر مجھے بے وقوف بنانے اور یہ ڈراما رچانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس ڈرامے کے پیچھے نہ صرف وقت خراب ہوا بلکہ ہاتھ بھی کچھ نہیں لگا۔'' اس نے غصے میں آ کر جعلی نوٹوں کی گڈیاں لفافے سے نکال کر فرش پر پھینک دیں۔

''ہاتھ کچھ کیوں نہیں لگا۔'' وہ دل کش انداز سے مسکرائی۔ ''ایک لاکھ اسی ہزار روپے نقد ملے ہیں۔''

''کیا مطلب۔'' وہ حیرت سے اچھل پڑا۔

''مطلب یہ ہے کہ اصلی لفافہ میں نے اپنی میز کی دراز میں رکھ لیا تھا۔'' نگہت نے چمک کر کہا۔

''تم نے ایسا کیوں اور کس لیے کیا تھا۔'' کامران کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

''تمہیں بچانے کے لیے۔'' نگہت کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔ ''کیونکہ بہت خطرہ تھا۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' اس نے نگہت کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے لیا۔

''اگر تم کسی وجہ سے پکڑے جاتے تو پھر یہ رقم ہمارے ہاتھ نہیں لگتی۔'' نگہت نے بتایا۔

''تم جتنی حسین ہو اتنی ہی ذہین اور تیز بھی ہو۔'' وہ نگہت کی ذہانت پر حیران ہوا تھا۔ ''ویسے تم ذہین اور تیز دکھائی نہیں دیتی ہو اور ہاں تم نے رقم تو اپنے پاس ہی حفاظت سے رکھی ہے نا کسی اور کے پاس تو نہیں رکھوائی۔'' کامران نے پوچھا۔

''اس رقم کو میں نے بڑی حفاظت سے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔'' نگہت نے جواب دیا۔ ''تم اس کی فکر نہ کرو۔ سنگاپور جانے کی تیاریاں شروع کر دو۔''

''ایک لاکھ اسی ہزار روپے سے کیا ہوگا میری جان۔'' وہ اس کے چہرے پر جھکنے لگا۔ ''دو لاکھ روپے اور بھی چاہئیں۔''

''وہ بھی ہو جائیں گے۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔'' وہ فاتحانہ انداز سے مسکرائی ''میں اب۔۔۔'' کامران کے ہونٹوں نے اس کے ہونٹوں کو بولنے نہیں دیا۔

دوسرے دن رقم لے جانے کی ذمے داری نسرین اور غزالہ کو سونپی گئی۔ صدیقی صاحب رقم کے ساتھ نگہت کے کیبن میں آئے تھے۔ ان تینوں نے مل کر رقم گنی جو ایک لاکھ ساٹھ ہزار تھی۔ نسرین نے اپنے ہاتھوں سے نوٹوں کی گڈیاں ایک بڑے لفافے میں رکھیں اور اس کا منہ بند کر کے اس پر ٹیپ چپکا دیا اور اس لفافے کو شاپنگ بیگ میں رکھ لیا جو گہرے رنگ کا تھا۔ باہر سے دیکھنے سے پتا نہیں چلتا تھا کہ اس بیگ میں کیا ہے۔ ایسے شاپنگ بیگ عام طور پر سبزی، ترکاری، پرچون کا سامان اور کپڑے رکھنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ غزالہ اپنا پرس لینے چلی گئی اور نسرین اپنا میک اپ درست کرنے پاؤڈر روم۔۔۔ وہ کیبن میں اسے چھوڑ گئی تھی۔

غزالہ اور نسرین کو بینک رقم لے جانے کا جو کام سونپا گیا تو اسے یوں لگا جیسے اسے اوپر سے نیچے

پھینک دیا گیا ہو۔ ایک طرح سے مزید رقم کے حصول کا منصوبہ خاک میں مل کر رہ گیا تھا۔ گیارہ تاریخ آنے میں ابھی چار دن باقی تھے۔ اسے ان چار دنوں میں کچھ نہ کچھ کرنا ہی تھا۔ وہ گہرے صدمے سے سوچ رہی تھی کہ اگر اس تاریخ تک لاکھوں کی رقم حاصل نہیں ہوئی تو اسے مزید ایک مہینہ انتظار کرنا ہوگا۔ نسرین اپنے میک اپ کا جائزہ لے کر آئی اور کیبن سے بیگ اٹھا کر نکل گئی۔ غزالہ اس کے انتظار میں باہر کھڑی تھی۔

ہفتے کے روز تک وہ رات دن سے تدبیریں سوچتی چلی آرہی تھی۔ کامران کے ذہن میں کوئی منصوبہ نہیں آسکا تھا۔ وہ نسرین کے ہاتھ سے شاپنگ بیگ چھین کر بھاگنے کا کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔ ہفتہ کے روز نسرین رقم کو لفافے میں اور لفافہ اپنے پرس میں رکھ کے پوڈر روم چلی گئی۔ اس کا چار دنوں سے یہی معمول بن گیا تھا۔ اچانک نگہت کے ذہن میں ایک تدبیر آئی تو وہ اچھل پڑی۔ اس نے اپنی اس تدبیر کے بارے میں کامران کو بالکل بھی نہیں بتایا تھا۔ وہ اسے سرپرائز دینا چاہتی تھی۔ پیر کے روز گیارہ تاریخ تھی۔ اس روز تین سے چار لاکھ کی رقم بھی ہوسکتی تھی۔ وہ اپنی اس تدبیر سے اتنی خوش اور اس میں ایسی کھوئی ہوئی تھی کہ اس نے اپنے آپ کو کامران کے ساتھ سنگاپور میں سیر و تفریح اور ہنی مون مناتے ہوئے محسوس کیا۔

پیر کے روز وہ اپنے کیبن میں پہنچی تو اپنی تدبیر پر عمل کرنے کے خیال سے اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ نسرین ڈائریکٹر خٹک کے کمرے میں فائل لے کر گئی ہوئی تھی۔ اس ڈائریکٹر کی رنگین مزاجی کے بارے میں وہ جان چکی تھی۔ وہ نسرین کو کسی نہ کسی بہانے سے زیادہ دیر تک روک لیتا تھا۔ اسے چائے کافی بھی پلاتا تھا۔ نسرین جتنی حسین تھی اتنی ہی پرکشش بھی۔ اسے باتیں کرنے اور لبھانے کا فن بھی خوب آتا تھا۔ وہ جب بھی خٹک کے کمرے سے آتی تھی تو اس کا چہرہ اور لباس ساری کہانی سنا دیتا تھا۔

نسرین کے واپس آنے تک وہ اپنے آپ پر قابو پا چکی تھی اور نارمل انداز سے اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

ٹھیک سوا گیارہ بجے صدیقی صاحب اور غزالہ اس کے کمرے میں رقم لے کر داخل ہوئے۔ رقم تین لاکھ چالیس ہزار تھی۔ ان تینوں نے مل کر جلدی سے اس رقم کی گنتی کی۔ پھر اس رقم کو تین لفافوں میں رکھا گیا۔ حسب معمول غزالہ کمرے سے نکلی تو نسرین بھی اس کے پیچھے پوڈر روم چلی گئی تو وہ تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھی۔ اس نے شاپنگ بیگ سے لفافہ نکال کر الماری کے نیچے اس طرح سے چھپا دیا کہ اس پر کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔ پھر اس نے اپنی میز کی دراز سے وہ پھولا ہوا لفافہ نکال کر شاپنگ بیگ میں رکھ دیا جو وہ اپنے پرس میں رکھ کر لائی تھی۔ نسرین کے پوڈر روم سے آکر شاپنگ بیگ اٹھا کر لے جانے تک اس کا دل سینے میں کسی زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑاتا رہا تھا۔ اس نے اپنے اعصاب کو پرسکون بنانے کے لیے تین گلاس ٹھنڈا پانی پیا۔

نگہت نے یہ منصوبہ بناتے ہوئے تمام پہلوؤں پر سوچ لیا تھا جاسوسی کہانیوں نے اس کا ذہن مجرمانہ بنا دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ بینک پہنچ کر راز افشا ہونے پر اس پر کوئی آنچ نہیں آسکتی تھی۔ کیوں کہ غزالہ اور نسرین مورد الزام ٹھہرتی تھیں اور ان کی کسی بات کا پولیس یقین نہیں کرتی۔ اگر اس سے بھی پوچھ گچھ کی جاتی اس کے پرس اور اور میز کی تلاشی لی جاتی تو ان کے ہاتھ کچھ نہیں لگتا۔ کیبن اور الماریوں کی بھی تلاشی لینے سے وہاں سے بھی کچھ نکلنے سے رہا۔ الماری کے نیچے جو جگہ تھی وہاں کسی کا خیال نہیں جاسکتا تھا۔ بالفرض محال وہاں سے لفافہ برآمد ہو جاتا تو نسرین ہی پھنستی کیوں کہ الماری اس کی کرسی کی پشت پر تھی۔

بارہ بج کر تیس منٹ پر دفتر میں ایک بھونچال سا آ گیا۔ بینک منیجر نے ٹیلی فون پر دفتر کو اطلاع دی تھی کہ ایک دراز قد اور باریش شخص نسرین کو بینک کے

باہر ریوالور دکھا کر اس کے ہاتھ سے شاپنگ بیگ چھین کر فرار ہوگیا۔ یہ سب کچھ اس تیزی سے ہوا کہ راہ گیر کچھ نہیں سمجھ سکے۔ بینک منیجر نے صدیقی صاحب کو خود بینک بلالیا تھا۔

یہ خبر سنتے ہی نگہت کے اعصاب پھول کی طرح ہلکے ہوگئے۔ اس نے خواب وخیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ نسرین کے ساتھ بھی ڈکیتی کا واقعہ پیش آسکتا ہے۔ وہ دل میں جتنی خوش تھی اس سے کہیں زیادہ حیران بھی ہورہی تھی۔ آج اس اتفاق نے اس کی ایک بہت بڑی مشکل حل کردی تھی۔ اب وہ بڑے اطمینان سے لفافہ اپنے پرس میں رکھ کر لے جاسکتی تھی۔ اسے کسی بات کا خوف وخدشہ نہیں رہا تھا۔

دفتر میں اس سنسنی خیز واقعے سے ایک ہیجان خیز سنسنی پھیل گئی تھی۔ اس ڈکیتی کے بارے میں قیاس آرائیاں ہورہی تھیں۔ اس شخص کا جو حلیہ بتایا گیا تھا اس سے بہت ملتا جلتا تھا جس نے نگہت کو رومال سونگھا کر بے ہوش کیا تھا اور نوٹوں کا لفافہ لے گیا تھا۔ نگہت کے دل کے کسی کونے میں یہ خیال آیا کہ کہیں وہ کامران تو نہیں تھا۔ کہیں اس نے نسرین کے ہاتھ سے شاپنگ بیگ تو نہیں چھینا۔ اس کے خیال میں اس کا کامران ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا۔ وہ دن دہاڑے ایک گنجان علاقے میں ڈکیتی کی واردات نہیں کرسکتا تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ نسرین کے ہاتھ سے شاپنگ بیگ چھیننے والے شخص کی شکل کامران سے ملتی تھی۔

کوئی دو بجے نسرین اور غزالہ آئی تھیں۔ قانونی کارروائی کی وجہ سے ان دونوں کو بینک میں زیادہ دیر رکنا پڑا تھا۔ نسرین اتنی خوف زدہ اور ہراساں نہیں تھیں جتنی غزالہ ہورہی تھی۔ وہ دونوں جلد ہی دفتر سے چھٹی لے کر چلی گئی تھیں۔ نسرین کا چھٹی لے کر جانا اس کے حق میں زیادہ بہتر ہوا تھا۔ اس نے چھٹی کے وقت بڑے اطمینان سے رقم کا لفافہ الماری کے نیچے سے نکال کر اپنے پرس میں رکھ لیا تھا۔

جب اس نے گھر پہنچ کر لفافے میں سے پانچ سو اور ہزار کے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر دیکھیں تو اسے لگا کہ گڈیاں اسے مسکرا کر دیکھ رہی ہیں۔ یہ رقم نہیں اس کے سہانے خواب تھے۔ اب سنگاپور لب بام پر رہ گیا تھا۔ وہ تھی اس کی محبت تھی۔ اس کا محبوب تھا اور اس کی مسرت بھری زندگی۔ اس نے یہ سب کچھ صرف اور صرف کامران کو پانے کے لیے کیا تھا۔ وہ اپنے محبوب کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتی تھی۔

وہ کامران کے فلیٹ پر پہنچی تو کامران موجود نہیں تھا۔ کامران نے اسے ایک ڈپلی کیٹ چابی دے رکھی تھی۔ کچھ دیر بعد کامران آیا تو وہ بہت زیادہ پریشان تھا۔ جب اس نے کامران سے اس کی وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگا۔ ''مصیبت جب آتی ہے تو چاروں طرف سے آتی ہے۔ ٹریولنگ ایجنسی خسارے کی وجہ سے بند کردی گئی ہے اور پھر اس کا دوست کینیڈا سے ایک ہفتے کے بعد آرہا ہے اور اس کے ساتھ میں اس کی غیر ملکی بیوی بھی ہے۔ اسے اس کے آنے سے دو دن پہلے فلیٹ خالی کرنا ہوگا۔''

''اس میں اس قدر پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔'' وہ چہکتی ہوئی اس کے قریب ہونے لگی۔

کامران کا موڈ سخت آف تھا۔ ''تمہارے نزدیک پریشانی کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ میں اب کہاں رہوں گا۔ چار پانچ دنوں میں فلیٹ کرائے پر کہاں ملے گا پھر اس کے لیے ڈپازٹ کی رقم پچیس تیس ہزار روپے کہاں سے لاؤں گا اور پھر گزر بسر کیسے ہوگی۔ کیوں کہ مجھے نوکری سے نکال دیا گیا ہے اور تم سے بے کاری کی حالت میں شادی کیسے کرسکتا ہوں۔''

''جو ہوا وہ بہت اچھا ہی ہوا۔'' وہ اس کے گلے میں بانہیں حمائل کرکے شوق سے بولی۔

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔'' کامران بگڑ گیا۔ ''مجھ پر مصیبت آن پڑی ہے تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔''

''چار پانچ دن کے بعد ہم دونوں سنگاپور میں ہوں گے۔'' نگہت اس کی طرف تیکھی نظروں سے

دیکھنے لگی۔ ''وہاں جا کر شادی کر کے نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔''

''لگتا ہے کہ تم پاگل ہوگئی ہو۔ ایک لاکھ اسی ہزار کی رقم ہمارے پاس کیا آ گئی ہے تم اونچے اونچے خواب دیکھنے لگی ہو۔'' کامران نے تلخی سے کہا۔

''اب میرے پاس پانچ لاکھ کی رقم موجود ہے۔'' وہ سینہ پھلا کر بولی۔ ''اب تو ہم سنگاپور جا سکتے ہیں نا۔''

''اتنی بڑی رقم تمہارے پاس کہاں سے آ گئی۔'' کامران کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''تم مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہی ہو۔'' نگہت نے اسے قدرے تفصیل سے سارا واقعہ سنایا۔ ''اب تمہیں یقین آ گیا۔''

''اوہ تم نے تو کمال کر دیا۔ میری جان۔'' کامران نے خوشی سے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ کل سے ہم سنگاپور جانے کی تیاری شروع کر دیں گے۔ ہمیں سب سے پہلے اس رقم میں سے ہوائی جہاز کے ٹکٹ کے پیسے نکال کر باقی رقم کو ڈالر میں تبدیل کرانا ہوں گے۔ تم ایسا کرو کل شام کے وقت اپنا پاسپورٹ اور ساری رقم لے کر آ جاؤ۔ میں وہ ایک آدمیوں سے بات کرتا ہوں۔ وہ غیر ملکی کرنسی کا کاروبار کرتے ہیں۔''

نگہت رات دس بجے تک فلیٹ میں رہی تھی۔ وہ دونوں جشن بھی مناتے رہے اور سنگاپور جانے اور خریداری کا پروگرام بھی ترتیب دیتے رہے تھے۔ گھر آ کر اس نے سوچا کہ ماں کو اس رقم میں سے پچیس ہزار اور اپنی خالہ کو دس پندرہ ہزار دے دے گی۔ وہ سنگاپور جا کر ماں کو ہر ماہ کچھ نہ کچھ رقم بھیجتی رہے گی۔ وہ سنگاپور جانے سے دو ایک دن پہلے ہوائی جہاز سے صبح لاہور جا کر اسے رقم دے کر شام کی فلائٹ سے واپس آ جائے گی۔ انہیں لاہور روانگی اور واپسی کے بارے میں کامران کو بھی نہیں بتائے گی۔ روانگی سے ایک دن قبل وہ دفتر جا کر اپنا استعفا پیش کر دے گی اور اس کی وجہ یہ بتائے گی کہ لاہور میں اس کی شادی طے ہوگئی ہے۔

صبح وہ نیند سے بے دار ہوئی تو اس پر ایک نشہ سا چھایا ہوا تھا اور کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ اس کا دل دفتر کو جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے کچھ دیر بعد دفتر ٹیلی فون کیا تو پتا چلا کہ نسرین اور غزالہ بھی آج دفتر نہیں آئی ہیں۔ اس نے صدیقی صاحب سے فون پر کہہ دیا کہ اس کی ماں کی طبیعت اچانک خراب ہوجانے کی اطلاع آئی ہے وہ آج لاہور جا رہی ہے۔

اس نے پچاس ہزار کی رقم گھر میں چھپا کر رکھ دی۔ پھر وہ ساری رقم پرس میں لے کر کامران کے فلیٹ پر پہنچی تو دن کا ایک بج رہا تھا۔ کامران فلیٹ میں نہیں تھا۔ اس نے رقم کے لفافے کامران کے بیڈ روم میں رکھ دیے۔ اس نے کامران سے کہا تھا کہ وہ دفتر سے واپسی پر رقم لے کر آئے گی۔ لیکن وہ اس لیے جلدی آ گئی تھی کہ اس کا دل گھر میں نہیں لگ رہا تھا۔ کامران کے ساتھ رات جو جشن منایا تھا وہ پھر سے اس جشن کی یاد تازہ کرنا چاہتی تھی۔

نگہت نے سوچا کہ کامران کے آنے تک سو لینا چاہیے۔ اس خیال سے وہ بیڈ روم میں آئی اور غیر ارادی طور پر کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر جھانکنے لگی۔ پھر اس پر جیسے کوئی بجلی سی آ گری۔

پھر اس نے نسرین کو دیکھا جو کامران کے ساتھ قہقہے لگاتی ہوئی ٹیکسی سے اتر رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے اس کے سارے بدن کا خون برف ہو کر رہ گیا۔ اس کا دماغ ایک دم بھک سے اڑ گیا تھا۔ دوسرے لمحے وہ جیسے کسی بھیانک خواب سے چونکی۔ وہ اپنا پرس لے کر دوسرے بیڈ روم میں آ گئی۔ اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ لفافے الماری میں سے نکالے۔ اس نے کمرے کا دروازہ اتنا کھلا رکھا تھا کہ اس میں ایک جھری سی بن گئی تھی۔ اس کمرے میں پردے کھڑکیوں پر کھینچے ہونے کی وجہ سے اندھیرا ہوگیا تھا۔ وہ اندھیرے میں کھڑی تھی۔ باہر سے اسے کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا۔ نگہت کا نہ صرف دماغ بلکہ پورا بدن بھی سنسنا رہا تھا۔ جیسے اسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ وہ دونوں بیڈ روم میں داخل ہو چکے تھے۔ انہوں نے

پردے کھینچ کر روشنی کردی گئی۔ لاؤنج میں اندھیرا سا تھا اس کی نس نس میں بجلی کی رو کی طرح سنسناہٹ اتر رہی تھی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔

ان دونوں کے باتیں کرنے کی آوازیں اسے صاف سنائی دے رہی تھی۔ کامران تمسخرانہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ''کلو اپنے آپ کو بہت حسین، بے حد ذہین اور نجانے کیا کچھ سمجھتی ہے۔ میں نے بھی اسے محبت کے جال میں پھنسا کر ایسا بے وقوف بنایا ہے کہ وہ ساری زندگی یاد کرے گی۔ کیوں؟ میرا منصوبہ کیسا رہا۔ وہ کس بری طرح پھنس گئی۔''

''بے حد شان دار۔'' نسرین نے جواب دیا۔ ''مگر وہ حرافہ بھی کم نہیں ہے۔ دیکھو تو سہی اس نے کس ہوشیاری سے دفتر سے لفافے تبدیل کردیے۔ تم نے اپنی جان پر کھیل کر میرے ہاتھ سے شاپنگ بیگ چھین لیا اور مجھ پر شک کرنے لگے کہ میں نے تمہیں ڈبل کراس کیا ہے۔ اب تمہیں میری بات کا یقین آیا کہ یہ ساری کارستانی اس چڑیل کی تھی۔''

''اب میں بھی اسے ڈبل کراس کروں گا۔'' کامران استہزائی لہجے میں بولا۔ ''وہ مجھ پر اس قدر مہربان ہوچکی ہے کہ آسانی سے بے وقوف بن جائے گی۔''

''اچھا اب میں چلوں۔'' نسرین مستی بھرے لہجے میں بولی۔ ''وہ تمہاری کالی کلوٹی محبوبہ آتی ہوگی۔''

''نہیں تم نہیں جاؤ گی۔'' کامران نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ ''وہ شام چھ بجے رقم لے کر آئے گی۔ ابھی تو دو بھی نہیں بجے ہیں۔ ہمیں اس کامیابی پر نہ صرف جشن منانا بلکہ تیاری کا پروگرام بھی بنانا ہے۔ ہم تین دن کے بعد یہاں سے چھو ہو جائیں گے۔''

تھوڑی دیر بعد وہ اس بیڈ روم سے دبے پاؤں نکلی۔ اب اسے ان لفافوں کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ محتاط انداز سے باہر کے دروازے کی طرف بڑھی۔ کمرے کا پردہ قدرے ہٹا ہوا تھا۔ وہ غلاظت کی دلدل میں اتنے دھنس چکے تھے کہ انہیں کسی بات کا ہوش نہیں رہا تھا۔ جب وہ لفٹ سے نیچے جارہی تھی تو اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ اس کے خواب شیشے کی طرح چکنا چور ہوگئے تھے اور ان کی کرچیاں اس کے دل میں چبھ رہی تھیں۔ وہ دل میں کامران کو مخاطب کرکے کہہ رہی تھی۔

''تم نے ایک عورت کا پیار دیکھا ہے اور اب اس کا انتقام بھی دیکھو۔ تم نے مجھے فریب دے کر جو داغ لگایا اب میں بھی تم پر اور تمہاری اس ناگن پر بھی داغ لگاؤں گی۔ اب تم دونوں سنگاپور میں نہیں جیل میں سنی مون منانا۔''

اس نے ایک سولہ برس کے لڑکے کو پی سی او کے قریب روک کر پوچھا۔ ''تم کہاں تک پڑھے ہو۔''

''میں فرسٹ ایئر میں پڑھ رہا ہوں۔'' اس لڑکے نے جواب دیا۔

''تم کیا بننا چاہتے ہو؟''

''پولیس افسر۔''

''کیا تم ایک نیک کام کرسکتے ہو۔'' نگہت بولی۔ ''میں تمہیں اس کے عوض پچاس روپے دوں گی۔''

''کیا۔'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ان دو نمبروں پر ٹیلی فون کرکے کہنا کہ کل جو صدر کے ایک بینک کے باہر ڈکیتی کی واردات ہوئی تھی اور ڈاکو ایک عورت کے ہاتھ سے تین لاکھ اسی ہزار کی رقم چھین کر بھاگا تھا وہ کلفٹن میں ڈریم لینڈ اپارٹمنٹس کے چھ سو دس نمبر کے اپارٹمنٹ میں موجود ہے۔ رقم الماری میں ہے۔ جلد سے جلد وہاں پہنچیں کیونکہ وہ اور اس کی بیوی سنگاپور فرار ہونے والے ہیں۔''

''یہ دو نمبر کہاں کے ہیں؟''

''ایک پولیس اسٹیشن کا اور دوسرا کمپنی کا۔'' نگہت نے جواب دیا۔

جب اس نوجوان لڑکے نے دونوں جگہ ٹیلی فون کردیا تو اس کے سینے میں بھڑکتی آگ سرد پڑ گئی۔ نگہت لڑکے کو پچاس روپے کا نوٹ دے کر سیدھے میرے ہاں آگئی۔ میں بھی اس روز دفتر نہیں گئی تھی۔ اس نے مجھے اعتماد میں لے کر ساری کہانی سنائی۔ اس کا دل ایک دم سے بھر آیا۔ باوجود کوشش کے وہ آنسوؤں پر قابو نہ پاسکی۔

محبت

عارف شیخ

پیار، عشق اور محبت جیسے احساسات اگر کسی کی زندگی میں شامل ہوجائے تو زندگی مکمل لگنے لگتی ہے لیکن جب یہی پیار دور جانے لگے تو۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ایک طالب علم کے پیار کی کہانی اُس کی اپنی زبانی

میرا نام شہزاد ہے۔ شہزاد ہمایوں، عمر کوئی ۲۳، ۲۴ کے لگ بھگ ہوگی۔ گھر، عزیز و اقارب، محلے، اسکول، پھر کالج سب ہی جگہ سے مجھے خوب صورت اور قابل ہونے کی سند ملی تھی۔ میں خود بھی محسوس کرتا تھا کہ قدرت نے مجھے اچھے ذہن کے ساتھ اچھی شکل و صورت عطا کی ہے۔ ارد گرد کی عورتیں تو اکثر میری ماں سے میرے متعلق تعریف ہی کرتی تھیں۔

میں اپنے گھر میں سب سے بڑا تھا، ہم تین بہن بھائی تھے۔ بہن سب سے چھوٹی تھی اور اسکول کے آخری سال میں پڑھ رہی تھی۔ جبکہ میں کالج کے آخری سال میں پہنچ گیا تھا۔ میری اور گھر کے سب ہی لوگوں کی خواہش تھی کہ میں ابھی اور پڑھائی کروں۔

میرے والد کی صدر میں کپڑے کی دکان تھی۔ مالی حالات ہمارے گھر کے خاصے اچھے تھے، میرے

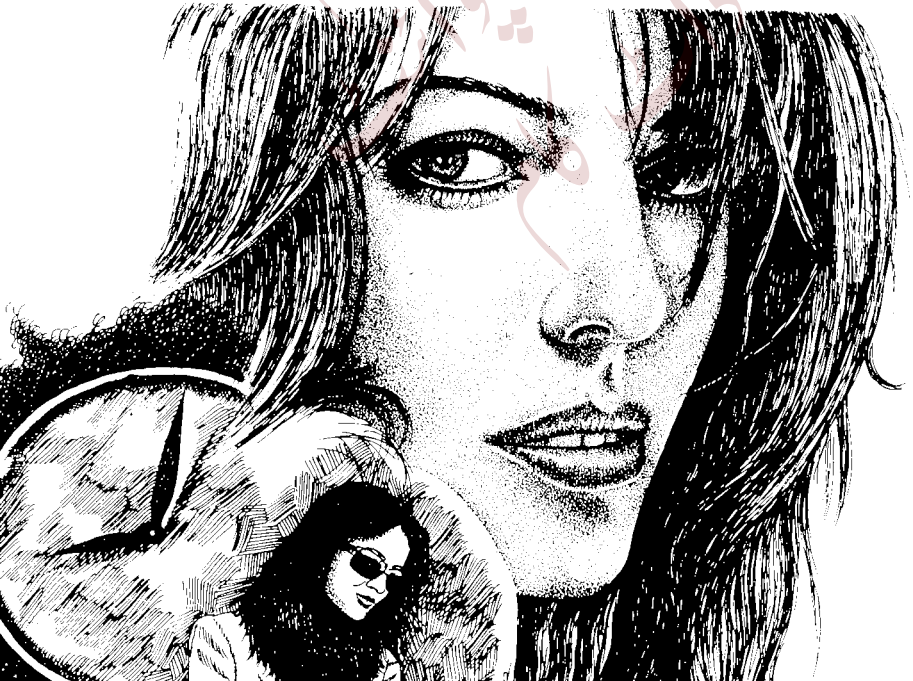

چھوٹے بھائی خرم ہمایوں نے والد صاحب کے ساتھ دکان سنبھال لی تھی۔ اس لیے مجھے یہ فکر بھی نہیں تھی کہ والد کے بزنس کو مجھے سنبھالنا ہے۔ میرا تو ایک خواب تھا جو میں، امی ابو تینوں ایک ساتھ دیکھ رہے تھے کہ میں اپنے خاندان میں سب سے زیادہ پڑھا لکھا اور قابل آدمی بنوں۔

میری زندگی برسوں سے ایک ہی ڈگر پر چل رہی تھی۔ صبح اٹھنا، نماز پڑھنا اور پھر ناشتا کر کے کالج کی تیاری کرنا۔ چار بجے تک کالج سے واپس گھر آنا، کھانا کھا کر آرام کرنا پھر ایک انسٹی ٹیوٹ جانا، وہاں سے واپس آ کر رات کا کھانا کھانا اور پھر سونے تک مسلسل پڑھائی کرنا۔

میرے اس شب و روز میں ایک دن اچانک تبدیلی آ گئی۔ ہوا یوں کہ میں کالج کے لیے اسٹاپ پر آیا تو اس وقت لوگوں کا اتنا رش نہیں تھا۔ میں حسب معمول اپنی بس کے آنے سے قبل اسٹاپ پر موجود اخباروں کے اسٹال پر کھڑا اخباروں کی سرخیوں پر نگاہیں دوڑا رہا تھا۔ دفعتاً ایک بجلی سی میری آنکھوں کو خیرہ کر گئی۔ ایک لمحے کو سب کچھ دھندلا سا گیا اور جب روشنی لوٹی تو میں اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جو مجھ سے چھ، سات گز کی دوری پر کھڑی تھی۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا، بس میں اسے دیکھتا ہی چلا گیا۔ اس نے بھی شاید یہ بات محسوس کر لی تھی کہ کوئی اسے گھور رہا ہے۔ اس نے میری طرف دیکھا، مجھے یوں لگا کہ وہ آنکھوں کے رستے میرے دل میں اترتی جا رہی ہے۔

میری بے خودی پر ایک لمحے کو اس کے لبوں پر مسکراہٹ ابھری اور پھر وہ دوسری طرف دیکھنے لگی۔ لیکن میں اسے مسلسل دیکھ رہا تھا، مجھے یہ بھی احساس نہیں تھا کہ میں بس اسٹاپ پر کھڑا ہوں۔ اتنے میں ایک بس آئی اور وہ بس کی طرف بڑھ گئی۔ بس میں چڑھنے کے بعد اس نے میری طرف دیکھا تو نہ جانے مجھے کیا ہوا۔ میں بلا سوچے سمجھے اس کی بس میں چڑھ گیا اور راستہ بناتا ہوا ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں سے وہ مجھے دکھائی دے۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا، ایک بار پھر سے مسکرائی۔ مجھے لگا اس کی مسکراہ مجھے حوصلہ دے رہی ہے۔ یہ بات میری لیے باعث تسکین تھی۔ وہ گلشن اقبال پہنچ کر ایک اسٹاپ پر اتر تو میں بھی وہیں اتر گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے پیچھے ایک قطار میں اس طرح چل رہے تھے کہ دونوں کے درمیان صرف دس گز کا فاصلہ تھا۔ مختلف گلیوں سے گزر کر وہ ایک مکان کے گیٹ پر رک گئی۔ چند منٹوں بعد دروازہ کھلا اور وہ اندر غائب ہو گئی۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ واپس لوٹ جانے کا سوچا، لیکن قدم نہیں اٹھ سکے۔ اسی طرح سے دس منٹ گزر گئے اور پھر اچانک وہ مجھے مکان کے اوپری حصے میں ایک کھڑکی میں دکھائی دی۔ وہ میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

اس کی اور میری آنکھیں ایک دوسرے میں ضم ہو چکی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر ایک بار پھر سے مسکراہٹ ابھری، اس بار اس نے مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ ہلا کر کچھ کہا اور پھر کھڑکی بند ہو گئی۔ میں سمجھ گیا کہ اس نے مجھے اللہ حافظ کہا۔

میں اس روز کہیں نہیں جا سکا اور سیدھا گھر چلا آیا۔ امی مجھے وقت سے پہلے گھر پر دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔

''شہزاد! کیا ہوا۔ آج تم جلدی لوٹ آئے ہو۔'' امی کے سوال پر مجھے پہلی بار جھوٹ کا سہارا لینا پڑا۔

''وہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

مجھے نہیں معلوم کہ مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میں کب تک جاگتا رہا اور کب سو گیا۔ لیکن مجھے یہ معلوم ہے کہ جاگنے یا سونے کے باوجود میں صرف اس لڑکی کو ہی دیکھتا رہا ہوں۔ میں اس وقت جاگا جب امی، ابو کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوئیں۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ رات ہو چکی ہے اور ابو کے آتے ہی امی نے انہیں تمام صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

''کیا ہوا ہے۔'' ابو نزدیک ہی بیٹھ گئے۔

''پتا نہیں، لیکن اب میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے انہیں تسلی کرانے کی کوشش کی۔

''تم نے اپنے اوپر پڑھائی کا بوجھ بھی بہت ڈال لیا ہے۔ ذرا سا اپنا خیال نہیں کررہے ہو۔'' امی کی خفگی میں محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

مجھے سخت شرمندگی محسوس ہورہی تھی کہ میں اپنے والدین سے جھوٹ بول رہا تھا۔ ''نہیں، اب میں خیال رکھوں گا۔'' میں نے بات ختم کرنا چاہی۔

''چلو پھر کھانا کھانے باہر آجاؤ۔'' ابو نے ہدایت کی اور پھر کچھ دیر بعد میں گھر والوں کے ہمراہ کھانا کھا رہا تھا۔

میں بالکل روبوٹ والی حرکتیں کررہا تھا۔ گھر سے نکل کر میں بالکل ٹھیک وقت پر اس جگہ پہنچا، جہاں وہ لڑکی کل مجھے ملی تھی۔ لیکن وہ آج وہاں نہیں تھی، میں نے پورے ایک گھنٹے تک اس کا انتظار کیا۔ مجھے کالج کو ویسے بھی دیر ہوچکی تھی، اس لیے کالج جانا بے کار تھا لہٰذا میں بس پکڑ کر سیدھا گلشن اقبال پہنچ گیا۔

مجھے بہت زیادہ زحمت نہیں اٹھانا پڑی تھی اس لیے کہ پندرہ منٹ کے بعد ہی وہ لڑکی مجھے مکان کے اوپری حصے میں دکھائی دے گئی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، وہ ہلکے آسمانی رنگ کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ وہ مجھے آج، کل سے بھی زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی۔ میں اسے ٹکٹکی باندھے گھور رہا تھا۔ میرا دل اتنا تیز دھڑک رہا تھا کہ میں خود اس کی تیزی کو محسوس کررہا تھا۔

مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ کب دوپہر ہوگئی۔ مجھے تو جب احساس ہوا جب اس نے اللہ حافظ کہہ کر کھڑکی بند کردی۔ اب مجھے وہاں سے روانہ ہونا تھا، لیکن اس وقت گھر نہیں جاسکتا تھا۔ جلدی گھر جانے کا مطلب گھر والوں کے سوالوں کا سامنا کرنا تھا۔ لہٰذا میں ایک دوست سے ملنے روانہ ہوگیا۔

کامران مجھے دیکھتے ہی خوش ہوگیا۔ ہم دونوں نے میٹرک ساتھ کیا تھا۔ کامران کے والد نہیں تھے، اس لیے اس نے مزید پڑھائی نہیں کی اور جاب کرلی۔ ایک سال قبل اس کی شادی بھی ہوگئی تھی۔

ہم دونوں باہر چائے کے ہوٹل پر آبیٹھے۔ کامران نے چائے کا آرڈر دے کر مجھے مخاطب کیا۔

''آج تجھے میری یاد کیسے آگئی اور وہ بھی اس وقت، یہ وقت تو تیرا کالج کا ہے۔'' وہ میری روٹین سے بخوبی آگاہ تھا۔

''آج مجھے تیری مدد کی ضرورت ہے۔'' میں بہت سنجیدہ تھا۔

''سب خیریت تو ہے۔''

''مجھے ایک لڑکی نے پریشان کردیا ہے۔'' میں اسے تمام تفصیل بتاتا چلا گیا۔

کامران میری روداد سن کر مسکرانے لگا اور پھر بولا۔ ''بے وقوف زیادہ سوچنے کے بجائے اس سے ملو اور بات کرو۔''

جب میں کامران کے پاس سے روانہ ہوا تو یہ بات طے ہوچکی تھی کہ مجھے اس لڑکی سے ملنا ہے۔

اس دن میں گھر پہنچا تو میں نے گھر والوں کو بالکل احساس نہیں ہونے دیا کہ میں کالج نہیں گیا ہوں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ گھر کے لوگوں کو شک ہو۔

میری اور اس کی ملاقات کو، جو صرف ایک دوسرے کو دیکھنے تک محدود تھی، چھ روز گزر چکے تھے۔ ساتویں دن وہ مجھ سے باہر ملنے پر راضی ہوئی، اس کے محلے سے دور ایک پارک میں، میں اور وہ ملے۔

''ہم ایک دوسرے کے نام سے بھی واقف نہیں ہیں اور حالت یہ ہے کہ روز دیکھے بغیر دن نہیں گزرتا۔'' میں نے بات کرنے کا آغاز کیا۔

''میرا نام زوبی ہے۔'' اس کی مترنم آواز میرے کانوں میں رس گھولتی چلی گئی۔

''میں شہزاد۔'' میں بولا۔ ''اپنے گھر میں سب سے بڑا ہوں۔'' میں اسے اپنے گھر والوں سے متعلق تفصیل بتاتا چلا گیا۔

اس نے بتایا کہ جس روز میں نے اسے پہلی بار اپنے اسٹاپ پر دیکھا تھا، وہ وومن کالج کسی کام سے

آئی تھی اور واپس جا رہی تھی۔

اس روز مجھے یوں لگا میں دنیا کا خوش قسمت ترین انسان ہوں، اس لیے کہ وہ دو گھنٹے میرے ساتھ رہی تھی اور مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ میرے یہ دو گھنٹے کب گزر گئے۔

دھیرے دھیرے ہماری ملاقاتیں طویل ہوتی چلی گئیں۔ دو ماہ کس طرح گزر گئے، کچھ خبر نہیں ہوئی۔ مجھے ان مہینوں میں اپنی پڑھائی، اپنے مستقبل سے کوئی دل چسپی نہیں رہی۔ مجھے گھر والوں کی فکر نہیں تھی، میری دل چسپی تھی تو وہ صرف زوبی تھی۔ ہماری دوستی اس نہج پر پہنچ چکی تھی کہ میں راتوں کو گھر سے غائب رہنے لگا۔ جس کا میرے گھر والوں کو بھی پتا نہیں تھا۔

یہ سلسلہ کچھ اس طرح شروع ہوا کہ ایک روز زوبی نے کہا کہ ہم اس طرح روزانہ باہر نہیں مل سکتے ہیں لہٰذا تم میرے گھر کی چھت پر ملنے آیا کرو۔ میں نے فوراً ہامی بھر لی اور پھر پچھلی گلی سے پائپ کے ذریعے میں چھت پر پہنچ جاتا تھا۔ زوبی کسی بہانے سے چھت پر آ جاتی اور ہم دونوں دیر تک باتیں کرتے رہتے تھے۔

جب میں وہاں جاتا تو نصف رات بیت چکی ہوتی تھی۔ مجھے اپنے گھر میں بھی چوروں کی طرح داخل ہونا پڑتا تھا۔ زوبی سے مل کر آنے کے بعد بھی مجھے دیر تک نیند نہیں آتی تھی۔ کمرے میں چاروں طرف زوبی گھوم رہی ہوتی تھی، کبھی وہ مسکراتی تھی تو کبھی ہنستی تھی۔ اس کی ہر حرکت سے مجھے تسکین ملتی تھی اور نہ جانے میں کب سو جاتا تھا۔

''زوبی، اب شاید میں تمہارے بغیر زندہ نہ رہ سکوں۔'' میں اس کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامے اپنی بے لوث محبت کا اظہار کر رہا تھا۔

''مجھے تمہاری یہ بات بالکل پسند نہیں آئی۔'' وہ بڑی ادا سے بولی۔

''کیوں۔ کیا کیا میں نے۔'' میں چونکا۔

''مردوں کی طرح زندہ رہنے کی بات کرو۔ مجھے مرد پسند ہیں، بزدل اور کم زور لوگ میری نفرت کے بھی قابل نہیں ہیں۔'' اس نے تیزی کے ساتھ اپنے ہاتھ کو کھینچ لیا۔

''واقعی میں غلط ہوں۔'' میں نے فوراً بات سنبھالی۔ ''مجھے تو تمہارے ساتھ جینا ہے، زندگی بھر ساتھ رہنا ہے اور میں گدھا ہوں، فضول میں مرنے کی بات کر رہا ہوں۔''

''تم خوش قسمت ہو میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' اس کی آواز میں عجیب سا رعب تھا۔ ''ورنہ میرے اوپر تو بہت لوگ جان دیتے ہیں۔''

ایک لمحے تو مجھے یوں لگا وہ میری توہین کر رہی ہے۔ ''میرے ساتھ رہنے والے بھی مجھے خوب صورت نوجوان سمجھتے ہیں۔''

وہ بڑے زور سے ہنسی، پھر آواز دبا کر بولی۔ ''تم برا مان گئے۔ نہیں، تم بھی وجیہہ ہو اس لیے تو اس وقت میرے ساتھ ہو۔''

''کبھی کبھی تم عجیب سی بات کرتی ہو۔''

اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ ''عجیب سی بات ہی کرتی ہوں، عجیب سی لگتی تو نہیں ہوں۔''

''اب تم برا مان گئی ہو۔'' میں مسکرایا۔

''چلو کوئی اور بات کرتے ہیں۔'' اس نے موضوع بدلا اور ہم ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔

کچھ دیر بعد اس نے انگڑائی لیتے ہوئے ایک طویل سی جمائی لی۔ ''چلو، مجھے نیند آ رہی ہے۔''

میں نے دیکھا کہ آج وہ اپنے وقت سے ایک گھنٹے قبل ہی رخصت ہو رہی تھی۔ میں چلنے کے ارادے سے اٹھ گیا۔

''کل نہیں مل سکوں گی ایک شادی میں جانا ہے، پتا نہیں کب تک لوٹوں۔'' اور میرے جانے کا انتظار کیے بغیر وہاں سے چلی گئی۔ چند منٹ بعد میں بھی وہاں سے روانہ ہو گیا۔

دوسرے روز رات کے گیارہ بج گئے، لیکن مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ آخر تھک کر میں وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ میرے قدم خود بخود زوبی کے مکان کی

طرف اٹھ رہے تھے۔ جب میں زوبی کے مکان کے نزدیک پہنچا تو سوا بارہ کا ٹائم تھا۔ میں نے کچھ نہیں سوچا اور اپنے طے شدہ راستے کی مدد سے اوپر چھت پر پہنچ گیا اور ٹنکی کے پیچھے، جہاں ہم بیٹھا کرتے تھے، وہاں بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا کہ شاید وہ آجائے۔ صبح کے پانچ بجے میں مایوس ہوکر وہاں سے واپس لوٹ آیا۔

میں تین دن تک لگاتار وہاں جاتا رہا، لیکن وہ نہیں آئی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر وہ ایسا کیوں کررہی ہے۔ چوتھے روز میں دن کے وقت اس کی گلی میں مکان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ایک گھنٹے بعد مجھے اس کی جھلک دکھائی دی۔ اس نے مجھے دیکھا ضرور، لیکن مسکرائی بالکل نہیں۔ دو منٹ بعد وہ وہاں سے ہٹ گئی، لیکن میں اپنی جگہ ڈٹا رہا۔

نصف گھنٹے کے بعد وہ پھر آئی۔ اس نے مجھے چند لمحے گھور کر دیکھا، اس کے بعد وہ دوبارہ اندر چلی گئی۔ اس کے بعد وہ بالکل نہیں آئی۔ میں نے اس جگہ مزید دو گھنٹے برباد کیے، لیکن اسے نہیں آنا تھا سو وہ نہیں آئی۔

میری عقل یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ آخر معاملہ کیا ہے اور زوبی کے رویے میں یہ اچانک تبدیلی کیونکر آئی ہے۔ میں جتنا اس مسئلے پر سوچتا تھا اتنا ہی پریشان ہوجاتا تھا۔

میں پورا دن شام ہونے تک یونہی سڑکوں پر مٹر گشت کرتا رہا پھر اپنے دوست کامران کے پاس چلا آیا۔ میں نے اسے تمام صورت حال سے آگاہی دی، اس نے یہ کہہ کر تسلی دی کہ وہ کسی بات پر خفا ہوگئی ہوگی، اکثر لڑکیاں ذرا ذرا سی بات کو بڑا کر کے ناراض ہوجاتی ہیں اور پھر انہیں بڑی مشکل سے راضی کرنا پڑتا ہے۔

چنانچہ میں دل میں تہیہ کر کے رات دس بجے اس کے مکان کی چھت پر پہنچ گیا۔ میں آج اپنے وقت سے دو گھنٹے قبل ہی آگیا تھا۔ مکان کی پوری چھت پر ویرانہ تھا، لیکن یہ خاموشی بہت دیر تک قائم نہیں رہ سکی۔ دس منٹ بعد ہی زوبی وہاں پہنچ گئی۔

وہ مجھے وہاں بے وقت پاکر ششدر رہ گئی۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا، لیکن منہ سے کوئی لفظ باہر نہیں آرہا تھا۔

''کیوں، حیران کیوں ہو۔'' میں بڑی نرمی اور محبت سے بات کررہا تھا۔

وہ بہت اعتماد والی لڑکی تھی، اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔ ''تم اتنی جلدی آگئے ہو؟''

''دیر سے تو میں کئی بار آیا ہوں، لیکن نہ جانے تمہیں کون سی مصروفیت مل گئی ہے کہ اب تم سے ملنا ہی نہیں ہورہا ہے۔''

''تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ، ابھی گھر کے سب ہی لوگ جاگ رہے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں، اگر انہیں ہماری محبت کا آج علم ہونا ہے تو ہوجانے دو۔'' میں نے کہا۔ ''آخر ایک دن تو بات سب کے سامنے آنی ہی ہے۔''

''اس طرح رات کے وقت اگر کوئی بات سامنے آتی ہے تو بات بنتی نہیں بلکہ بگڑ جاتی ہے۔''

مسکراہٹیں

کوریئر سروس کا ایک ہرکارہ دوڑتا ہوا اپنے دفتر سے نکلا اور دروازے سے اس نے فٹ پاتھ پر ایک لمبی چھلانگ لگائی۔ دھپ سے وہ پشت کے بل فٹ پاتھ پر گرا اور چند لمحے کے لیے گویا چکرا سا گیا۔ ایک راہ گیر نے اسے اُٹھایا۔ اس کے کپڑے جھاڑے، اس کا ڈاک کا تھیلا اُٹھا کر اسے دیتے ہوئے ہمدردی سے پوچھا۔

''زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔؟''

''چوٹ کو چھوڑیے۔'' ہرکارہ پیٹھ سہلاتے ہوئے بولا۔ ''اگر آپ نے دیکھا ہو تو یہ بتا دیجیے کہ وہاں سے میری موٹر سائیکل کس نے ہٹائی ہے جہاں میں نے چھلانگ لگائی تھی؟''

اس کی آواز، لہجے دونوں میں سختی تھی۔

''مجھے اب کسی کی پروا نہیں ہے، کسی کا ڈر نہیں ہے۔'' میں بھی مضبوطی کے ساتھ کھڑا تھا۔

''لیکن مجھے پروا ہے لہٰذا تم اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ۔'' وہ غصے سے بولی۔

''زوبی! یہ ظلم مت کرو۔ بغیر قصور کے سزا مت دو۔ اگر مجھ سے کوئی خطا ہوگئی ہے تو میں یہ جانے بغیر کہ میں قصوروار ہوں یا نہیں، تم سے معافی مانگنے کے لیے تیار ہوں۔'' میں گڑگڑا رہا تھا۔

''دیکھو، گھر پر مہمان آئے ہوئے ہیں لہٰذا ابھی تم چلے جاؤ۔ میں تمہیں بعد میں ملتی ہوں۔'' اس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

''میں تمہیں چاہتا ہوں، اس لیے تمہاری ہر بات مان لوں گا۔ لیکن مجھے یہ کیوں لگ رہا ہے کہ تم بدل گئی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے یہ کیوں لگ رہا ہے کہ تم مجھ سے دور ہوتی جارہی ہو۔''

وہ چند لمحے سوچتی رہی، پھر بولی۔ ''میں اب تم سے نہیں ملنا چاہتی ہوں۔'' وہ حد درجہ سنجیدہ تھی۔

''دیکھو، ہم ملے تھے، یہ ٹھیک ہے، تم نے مجھے بہت چاہا یہ بات میں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ لیکن اب میں تم سے نہیں مل سکتی ہوں۔''

''کیوں۔'' میری آواز خاصی بلند تھی۔ اس نے ڈر کر اطراف میں دیکھا پھر بولی۔

''میری شادی ہورہی ہے، میرا رشتہ طے ہوچکا ہے۔''

اس کے الفاظ میرے وجود پر ایٹم بم بن کر گرے اور میرے چیتھڑے اڑ گئے۔ دل ڈوب گیا، دماغ ماؤف ہوگیا۔ آنکھوں کے آگے جیسے اندھیرا آ گیا ہو۔

''میں جانتی ہوں کہ تمہیں میری اس بات سے بہت تکلیف ہوئی ہوگی۔'' وہ مجھے سمجھا رہی تھی۔

''لیکن ہم مشرقی لڑکیاں ہیں، کیا کرسکتی ہیں۔ گھر والوں نے جہاں طے کردی، وہاں شادی کرنا پڑتی ہے۔ میں مجبور ہوں۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

میرا دماغ بھک سے اڑ چکا تھا۔ میری پوری دنیا تاریکی میں ڈوب چکی تھی۔

☆☆☆

میں اس وقت چونکا، جب ایک پولیس کانسٹیبل نے آکر یہ خبر دی کہ میرے گھر والے مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ میں اٹھ کر سلاخوں کے نزدیک آ گیا۔ جہاں میرا باپ جسے میں نے ایک دم بوڑھا کردیا تھا، اس کے ساتھ میری ماں، جو چند روز ہی میں برسوں کی بیمار دکھائی دینے لگی تھی۔

وہ دونوں روزانہ مجھ سے ملنے آتے تھے اور پوری ملاقات میں صرف روتے تھے۔ میں تو ایسا پتھر دل ہوچکا تھا کہ نہ تو انہیں تسلی دیتا تھا اور نہ ان کے آنسو پوچھتا تھا۔

میری ماں تو بس ایک ہی بات بولتی رہتی تھی۔ یہ سب کیا ہوگیا۔ تو نے یہ سب کیا کردیا۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ میں نے یہ سب کیوں کردیا۔ اس لیے کہ خود میرے پاس جواب نہیں تھا کہ میں نے زوبی کو کیوں جان سے مار ڈالا۔ ہاں کبھی کبھی خیال آتا تھا کہ میں نے اس لڑکی کو ٹھیک ہی مارا۔ وہ میری محبت کی قاتل تھی، وہ میرے مستقبل کی قاتل تھی۔ وہ میرے ماں باپ کے خوابوں کی قاتل تھی۔ وہ میرے پورے گھر کی قاتل تھی۔

ایک ہفتے بعد مجھے حوالات سے جیل بھیج دیا گیا اور باقاعدہ سے میرے مقدمے کا آغاز ہوگیا۔ میرے والدین کافی پیسے خرچ کررہے تھے مجھے بچانے کے لیے۔ ادھر زوبی کے والد نے بھی بڑا وکیل کیا ہوا تھا۔

ہمارے ملک میں مقدموں کے فیصلے جلد نہیں ہوتے ہیں لہٰذا میں بھی منتظر تھا کہ کب میرے مقدمے کا فیصلہ ہوتا ہے۔ کب تقدیر یہ طے کرتی ہے کہ میں نے زوبی کے ساتھ ٹھیک کیا یا پھر میں غلط تھا۔

ایک اَن پڑھ اوباش لڑکے کا قصہ جو کہتا تھا....

"لوگ سریپ (شریف) بننے کو تو بولتے ہیں، لیکن سریپ (شریف) کا ساتھ کوئی نہیں دیتا۔"

انجمن

راوی۔ لائبہ شاہ

سماج سدھار کا جذبہ رکھنے والے ایک نوجوان کی داستان

ہم کچھ دوستوں نے مل کر ایک سماج سدھار ادارہ بنایا تھا۔ ہم اپنا وقت بے مقصد کاموں میں صرف کر دیتے ہیں، یہ وقت کسی نیک کام کے لیے صرف کریں۔ بہت سوچ بچار کے بعد ہم نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں ایسے افراد کی جو غلط راستے پر چل رہے ہیں اصلاح کرنی چاہیے۔

ابتدا میں ہم نے اس مقصد کو سامنے رکھ کر کئی مضامین لکھے اور انہیں مختلف اخبارات و جرائد میں شایع کروایا۔ مگر ہم اس بات کا اندازہ نہ لگا سکے کہ ان مضامین کو کتنے لوگوں نے پڑھا اور ان میں سے کتنے لوگ متاثر ہوئے۔ لہٰذا ہماری انجمن نے یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں ایسے لوگوں کو ڈھونڈ کر نکالنا ہوگا جو بے راہ روی کا شکار ہیں۔ ان سے بالمشافہ ملاقات کرنی ہوگی اور ان پر محنت کرنی ہوگی۔ چنانچہ انجمن کے اراکین کو ایک ایک علاقہ دے دیا گیا کہ وہاں جائیں اور ایسے افراد کو تلاش کر کے ان کو سمجھائیں۔ اس ضمن میں مجھے

اورنگی ٹاؤن کے ۱۳ اور ۱۴ نمبر کا علاقہ دیا گیا کہ آپ وہاں جا کر اپنے مشن کا آغاز کریں۔

میں ایک دو دن تو اس علاقے میں گھوم پھر کر وہاں کے ماحول کا اندازہ لگاتا رہا۔ وہاں مجھے ہر طرح کے لوگ نظر آئے۔ غریب لوگ بھی، متوسط طبقے کے افراد بھی، کھاتے پیتے اور خوش حال لوگ بھی، پڑھے لکھے بھی اور جاہل اور لٹھ مار بھی۔

شام کے وقت وہاں چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں اور ریستورانوں میں خاصی بھیڑ بھاڑ نظر آئی۔ بہاری کباب اور کچوری، جسے وہاں کے لوگ پوری کہتے ہیں خاص آئٹم کے طور پر بہت استعمال کیے جاتے ہیں۔ سموسے اور پکوڑے بھی دستیاب ہوتے ہیں مگر شام کا خاص کھانا بہاری کباب اور پوری ہوتا ہے۔ میں نے بھی دو تین دن اس علاقے کے سروے کے دوران بہاری کباب اور کچوری کا خاص لطف لیا۔ یہاں چائے بھی بڑی اچھی بنتی ہے۔ جن میں خصوصی طور پر ملائی ڈلوائی جاتی ہے۔

ایک دن میں فوجی ہوٹل میں پوری کباب کھا رہا تھا کہ دیکھا ہوٹل میں ایک لڑکا داخل ہوا جسے دیکھتے ہی کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے منیجر کے علاوہ ہوٹل کے بیرے اور گاہک چوکنا ہوگئے۔ لڑکے کی عمر بدقت تمام سولہ سترہ برس ہوگی۔ دبلا پتلا، سر کے بال بے ترتیب، قمیص اور پینٹ میں ملبوس، قمیص کے بٹن کھلے ہوئے، انگلیوں کے درمیان سلگتی ہوئی سگریٹ۔ وہ ایک خالی ٹیبل پر جا کر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر بعد ایک بیرا اس کے قریب آیا اور کندھے پر پڑی جھاڑن سے میز صاف کرنے لگا۔

''تم لوگ بڑے ہڈحرام ہوگئے ہو۔'' لڑکے نے بیرے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''گاہک آ کر بیٹھا سوکھتا رہتا ہے اور تم لوگ جانے کہاں۔۔۔''

بیرے نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کیا۔ ''کیا لاؤں آپ کے لیے؟''

''کیا کیا ہے تمہارے ہوٹل میں؟''

بیرا روایتی انداز میں شروع ہوگیا اور ایک سانس میں متعدد آئٹمز کے نام گنوا دیے جنہیں سننے کے بعد لڑکے نے ایک لمحہ سوچا۔ پھر بولا۔ ''فی الحال مجھے ایک گلاس ٹھنڈا پانی دو۔''

بیرا بدبداتا ہوا چلا گیا اور دوسری میز سے پانی کا بھرا ہوا جگ اور گلاس لا کر لڑکے کی میز پر زور سے رکھا۔ لڑکے نے لپک کر بیرے کا گریبان پکڑ لیا۔

''سالا! ایسا پٹڑ ماروں گا کہ بتیسی باہر آ جاوے گی۔''

''جبان سنبھال کر بات کرو صاب ہم کو بھی گنڈہ گردی آوے ہے۔'' بیرا بھی الجھ پڑا۔ قریب تھا کہ دونوں گتھم گتھا ہو جاتے کہ منیجر نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے آواز لگائی۔

''ای کا ہو رہا ہے پھجلو!'' جب کہ ہوٹل میں موجود دوسرے لوگ اپنی جگہ گم صم بیٹھے رہے۔ کسی نے کچھ نہیں کہا۔ ایسے میں میرا خاموش تماشائی بنا بیٹھا رہنا ممکن نہیں تھا۔ میں اپنے پوری کباب کو چھوڑ کر اٹھا اور دونوں کو علیحدہ کیا اور لڑکے کو اپنے ساتھ لے کر اپنی میز پر آ گیا۔

''ذرا ذرا سی بات پر نمپر لوز نہیں کرتے یار!'' میں نے لڑکے سے کہا

''دیکھو نا صاب! سالا دو کوڑی کا بیرا روباب (رعب) دکھاتا ہے۔''

میں نے گلاس میں پانی انڈیل کر اسے دیا جسے وہ ایک ہی سانس میں پی گیا۔ میں نے سامنے سے گزرتے ہوئے دوسرے بیرے کو بلا کر دو کباب اور چار پوریاں لانے کو کہا۔

''نہیں صاب جی! میرے لیے کچھ نہ منگواؤ۔ میں کچھ کھانے پینے کے موڈ میں نہیں۔'' لیکن اس وقت تک بیرا آرڈر لے کر جا چکا تھا اور اس بار خلاف توقع واپس آنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

''نہیں صاب جی آپ کھائیے۔'' اس نے پھر تکلف کیا۔

''ارے یار! بہادر لوگ تکلف نہیں کرتے۔ کھاؤ پیو جان بناؤ۔'' میں نے انہی لوگوں کے انداز

میں کہا اور پھر وہ شروع ہو چکا تھا۔

جب وہ دو چار لقمے کھا چکا تو میں نے محض اس کی توجہ بٹانے کے لیے کہا۔ ''یار اس ہوٹل کا نام فوجی ہوٹل کیوں ہے؟ اس میں تو مجھے کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جس سے پتا چلے کہ یہ فوجی ہوٹل ہے۔''

''ہم نے تو کبھی اس بات پر سوچا بھی نہیں صاب جی!'' اس نے پوری کباب کھاتے ہوئے کہا۔ ''ہوگا کبھی کوئی فوجی جس نے کبھی ہینیاں (یہاں) ہوٹل کیا ہو۔ ہم تو ہوس سنبھالنے کے بعد سے اس کو اسی نام سے دیکھ رہے ہیں۔ ای تو ہوٹل کے مالک لوگن کو معلوم ہوگا۔''

''لیکن مجھے تو معلوم ہوا ہے اس کے مالک بھی کئی بدل چکے ہیں۔''

''ہاں صاب! اب سالا کاروبار میں رکھا کا ہے۔ جتنا کماؤ کم ہے۔ ایک تو مہنگائی، دوسرے آئے دن ہنگامے فساد، ہڑتال، جلاؤ گھیراؤ ایسے میں بج نس (بزنس) کا کھاک ہوگا۔''

اس روز کباب اور پوری کھلا کر اور ملائی والی چائے پلا کر میں نے اس لڑکے سے گویا دوستی کی بنیاد رکھ دی تھی۔ پھر کبھی کبھی سر شام اس سے اسی طرح کہیں نہ کہیں ملاقات ہوتی رہی۔ اس کا نام شمسو تھا۔ آوارہ گردی اور بدمعاشی کے علاوہ وہ کچھ اور نہیں کرتا تھا۔ ۱۳ نمبر کے علاقے میں کہیں رہتا تھا۔ اب میں آہستہ آہستہ اس پر اپنا کام کرنے لگا۔ بڑے غیر محسوس طور پر اسے سمجھانے بجھانے لگا کہ وہ اپنی ساری بدمعاشیوں کو چھوڑ کر بندے دا پتر بن جائے۔ کوئی کام کاج کرے۔ شریف آدمی بن جائے۔ بدی کا راستہ چھوڑ کر نیکی کے راستے پر چل پڑے، لیکن ایک دن اچانک وہ جیسے پھٹ پڑا اور میز پر زوردار ہاتھ مار کر بڑے غصے سے بولا۔

''نیکی۔۔۔ نیکی۔۔۔ نیکی۔۔۔ یہ آپ ہر وقت نیکی کا پہاڑہ کیوں پڑھتے رہتے ہو صاب جی! مجھے نئی کرنی ہے نیکی، مجھے نئی بننا ہے نیک۔''

میں نے اس کے لہجے کا برا منایا نہ اس کی بات کا۔ بڑے پیار سے اس سے کہا۔ ''یار تیرا یہ سلطان راہی والا روپ بڑا اچھا لگتا ہے۔ کاش کہ تو تھوڑا موٹا اور تگڑا جوان ہوتا تو سچ مچ سلطان راہی لگتا۔''

اپنی تعریف سن کر اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ پانی کا ایک گلاس چڑھا کر بولا۔ ''صاب جی! ہم سے نیکی ویکی کی بات مت کیا کرو۔ ہم جیسے بھی ہیں ٹھیک ہیں۔ ہم نیک بن کر سر پھرے بن کر اپنی مٹی خراب کرنا نہیں چاہتے۔''

میں ہنس دیا۔ مجھے ہنستا ہوا دیکھ کر وہ بولا۔ ''آپ ہنس کیوں رہے ہو صاب!''

''ہنس اس لیے رہا ہوں کہ تم نے بالکل بچوں جیسی بات کہی ہے۔''

''بچوں والی بات کیسے؟''

''ایک دن میں نے ایک بچے کو دیکھا۔'' میں نے کہا۔ ''حاجت ضروریہ کرنے کے بعد بھاگا بھاگا پھر رہا تھا۔ اس کی ماں اس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہی تھی۔ منا دھلوالو۔''

''نہیں میں نہیں دھلواؤں گا۔ مجھے کھیلنے دو۔ میں جیسا ہوں ٹھیک ہوں۔''

میری یہ مثال سن کر وہ بھی ہنس پڑا۔ ''صاب جی! تم بھی بڑے عجیب آدمی ہو۔ تمہاری باتیں بھی عجیب و غریب ہوتی ہیں۔''

''شمسو بھائی! تم بھی کیسی اوندھی سیدھی باتیں کرتے ہو۔ اب دیکھو نا تم نے جو یہ بات کہی ہے میں جیسا بھی ہوں ٹھیک ہوں۔ میں نیک اور شریف بن کر اپنی مٹی خراب کرنا نہیں چاہتا۔ تو یہ بات منے میاں کی بات جیسی نہیں۔ جس طرح منے میاں کو دھونا ضروری ہے اسی طرح تمہاری موجودہ حالت کی درستگی بھی ضروری ہے۔ تم نے کیسے کہہ دیا میں جیسا بھی ہوں ٹھیک ہوں۔''

شمسو چند لمحوں تک خاموش رہ کر مجھے گھورتا رہا پھر بڑے دکھی لہجے میں بولا۔ ''صاب جی آپ لوگ سریپ (شریف) بننے کو تو بولتے ہو، لیکن سریپ کا ساتھ کوئی نہیں دیتا۔ آپ جیسے سریپ لوگ بھی

سرلپھت کا سجا (سزا) بھگتنے والوں کی کوئی مدد نہیں کرتے۔''

شمسو کے لہجے میں جو درد پوشیدہ تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی تلخ تجربے سے گزر چکا ہے۔ اس لیے ایسی جلی کٹی باتیں کر رہا ہے۔ میں سوچنے لگا جب بھی موقع ملا یہ جاننے کی ضرور کوشش کروں گا کہ ایسی کون سی بات تھی کہ وہ شرافت اور شریفوں سے اس طرح الرجک ہے۔

''ارے شمسو! تم یہاں بیٹھے ہو۔ میں تمہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا۔'' میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ہماری میز کے قریب ایک ادھیڑ عمر شخص کھڑا تھا۔

''کا بات ہے چاچا! تم ہم کو کیوں ڈھونڈ رہے ہو۔'' پھر چاچا کے کچھ بولنے سے پہلے خود ہی بول پڑا۔ ''کھیر (خیر) چھوڑو اس کھسے (قصے) کو تم بیٹھو اچھا ہوا تم آ گئے۔''

آنے والا خاموشی سے بیٹھ گیا۔ ''یہ صاب جی جو ہمرے سامنے بیٹھے ہیں۔'' شمسو نے چاچا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہم کو سریپ بنانا چاہتے ہیں۔ تم انہیں بتاؤ میرا باپ سریپ تھا۔ اس کو اس کی سرلپھت کا صلا ملا اور آج تک اس کی کا سجا وہ بھگت رہا ہے۔''

آنے والے شخص نے غور سے میری طرف دیکھا پھر ایک ٹھنڈی آہ بھر کر بولا۔ ''صاب جی! اس کا باپ بڑا نیک اور شریف آدمی تھا۔ غریب ماں باپ کی اولاد ہونے کے باوجود اس نے بہت معقول تعلیم حاصل کر لی تھی۔ وہ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد کوئی اچھی سی ملازمت کر کے اپنے بوڑھے باپ کو آرام دینا چاہتا تھا کہ اسے یہ معلوم ہوا وہ جس ہوٹل میں کام کرتا ہے اس کے مالک کا مقروض ہے۔ قرض کی رقم اچھی خاصی ہے۔ اس کے باپ نے یہ قرض اس کی اور اس کی بہن کی شادی کے لیے لیا تھا۔ اس نے ہوٹل کے مالک سے بات کی۔ میرے ابا جی کی چھٹی کر دیں میں آپ کا ایک ایک پیسہ ادا کر دوں گا۔

مالک ہنسا۔ ''ارے بھئی ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ ہاں اگر تم باپ کا قرض چکانا ہی چاہتے ہو تو یہیں میرے ہوٹل میں ملازمت کر لو اور اس ملازمت کے دوران باپ کا قرض ادا کر دو۔

''تو کیا میں اتنا پڑھ لکھ کر ابا جی کی جگہ بیرا گیری کروں۔''

''ہاں تمہارا یہ سوچنا بھی غلط نہیں ہے۔ تم پڑھ لکھ کر بابو بن گئے ہو۔ باپ کی جگہ بیرہ گیری تو نہیں کر سکتے۔'' مالک نے فکر مند لہجے میں کہا۔ پھر ذرا سوچ کر بولا۔ ''تم پڑھے لکھے ہو تو پڑھنے لکھنے کا کام کر لو۔ ہوٹل کے منیجر بن جاؤ۔''

اس نے کچھ دیر سوچا پھر بولا۔ ''چلو چلے گا۔ اس طرح تو ابا جی کو گھر بٹھا کر آرام کرنے کا موقع دے سکوں گا۔''

اور پھر وہ اسی ہوٹل میں ملازمت کرنے لگا جہاں اس کا باپ بیرا تھا۔ وہاں وہ منیجر بن گیا۔

ایک مہینے کے بعد ریاض الحق نے مالک کو مہینے بھر کا حساب کتاب پیش کیا تو وہ دنگ رہ گیا۔ ''ارے بھائی ریاض الحق میں جاگ رہا ہوں یا خواب دیکھ رہا ہوں۔''

''نہیں جناب! آپ جاگ رہے ہیں۔''

''مگر مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔ یہ جو تم نے ایک مہینے میں اتنی آمدنی دکھائی ہے تو کیا یہ صرف حساب کتاب میں ہے یا۔۔۔''

''یہ سارے پیسے میں نے بینک میں جمع کرا دیے ہیں۔ آپ کے اکاؤنٹ میں۔''

''مگر اتنا منافع، اتنا منافع تو چھ مہینے میں بھی نہیں ہوتا تھا۔ اتنا منافع ایک مہینے میں کیسے ہو گیا بھائی ریاض الحق!''

''حاجی صاحب! آپ اگر برا نہ منائیں تو ایک بات عرض کروں۔''

''ہاں ہاں کہو۔'' مالک نے کہا۔

''میں نے اپنا چارج سنبھالنے کے بعد سب سے پہلے حساب کتاب کے کھاتوں کا مطالعہ کیا تو مجھے چکر آ گیا۔ خدا کی پناہ اتنے چھوٹے سے ہوٹل کے لیے اتنی خریداری۔ میں نے اگلے روز سے خود خریداری کا کام سنبھال لیا۔'' ریاض الحق نے مالک کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''گوشت کی دکان پر گیا تو قصاب نے کہا، صاحب جی! اپنے گھر کا پتا بتائیں۔''

''کیوں میرے گھر کے پتے سے تمہیں کیا کام ہے۔''

''ارے صاحب! ہم آپ کے گھر پر گوشت بھجوائیں گے نا۔''

''کیسا گوشت؟''

''صاحب جی! ہوٹل کے حساب سے آپ کے گھر گوشت جائے گا نا۔''

''کیوں جائے گا؟''

''یہ تو ہم کو معلوم نہیں پہلے والے منیجر صاحب ڈھائی تین کلو گوشت روزانہ اپنے گھر بھجواتے تھے نا۔''

''مگر اب ایسا نہیں ہوگا۔ ہوٹل کے حساب سے میرے گھر ایک بوٹی بھی نہیں جائے گی۔''

''آپ کی مرضی۔'' قصاب نے کندھے اچکا کر کہا۔

''صاحب جی!'' ریاض الحق بولا۔ ''یہی حال سبزی ترکاری والوں کے ساتھ بھی تھا اور چاول، دال، آٹا اور مسالوں کی دکان سے بھی تھا۔ منیجر صاحب کے گھر کی ساری ضرورتیں آپ کے ہوٹل کے حساب سے پوری ہوتی تھیں۔''

ہوٹل کے مالک نے اپنا سر تھام لیا۔ ریاض الحق بولا۔

''حاجی صاحب! ہوٹل کے دوسرے ملازمین بھی حسب استطاعت آپ کو چونا لگاتے تھے۔ جس کو جہاں موقع ملتا تھا ہاتھ دکھا جاتا تھا۔ ایسے میں آپ کا کاروبار چل رہا تھا۔ یہ بہت بڑی بات تھی آپ نے کبھی کسی سے یہ نہیں پوچھا جو کچھ تم خرچ کرتے ہو اس کا کیا حساب کتاب ہے۔''

''ہاں یہ میرا قصور تو ہے۔'' مالک نے اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ ''بیٹے تم نے تو میری آنکھیں کھول دی ہیں۔''

''محترم! اگر آپ کو اپنے کاروبار کو بچانا ہے تو آپ کو ہمہ وقت اپنی آنکھیں کھلی رکھنی ہوں گی اور سارے نظام کو خود اپنی سخت نگرانی میں چلانا ہوگا۔ آپ نے تو کبھی اس بات کی بھی خبر نہیں لی کہ جو سامان آپ کے ہوٹل کے لیے خریدا جا رہا ہے وہ کیسا ہے۔''

حاجی صلاح الدین نے ہاتھ اٹھا کر ریاض الحق کو روکا پھر بولے۔ ''میں تمہاری اس بات کا مطلب نہیں سمجھا۔ ہوٹل کے لیے جو سامان خریدا جا رہا ہے وہ کیسا ہے۔''

''حاجی صاحب! گھٹیا اور سستا مال خریدا جاتا تھا، لیکن اعلا کوالٹی کے دام رجسٹر میں لکھے جاتے تھے۔ مثلاً بھینس کا گوشت خریدا جاتا تھا، لیکن بچھیا کے گوشت کی قیمت ظاہر کی جاتی تھی۔ یہی حال گھی، تیل اور مسالا جات کا تھا۔ اسی طرح سبزی ترکاریوں کی کوالٹی بھی ناقص اور گھٹیا ہوتی تھی۔ ایسے میں آپ خود ہی سوچیے۔ ہوٹل میں آنے والے گاہک کس قدر غیر مطمئن ہو کر لوٹتے ہوں گے۔ لیکن اب جب انہیں اچھا اور نفیس کھانا مل رہا ہے تو فطری طور پر ان کی تعداد بڑھ گئی ہے اور ہوٹل کی آمدنی میں اضافہ ہو گیا ہے۔''

''بیٹے اللہ تمہیں خوش رکھے۔ تم نے مجھے مکمل طور پر تباہ ہونے سے بچا لیا۔''

''میں نے نہیں حاجی صاحب! آپ کو اللہ نے بچا لیا ہے، لیکن ایک بات میں آپ سے عرض کروں گا۔ اللہ بھی اس کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتا ہے۔ میں بھی آپ کا ملازم ہوں۔ پتا نہیں کب شیطان میرے نفس پر بھی حاوی ہو جائے۔ اس لیے میں آپ سے درخواست

کروں گا کہ اپنے پورے کاروبار کا نظام اپنے ہاتھ میں لے لیں اور اپنی مرضی کے مطابق اپنا ہوٹل چلائیں۔''

شمسو کا چاچا اتنا کہہ کر رکا۔ پھر بولا۔ ''صاحب جی! اس کا باپ میرا حقیقی بھائی نہیں ہے۔ میرا دوست ہے، لیکن بھائیوں سے بڑھ کر، مجھے ایک ایک بات بتاتا تھا اور جب ضرورت پڑتی تھی مجھ سے مشورہ بھی لیتا تھا۔''

''آپ یہ بتائیں محترم شمس الحق کے والد ریاض الحق کے کہنے پر حاجی صلاح الدین نے اپنے ہوٹل کا کاروبار خود سنبھالا یا نہیں۔'' میں نے چاچا جی سے پوچھا۔

''یہی بتانے جا رہا ہوں صاحب جی! ریاض الحق کے کہنے پر حاجی صاحب کمر کس کر میدان میں آ گئے۔ اب وہ خود تھے اور ریاض الحق جیسا محنتی اور دیانت دار منیجر۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے ہوٹل نے بڑی ترقی کر لی۔'' شمسو کا چاچا ایک لمحہ کو رکا پھر بولا۔ ''صاحب جی ایک بات تو بتانا میں بھول ہی گیا۔ حاجی صاحب نے جب مکمل طور پر ہوٹل کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لیا تو انہیں آہستہ آہستہ پتا چل گیا کہ ان کے عملے میں کتنے لوگ ان کے بدخواہ ہیں جو ان کو کسی نہ کسی طرح نقصان پہنچاتے رہے ہیں اور اب بھی موقع محل دیکھ کر ہاتھ دکھا جاتے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے ایسے تمام ملازمین کو ایک ایک کر کے نکال دیا۔ سابقہ منیجر کو تو ریاض الحق کی آمد سے پہلے وہ نکال چکے تھے۔ باقی لوگ جب نکلے تو سابقہ منیجر شبیر خان سے ملے اور اپنا دکھڑا اس کے سامنے رویا گایا اور بشیر خان کو بتایا کہ سارے فساد کی جڑ نیا منیجر ریاض الحق ہے۔ بشیر خان کو ان لوگوں نے یہ کہہ کر بھی بھڑکایا کہ غالباً آپ کے خلاف بھی اسی منیجر نے ورغلایا ہوگا۔ ان سب باتوں نے بشیر خان کو مشتعل کر دیا اور اس نے کہا۔ ''اب حاجی اور اس کے نئے منیجر کو سبق دینے کا وقت آ گیا ہے۔''

اور اس نے درپردہ ان کے خلاف سازشی کارروائی شروع کر دی۔ اب حاجی کے ہوٹل میں اکثر گڑبڑ ہونے لگی۔ کچھ غنڈے موالی اکثر بے وجہ ہی ہوٹل میں دنگا فساد کرنے لگے۔ وہاں جا کر کسی بہانے بات کا بتنگڑ بناتے اور مار پیٹ اور توڑ پھوڑ شروع کر دیتے۔ ریاض الحق نے تھانے پولیس کو ان حالات سے باخبر کیا مگر پولیس پہلے ہی ریاض الحق سے خوش نہیں تھی۔ اس کے ہڈحرام کارندوں کا حلوہ بانڈہ اس نے بند کر دیا تھا۔ جب کہ بشیر خان کے دور میں انہیں کھلی چھوٹ تھی۔ جو چاہو کھاؤ پیو اور ہاتھ منہ صاف کر کے چلتے بنو۔ اب جو گڑبڑ ہو رہی تھی اس کے پس پردہ چونکہ بشیر خان ہی تھا اس لیے پولیس اس کا یا اس کے چیلوں کا ساتھ دیتی یا ریاض الحق کا۔ پولیس آتی بھی تو بہت دیر سے اور اگر کسی کو پکڑ کر لے بھی جاتی تو تھوڑی دور لے جا کر چھوڑ دیتی۔''

''ایک دن ایک غنڈے نے۔۔۔'' چاچا نے ذرا رک کر سانس لینے کے بعد کہا۔ ''محض اس بات پر ایک بیرے کو مارنا شروع کر دیا کہ میز صاف کرتے وقت اس کی صافی اس کے کپڑے سے چھو گئی تھی۔ ریاض الحق بھاگ کر آیا اور بیرے کو غنڈے کی دسترس سے آزاد کرانا چاہا تو اس نے بیرے کو پیچھے دھکیل کر ریاض الحق پر فائر کر دیا۔ گولی اسے نہیں لگی جب کہ وہ غنڈے کے ہاتھ سے پستول چھیننے میں کامیاب ہو گیا۔ گولی کی آواز سنتے ہی پولیس آ گئی تھی۔ دیکھا تو پستول ریاض الحق کے ہاتھ میں ہے اور دوسری طرف حاجی صلاح الدین خون میں لت پت تڑپ رہے ہیں۔ دراصل غنڈے نے جو گولی چلائی تھی اس کا نشانہ ریاض الحق نہیں حاجی صاحب تھے۔ ریاض الحق تو بیرے کو بچانے کے لیے غنڈے پر پل پڑا تھا اور گولی چلانے پر پستول اس کے ہاتھ سے چھین لیا تھا۔ مگر غنڈے نے مکمل طور پر ریاض الحق کے خلاف سازشی پلان تیار کیا

ہوا تھا۔ پولیس کے آتے ہی ان لوگوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔

''ہائے ہائے منیجر نے مالک کو گولی ماردی۔''

ہوٹل میں موجود غنڈوں کے ساتھیوں نے عینی شاہدین کی حیثیت سے ریاض الحق کے اقدام قتل کی گواہی دی۔ ہوٹل کے ایک دو کارندوں نے اس بیان کو جھٹلانے کی کوشش بھی کی تو پولیس نے انہیں مار پیٹ کر خاموش کر دیا اور ریاض الحق کو گرفتار کر کے لے گئے۔

یہاں تک کہہ شمس الحق کے چاچا نے ایک ٹھنڈی آہ بھری پھر بولے۔ ''اور وہ آج بھی اپنی نیکی، سچائی اور بے گناہی کی سزا بھگت رہا ہے اور اس کے ساتھ اس کے بال بچے بھی ایک طویل عرصے سے دربدر ہو رہے ہیں۔ یہ شمسو اسی پڑھے لکھے، نیک، شریف اور دیانت دار باپ کا بیٹا ہے جو باپ کے جرم بے گناہی کی وجہ سے اس حال کو پہنچ گیا ہے۔'' چاچا کی آواز لڑکھڑانے لگی تھی۔ میں نے ان کی طرف پانی کا گلاس بڑھایا۔ پانی پی کر ان کی طبیعت کچھ سنبھلی تو انہوں نے کہا۔

''صاحب جی! برا مت مانیے گا۔ شمسو جیسے بگڑے نوجوانوں کو راہ راست پر لانے سے زیادہ ضروری ان لوگوں کی اصلاح ہے جو معاشرے کے ٹھیکے دار بنے بیٹھے ہیں، لیکن معاشرے کو سدھارنے کے بجائے اسے بگاڑنے والوں کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ سانپ کا سر کچلنے کے بجائے اسے دودھ پلا رہے ہیں۔''

''نہیں چاچا جی! میں اس مرحلے پر آپ سے تھوڑا سا اختلاف کروں گا۔ معاشرہ کو بگاڑنے والے ٹھیکے داروں اور سانپ کو دودھ پلانے والوں کی اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ یہ کام نچلی سطح سے کیا جائے۔ شمسو جیسے لوگوں کو اگر سدھار لیا گیا تو یہی لوگ بڑے مجرموں کو راہ راست پر لانے کا کام بہتر طریقے پر کر سکیں گے۔''

مسکراہٹیں

کنجوس لڑکے کو کنجوس لڑکی سے پیار ہو جاتا ہے۔

لڑکی: ''جب ابو سو جائیں گے تو میں گلی میں سکہ پھینکوں گی آواز سن کر فوراً اندر آ جانا، لیکن لڑکا سکہ پھینکنے کے ایک گھنٹے بعد آیا۔''

لڑکی: ''اتنی دیر کیوں لگا دی؟''

لڑکا: ''وہ میں سکہ ڈھونڈ رہا تھا۔''

لڑکی: ''پاگل! وہ دھاگہ باندھ کر پھینکا تھا، واپس کھینچ لیا تھا۔''

☆☆☆

پہلا دوست: ''یار! میں جس لڑکی کو پیار کرتا تھا اس سے میری شادی نہیں ہوئی۔''

دوسرا دوست: ''تم نے اس کو بتایا تھا کہ تمہارے ابو بہت پیسے والے ہیں؟''

پہلا دوست: ''ہاں یار.....''

دوسرا دوست: ''تو پھر؟''

پہلا دوست: ''تو پھر کیا! اس نے میرے ابو سے شادی کر لی۔''

☆☆☆

گھر کی مالکن نئی متوقع ملازمہ کو یہ احساس دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس کے ہاں ملازمت کرنا اس کے لئے بہت آسان ہوگا اور اس گھر میں وہ خوش رہ سکے گی۔

اپنے گھر کی بہت سے خوبیاں گنوانے کے بعد مالکن بولی۔ ''اور یہاں بچے بھی نہیں ہیں جو تمہیں تنگ کریں۔''

''ارے بیگم صاحبہ! بچوں سے میں تنگ نہیں ہوتی..... آپ میری وجہ سے خوامخواہ فیملی پلاننگ کا تکلف مت کیجیے۔'' متوقع ملازمہ نے فراغ دلی سے کہا۔

اس داستان نے اولیا کی سر زمین ملتان میں جنم لیا، جہاں کی گرمی پورے پاکستان میں مشہور ہے۔

تو قیر حیدر شاہ

محبت کی سچی کہانی

اس داستان نے اولیا کی سرزمین ملتان میں جنم لیا، جہاں کی گرمی پورے پاکستان میں مشہور ہے۔ میرا نام تو قیر حیدر شاہ ہے۔ ہمارا تعلق ضلع خانیوال کے ایک خوب صورت چھوٹے سے گاؤں سدھو کانواں سے ہے۔ اس گاؤں کے شمال کی جانب سرائے سدھو اور عبدالحکیم جیسے مشہور شہر ہیں۔ سرائے سدھو اور سدھو کانواں کو دریائے راوی آپس میں جدا کرتا ہے۔ جب میں نے پانچ کلاس پاس کی تو ابا نے امی سے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ میں تو قیر کو پڑھنے کے لیے ملتان بھیج دوں۔''

''ملتان۔'' امی بولیں۔ ''مگر کس کے پاس؟''

''میرا ایک بہت قریبی دوست ہے۔ اس کے پاس چلا جائے گا۔ وہ خود بھی انگلش ٹیچر ہے، اسے خوب پڑھائے گا۔''

''مگر یہاں کیا ہے۔'' امی جان نے اعتراض کیا۔

''یہاں صرف پرائمری تک اسکول ہے، ہائی اسکول یا تو حویلی پل پر ہے یا سرائے سدھو۔ تو قیر ابھی بچہ ہے یہ روزانہ اتنا سفر نہیں کر سکے گا۔ میرا دوست اسد اس کا بہت خیال رکھے گا۔''

''جیسے آپ کی مرضی۔'' امی نے جواب دیا۔

اور یوں میں سرائے سدھو سے ملتان آ گیا۔ شروع میں تو میرا ملتان میں دل نہ لگا، پھر انکل اسد نے مجھے خوب پیار کیا اور آہستہ آہستہ میرا دل وہاں لگ گیا۔

وقت دن رات پر لگا کر اڑتا رہا۔ میں نے آٹھویں جماعت اعلا نمبروں سے پاس کر لی۔ یہ میری نویں کلاس کا ذکر ہے، ستمبر ۱۹۹۲ء کی ایک خوب صورت شام تھی۔ دوسری صبح میرا بیالوجی کا ٹیسٹ تھا۔ جب میں تیاری کرنے کے لیے بیٹھا تو مجھے پریشان ہو جانا پڑا۔ بیالوجی کی کتاب گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب تھی۔

میں اپنے ایک دوست حسیب کے پاس پہنچا۔ اس کی کریانے کی دوکان تھی، اسکول اس نے گھریلو مجبوریوں کی وجہ سے چھوڑ دیا تھا۔

''آؤ تو قیر!'' اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ''سناؤ، صحت کیسی ہے؟''

''فرسٹ کلاس'' میں نے جواب دیا۔ ''مگر ایک چھوٹی سی پریشانی ہے۔''

''حکم کرو۔۔۔ میں حاضر ہوں۔''

''کیا تمہارا کوئی ایسا دوست ہے، جو نویں،

BUSS
STOP

دسویں میں پڑھ رہا ہوں۔۔۔ دراصل مجھے ایک رات کے لیے بیالوجی کی کتاب چاہیے۔''

''نو پرابلم۔'' وہ بولا۔ ''تم بیٹھو میں ابھی کہیں سے کتاب لاتا ہوں۔'' میں اس کی دوکان پر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ آ گیا مگر خالی ہاتھ تھا۔

''یار کیا تمہارے پاس اردو کی کتاب ہے؟''

''ہاں! مگر کیوں؟''

''دراصل جس سے میں کتاب لینے گیا تھا، اسے اردو کی کتاب چاہیے۔ اس لیے میں تمہارے پاس آ گیا۔''

''یعنی کہ وہ میری کتاب کو بطور ضمانت رکھنا چاہتا ہے۔ ایسے بے اعتماد بندے کی کتاب میں نہیں لینا چاہتا۔''

''تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ بندہ نہیں بلکہ بندی ہے اور اسے واقعی کتاب کی ضرورت ہے، جیسا کہ تمہیں۔''

''اچھا میں ابھی لاتا ہوں۔''

میں نے گھر سے اردو کی کتاب لا کر دی، جسے لے کر وہ چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد بیالوجی کی کتاب لے آیا۔''

دوسرے دن میں نے اسے کتاب واپس کی اور اس کا شکریہ بھی ادا کیا کہ اس نے مجھے کتاب لا کر دی۔

تھوڑی دیر بعد حسیب میری کتاب لے کر آ گیا۔ اتفاق سے اگلے روز میرا اردو کا پرچہ تھا اس لیے گھر آتے ہی میں اردو کی تیاری کرنے بیٹھ گیا۔ کتاب کھولتے ہی میں بھونچکا رہ گیا تھا۔

کتاب کے پہلے صفحے پر ہی ایک شعر جگمگا رہا تھا۔ میں نے مزید صفحات الٹے اور میرے پاؤں سے زمین نکلتی چلی گئی، کیوں کہ کتاب کا کوئی صفحہ ایسا نہ تھا جہاں عشقیہ شعر نہ لکھے ہوئے ہوں۔

''اف اللہ!'' میں نے اپنا سر تھام لیا۔ ''انکل نے دیکھ لیا تو میرا کام ہو گیا۔''

میری جیب میں روپے موجود تھے۔ میں نے اس کتاب کو چھپایا اور دکان سے نئی کتاب خرید لایا۔ ابھی میں کتاب پڑھنے بیٹھا ہی تھا کہ حسیب آ دھمکا۔

''یار تو قیر!'' وہ بولا۔ ''اس نے انگلش کی کتاب منگوائی ہے۔''

''کیا۔۔۔؟'' میں چیخ اٹھا۔ ''یعنی کہ کتابوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ میری توبہ کہ میں اب کوئی کتاب دوں یا لوں۔'' میں نے صاف انکار کر دیا تھا۔

''مگر کیوں؟'' اس نے وجہ دریافت کیا اور میں نے اسے اردو کی کتاب دکھائی۔

''اب میں گارنٹی دیتا ہوں کہ وہ کچھ نہیں لکھے گی۔''

مجبوراً مجھے کتاب دینی پڑی۔ اسی وقت انکل اسد نے مجھے بلایا۔

''تو قیر! بازار سے کچھ سامان تو لے آؤ۔'' انہوں نے مجھے سامان کی تفصیل بتائی اور روپے دیے۔

''آؤ اکٹھے چلتے ہیں۔'' میں نے حسیب کو کہا اور ہم باہر نکل آئے۔

''آؤ پہلے یہ کتاب دے دیں۔۔۔ سڑک پار سامنے والا گھر ہے۔'' اس نے گھر بتایا اور میں اس اتفاق پر حیران رہ گیا کہ ہمارے گھر کے بالکل سامنے والا سڑک کی دوسری جانب ان کا گھر تھا۔

حسیب نے دروازہ کھٹکھٹایا اور دروازہ کھولنے والی شخصیت کو دیکھ کر میں دم بخود رہ گیا۔ میں شاید حسن کے اس پیکر کو سحر زدہ ہو کر دیکھتا ہی رہتا مگر حسیب نے مجھے ٹہوکا مارا۔

''یار! کتاب تمہارے ہاتھ میں ہے، اسے دے دو۔'' میں بے اختیار چونک اٹھا اور خفت کے ساتھ کتاب اس خوب صورت لڑکی کی جانب بڑھائی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر مجھ سے کتاب لی اور اس دوران اس کی انگلیاں میری انگلیوں سے مس ہوئیں اور میں کانپ کر رہ گیا۔

''آپ کہاں سے آئے ہیں؟'' اس لڑکی نے

متبسم آواز کے ساتھ سوال کیا اور میں سوچنے لگا کہ کیا واقعی یہ سوال مجھ سے کیا گیا ہے۔

''بتاؤ تم کہاں سے آئے ہو؟'' حسیب نے مجھے پھر ٹہوکا مارا۔

''مم۔۔۔ مم۔۔۔ میں خانیوال سے آیا ہوں۔'' میں بوکھلا گیا تھا۔ ''ہمارا وہ سامنے والا گھر ہے۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' اس نے دھماکا کیا۔ ''میرا نام فرزانہ شاہ ہے، آپ کا۔۔۔؟''

''مم۔۔۔ مم مجھے تو قیر حیدر شاہ کہتے ہیں۔''

''آپ کا شکریہ کہ آپ نے مجھے کتاب۔۔۔ دی آپ ایک منٹ رکیں میں ابھی آئی۔''

زمین کا جادو دروازے سے غائب ہوا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سب کچھ بے رنگ ہو گیا ہو۔ میرے دل کی اس وقت عجیب حالت تھی۔

''شاید میں محبت کر بیٹھا ہوں۔'' میں نے سوچا۔ اس وقت میری عمر سولہ سال تھی اور یہ وہ عمر ہوتی ہے جب نئے نئے جذبے دل کی بستی میں جنم لیتے ہیں۔ فطرت کی ہر چیز خوب صورت لگتی ہے۔

وہ ایک منٹ سے پہلے ہی دروازے پر نمودار ہو گئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی اور ایک چھوٹا سا لڑکا اس کے ساتھ تھا۔

''یہ کتاب آپ پڑھ لیجئے گا۔'' اس نے میری جانب ایک کتاب بڑھائی۔

''یہ میرا چھوٹا بھائی ہے، حیدر علی!'' فرزانہ شاہ نے اپنے بھائی کا تعارف کروایا۔

''شکریہ۔'' کتاب لیتے ہوئے میں نے کہا۔

''یقیناً آپ کی طرح ضرور اچھی ہو گی۔'' میں نے یہ فقرہ تو کہہ دیا مگر اس کے چہرے پر آئی ہوئی شرم کی دھنک نے مجھے بہت کچھ بتا دیا۔ میں نے اس کے چھوٹے بھائی کو پیار کیا اور جیب سے دس روپے نکال کر اسے دیے۔ ''امید ہے آپ سے ملاقات ہوتی رہے گی۔'' میں نے کہا اور اسے ہکا بکا دروازے پر کھڑا چھوڑ کر حسیب کے ساتھ آگے چل دیا۔ چند قدم چلنے کے بعد میں نے واپس مڑ کر دیکھا تو وہ حسن کا پیکر مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

میں نے گھر آ کر فرزانہ شاہ کی کتاب کھولی۔ وہ کہانیوں کی ایک عام سی کتاب تھی مگر اس میں خاص بات ایک خط کی موجودگی تھی جو فرزانہ شاہ نے میرے نام لکھا تھا۔

''پیارے لڑکے! جب سے آپ کو دیکھا ہے، دل میں عجیب سے جذبوں نے جنم لیا ہے۔ آپ مجھے بہت اچھے لگے ہیں، شاید میں آپ سے محبت کر بیٹھی ہوں۔ میں یہ خط لکھ تو رہی ہوں مگر سوچتی ہوں کہ آپ کو دے بھی پاؤں گی کہ نہیں۔ اگر یہ خط آپ کو مل جائے تو جواب ضرور دیں۔ شکریہ! فرزانہ شاہ۔''

میں خط پڑھ کر دم بخود رہ گیا۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے مجھے دنیا جہاں کی دولت مل گئی ہو۔ جس کو دل نے چاہا وہ یوں آسانی سے مل گیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔

میں نے اردو کی تیاری کو پس پشت ڈالا اور جواباً خط لکھ ڈالا۔ جس میں، میں نے اپنے دل کا حال بھی لکھ ڈالا۔ دوسرے دن میں اسکول سے گھر آیا ہی تھا کہ اس کا چھوٹا بھائی حیدر علی آ گیا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور کہا۔

''بھائی تو قیر! باجی نے یہ کتاب دی ہے اور اپنی کتاب منگوائی ہے۔'' میں نے اس سے انگلش کی کتاب لی اور کہانیوں کی کتاب میں جواب ڈالا اور اسے کتاب دے دی۔

''اپنی باجی کا شکریہ ادا کرنا۔'' میں نے کہا۔

جب وہ چلا گیا تو میں نے انگلش کی کتاب کھولی۔ اس وقت میری خوشی دو چند ہو گئی جب میں نے اندر ایک خط کو دیکھا۔ خط فرزانہ شاہ نے میرے نام لکھا تھا۔

''تو قیر حیدر شاہ!'' وہ مجھے مخاطب کر کے لکھتی تھی۔ ''کل آپ سے ملاقات ہوئی، ایسا لگا جیسے مجھے دنیا جہاں کی دولت مل گئی ہو۔ میں آپ سے ایک درخواست کرتی ہوں کہ آپ صبح اسکول سے چھٹی

کریں اور مجھے صبح دس بجے گھر پر ملیں۔ آپ کی اپنی فرزانہ شاہ۔''

میں نے خط کو چوما اور مسکرا کر جیب میں ڈال لیا۔

☆☆☆

ہماری دوسری ملاقات بھی عجیب تھی۔ میں نے دس بجے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ جیسے میرے ہی انتظار میں دروازے سے لگی کھڑی تھی۔

''مجھے یقین تھا کہ آپ ضرور آئیں گے۔'' وہ بولی۔

''آیئے! باہر کیوں کھڑے ہیں، اندر آجائیں۔''

''مم۔۔۔مم۔۔۔مگر آپ کے گھر والے۔''

میں نروس ہوگیا تھا۔

''گھبرائیں مت! گھر میں کوئی نہیں ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کی مسکراہٹ بے حد جان دار تھی۔ میں جھجکتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔

اس نے مجھے ایک کمرے میں بٹھایا اور میرے لیے چائے لے آئی۔

میں چائے پیتے ہوئے اس حسن کی دیوی کو دیکھتا رہ گیا۔ نجانے کتنی دیر گزر گئی مجھے کچھ خبر نہیں۔ وقت جیسے ساکت ہوگیا تھا، ہم دونوں خاموش تھے مگر ہماری آنکھیں بے باک ہو رہی تھیں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں کئی باتیں ہوئیں، پھر فرزانہ شاہ بولی۔

''توقیر! تم خانیوال میں کہاں رہتے ہو؟''

میں نے اسے اپنے گاؤں کے بارے میں بتایا اور پھر باتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس نے بتایا کہ اس کے گھر والے ایک شادی میں گئے ہوئے ہیں۔ ہم باتوں میں اس قدر محو ہوئے کہ دن کا ایک بج گیا۔

''اوہ، ایک بھی بج گیا۔'' میں بولا۔ ''مجھے اب چلنا چاہیے۔'' یہ کہہ کر میں کھڑا ہوگیا۔

''آپ پھر بھی آئیں گے نا؟'' اس نے امید سے پوچھا۔ ''میں آپ کا تعارف امی اور اپنی بڑی باجی سے کرواؤں گی۔''

میں نے اس سے وعدہ کیا اور واپس آ گیا۔

☆☆☆

بزرگ ٹھیک کہتے ہیں کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ ہماری محبت کا علم بھی فرزانہ کے گھر والوں کو ہو گیا اور ہوتا بھی کیسے نہیں۔ مجھے اُس نے اپنی امی سے ملوایا تھا اور اب میں اکثر اس کے گھر میں بیٹھ کر اُس سے باتیں کرتا رہتا تھا۔ میں نے اس کی تمام کتابوں میں خط ڈالا تھا۔ اس کی امی نے ایک دن مجھے اپنے پاس بٹھایا اور مجھ سے کہا۔

''توقیر بیٹے! مجھے معلوم ہے کہ فرزانہ اور تم آپس میں محبت کرتے ہو مگر بیٹے ہماری محلے میں عزت بنی ہوئی ہے اس لیے کچھ احتیاط کیا کرو اور یہ بات اپنے پلو میں باندھ لو کہ میں اپنی بیٹی کا ہاتھ اس ہاتھ میں دوں گی جو معاشی طور پر مضبوط ہوگا اور اس کی اچھی جاب ہوگی۔''

''آنٹی! آپ پریشان نہ ہوں۔'' میں بولا۔ ''میں آپ کی بیٹی کو زندگی کا ہر سکھ دوں گا۔''

کہنے کو تو میں نے کہہ دیا مگر یہ بات کر کے نہ دکھا سکا۔ میں نے میٹرک کلیئر کر لیا۔ میں میٹرک میں پاس ہو جانے کو معجزہ ہی کہوں گا کیوں کہ محبت میں پڑھائی نہیں ہوتی اور جب سے میں نے محبت کی تھی، پڑھائی کو فراموش کر بیٹھا تھا۔

میں نے جاب کی تلاش شروع کر دی اور کالج میں داخلہ لے لیا۔ جاب نہ ملنی تھی نہ ملی۔ اس دوران فرزانہ شاہ نے بھی کالج جوائن کر لیا۔

گزرتے وقت کے ساتھ ہمارے درمیان محبت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی۔ محلے میں ہماری محبت مشہور ہو چکی تھی اور لوگ مجھے معنی خیز نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے۔

ایک دن میں فرزانہ سے ملا تو اس سے کہا۔

''اچھی لڑکی! میں کچھ دنوں کے لیے گاؤں جا رہا ہوں۔ ابو جی لینے آئے ہیں، پریشان مت ہونا۔''

اس نے شاکی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور کہا۔

''ایف ٹی ایچ!'' وہ مجھے ''ایف ٹی ایچ'' کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔ ''میں تمہارے بغیر کیسے رہ پاؤں گی؟'' اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے تھے۔ میں نے اس کے آنسوؤں کو اپنے ہونٹوں سے صاف کیا اور کہا۔

''میں جلد ہی آجاؤں گا۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی میں ابو کے ساتھ گاؤں چلا آیا۔ بڑی مشکل سے میں نے تین دن گھر میں گزارے اور واپس ملتان آیا مگر یہاں ایک بری خبر میری منتظر تھی۔

فرزانہ شاہ اور اس کے گھر والے مکان چھوڑ کر جا چکے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ جس گھر میں وہ رہ رہے تھے، وہ کرائے کا مکان تھا اور اب وہ کہاں گئے، کچھ خبر نہیں۔

میں گلی گلی انہیں تلاش کرتا رہا، غضب یہ ہوا کہ جس گھر میں، میں انکل کے ساتھ رہ رہا تھا، انکل نے بھی کسی وجہ سے وہ مکان چھوڑ دیا اور دوسرے محلے میں مکان کرائے پر لے لیا۔ اب فرزانہ شاہ مجھ سے رابطہ بھی نہ کر سکتی تھی۔

ایک دن میرے دوست حسیب نے مجھے بتایا کہ اس نے سراغ لگا لیا ہے کہ وہ کس محلے میں رہ رہے ہیں۔ میں فوری طور پر اس ایڈریس پر پہنچا اور اس گھر کے دروازے پر دستک دی جو مجھے حسیب نے بتایا تھا۔

دروازہ فرزانہ شاہ کی بڑی بہن نے کھولا۔

''تو تم یہاں بھی پہنچ گئے؟''

''پلیز آپ مجھے فرزانہ سے ملوا دیں۔'' میں نے درخواست کی۔

''اندر آجاؤ۔'' انہوں نے میری حالت پر رحم کھاتے ہوئے کہا اور میں اندر داخل ہو گیا۔ فرزانہ شاہ سے ملاقات ہوئی۔ وہ مجھے مل کر خوب روئی۔ اس نے بتایا کہ انہوں نے وہ محلہ میری وجہ سے ہی چھوڑا ہے کیوں کہ محلے والے امی سے شکایتیں کرنے لگے تھے۔ ہم نے بیٹھ کر خوب گلے شکوے کیے اور میں دوسرے دن کا وعدہ کر کے چلا آیا۔

دوسرے دن جب وہاں پہنچا تو میرے قدموں سے زمین ہی نکل گئی کہ گھر کے دروازے پر ایک بڑا تالا لگا ہوا تھا اور معلوم ہوا کہ وہ یہ گھر بھی چھوڑ کر جا چکے تھے۔

قارئین کرام! سمجھ لیں کہ میری داستان عشق یہیں تک ہے۔ اس کے بعد میں نے انہیں دو مرتبہ تلاش کیا اور دونوں مرتبہ وہ مکان چھوڑ کر چلے گئے۔ گویا وہ مجھ سے بھاگ رہے تھے۔ یہ جنوری کی ۲۴ تاریخ ۱۹۹۹ء کی بات ہے کہ میں سینما میں ''چوڑیاں'' فلم دیکھنے گیا، وہیں میں نے دیکھا کہ وہ تمام فیملی موجود ہے۔ ایک شخص کا اضافہ تھا۔ نجانے وہ کون تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ آدمی اٹھ کر باہر گیا تو میں ان کے پاس پہنچ گیا اور انہیں سلام کیا۔ وہ سب مجھ سے ملے فرزانہ شاہ نے مجھے دیکھ کر نقاب اتار دیا۔ اس نے بتایا کہ اس کی بڑی بہن کی شادی ہو گئی ہے اور جو آدمی ساتھ بیٹھا تھا، وہ بڑی بہن کا شوہر تھا۔ میں نے اس سے ایڈریس مانگا مگر اس نے نہیں دیا۔

''پلیز تو قیر! ہماری مجبوری ہے۔'' اسی وقت اس کی بڑی بہن کا شوہر آ گیا اور میں اٹھ کر واپس اپنی سیٹ پر آ گیا۔

میں اگر چاہتا تو ان کا پیچھا کر سکتا تھا مگر میں نے ایسا نہیں کیا اور فلم ادھوری چھوڑ کر ہی تمام عمر کے لیے جدائی کے عذاب میں تڑپنے کے لیے واپس آ گیا۔ بی اے کرنے کے بعد میں نے ملتان کو خیر باد کہہ دیا ہے اور اپنے گاؤں آ گیا ہوں۔ کچھ عرصہ تو مجھے اپنے محبوب کی کوئی خبر نہیں ملی مگر ایک دن میرا دوست حسیب مجھ سے ملنے آیا اور اس نے بتایا۔

''تو قیر! فرزانہ کی شادی ہو گئی ہے۔''

میں اس سے یہ بھی نہ پوچھ سکا کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا۔ بلکہ میں نے خود کو یہ کہتے ہوئے پایا۔

''وہ جہاں بھی رہے اللہ تعالیٰ اسے خوش رکھے۔''

ہڈی کی چوری

اقبال کاظمی

مشہور اور مقبول چور نک ویلوٹ کا تازہ ترین کارنامہ، اس بار نک کو بدنام زمانہ تنظیم مارفیا کے ایک اہم رکن کے لیے انسانی بازو کی ایک بے وقعت ہڈی چرانا پڑی۔

نک کے شیدائیوں کے لیے توشہ خاص

تمباکو نوشی تک ویلیوٹ کی عادت میں شامل نہیں تھی لیکن کبھی کبھار منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے وہ ایک آدھ سگریٹ پی لیا کرتا تھا۔ اس وقت بھی ریسٹورنٹ سے نکلتے ہوئے اس نے سگریٹ نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تھا لیکن سگریٹ کے پیکٹ سے پہلے اس کی انگلیاں جیب میں پڑی ہوئی کسی غیر مانوس چیز سے ٹکرائیں تو وہ چونک سا گیا۔ وہ ٹٹول کر یہ جاننے کی کوشش کرنے لگا کہ یہ کیا چیز ہوسکتی ہے۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ جیب میں اس نے سگریٹ کے پیکٹ اور ماچس کے سوا کچھ نہیں رکھا تھا لیکن اس وقت کسی اور چیز کی موجودگی نے اسے الجھا دیا۔ اچھی طرح ٹٹولنے کے بعد اسے ایک حد تک اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کوئی وزیٹنگ کارڈ یا اسی قسم کی کوئی چیز تھی۔ اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس نے اپنا یا کسی اور کا وزیٹنگ کارڈ اس جیب میں رکھا ہو۔ ایک لمحہ کو اس کے ذہن میں یہ خیال ابھرا تھا کہ ممکن ہے گھر میں گلوریا نے اس کی جیب میں ڈال دیا ہو اور اس کے بارے میں بتانا بھول گئی ہو۔

ریسٹورنٹ سے چند قدم آگے نکل کر وہ رک گیا اور جیب میں پڑی ہوئی وہ چیز نکال لی جو اس کے لیے الجھن کا باعث بنی ہوئی تھی۔ وہ ایک وزیٹنگ کارڈ ہی تھا۔ کریم کلر کا یہ پلاسٹک کارڈ دیکھنے میں خاصا قیمتی نظر آ رہا تھا۔ اس کے کونے پر سنہرا حاشیہ کھینچا ہوا تھا۔ نک ویلیوٹ نے پہلی ہی نظر میں تاڑ لیا تھا کہ اس حاشیے کی بناوٹ میں سونے کا پانی استعمال کیا گیا تھا۔ اس قسم کے مہنگے کارڈ رکھنا کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں تھی۔ کارڈ کے ایک طرف سرخ روشنائی سے شکستہ سی ہینڈ رائیٹنگ میں کچھ تحریر تھا اور دوسری طرف ابھرے ہوئے حروف میں کارڈ کے مالک کا نام اور پتا چھپا ہوا تھا۔ اس پر چھپائی میں بھی سونے کا پانی استعمال کیا گیا تھا۔

''مائیکل کارلیون۔ لانگ آئی لینڈ۔''

نک ویلیوٹ الجھ کر رہ گیا۔ یہ نام اس کے لیے اجنبی نہیں تھا لیکن اسے حیرت تھی کہ مافیا کے سربراہ کا یہ کارڈ اس کی جیب میں کیسے آ گیا تھا۔ صرف نک ویلیوٹ ہی کیا، امریکا کا بچہ بچہ مافیا کے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا۔ ہر قسم کے غیر قانونی کاروبار اس خوف ناک تنظیم کا کنٹرول تھا۔ یہ تنظیم مختلف گروہوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ہر گروہ کا کاروباری شعبہ بھی الگ تھا۔ اگر ایک گروہ جوئے کے اڈے چلا رہا تھا تو دوسرا گروہ منشیات کا کاروبار سنبھالے ہوئے تھا۔ جوئے کے اڈے چلانے والا گروہ اگر منشیات کے کاروبار

میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتا تو اسے دوسرے گروہ کے کام میں مداخلت سمجھا جاتا۔ پہلے تو افہام وتفہیم سے معاملہ طے کرنے کی کوشش کی جاتی لیکن مذاکرات میں ناکامی کی صورت میں قتل وغارت کا بازار گرم ہوجاتا۔ اگر ایک گروہ کا ایک آدمی مارا جاتا تو انتقامی کارروائی کے طور پر مخالف گروہ کے دو آدمیوں کی موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا اور اس طرح یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہتا جب تک کہ ایک گروہ اپنی شکست تسلیم نہ کرلیتا۔ تنظیم کے ان ہنگاموں میں کئی بے گناہ بھی مارے جاتے۔ ابھی پچھلے دنوں اس تنظیم کے دو گروہ آپس میں ٹکرا گئے تھے جس کے نتیجہ میں ایک گروہ کا سربراہ مارا گیا تھا۔ باپ کی موت کے بعد گروہ کی قیادت اس کے بیٹے مائیکل کارلیون نے سنبھال لی تھی۔ پورے امریکا میں جوئے کے کاروبار پر اسی گروہ کی اجارہ داری تھی۔

نک ویلیوٹ کے لیے یہ بات الجھن کا باعث بنی ہوئی تھی کہ مائیکل کارلیون کا یہ وزیٹنگ کارڈ اس کی جیب میں کیسے آ گیا تھا۔ اس نے گلوریا کے بارے میں سوچا پھر خود ہی نفی میں سر ہلا دیا۔ گلوریا اگر یہ کارڈ اس کی جیب میں رکھتی تو ضرور بتا دیتی۔ اب تصدیق کرنے کا موقع ہی نہیں تھا کیونکہ تقریباً دو گھنٹے پہلے گلوریا اپنی ایک دوست سے ملنے کے لیے لاس ویگاس روانہ ہوچکی تھی۔ اسے ایئرپورٹ پر چھوڑنے کے بعد ہی نک ویلیوٹ کچھ وقت گزارنے کے لیے اس ریسٹورنٹ میں آن بیٹھا تھا۔ سگریٹ کا پیکٹ اس نے آج صبح خریدا تھا اور دن بھر میں صرف ایک سگریٹ پیا تھا۔ اس وقت دوسرا سگریٹ نکالنے کے لیے ہی اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تھا کہ یہ کارڈ بیچ میں حائل ہوگیا اور وہ سگریٹ نکالنا بھول گیا۔ اس نے کارڈ پلٹ دیا اور سرخ روشنائی والی شکستہ تحریر پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔

''مسٹر ویلوٹ! کارڈ پر دیے ہوئے نمبر پر پہلی فرصت میں فون کرلو۔''

اس نے ایک بار پھر کارڈ پلٹ کر دیکھا۔ مائیکل کارلیون کے ایڈریس کے ساتھ لانگ آئی لینڈ کا فون نمبر بھی درج تھا۔ اسے حیرت تھی کہ اسے فون کرنے کا مشورہ کیوں دیا گیا تھا۔ وہ اپنے پچھلے کارناموں کے بارے میں سوچنے لگا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ نادانستگی میں کسی وقت مافیا سے ٹکرا گیا ہو۔ کسی ایسے شخص کے قبضے سے کوئی چیز چرائی ہو جس کا تعلق مائیکل کارلیون کے گروہ سے رہا ہو۔ لیکن کوشش کے باوجود اسے ایسا کوئی واقعہ یاد نہ آ سکا۔ وہ تو صرف ایسی چیزیں چراتا تھا جن کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی تھی۔ اس کے کاروبار کا کسی شخص یا تنظیم سے کوئی تعلق بھی نہیں تھا۔ کسی گروہ سے رقابت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایسی صورت میں یہ بات اس کے لیے باعث الجھن ہی تھی کہ مافیا کے ایک گروہ کا سربراہ اس سے کیا بات کرنا چاہتا تھا۔ یہ تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مائیکل کارلیون اس کے ذریعے کوئی چیز چوری کرانا چاہتا ہوگا۔ ان کے اپنے ذرائع لامحدود تھے۔ وہ لوگ بے پناہ وسائل کے مالک تھے۔ وہ کسی دوسرے کے کندھے پر بندوق رکھ کر گولی چلانے کے قائل نہیں تھے۔ وہ جو چاہتے خود حاصل کرسکتے تھے۔ انہیں نک ویلیوٹ جیسے شخص کی کیا ضرورت پیش آ سکتی تھی۔

اس نے کارڈ جیب میں ڈالا اور اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔ راستے میں فون بوتھ دیکھ کر اس کے قدم رک گئے۔ ایک لمحہ کو اس کے ذہن میں خیال ابھرا کہ کارڈ کے نمبر پر فون کرلینے میں کیا حرج ہوسکتا ہے۔ یہ سوچتے ہی وہ فون بوتھ میں داخل ہوگیا۔ جیب سے کارڈ نکال کر سامنے رکھا اور ریسور اٹھا کر مطلوبہ سکے ڈالنے کے بعد لانگ آئی لینڈ کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ دوسری گھنٹی پر ہی ریسور اٹھا لیا گیا اور دوسری طرف سے ایک بھاری آواز سنائی دی۔

''یس، بگین اسپیکنگ۔''

''میرا نام نک ویلیوٹ ہے اور میں مسٹر مائیکل کارلیون سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' نک نے کہا۔

''اوہیلو مسٹر نک! ہمیں امید تھی کہ تم پہلی فرصت میں رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرو گے۔ مسٹر مائیکل اس وقت مصروف ہیں۔ میں ان کا سیکریٹری ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تم اس وقت سینٹرل پارک کے علاقے میں موجود ہو۔ اگر تم ٹہلتے ہوئے لزارو بار کے سامنے والے پارکنگ لاٹ پر پہنچ جاؤ تو وہاں پر موجود ایک گاڑی تمہیں زیادہ سے زیادہ پینتالیس منٹ میں یہاں پہنچا دے گی۔ اس وقت تک مسٹر مائیکل بھی فارغ ہو چکے ہوں گے وہ ایک اہم مسئلہ پر تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں اس وقت سینٹرل پارک کے علاقے میں ہوں۔'' نک نے تعجب کا اظہار کیا۔

''میں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ چند منٹ پہلے تم جیری کے ریسٹورنٹ میں بیٹھے کافی پی رہے تھے۔'' دوسری طرف سے جواب ملا۔ ''بہرحال خیالی گھوڑے دوڑانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے دو آدمی صبح سے تمہاری نگرانی کر رہے ہیں۔ یہ کارڈ اس وقت تمہاری جیب میں ڈالا گیا تھا جب تم اپنی دوست کو رخصت کرنے ایئرپورٹ گئے تھے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ تمہاری دوست گلوریا اپنی ایک دوست سے ملنے لاس ویگاس گئی ہے۔ تم کیا ہو۔ ہمیں اس سلسلے میں بھی تمام معلومات حاصل ہیں۔ بہرحال، تم فون بند کر کے سیدھے لزارو بار کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ پارکنگ لاٹ میں داخل ہوتے ہی ہمارا آدمی تم سے خود رابطہ قائم کر لے گا۔''

''لیکن معاملہ کیا ہے۔ مسٹر کارلیون مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟'' نک نے بوتھ کے شیشوں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ مائیکل کے سیکریٹری ہیگن کو تمام معلومات حاصل ہونے کا مطلب یہ تھا کہ اس وقت بھی اس کی نگرانی ہو رہی ہوگی اور نگرانی کرنے والا کہیں آس پاس ہی موجود ہوگا۔ اسے حیرت تو اس بات پر بھی ہوئی تھی کہ مائیکل کا کارڈ ایئرپورٹ پر اس کی جیب میں ڈالا گیا تھا اور اسے اس بات کا قطعاً علم نہیں ہو سکا تھا۔ گویا وہ اس قدر غافل تھا کہ کسی کو اس کی جیب میں ہاتھ ڈالنے کا موقع مل گیا۔ وہ اس سوچ میں غرق تھا کہ کلک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اس نے آہستگی سے ریسیور ہک پر ٹانگا اور بوتھ سے باہر آ کر ایک بار پھر محتاط نگاہوں سے اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ لیکن کوئی بھی ایسا شخص دکھائی نہیں دیا جس پر کسی قسم کا شبہ کیا جا سکتا ہو اور پھر اس کے خیال میں مافیا جیسی تنظیم کے کارکن اتنے بے پروا نہیں ہو سکتے تھے کہ آسانی سے کسی کی نظروں میں آ جاتے۔

لزارو بار ایک فرلانگ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اسے وہاں پہنچنے میں پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ سڑک عبور کر کے جیسے ہی وہ پارکنگ لاٹ کے قریب پہنچا ایک آدمی اچانک ہی اس کے سامنے آ گیا۔ نک ویلیوٹ یہ اندازہ بھی نہیں لگا سکا تھا کہ وہ شخص کس طرف سے آیا تھا۔

''ہیلو مسٹر ویلیوٹ!'' وہ شخص اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ہونٹوں پر دوستانہ مسکراہٹ تھی۔ ''مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔ آ جاؤ۔ گاڑی اس طرف کھڑی ہے۔''

اسٹریٹ لیمپ کی روشنی میں نک ویلیوٹ نے بھرپور نگاہوں سے اس شخص کی طرف دیکھا۔ اس میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی تھی جس سے کسی قسم کا خوف محسوس کیا جا سکتا ہو۔ اس کے برعکس اجنبی کے چہرے پر شرافت تھی۔ اسے دیکھ کر تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ اس شخص کا تعلق مافیا جیسی خوفناک تنظیم سے ہوگا۔ اس کا انداز بھی ایسا ہی تھا جیسے کوئی شریف آدمی سرِ راہ اپنے کسی بچھڑے ہوئے دوست سے مل گیا ہو اور دوستی کی تجدید کے لیے اسے ایک ڈرنک کی دعوت دے رہا ہو۔

نک ویلیوٹ خاموشی کے ساتھ چل دیا۔ ایک سیاہ سیڈان کے قریب پہنچ کر اس شخص نے پچھلی نشست کا دروازہ کھول دیا اور نک کے بیٹھنے کے بعد

خود ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا اور انجن اسٹارٹ کر کے گاڑی کو سڑک پر لیتا چلا گیا۔ ٹریفک کے ہجوم میں شامل ہوتے ہی اس نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے سگریٹ کا ایک پیکٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر بولا۔ ''سگریٹ مسٹر ویلویٹ!''

نک ویلویٹ نے غیر ارادی طور پر سگریٹ کا پیکٹ لے لیا۔ اس وقت وہ بڑی شدت سے کسی ایسی چیز کی طلب بھی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا اور آگے جھک کر پیکٹ ڈیش بورڈ پر رکھنے کے بعد سیٹ کی پشت سے ٹیک لگالی اور سامنے لگے ہوئے عقبی منظر والے آئینے کی طرف دیکھتے ہوئے لمبے لمبے کش لگانے لگا۔ کار میں اگرچہ تاریکی تھی لیکن پیچھے آنے والی گاڑیوں کے ہیڈ لیمپس کی روشنی کے باعث اسے آئینے میں ڈرائیور کے چہرے کا ہلکا سا عکس نظر آ رہا تھا۔ اس شخص کا موڈ خاصا خوش گوار تھا۔ وہ سیٹی میں شاید موسیقی کی کوئی مشہور دھن بھی بجا رہا تھا لیکن آواز اتنی ہلکی تھی کہ نک اس دھن کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ ابھی تک اس شخص نے نک سے کوئی بات نہیں کی تھی اور نہ ہی نک ویلویٹ نے اس سے کچھ معلوم کرنے کی کوشش کی تھی کہ مائیکل کاریلون اس سے کیوں ملنا چاہتا ہے۔ وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ ڈرائیور اس کی کسی بات کا جواب نہیں دے گا۔ اس لیے وہ خاموش بیٹھا سگریٹ کے کش لگاتا رہا۔ کار اب پرہجوم سڑک سے نکل کر جونز بیچ کے رن وے پر پہنچ گئی تھی۔ دن میں تو اس سڑک پر ٹریفک کا ہجوم رہتا تھا لیکن اس وقت رات کے گیارہ بجے اس کی گاڑی کے علاوہ کسی اور گاڑی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ یہاں روشنی کا انتظام بھی مناسب نہیں تھا۔ اس سڑک پر آتے ہی ڈرائیور نے گاڑی کی رفتار خطرناک حد تک بڑھا دی۔ اس راستے کا انتخاب بھی اس نے شاید اسی لیے کیا تھا کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ فاصلہ طے کیا جا سکے۔ راستے میں انہیں صرف ٹال بوتھ پر رکنا پڑا تھا۔ اس ٹال بوتھ پر مختلف نوعیت کی گاڑیوں کے گزرنے کے لیے متعدد منحرابی راستے بنے ہوئے تھے مگر اس وقت ٹریفک نہ ہونے کی وجہ سے ایک کے سوا تمام راستے بند تھے۔ ٹال بوتھ سے ٹکٹ لیتے ہی ڈرائیور نے کار کی رفتار ایک بار پھر تیز کر دی۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد نک ویلویٹ کو سامنے تیز روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔ وہ دن کے وقت بھی ایک دو مرتبہ اس طرف آ چکا تھا۔ ہائی وے سے ایک سڑک کٹ کر دائیں طرف چلی گئی تھی جہاں ہزاروں ایکٹر کا رقبہ اونچی خاردار تاروں میں گھرا ہوا تھا۔ ساحل کا کچھ حصہ بھی اس رقبے میں شامل تھا جسے پرائیویٹ پراپرٹی تسلیم کیا گیا تھا۔

اس خاردار جنگلے کے اندر عمارتوں کا ایک وسیع سلسلہ بھی تھا اور نک ویلویٹ لاکھوں، کروڑوں امریکیوں کی طرح آج تک اس حقیقت سے لاعلم تھا کہ لانگ آئی لینڈ کا خاردار تاروں میں گھرا ہوا ہزاروں ایکٹر کا یہ علاقہ مافیا کے اس گروہ کا ہیڈ کوارٹر تھا جس کی پورے امریکا میں جوئے اور قمار بازی کے کاروبار پر اجارہ داری قائم تھی۔ دور سے نظر آنے والی روشنیاں اس گیٹ کی تھیں۔ جہاں کم از کم ایک درجن مسلح محافظ موجود تھے۔ ان کی گاڑی کو گیٹ پر صرف ایک لمحہ کو روکا گیا تھا۔ مزید ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد گاڑی ایک عمارت کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ نک ویلویٹ کے نیچے اترنے سے پہلے ہی ایک شخص کار کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھول دیا۔ نک نیچے اتر آیا اور اس شخص کی معیت میں عمارت کے اندر داخل ہو گیا جہاں متعدد آدمی اِدھر سے اُدھر آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں سے کسی نے بھی نک ویلویٹ پر توجہ نہیں دی تھی اور یہ بات تو نک پہلی ہی نظر میں محسوس کر چکا تھا کہ عمارت میں گھومنے والا ہر شخص مسلح تھا۔

نک ویلویٹ کو ایک آراستہ دفتر میں پہنچا دیا گیا

تھا جہاں مائیکل کارلیون کے سیکریٹری ہیگن نے گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا۔

''مسٹر کارلیون آپ کے منتظر ہیں مسٹر ویلویٹ!'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ گٹھے ہوئے جسم کا ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ چہرے کے نقوش اسے چلی کا باشندہ ظاہر کررہے تھے۔ لہجہ بھی اس کی وطنیت کی چغلی کھا رہا تھا۔

ہیگن نے ایک اندرونی دروازہ کھول کر اندر جھانکا پھر نک ویلویٹ کو اشارہ کرتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔ دفتر کا یہ کمرا نہایت عالی شان طریقہ سے آراستہ تھا۔ شیشے کی بڑی میز کے پیچھے اس خوف ناک تنظیم کا سربراہ مائیکل کارلیون بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر نک ویلویٹ دنگ سا رہ گیا۔ اس کی عمر تیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ مردانہ وجاہت کا پیکر اور چہرے پر ایسا بھولپن کہ اسے دیکھ کر تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ مافیا جیسی خوف ناک تنظیم کا سربراہ ہوسکتا ہے۔

تعارف ہونے کے بعد کچھ دیر تک رسمی سی گفتگو ہوتی رہی پھر مائیکل اس قسم کی باتیں کرنے لگا جن سے نک کو یہ تاثر دینا مقصود تھا کہ وہ اس کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے لیکن گفتگو کا یہ انداز سو فیصد دوستانہ تھا۔ نک نے ایک مرتبہ بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ مائیکل ان دنوں کا حوالہ دے کر اسے بلیک میل کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ اس قسم کا کوئی اشارہ نہیں ملتا تھا۔

''میں یہ جاننا چاہتا ہوں مسٹر مائیکل! کہ مجھے یہاں کیوں بلایا گیا ہے؟'' نک نے بالآخر اسے اصل موضوع کی طرف لانے کی کوشش کی۔

''بات یہ ہے مسٹر ویلویٹ! کہ میں تمہارے ذریعے ایک چیز چوری کرانا چاہتا ہوں اور اس کے لیے نہ صرف تمہاری مطلوبہ فیس ادا کی جائے گی بلکہ کامیابی کی صورت میں بونس بھی دیا جائے گا۔'' مائیکل نے بات شروع کرتے ہوئے کہا۔

''کیا۔۔۔؟'' نک ویلویٹ بری طرح چونک گیا۔ ''اتنے وسیع ذرائع اور وسائل ہونے کے باوجود آپ میری خدمات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔''

''اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے وسائل لامحدود ہیں۔ اگر میں چاہوں تو مطلوبہ چیز چند گھنٹوں کے اندر اندر میری میز پر پہنچ سکتی ہے لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ میں خود یا اپنے کسی آدمی کو اس معاملے میں ملوث نہیں کرنا چاہتا بلکہ اس میں ہمارا نام بھی نہیں آنا چاہیے۔ میں آپ کے بارے میں اطمینان کرچکا ہوں کہ آپ کسی راز کو راز ہی رکھتے ہیں اسی لیے آپ کو زحمت دے رہا ہوں۔'' مائیکل نے کہا۔

''تو پھر آپ میری شرائط سے بھی آگاہ ہوں گے مسٹر مائیکل!'' نک ویلویٹ نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

''بہت اچھی طرح۔'' مائیکل مسکرایا۔ ''یقین کرو میں جو چیز چوری کرانا چاہتا ہوں اس کی نہ تو کوئی تاریخی حیثیت ہے اور نہ قدر و قیمت۔ اگر تم اسے بیچنا بھی چاہو گے تو کوئی ذی ہوش انسان اسے ایک سینٹ میں بھی خریدنے کو تیار نہیں ہوگا۔''

''وہ کیا چیز ہے۔'' نک نے پوچھا۔ اب وہ مائیکل کی باتوں میں دلچسپی لے رہا تھا۔ اسے حیرت تھی کہ ایسی کیا چیز ہوسکتی ہے جسے کوئی شخص ایک سینٹ میں بھی خریدنے کو تیار نہ ہو۔ حالانکہ اس نے آج تک جتنی بھی چیزیں چرائی تھیں، ان کی اصل اہمیت سے قطع نظر، ان کی کوئی نہ کوئی معقول قیمت ہوسکتی تھی۔

''ایک ہڈی۔۔۔'' مائیکل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''ہڈی۔۔۔؟'' نک ویلویٹ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اگر اس ہڈی کا تعلق کسی میوزیم سے نہیں تھا تو وہ یقیناً ایسی چیز تھی جس کے لیے کوئی شخص ایک سینٹ خرچ کرنے کو تیار نہیں ہوسکتا۔

''کیسی ہڈی۔ میں سمجھا نہیں۔'' نک نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ کہنی سے کندھے تک کی انسانی بازو کی ہڈی

ہے جو اس وقت ہندوستان سے آئے ہوئے ایک جوتشی کے قبضے میں ہے۔ سیواداس نامی یہ ہندو جوتشی ان دنوں لاس ویگاس کے شیراٹن ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ مشرق کے پراسرار علوم کے بارے میں تم نے بھی بہت کچھ سن رکھا ہوگا۔ سنا ہے کہ سیواداس ایسے ہی پراسرار علوم کا ماہر ہے اور لاس ویگاس کے لوگوں میں خاصی مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ جوئے میں جیت کے خواہش مند لوگ اس سے رجوع کر رہے ہیں۔ وہ اپنے جنتر منتر کے ذریعے لوگوں کو ایسی باتیں بتا دیتا ہے کہ وہ چند ڈالر لے کر کسی جوئے خانے میں داخل ہوتے ہیں اور جب باہر نکلتے ہیں تو ان کی جیبیں نوٹوں سے بھری ہوتی ہیں۔ اس کے جادو کا تمام تر دارومدار اس ہڈی پر ہے۔ تمہیں شاید یہ بھی معلوم ہو کہ میرے صرف ایک اشارے پر وہ جوتشی روئے زمین سے غائب ہوسکتا ہے لیکن ایک معمولی سی بات کے لیے میں کسی کے خون سے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتا۔ ایک آدمی نے اسے کچھ رقم کی پیش کش کرتے ہوئے لاس ویگاس چھوڑنے کا مشورہ دیا تھا لیکن وہ اپنی ضد پر قائم ہے۔ اس کے علاوہ ہندو جوتشی وہاں کے لوگوں میں خاصی مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ اگر اسے زبردستی وہاں سے ہٹانے کی کوشش کی گئی تو کوئی بڑا ہنگامہ جنم لے سکتا ہے۔ میں اس کے ساتھ کوئی زیادتی بھی کرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے میں نے سوچا ہے کہ کیوں نہ اس کی وہ جادو کی ہڈی چرا لی جائے جس کے بل بوتے پر وہ جوئے کے شوقین لوگوں کو اپنا گرویدہ بنائے ہوئے ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہڈی چھن جانے کے بعد وہ ادھورا رہ جائے گا۔ یہ ایک نفسیاتی حربہ ہے جس سے وہ اس حد تک متاثر ہوگا کہ وہ اپنے علوم کا خاطر خواہ استعمال نہیں کر سکے گا۔ اس طرح لوگ رفتہ رفتہ اس سے بدظن ہونے لگیں گے اور کچھ عرصہ بعد وہ خود ہی مایوس ہو کر لاس ویگاس چھوڑ دے گا۔ اس کے بعد وہ ہڈی اسے لوٹا دی جائے گی۔ اگر پسند کرو تو یہ کام بھی تمہارے ہی توسط سے ہوگا۔ مائیکل نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''میری ایک شرط یہ بھی ہے کہ میں ایسا کوئی کام نہیں کرتا جس سے کسی کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔'' نک نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

''اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اسے وہاں آئے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے لیکن وہ اتنا کچھ کما چکا ہے کہ ایک سال تک کوئی کام بھی نہ کرے تو نوابوں کی سی زندگی بسر کر سکتا ہے اور پھر ہڈی اسے لوٹا دی جائے گی جس سے وہ ایک بار پھر کہیں اور جا کر دولت سمیٹنے لگے گا۔''

''اگر وہ ہندو جوتشی تمہارے کاروبار میں مداخلت کیے بغیر تھوڑی سی دولت سمیٹ رہا ہے تو تمہیں کیا اعتراض ہے۔ میرا خیال ہے تمہیں اس سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت تو نہیں۔'' نک ویلویٹ نے کہا۔

''یہ درست ہے کہ وہ ہمارے کاروبار میں عملی طور پر کوئی مداخلت نہیں کر رہا لیکن اس کے عقیدت مندوں کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہو رہا ہے اس کا آشیرباد حاصل کرنے کے بعد لوگ جب لمبی لمبی بازیاں جیت کر جوا خانوں سے نکلتے ہیں تو نقصان ہمارا ہی ہوتا ہے۔ اگر یہی صورت حال رہی تو چند ماہ بعد ہمیں وہاں اپنا کاروبار بند کرنا پڑے گا۔'' مائیکل چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا پھر میز کی دراز سے خاکی رنگ کا ایک پھولا ہوا لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''اس میں تمہاری مطلوبہ فیس کے علاوہ لاس ویگاس تک کا ہوائی ٹکٹ موجود ہے۔ تم اس ہوائی کمپنی کی کسی بھی پرواز سے جا سکتے ہو۔ ایک بات اور۔۔۔ تم پر کوئی دباؤ نہیں ہے اگر تم چاہو تو انکار بھی کر سکتے ہو۔ اس کام کے لیے کسی اور کا انتخاب کر لیا جائے گا لیکن تمہیں محض اس لیے ترجیح دیتا ہوں کہ تم اصولوں کے تحت کام کرتے ہو اور تم پر ہر لحاظ سے اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ تمہارے لیے ایک اور پیش کش بھی ہے۔ تمہاری دوست گلوریا بھی آج ہی لاس ویگاس گئی ہے۔ اگر تم بھی پہنچ جاؤ تو تفریح کا

بہترین موقع ہوگا۔ میرا کارڈ پیلے ہوٹل کے منیجر کو دکھا دینا جو ہوٹل کا بہترین سوئٹ تمہارے لیے مخصوص کردے گا۔ مجھے امید ہے کہ ایک معمولی سے کام کے لیے اتنے عمدہ معاوضے کی پیش کش آج تک کسی نے نہیں کی ہوگی۔

نک ویلویٹ چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر لفافہ اٹھالیا۔ اس کے ساتھ ہی مائیکل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی آ گئی۔ وہ ہیگن کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ہیگن! فریڈی سے کہو مسٹر ویلویٹ کو واپس چھوڑ آئے۔''

نک ویلویٹ نے لفافہ کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھا اور مائیکل سے ہاتھ ملا کر کمرے سے باہر آ گیا۔

☆☆☆

لاس ویگاس کے روشنیوں سے جگمگاتے ہوئے ایئرپورٹ پر نک ویلویٹ طیارے سے اترا تو رات کے دو بج رہے تھے۔ لاس ویگاس میں قمار بازی کا سیزن شروع ہو چکا تھا۔ امریکا کے کونے کونے سے قسمت آزمائی کے شوقین یہاں کا رخ کر رہے تھے۔ ایسے میں کسی ہوٹل میں کمرا حاصل کر لینا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ چنانچہ نک ویلویٹ نے فیصلہ کرلیا کہ رات کے اس آخری پہر ہوٹل گردی کرنے کے بجائے مائیکل کارلیون کی پیش کش سے فائدہ اٹھایا جائے۔ ایئرپورٹ سے نکلتے ہی ایک ٹیکسی میں سوار ہو کر اس نے ڈرائیور کو پہلے ہوٹل چلنے کی ہدایت کردی۔

میکسیکو کی سرحد پر واقع ریاست نیواڈا کا سب سے بڑا شہر لاس ویگاس پوری طرح جاگ رہا تھا۔ چاندنی رات میں بجلی کی رنگ برنگی روشنیاں عجیب سا تاثر دے رہی تھیں۔ وہ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے ان لوگوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جو قسمت آزمائی کے لیے یہاں آتے تھے اور اپنا سب کچھ جوئے میں ہار کر چلے جاتے تھے۔ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہوتی جو جیتنے میں کامیاب ہو پاتے لیکن اب مائیکل کے کہنے کے مطابق اس ہندو جوتشی کی وجہ سے جوئے خانوں میں داخل ہونے والا ہر شخص جیبیں بھر کر لوٹ رہا تھا۔ نک ویلویٹ یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ یہاں ہندو جوتشی کا پراسرار علم کام کر رہا تھا۔ جوئے خانوں کے منتظمین کی وجہ سے اپنے ہتھکنڈوں میں کامیاب نہیں ہو پا رہے تھے۔

نک ویلویٹ نے یوں تو مشرق کے پراسرار علوم کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا لیکن کسی ایسے شخص سے ملنے کا اتفاق کبھی نہیں ہوا تھا جو اپنے علم کے بل بوتے پر لوگوں کی قسمت بدل دینے پر قادر ہو۔ مائیکل کے کہنے کے مطابق جوتشی سیوداس کے جادو کا تمام تر دارومدار اس انسانی ہڈی پر تھا جو ہر وقت اس کے ہاتھ میں رہتی تھی یہ ہڈی چھن جانے کے بعد وہ ناکارہ ہو کر رہ جاتا۔ نک ویلویٹ ایسے نفسیاتی حربوں سے بخوبی واقف تھا۔ اسے ایک وکیل کا واقعہ یاد آ گیا جس نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی کیس نہیں ہارا تھا۔ عدالت میں بحث کے دوران وہ ایک ہاتھ سے اپنے کوٹ کے سب سے اوپر والے بٹن کو مسلتا رہتا۔ ایک کیس کے دوران اس کے مخالف وکیل نے ملازم کو رشوت دے کر اس کے کوٹ کا وہ بٹن تڑوا دیا۔ اس روز عدالت میں بحث کے دوران وہ وکیل بار بار بہکنے لگا۔ اس کا ہاتھ بار بار کوٹ پر جاتا لیکن بٹن کو وہاں نہ پا کر نیچے لٹک جاتا۔ وہ بہت سیدھا سادا کیس تھا۔ اناڑی سے اناڑی وکیل بھی جیت سکتا تھا لیکن وہ وکیل کیس ہار گیا اور اس کے موکل کو سزا ہوگئی۔ وہ محض اس نفسیاتی حربے کی وجہ سے ناکام ہوگیا تھا۔ نک ویلویٹ سوچنے لگا کہ ممکن ہے جوتشی سیوداس کا جادو محض فراڈ ہو اور وہ صرف اپنی باتوں سے لوگوں میں اس حد تک اعتماد بحال کر دیتا ہو کہ لوگوں کی ناکامی بھی کامیابی میں بدل جاتی۔ گفتگو کرتے ہوئے وہ ہڈی سیوداس کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ ممکن ہے سیوداس اس ہڈی پر اعتقاد رکھتا ہو۔ ہڈی چھن جانے سے اس کا اپنا اعتماد پاش پاش ہوسکتا

تھا۔اس طرح اس کا جادو بھی اپنی حیثیت کھو بیٹھتا اور وہ یہاں سے اپنا بوریا بستر سمیٹنے پر مجبور ہو جاتا۔

نک جب بیلے ہوٹل پہنچا تو پونے تین کا وقت ہو رہا تھا۔ استقبالیہ کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی خوب صورت لڑکی کے ہاتھ میں کوئی ناول تھا لیکن اس کا سر سینے پر جھکا ہوا تھا اور آنکھیں بند تھیں۔ نک کاؤنٹر کے سامنے کھڑا چند لمحوں تک اونگھتی ہوئی لڑکی کو دیکھتا رہا پھر اس نے بڑے اطمینان سے اس کے ہاتھ سے کتاب کھینچ لی۔ لڑکی نے گڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں اور اسے گھورتے ہوئے بولی۔

''اس وقت کوئی کمرا خالی نہیں ہے کہیں اور جا کر کوشش کرو۔ اگر چاہو تو کسی پارک میں بھی رات بسر کر سکتے ہو۔ کوئی تم سے باز پرس نہیں کرے گا۔''

''لیکن مجھے تو بتایا گیا تھا کہ اس ہوٹل کا سب سے بہترین سوئٹ میرے لیے مخصوص کیا جا سکتا ہے۔'' نک اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

''یہ بیلے ہوٹل ہے۔ جہاں پر ہفتوں پہلے ریزرویشن کرانا پڑتی ہے۔ سیزن میں تو یہاں کوئی کمرا خالی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایونیو کی طرف چلے جاؤ۔ شاید وہاں کے کسی ہوٹل میں تمہیں جگہ مل جائے۔''

''نہیں، اس وقت کہیں جگہ نہیں مل سکتی۔ میرا خیال ہے یہ کارڈ شاید میری کوئی مدد کر سکے گا۔'' نک نے کہتے ہوئے مائیکل کارلیون کا سنہری حاشیے والا وزیٹنگ کارڈ جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

کارڈ دیکھتے ہی لڑکی اپنی جگہ سے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے ذہن پر طاری نیند کا خمار چھٹ چکا تھا۔ اس نے کاؤنٹر کی ایک دراز کھول کر اندر جھانکا پھر دراز بند کرتے ہوئے معذرت طلب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''معاف کرنا مسٹر ویلیوٹ! اگر تم پہلے ہی بتا دیتے تو اس بحث کی ضرورت پیش نہ آتی۔ واقعی بیلے کا بہترین سوئٹ تمہارا منتظر ہے۔''

نک ویلیوٹ نے جواب دینے کے بجائے محض مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔ لڑکی کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل آئی۔ نک اس کی رہنمائی میں چلتا ہوا لفٹ میں داخل ہو گیا جس نے چند سیکنڈ میں انہیں آٹھویں منزل پر پہنچا دیا۔ لفٹ سے نکل کر لڑکی نے راہداری کا آخری دروازہ کھول دیا اور نک کو اندر پہنچانے کے بعد مسکراتے ہوئے بولی۔ ''لیونگ روم کے بار کیبنٹ میں دنیا کی بہترین شراب کی چند بوتلیں موجود ہیں۔ جنہیں تم پوری آزادی سے استعمال کر سکتے ہو۔''

لڑکی کے جانے کے بعد نک نے دروازہ بند کر دیا اور خواب گاہ میں آ کر لباس تبدیل کیے بغیر بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ کچھ دیر بعد ہی وہ نیند کی آغوش میں پہنچ چکا تھا۔

جب بے دار ہوا تو دس بج رہے تھے۔ دھوپ کھڑکی کے راستے اندر آ رہی تھی۔ اس نے غسل کر کے لباس تبدیل کیا اور فون پر ناشتے کی ہدایت دے کر دوسرے کمرے سے ہوتا ہوا بالکونی میں آ گیا۔ یہ سوئٹ ایک نشست گاہ اور دو بیڈ رومز پر مشتمل تھا۔ بالکونی سے شہر کے اس پار میڈوبھیل کا جھلملاتا ہوا نیلگوں پانی نظر آ رہا تھا۔ دائیں طرف کچھ فاصلے پر بولڈر ڈیم تھا جسے لاس ویگاس کی سب سے بڑی تفریح گاہ کہا جاتا تھا۔ اس تفریح گاہ کو شکاری عورتوں کی جنت بھی سمجھا جاتا تھا۔

دروازے پر دستک کی آواز سن کر نک ویلیوٹ نشست گاہ میں آ گیا۔ اس نے بیرونی دروازہ کھول دیا۔ ویٹر تھا جو ناشتے کی ٹرالی لیے کھڑا تھا۔ اس نے اندر آ کر میز پر ناشتا سجا دیا اور ٹرالی کے نچلے حصہ پر رکھا ہوا اخبار بھی اٹھا کر میز کے ایک کونے پر رکھ دیا۔ ناشتے کے دوران نک ویلیوٹ اخبار کے صفحات بھی الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ آخری صفحہ پر اسے جوئشی سیوا داس کی طرف سے شائع کیا جانے والا وہ اشتہار نظر آ گیا جس میں لوگوں کو اپنے مسائل کے حل کے لیے اس سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا گیا تھا۔ اشتہار کے اوپر دائیں اور بائیں کونے پر دو کراس

کرتی ہڈیوں کے بیچ میں ایک کھوپڑی کا نشان بھی دیا گیا تھا جو عام طور پر پراسرار علوم یا خطرے کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

ناشتے کے بعد نک ویلویٹ نے گلوریا کی دوست کے گھر فون کیا لیکن پتا چلا کہ وہ دونوں اپنی ایک تیسری دوست کے ساتھ پکنک منانے کے لیے صبح سویرے ہی بولڈ ڈریم جاچکی ہیں اور رات سے پہلے ان کی واپسی متوقع نہیں۔ نک فون بند کر کے کمرے سے باہر آ گیا۔ ہوٹل کے صدر دروازے سے نکلتے ہوئے اس نے کلائی کی گھڑی کی طرف دیکھا۔ بارہ بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔ گویا آدھا دن جاچکا تھا۔ وہ کچھ دور تک پیدل چلتے ہوئے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا کہ اس کا تعاقب تو نہیں کیا جارہا۔ اس کے خیال میں مائیکل کی طرف سے بیلے جیسے مہنگے ہوٹل میں مفت رہائش کی پیش کش بلاوجہ نہیں تھی۔ وہ لوگ یقیناً اسے نگاہ میں رکھنا چاہتے تھے۔ یہ رات اس نے مجبوری کی حالت میں بیلے ہوٹل میں گزاری تھی کیونکہ رات کے تین بجے کسی ہوٹل میں جگہ ملنا واقعی ناممکن تھا۔ اب سب سے پہلے اسے اپنی رہائش ہی کا انتظام کرنا تھا تاکہ اگر مائیکل کے آدمی اس کی نگرانی کررہے ہوں تو ان سے نجات حاصل کی جاسکے۔

تقریباً ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جب اسے یقین ہوگیا کہ اس کی نگرانی نہیں ہورہی تو وہ ایونیو کی طرف مڑگیا۔ رات ہوٹل کی استقبالیہ کلرک نے اسے ایک اچھی راہ سجھائی تھی کہ اگر وہ کوشش کرے تو ایونیو کے کسی تھرڈ کلاس ہوٹل میں جگہ مل سکتی ہے۔ اس وقت ایونیو کی طرف جانے کا مقصد بھی یہی تھا۔ بیلے سے غائب ہونے کے بعد مائیکل کے دو آدمی اسے بڑے بڑے ہوٹلوں میں تلاش کرتے پھریں گے۔ اتنا تو وہ سوچ بھی نہ سکیں گے کہ وہ کسی انتہائی گھٹیا ہوٹل میں منتقل ہو چکا ہے۔

گرینڈ ہوٹل کے صرف نام ہی میں کشش تھی۔ اس کے برعکس اسے مرغیوں کا ڈربہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ شہر بھر کے بدمعاش اسی ہوٹل میں رکتے ہیں۔ کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی سیاہ فام لڑکی نے سفید دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور جب تک ویلویٹ نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا تو وہ سر سے پیر تک اس کا جائزہ لینے لگی۔ نک نے جیب سے پانچ ڈالر کا ایک نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

”اگر تم چند روز کے لیے ایک کمرا دے سکو تو انعام کی حق دار بھی بن سکتی ہو۔“

لڑکی کے دانت ایک بار پھر چمکنے لگے۔ اس نے نوٹ اٹھا کر بلاؤز میں ٹھونس لیا اور کی بورڈ سے ایک چابی اتار کر اس کی طرف بڑھا دی۔

”دوسری منزل پر چلے جاؤ۔ روم نمبر سترہ۔ یہ کمرہ مائیکو کے نام ریزرو ہے لیکن وہ ان دنوں شہر سے باہر گیا ہوا ہے اور ایک ہفتہ سے پہلے اس کی واپسی کی توقع نہیں ہے۔ امید ہے اس وقت تک تم جاچکے ہوگے یا کہیں اور انتظام کرلوگے۔“

نک اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اوپر جانے والے زینوں کی طرف بڑھ گیا۔ روم نمبر سترہ ایک ڈربہ ہی ثابت ہوا جس میں آہنی اسپرنگوں والا ایک پلنگ بچھا ہوا تھا۔ دراصل ایک بڑے کمرے کو لکڑی کی پارٹیشن کے ذریعے چار حصوں میں تقسیم کردیا گیا تھا۔ ساتھ والے کیبن سے ایک مرد اور ایک عورت کے ہنسنے کی آواز سنائی دے رہی تھیں۔ دفعتاً عورت کی ہنسی رک گئی اور اس کی زبان سے غلیظ گالیوں کا طوفان امڈ پڑا جس کے جواب میں چٹاخ کی زوردار آواز ابھری۔ غالباً مرد نے عورت کے منہ پر تھپڑ رسید کیا تھا اور اس کے بعد دھینگا مشتی کی آوازیں سنائی دینے لگیں جن میں گالیوں اور غراہٹوں کی آواز بھی شامل تھی۔

نک ویلویٹ نے اپنے پلنگ کی طرف دیکھا جس پر بچھے ہوئے میٹریس میں ایک جگہ سے آہنی اسپرنگ جھانک رہا تھا۔ وہ ذرا سنبھل کر بستر پر بیٹھ گیا۔ یہ جگہ اگرچہ کسی شریف آدمی کے رہائش کے قابل نہیں تھی لیکن روپوشی کے لیے اس سے بہتر کوئی

اور جگہ ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ اسے بیٹھے ہوئے ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ سیاہ فام لڑکی میلا سا رجسٹر بغل میں دبائے کمرے میں داخل ہوئی اور رجسٹر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

''اپنا نام، پتا اور آنے کا مقصد اس رجسٹر میں لکھ دو اور جتنے دن رہنا ہو پانچ ڈالر یومیہ کے حساب سے پیشگی کرایہ بھی دے دو۔''

پانچ ڈالر کرایہ اگرچہ بہت زیادہ تھا مگر نک ویلویٹ نے رجسٹر میں اندراج کرنے کے بعد جیب سے پرس نکالا اور پینتیس ڈالر کی رقم نکال کر لڑکی کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دی۔ پرس میں نوٹ بھرے ہوئے دیکھ کر لڑکی کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔

''اگر کسی وقت تنہائی محسوس کرو تو مجھے بلا لینا۔''

لڑکی نے رجسٹر سنبھالا اور نوٹ بلاؤز میں ٹھونستے ہوئے باہر نکل گئی۔

دوسرے کیبن سے دھینگا مشتی کی آوازیں بند ہوگئی تھیں۔ غالباً وہ دونوں جا چکے تھے۔ نک ویلویٹ کچھ دیر تک بستر پر بیٹھا رہا پھر اٹھ کر دروازہ بند کرتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ ہوٹل سے کافی دور نکل آنے کے بعد وہ ایک ریسٹورنٹ میں گھس گیا۔ لنچ کا وقت تھا۔ کھانے پینے کی اشیا فروخت کرنے والے اسٹالوں اور ریستورانوں میں کافی بھیڑ تھی۔ بیئر کے ساتھ ایک سینڈوچ کھانے کے بعد وہ ریسٹورنٹ سے باہر آ گیا اور ایک ٹیکسی میں سوار ہوتے ہوئے اسے شیراٹن کی طرف چلنے کی ہدایت کی۔

شیراٹن ہوٹل کی تیسری منزل کا ایک سوئٹ ہندوستانی جوشی سیوا داس کے نام مخصوص تھا۔ یہ سوئٹ چار کمروں پر مشتمل تھا جس میں ضرورت کے مطابق کچھ تبدیلیاں کی گئی تھیں۔ پہلا چھوٹا کمرا استقبالیہ کا کام دے رہا تھا۔ اس سے ملحق ویٹنگ روم تھا جس کے سامنے والا کمرا سیوا داس کی سیکریٹری کے لیے مخصوص تھا اور آخری کمرے میں وہ خود بیٹھتا تھا۔ استقبالیہ پر بیٹھی ہوئی لڑکی کو دیکھ کر نک ویلویٹ ایک لمحہ کو تو پلکیں جھپکانا بھول گیا۔ وہ ہندو جوتشی کے حسنِ ذوق کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ نک چند لمحے پلک جھپکائے بغیر اس لڑکی کی طرف دیکھتا رہا پھر اس کی نظریں کھلے ہوئے دروازے سے ویٹنگ روم میں رینگ گئیں جہاں تقریباً ایک درجن افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی اور ظاہر ہے وہ سیوا داس سے ملاقات کے لیے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔

''یس، پلیز!'' لڑکی نے مسکراتے ہوئے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

''یہاں آنے کا صرف ایک ہی مقصد ہوسکتا ہے۔'' نک بھی جواباً مسکرا دیا۔ ''ویسے اگر مسٹر سیوا داس بہت زیادہ مصروف ہوں تو بیچ کا وقت تمہارے ساتھ بھی گزار سکتا ہوں۔''

''مسٹر سیوا داس سے ملاقات کے لیے تمہیں کم از کم تین دن انتظار کرنا پڑے گا اور ظاہر ہے میں تین دن تمہارے ساتھ نہیں گزار سکتی۔''

''تین دن۔۔۔؟'' نک ویلویٹ چونک گیا۔ ''کیا اس سے پہلے بات نہیں ہوسکتی؟''

''ناممکن۔'' لڑکی نے جواب دیا۔ ''ملاقات کے لیے پہلے وقت لینا پڑتا ہے، تم اپنا نام، پتا اور فون نمبر لکھوا دو۔ تمہیں اطلاع دے دی جائے گی۔''

''نام لکھ لو اور تیسرے دن صبح میں خود آ کر معلوم کرلوں گا۔ آج نٹالی میں ڈنر کے بارے میں کیا خیال ہے؟ سنا ہے جین فونڈا بھی آج وہاں آنے والی ہے۔'' نک نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''کیا واقعی۔۔۔؟'' لڑکی کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔

''میرا تعلق ہالی ووڈ کی فلم انڈسٹری سے ہے۔ بہت سے اداکاروں اور اداکاراؤں سے میرے قریبی تعلقات ہیں۔ اکثر فنکار لاس ویگاس آتے رہتے ہیں۔ اگر تم چاہو تو میں بہت سے نامور فنکاروں سے تمہاری ملاقات کرا سکتا ہوں۔''

''ایسی صورت میں مجھے تمہاری دعوت منظور ہے اور ہاں، میں کوشش کروں گی کہ کل صبح مسٹر سیواداس سے تمہاری ملاقات کرادوں۔ کیا تم شام چھ بجے مجھے یہاں مل سکتے ہو؟''

''کیوں نہیں۔ مجھے کچھ ضروری کام ہیں۔ لیکن اس وقت تک میں یقیناً فارغ ہوجاؤں گا۔'' نک ویلیویٹ نے جواب دیا اور اس جوڑے کی طرف دیکھنے لگا جو کمرے میں داخل ہورہا تھا۔ اس نے لڑکی کو وش کیا اور مسکراتے ہوئے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

کلارا سے ہوٹل کی لابی ہی میں ملاقات ہوگئی اس وقت نک بڑی شدت سے کافی کی طلب محسوس کر رہا تھا۔ ہوٹل سے باہر نکل کر اس نے کلارا سے جب اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''میرا خیال ہے کافی پینے کے لیے کسی ریسٹورنٹ میں جانے کی ضرورت نہیں۔ میرا اپارٹمنٹ یہاں سے قریب ہی ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں وہاں پہنچ جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ چلو اس بہانے تھوڑی دیر آرام بھی کرلوں گا۔ دن بھر کی مصروفیات نے بری طرح تھکا ڈالا ہے۔'' نک نے جواب دیا۔ ویسے یہ حقیقت تھی کہ بلا مقصد سڑکوں پر گھومتے رہنے سے وہ بری طرح تھک گیا تھا۔

کلارا کی رہائش ایک آٹھ منزلہ عمارت کے ایک مختصر سے اپارٹمنٹ میں تھی۔ دو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ کلارا کے بیان کے مطابق ایک اور لڑکی بھی اس کے ساتھ اس فلیٹ میں رہائش پذیر تھی جو ان دنوں اپنی بیمار بہن کی عیادت کے لیے لاس اینجلز گئی ہوئی تھی۔ اپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہی کلارا نے سب سے پہلے کافی بنائی اور کپ چھوٹی میز پر رکھ کر لباس تبدیل کرنے کے لیے باتھ روم میں گھس گئی۔

وہ لوگ ٹھیک آٹھ بجے فلیٹ سے نکل گئے۔ آدھے گھنٹے بعد وہ نٹالی کے وسیع و عریض ڈائننگ ہال میں موجود تھے۔ یہاں کا ماحول دیکھ کر کلارا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ کم حیثیت لڑکی نٹالی جیسے ریسٹورنٹ میں داخل ہونے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتی تھی چہ جائیکہ اس وقت وہ یہاں کھانا کھانے آئی تھی۔

جین فونڈایا کوئی اور نامور فن کار تو نظر نہیں آیا البتہ کھانا کھانے کے بعد نک ویلیویٹ نے ٹیلی ویژن کے تیسرے درجے کے ایک فن کار کو گھیر لیا جو غالباً قمار بازی میں قسمت آزمائی کے لیے لاس ویگاس آیا ہوا تھا۔ اس سے زبردستی کی شناسائی ظاہر کرتے ہوئے نک نے اس سے کلارا کا تعارف بھی کرادیا۔ کلارا اس اداکار کو ٹی وی کی دو تین فلموں میں دیکھ چکی تھی اور اس وقت وہ واقعی اپنی قسمت پر رشک کر رہی تھی۔ نک زیادہ دیر وہاں نہیں ٹھہرا اور کلارا کو لے کر ایک قریبی نائٹ کلب میں گھس گیا۔

جب وہ نائٹ کلب سے باہر نکلے تو رات کا ڈیڑھ بج چکا تھا۔ سڑک پر چلتے ہوئے نک ویلیویٹ نے اچانک ہی اس پر پریشانی کا اظہار کیا کہ دن بھر کی کاروباری مصروفیات کے باعث وہ کسی ہوٹل میں کمرا تک نہیں کرا سکا تھا اور اس وقت کسی ہوٹل میں کمرا ملنا ممکن نہیں تھا۔ کلارا نے اسے شب بسری کے لیے اپنے اپارٹمنٹ چلنے کی دعوت دی تو معمولی سے پس و پیش کے بعد اس نے دعوت قبول کرلی اور قریبی ٹیکسی اسٹینڈ پر پہنچ کر اس نے کلارا کے لیے ایک ٹیکسی کا دروازہ کھول دیا۔

نک ویلیویٹ اگر فلم لائن کا انتخاب کرتا تو یقیناً ایک کامیاب اداکار ثابت ہوتا۔ کلارا کو اس نے جس طرح شیشے میں اتارا تھا وہ بالکل نیچرل تھا۔ اس نے اگرچہ گرینڈ میں اپنے لیے کیبن بک کروالیا تھا لیکن شیرائن میں کلارا کو دیکھ کر اس نے اپنا پروگرام بدل دیا تھا اور اس وقت وہ کلارا کے کمرا میں لیٹا اس سے ہندوستانی جوتشی سیواداس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا، وہ اپنا میک اپ

صاف کررہی تھی۔

کلارا کو سیوا داس کی ملازمت اختیار کیے صرف ایک ہفتہ ہوا تھا۔ اس سے پہلے وہ ایک قمار خانے میں ویٹریس تھی جہاں آئے دن دنگا فساد ہوتا رہتا تھا جس کی وجہ سے اس نے قمار خانے کی ملازمت چھوڑ دی تھی۔ خوش قسمتی سے اس سے اگلے ہی روز سیوا داس کے پاس کام مل گیا۔ اس کے کہنے کے مطابق سیوا داس ایک پراسرار شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے سیوا داس کے پاس کچھ ایسے لوگوں کو بھی آتے دیکھا تھا جو جادو ٹونے پر یقین نہیں رکھتے۔

''میرا خیال ہے سیوا داس زیادہ عرصہ تک یہاں اپنا کاروبار جاری نہیں رکھ سکے گا۔'' اس نے کہا۔

''کیوں، اس کا کاروبار ماند پڑ رہا ہے کیا؟'' نک ویلویٹ نے پوچھا۔

''نہیں۔ بلکہ جس روز میں نے اس کی ملازمت اختیار کی تھی اس کے اگلے ہی روز میں نے مافیا کے ایک آدمی کو اس کے کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ میرا خیال ہے وہ لوگ اسے یہاں سے بھگا دیں گے۔'' کلارا نے بتایا۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ مافیا ہی کا آدمی تھا۔'' نک نے دل چسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ ''تم نے اسے کیسے پہچانا؟''

''ہاں میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ سیوا داس کے پاس آنے سے پہلے میں ایک قمار خانے میں ویٹریس تھی اور یہ تو تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ جوئے کے کاروبار پر مافیا کے ایک گروہ کی اجارہ داری ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ چند روز بعد یہ شہر جہنم کا نمونہ بننے والا ہے۔''

''کیوں، ایسی کیا بات ہونے والی ہے۔ کیا کوئی اور گروہ جوئے کا کاروبار شروع کررہا ہے؟''

''نہیں۔ جس طرح جوئے کے کاروبار پر ایک مخصوص گروہ کی اجارہ داری ہے اسی طرح منشیات کے بزنس پر ایک دوسرے گروہ کا قبضہ ہے لیکن کچھ عرصہ سے کوئی تیسرا گروہ منشیات کے کاروبار میں قدم جمانے کی کوشش کررہا ہے۔ پہلے گروہ کو شبہ ہے کہ جوئے کا کاروبار کرنے والا گروہ منشیات کے منافع بخش بزنس پر بھی قابض ہوجانا چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں آئے دن دونوں گروہوں میں تصادم ہوتے رہتے ہیں اس لیے میں نے جوئے خانے کی ملازمت چھوڑی تھی لیکن اب لگتا ہے کہ ہندو جوتشی کی ملازمت سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے کیوں کہ جوئے خانوں کے منتظموں کا خیال ہے کہ وہ اپنے علم سے جواریوں کو جیتنے کے گر بتا رہا ہے جس کی وجہ سے جوئے خانوں کو نقصان ہورہا ہے۔

''ہندو جوتشی کے بارے میں کوئی اور بات۔۔۔؟'' نک نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

''نہیں۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی۔ اس کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یہاں سے جائے گا نہیں۔ ایسی صورت میں قمار بازوں کا گروہ اسے ہراساں کرنے کے لیے دوسرے طریقے اختیار کرے گا اس صورت میں بھی میری ملازمت خطرے میں پڑ جائے گی۔''

''اگر تمہیں ہالی ووڈ کے کسی اسٹوڈیو میں جگہ مل جائے تو میرا خیال ہے تم اپنے لیے راستہ بنا سکتی ہو۔ عین ممکن ہے کسی ہدایت کار کی نظروں میں آجاؤ اور تمہیں فلموں میں بھی چانس مل جائے۔'' نک ویلویٹ نے کہا۔

''کیا ایسا ممکن ہے؟ کیا تم مجھے کسی اسٹوڈیو میں ملازمت دلا سکتے ہو؟'' کلارا کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی۔

''اس دنیا میں کسی بھی بات کو ناممکن قرار نہیں دیا جاسکتا۔ بہرحال میں سوچوں گا کہ تمہارے لیے کیا کیا جاسکتا ہے۔ تم نے جو تشویش انگیز صورت حال بتائی ہے اس کے پیش نظر تمہیں جلد سے جلد یہاں سے ہٹ جانا چاہیے۔''

☆☆☆

نک ولیویٹ کی آنکھ کھلی تو دن کے گیارہ بج چکے تھے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ کلارا موجود نہیں تھی لیکن میز پر اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک پرچہ پڑا ہوا تھا جس میں نک کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ فارغ ہوتے ہی شیراٹن پہنچ جائے۔ نک فوراً ہی باتھ روم میں گھس گیا۔ شیو بنانے اور پھر ناشتا کرنے میں آدھ گھنٹہ لگ گیا۔ وہ تیار ہو کر دروازے کی طرف بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھانا چاہا مگر رک گیا۔ چند لمحے فون کی طرف دیکھتا رہا پھر خاموشی سے باہر نکل گیا۔

شیراٹن تک پہنچنے میں دس منٹ لگے۔ کمرا استقبالیہ میں کلارا نے دل کش مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ انتظار گاہ میں حسب معمول بہت سے لوگ بیٹھے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔

''ملاقاتیوں کی فہرست میں ردوبدل کے بعد میں نے بڑی مشکل سے تمہارے لیے گنجائش نکالی ہے۔ تم فوراً سامنے والے کمرے میں چلے جاؤ اور یہ سلپ مسٹر سیوا داس کی سیکریٹری کو دے دینا۔'' کلارا نے کہتے ہوئے کاغذ کی ایک سلپ اس کی طرف بڑھا دی جس پر نک ولیویٹ کا بتایا ہوا فرضی نام اور کوئی نمبر لکھا ہوا تھا۔

وہ ویٹنگ روم سے گزرتا ہوا اس کے کمرے میں داخل ہو گیا جس پر سیکریٹری کی پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی اس کی آنکھوں میں چکا چوندی پیدا ہو گئی۔ اسے ایک بار پھر ہندو جوتشی کی قسمت پر رشک آنے لگا۔ کم بخت دنیا کی حسین ترین لڑکیوں پر قبضہ جمائے بیٹھا تھا۔ نک نے ہیلو کہتے ہوئے کاغذ کی سلپ سیکریٹری کی طرف بڑھا دی۔ اس نے سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے سلپ پیپر ویٹ کے نیچے رکھ دی اور نک کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

''تشریف رکھیے مسٹر فورڈ! ایک کلائنٹ اس وقت مسٹر سیوا داس کے کمرے میں موجود ہے۔ اس کے جاتے ہی آپ کو اندر بھیج دیا جائے گا۔ ویسے آپ کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں؟''

''میری بیوی گزشتہ تین روز سے لاپتا ہے۔ ہر جگہ تلاش کر کے مایوس ہو چکا ہوں۔ پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا کہ وہ اطلاع دیے بغیر کہیں گئی ہو۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں، مجھے یقین ہے کہ وہ بھی میری طرح میری جدائی میں تڑپ رہی ہوگی۔ مجھے ایک دوست نے بتایا تھا کہ مسٹر سیوا داس اپنے پراسرار علوم کے ذریعے میری بیوی کا سراغ لگا سکتے ہیں۔ اس کے لیے میں بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں۔'' نک ولیویٹ نے فرضی کہانی سناتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ بیوی کی گم شدگی نے واقعی اسے پاگل بنا رکھا ہے۔

سیکریٹری چند لمحے ہمدردانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اس کی گم شدہ بیوی اور خود اس کے بارے میں مختلف سوالات کرنے لگی جن کے وہ اوٹ پٹانگ سے جواب دیتا رہا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد میز پر رکھے ہوئے انٹرکام کا بزر بول اٹھا۔

''یس سر!'' سیکریٹری بٹن دباتے ہوئے بولی۔

''اگلے موکل کو بھیج دو۔'' انٹرکام پر ایک باریک سی آواز سنائی دی۔

سیکریٹری نے بٹن آف کرتے ہوئے ایک اندرونی دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ نک دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا لیکن اندر قدم رکھتے ہی وہ ٹھٹک گیا۔ کمرے کے تاریک ماحول میں اسے کچھ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ سامنے والی دیوار پر روشنی کا ایک ہلکا سا دھبا نظر آ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد جب اس کی آنکھیں کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں تو وہ متوحش نگاہوں سے اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ چاروں دیواروں پر اوپر سے نیچے تک سیاہ پردے لٹکے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن اسی لمحہ کمرے کے وسط میں ایک روشنی چمکی اور وہ چونک کر اس طرف دیکھنے لگا۔

ایک بہت بڑی میز تھی جس کے تین طرف زمین تک سیاہ پردے جھول رہے تھے۔ میز پر مختلف چیزوں کے علاوہ دو انسانی کھوپڑیاں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ جن کے درمیان ذرا پہلے انسانی بازو کی ایک ہڈی بھی موجود تھی۔ روشنی میز کے نیچے کسی جگہ سے خارج ہو رہی تھی اور روشنی کے حلقے نے جس چہرے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اسے دیکھ کر ایک لمحہ کو تو نک جیسے شخص کو بھی سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ دبلا لمبوترہ چہرہ، پیشانی پر سفید رنگ کی تین اوپر نیچے متوازی لکیریں، سر پر مخصوص انداز میں بندھی ہوئی سیاہ پگڑی جس کے سامنے کے رخ پر کوئی نگینہ جگمگا رہا تھا۔ سرخ انگارہ آنکھیں جیسے اپنے حلقوں سے باہر کو ابلی پڑ رہی تھیں۔ یہ پراسرار اور خوف ناک ماحول کسی بھی کمزور دل انسان کی حرکت قلب بند کرنے کے لیے کافی تھا۔

''بیٹھ جاؤ مسٹر فورڈ!'' نک کو ایک باریک سی منمناتی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ یہ آواز اس شخص کے ہونٹوں سے خارج ہوئی تھی یا کسی دیوار سے، بہرحال، وہ دھم سے میز کے سامنے پڑی ہوئی واحد کرسی پر بیٹھ گیا۔

''تم اپنی بیوی کی گم شدگی پر پریشان ہو۔ میں اس کے بارے میں سب کچھ بتا سکتا ہوں، وہ اس وقت کہاں ہے، کیا کر رہی ہے؟ تمہیں سب کچھ بتایا جا سکتا ہے، مگر پہلے سوڈالر۔ میری فیس۔'' جوتشی سیوا داس نے کہا۔

نک نے سوڈالر کا نوٹ نکال کر میز پر رکھ دیا جو سیوا داس کے ہاتھ میں پہنچ کر غائب ہو گیا۔ نک کو اس امر پر کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی کہ کچھ بتائے بغیر ہندو جوتشی اس کی آمد کے مقصد سے، وہ مقصد جو اس نے جوتشی کی سیکریٹری کو بتایا تھا، کیسے آگاہ ہو گیا تھا۔ جوتشی اپنے سامنے رکھے ہوئے پیڈ پر زائچہ بنانے لگا اور نک اس کے سیاہ لبادے کی طرف دیکھنے لگا جس پر عین دل کے مقام پر چمک دار سنہری دھاگے سے بچھو کڑھا ہوا تھا۔ لبادے کو ذرا سی حرکت ہوئی تو یوں محسوس ہوا جیسے بچھو اوپر کی طرف حرکت کر رہا ہو۔ اس کی نظریں بچھو سے ہٹ کر میز پر پڑی ہوئی انسانی بازو کی ہڈی پر جم گئیں۔ یہی وہ ہڈی تھی جس کے لیے مافیا کے سربراہ نے اسے پچیس ہزار ڈالر ادا کیے تھے۔ وہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ کیا واقعی یہ جادوئی ہڈی ہو سکتی تھی لیکن اس نے خود ہی اپنے اس خیال کی نفی کر دی۔ سیکریٹری کے کمرے سے لے کر یہاں تک ایسے جو تجربہ ہو چکا تھا اس کی بنا پر وہ کہہ سکتا تھا کہ جوتشی کا علم فراڈ سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ جو کچھ بیرونی کمرے میں سیکریٹری نے پوچھا تھا وہ ہی کچھ یہ جوتشی بتا رہا تھا۔ گویا وہ یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ بتائے بغیر وہ اس کی آمد کے مقصد سے آگاہ ہو چکا ہے۔ اس سے نک کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ سیکریٹری کے کمرے میں میز پر کوئی ایسا فون پوشیدہ تھا جس کا ریسیور جوتشی کے کان میں لگا ہوا تھا اور سیاہ رنگ کی بڑی سی پگڑی کی وجہ سے کسی دوسرے آدمی کے لیے اسے دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ یوں بھی کمرے کا ماحول ایسا تھا کہ یہاں داخل ہونے کے بعد عام آدمی کے ذہن پر عجیب سا طلسم یا خوف طاری ہو جاتا اور وہ کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ ہندو جوتشی جب یہاں آنے والوں کو پوچھے بغیر ان کے بارے میں سب کچھ بتا دیتا تو وہ اس کے پراسرار علوم کے قائل ہو جاتے۔ مگر ظاہر ہے نک ویلویٹ کا شمار عام آدمیوں میں نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کی نظریں ہڈی سے ہٹ کر کمرے کا طواف کرنے لگیں۔

دیواروں پر آویزاں سیاہ پردوں پر بھی سنہرے بچھو رینگتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ بائیں طرف کونے میں ایک انسانی ڈھانچہ کھڑا تھا۔ نیم تاریک ماحول اور سیاہ پردے کے پس منظر میں یہ ڈھانچہ بہت ہی خطرناک تاثر دے رہا تھا۔ اس ڈھانچے کو دیکھ کر نک ویلویٹ کے ذہن میں ایک دھماکا سا ہوا۔ وہ ایک بار پھر سیوا داس کی طرف دیکھنے لگا جو اس وقت ہڈی ہاتھ میں پکڑے مخصوص انداز میں زائچے کے اوپر گھما رہا تھا اس کے چہرے پر شیطانیت تھی۔

نک ویلویٹ ایک لمحہ کو یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اگر شیطان انسانی روپ اختیار کر لے تو وہ اس ہندو جوتشی سے مختلف نہیں ہوگا۔ جوتشی کچھ دیر تک ہڈی کو زائچے کے اوپر گھماتا رہا پھر ہڈی ایک طرف رکھتے ہوئے بولا۔

''بیوی کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں مسٹر فورڈ! وہ اس وقت شمال میں۔۔۔''

''بیوی کے بارے میں مجھے کبھی کوئی پریشان لاحق نہیں ہوئی مسٹر سیوا داس!'' نک نے اس کی بات کاٹ دی۔

''کیا مطلب۔۔۔؟'' جوتشی نے خوں خوار نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''اگر میں یہ کاروبار شروع کر دوں تو تم سے زیادہ کامیاب ثابت ہو سکتا ہوں۔ فون کے ذریعے آنے والوں کے بارے میں معلومات حاصل کر کے انہیں سحر زدہ کر دینا میرے نزدیک کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اس فراڈ میں تمہاری سیکریٹری واقعی کامیاب رول ادا کر رہی ہے، لیکن مطمئن رہو۔ میں کسی کو تمہارے اس راز سے آگاہ نہیں کروں گا۔'' نک نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تت۔۔۔تم کون ہو۔۔۔ مافیا؟'' سیوا داس کے چہرے پر پہلی مرتبہ خوف کی ہلکی سی جھلک نظر آئی لیکن اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پا لیا۔

''نہیں، میرا مافیا یا کسی اور تنظیم سے کوئی تعلق نہیں ہے، میں آزادرہ کر کام کرنا زیادہ پسند کرتا ہوں اور اس وقت بھی کاروبار ہی کے سلسلے میں تمہارے پاس آیا تھا جس کے لیے مجھے تمہاری فیس بھی ادا کرنا پڑی۔''

''تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟'' جوتشی نے اسے گھورا۔

''میں انسانی ہڈیوں کا کاروبار کرتا ہوں۔ کھوپڑیاں اور ڈھانچے تم جیسے لوگ ہی میرے بہترین گاہک ثابت ہوتے ہیں۔ اگر کسی ایسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے تمہاری خدمت کر کے بہت خوشی ہوگی۔ ہم آپس میں جو بھی کاروبار کریں گے وہ راز میں رہے گا۔'' اس نے ایک خوب صورت کارڈ سیوا داس کے سامنے رکھا جس پر صرف اس کا فرضی نام اور پتا لکھا تھا۔

ہندو جوتشی چند لمحے مشتبہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر آگے جھکتے ہوئے بولا۔ ''یہ ڈھانچہ جو تم دیکھ رہے ہو، میں نے برطانیہ سے خریدا تھا۔ ایک نہیں بلکہ دو ڈھانچے، لیکن پچھلے سال اٹلی کے دورے کے دوران ایک ڈھانچہ ضائع ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے حال ہی میں ہندوستان کا بھی دورہ کیا ہے لیکن کوشش کے باوجود مجھے کوئی ڈھانچہ دستیاب نہیں ہو سکا۔ تم جانتے ہو کہ اس قسم کی چیزیں ہمارے بزنس میں بہت مفید ثابت ہوتی ہیں۔ اگر تم ایک مکمل ڈھانچہ فراہم کر سکو تو منہ مانگے دام ادا کرنے کو تیار ہوں لیکن اس میں کوئی دھوکا نہیں ہونا چاہیے۔ آج کل پلاسٹک سے بھی یہ چیزیں مصنوعی طور پر تیار ہو رہی ہیں اور میں ایسی کوئی چیز پسند نہیں کرتا۔''

''میں بزنس میں بددیانتی کا قائل نہیں ہوں مسٹر سیوا داس! ویسے بھی میرا اصول ہے کہ کوئی چیز فروخت کرنے سے پہلے ٹرائیل کے لیے اپنے موکل کو فراہم فراہم کر دیتا ہوں۔ اگر وہ مطمئن ہو تو سودا فائنل ہوتا ہے۔ میں وہ ڈھانچہ کم از کم دو دنوں تک تمہارے پاس چھوڑ دوں گا۔ تمہارا اطمینان ہونے کے بعد ہی لین دین کی بات ہوگی، اگر سودا نہ بن سکا تو میں ڈھانچہ واپس لے جاؤں گا اور اس طرح بات ختم ہو جائے گی۔''

''آج جمعرات ہے۔ میں ہفتے کی صبح ڈھانچہ یہاں پہنچا دوں گا جو دو دن تک تمہارے پاس رہے گا۔ اتوار کی شام ہم رقم کے لین دین کی بات کریں گے۔ ویک اینڈ کا انتخاب میں نے اس لیے کیا ہے کہ عام دنوں میں تمہارا کاروبار متاثر نہ ہو اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کسی اور کو اس سودے کا علم نہ ہو سکے۔'' نک نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ میں ہفتے کی صبح تمہارا انتظار کروں گا اور یہ لو اپنے سو ڈالر۔'' جوشی نے کہتے ہوئے سو ڈالر کا نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔

''نہیں۔ تمہارا وقت ضائع ہوا ہے۔ اسے تم اپنی فیس سمجھ کر رکھ لو۔ میں ڈھانچے کے سودے میں اپنا یہ خسارہ پورا کرلوں گا۔'' نک مسکراتا ہوا اٹھ گیا۔

''واپسی کا راستہ اس طرف ہے۔'' سیوا داس نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کمرے کے کونے میں ایستادہ ڈھانچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ڈھانچے کے پیچھے سیاہ پردہ ایک طرف کو سرک چکا تھا اور اب وہاں ایک دروازہ نظر آرہا تھا۔ نک نے قریب سے گزرتے ہوئے ڈھانچے کی طرف دیکھا اور مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔

☆☆☆

چھ بجے تک کا وقت نک کو سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے ہوئے گزارنا پڑا اور پھر چھ بجے کے لگ بھگ وہ شیراٹن کے سامنے پہنچ گیا تھا۔ اس نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ اگر جوشی سیوا داس ہوٹل سے باہر نکلے تو اس پر نظر نہ پڑ سکے۔ وہ سڑک کے دوسری طرف ایک اسٹال کے پاس کھڑا اخبار دیکھتا رہا تقریباً پندرہ منٹ بعد کلارا ہوٹل کے صدر دروازے سے باہر نکلتی ہوئی نظر آئی۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھے بغیر بائیں طرف چلتی رہی۔ سڑک کے دوسری طرف نک ولیویٹ بھی اس کے متوازی چلتا رہا۔ کلارا کا رخ اپنے اپارٹمنٹ ہی کی طرف تھا۔

کلارا کے اپارٹمنٹ ہاؤس میں داخل ہونے کے بعد وہ بھی عمارت میں داخل ہوگیا۔ چند سیکنڈ بعد ہی وہ کلارا کے اپارٹمنٹ پر دستک دے رہا تھا۔ دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ کلارا اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

''میرا خیال ہے آج بھی مصروفیت کے باعث تم کسی ہوٹل میں کمرے کا انتظام نہیں کرسکے۔''

''تم نے یہ بات وقت سے پہلے کہہ دی۔ حالانکہ اس پریشانی کا اظہار آدھی رات کے لگ بھگ مجھے کرنا چاہیے تھے۔'' نک ولیویٹ اندر داخل ہوتے ہوئے بولا۔

''میری پیش کش برقرار ہے، تم جب تک لاس ویگاس میں ہو یہاں رہ سکتے ہو۔ کہو، کافی چلے گی؟'' کلارا بولی۔

''کیوں نہیں۔ میں اس وقت واقعی کافی کی طلب محسوس کررہا ہوں۔'' نک کہتے ہوئے ایک بیڈ پر نیم دراز ہوگیا۔

تقریباً دس منٹ بعد کلارا کافی بنا کر لے آئی۔ کافی پیتے ہوئے وہ اِدھر اُدھر کی باتیں بھی کرتے رہے۔ نک باتوں کو گھما کر جوشی کے موضوع پر آگیا۔

''اس ہندو جوشی کے بارے میں تمہارا خیال درست تھا۔ مافیا والوں نے اسے یہاں سے چلے جانے کی دھمکی دی ہے لیکن وہ بھی نہایت ہٹ دھرم واقع ہوا ہے میرا خیال ہے چار چھ روز میں یہاں ہنگامے شروع ہونے والے ہیں۔ اس لیے میرے خیال میں تمہیں اس سے پہلے ہی ملازمت چھوڑ دینا چاہیے۔ بہتر تو یہی ہوگا کہ تم کل ہی اسے جواب دے دو۔ ویک اینڈ کے بعد تم میرا خط لے کر ہالی ووڈ چلی جانا۔ میرا دوست تمہیں کسی اچھے اسٹوڈیو میں ملازمت دلا دے گا۔''

''کیا واقعی؟'' کلارا کی آنکھوں میں ایک بار پھر چمک ابھر آئی۔

''ہاں، میرا وہ دوست ایک معاملے میں میرا احسان مند ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ احسان کا بدلہ چکانے میں بخل سے کام نہیں لے گا۔'' نک ولیویٹ نے جواب دیا۔ اس نے غلط نہیں کہا تھا ہالی ووڈ میں موجود اس کے دوست کا تعلق اگرچہ فلم انڈسٹری سے نہیں تھا لیکن اس کا اتنا رسوخ تو بہرحال تھا کہ نک کے احسان کا بدلہ چکانے کے لیے کلارا کو کسی بھی اسٹوڈیو میں ملازمت دلا سکتا تھا۔

تقریباً آٹھ بجے وہ اپارٹمنٹ سے نکل آئے ایک فرسٹ کلاس ریسٹورنٹ میں کھانے سے نمٹنے

کے بعد وہ ایک ٹیکسی پر بولڈر ڈیم کی طرف روانہ ہوگئے۔ چاندنی رات میں تفریح کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ گزشتہ روز نک نے گلوریا کی دوست کے ہاں فون کیا تھا، لیکن اس سے ملاقات نہیں ہوسکی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ رات کو پھر فون کرے گا لیکن کلارا سے ملاقات کے بعد اس نے اپنا ارادہ بدل دیا تھا۔ وہ اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی خیال تھا کہ اگر کہیں اتفاق سے گلوریا سے آمنا سامنا ہوگیا تو وہ اسے آڑے ہاتھوں لے گی۔

بولڈر ڈیم کی رونق شباب پر تھی۔ یہاں لاتعداد قمار خانے اور چھوٹے چھوٹے ایسے ہوٹل بنے ہوئے تھے جن کے کمرے زیادہ سے زیادہ دو تین گھنٹوں کے لیے کرائے پر دیے جاتے تھے۔ اس سے ہوٹلوں کے مالکان کے علاوہ زیادہ سے زیادہ لوگ بھی فائدہ اٹھا رہے تھے۔

نک ویلویٹ ٹیکسی سے اتر کر کلارا کے ساتھ ساحل کے اس حصے کی طرف چلا گیا۔ جو بجلی کی روشنی سے منور ہو رہا تھا۔ یہاں پیراکی کرنے والوں کا ہجوم تھا۔ نک نے ایک اسٹال سے ٹکٹ خریدا اور اس پر لکھا ہوا نمبر پڑھتا ہوا متعلقہ کیبن کی تلاش میں چل پڑا۔ یہاں دو قسم کے کیبن کرائے پر ملتے تھے۔ ایک تو خالی لباس وغیرہ تبدیل کرنے کے لیے اور دوسرے ایسے کیبن جن میں پیراکی کا لباس وغیرہ بھی موجود ہوتا تھا۔ نک ویلویٹ نے جو کیبن حاصل کیا تھا وہ ڈبل تھا اور اس میں زنانہ اور مردانہ دونوں قسم کے لباس موجود تھے۔

کیبن میں لباس بدل کر وہ دونوں باہر آگئے اور پانی کی طرف دوڑے۔ چٹانی ساحل ہونے کی وجہ سے یہاں کا پانی شفاف تھا تقریباً ایک گھنٹے تک پیراکی سے لطف اندوز ہونے کے بعد وہ پانی سے باہر آگئے۔ کیبن کی طرف واپس جاتے ہوئے نک نے ایک ہاتھ سے کلارا کا بازو تھام رکھا تھا لیکن ابھی انہوں نے نصف راستہ ہی طے کیا تھا کہ نک ویلویٹ اس طرح رک گیا جیسے زمین نے پیر پکڑ لیے ہوں۔ اچانک ہی گلوریا کو اپنے سامنے دیکھ کر اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ گلوریا بھی پیراکی کے لباس میں تھی اور اس کے ساتھ اس کی دوست بھی تھی۔ گلوریا چند لمحے خوں خوار نظروں سے کلارا کو دیکھتی رہی پھر نک کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولی۔

''ہیلو نکی! میرا خیال تھا کہ تم نیویارک میں ہوگے اور شاید اتنے مصروف بھی کہ سر کھجانے کی فرصت نہ مل سکے۔''

نک ویلویٹ، گلوریا کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتا ہوا الگ لے گیا۔ ''دیکھو گلوریا! تمہارے نیویارک سے آنے کے بعد اس رات مجھے ایک کام مل گیا تھا جس کی وجہ سے مجھے یہاں آنا پڑا۔ میں نے یہاں آتے ہی تمہاری دوست کے گھر فون کیا تھا، مگر ملاقات نہ ہوسکی۔''

''شاید تمہیں یہی کام ملا تھا۔'' گلوریا نے کلارا کی طرف اشارہ کیا۔

''بزنس۔۔۔ مائی ڈیر سو فیصد بزنس۔۔۔ تم جانتی ہو کہ میں عورتوں کے پیچھے بھاگنے والا نہیں ہوں۔ محض بزنس کا معاملہ ہے۔'' نک نے بات بتائی۔

''اور یہ بزنس کب تک چلے گا؟'' گلوریا کے لہجے میں طنز بدستور تھا۔

''دو تین دن۔ تم دو ہفتے کی چھٹی لے کر آئی ہو، یہاں سے فارغ ہوتے ہی ہم لاس اینجلس چلیں گے۔ یاد ہے، پچھلی مرتبہ ہم نے وہاں کا پروگرام بنایا تھا، لیکن تمہارے باس نے چھٹی منظور نہیں کی تھی، جس کی وجہ سے ہمیں پروگرام منسوخ کرنا پڑا تھا۔''

''رشوت دے رہے ہو۔'' گلوریا نے اسے گھورا۔

''بالکل نہیں، تمہاری خوشی کے لیے ایک پروگرام ترتیب دے رہا ہوں اور دیکھو، اب تم کلارا کے سامنے برہمی کا اظہار نہیں کروگی۔''

''بہت خیال ہے اس کتیا کا۔'' گلوریا نے دانت کچکچائے۔ پھر اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ''ٹھہرے کہاں ہو؟''

''میں یہاں مافیا کا مہمان ہوں۔ اس وقت کے بعد اگر سر راہ ہمارا آمنا سامنا ہو بھی جائے تو لاتعلقی کا اظہار کرتے ہوئے مجھ سے دور ہی رہنا۔ چلو اب کلارا سے ملو۔'' نک کہتا ہوا گلوریا کو لے کر وہاں پہنچ گیا جہاں کلارا اور گلوریا کی دوست کھڑی تھی۔

نک ویلویٹ نے ان دونوں کا تعارف کرایا اور پھر چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد وہ ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔ کیبن میں لباس تبدیل کرنے کے بعد نک اور کلارا شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے وہ ایک نائٹ کلب میں گھس گئے جہاں دو بجے تک زندگی کے ہنگاموں سے لطف اندوز ہونے کے بعد اپارٹمنٹ واپس آ گئے۔ بولڈر ڈیم سے روانگی سے لے کر اب تک نک ویلویٹ نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ گلوریا کہیں ان کا تعاقب تو نہیں کر رہی تھی۔ یوں تو اسے امید تھی کہ گلوریا اس پر کسی قسم کا شبہ نہیں کرے گی۔ اس نے یہ مان لیا ہوگا کہ نک کو ایک کام ہی کے سلسلے میں یہاں آنا پڑا تھا اور کلارا کا ساتھ بھی کاروباری سلسلے ہی کی ایک کڑی تھا لیکن نک کے ساتھ کسی عورت کی موجودگی اس کے لیے ہمیشہ ناقابل برداشت رہی تھی۔ ساحل پر گلوریا کو دیکھ کر نک کے دیوتا کوچ کر گئے تھے وہ تو یہی سمجھ رہا تھا کہ گلوریا کسی بھی لمحے جنگلی بلی کی طرح کلارا پر جھپٹ پڑے گی لیکن غنیمت تھا کہ خیریت ہی رہی۔ اسے گلوریا کی اس نرم مزاجی پر حیرت بھی ہوئی تھی۔

نک ویلویٹ کی یہ رات بھی پچھلی رات سے مختلف نہیں گزری تھی۔ لیکن آج صبح وہ جلد بے دار ہو گیا۔ کلارا بے خبر سو رہی تھی۔ لیکن چند ہی منٹ بعد اس کی آنکھ بھی کھل گئی اور تقریباً ایک گھنٹے بعد جب دونوں تیار ہو کر اپارٹمنٹ سے باہر نکلے تو اس وقت دس بج رہے تھے۔ کلارا نے فلیٹ کی ایک چابی نک کے حوالے کرتے ہوئے بتایا کہ آج وہ اپنی ملازمت سے استعفا دے آئے گی۔

سڑک پر وہ کچھ دور تک ساتھ چلے تھے۔ پھر کلارا تو شیراٹن کی طرف مڑ گئی اور نک ویلویٹ ایک ٹیکسی پر میڈیکل آرٹ میوزیم کی طرف روانہ ہو گیا۔ تقریباً بیس منٹ بعد وہ ٹیکسی سے اتر کر میوزیم کے گیٹ میں داخل ہو رہا تھا۔ میوزیم ابھی کھلا ہی تھا اس لیے زیادہ لوگوں کی آمد و رفت نہیں تھی۔ وہ مختلف شعبے دیکھتا ہوا لائبریری روم میں داخل ہو گیا جہاں میز کے پیچھے ایک سیاہ فام عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نیگرو عورت کے علاوہ لائبریری روم میں اس وقت اور کوئی نہیں تھا۔ نک ویلویٹ ٹہلتا ہوا میز کے قریب پہنچ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

''یس پلیز، کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتی ہوں۔'' عورت نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم چاہو تو میری بہت بڑی مشکل حل کر سکتی ہو۔ اس کے ساتھ ہی تمہیں ایک معقول رقم کمانے کا موقع بھی مل سکتا ہے۔'' نک ویلویٹ آگے کو جھکتا ہوا بے تکلفانہ لہجے میں بولا۔

''کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں۔'' عورت نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''مجھے دو دن کے لیے ایک ڈھانچے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے میں معقول معاوضہ ادا کرنے کو تیار ہوں۔''

''اس کے لیے تمہیں میوزیم کے ڈائریکٹر سے بات کرنا چاہیے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ انکار کر دے گا۔ میوزیم کی کوئی چیز باہر نہیں جا سکتی۔''

''دیکھو مس!'' نک ویلویٹ اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ''میں ایک فلم ساز ہوں۔ اپنی فلم کی شوٹنگ کے لیے مجھے ایک انسانی ڈھانچے کی ضرورت ہے۔ ڈائریکٹر سے بات کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ مجھے دو تین دن ضائع کرنے ہوں گے۔ میرا مطلب ہے پہلے باقاعدہ درخواست

دی جائے پھر ڈسکشن کی جائے گی اور تب کہیں جا کر ڈھانچہ ملے گا تم یہاں کی لائبریرین ہو تمہارے بھی کچھ اختیارات ہیں۔ اگر تم چاہو تو مجھے ان تمام جھمیلوں سے بچا سکتی ہو۔ کل اور پرسوں میوزیم بند رہے گا۔ اس دوران میں فلم کے ڈھانچے والے مناظر کی عکس بندی مکمل کرلوں گا۔ اگر تم ذرا سا تعاون کرو تو کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی کہ ڈھانچہ میوزیم سے باہر گیا تھا۔'' نک ویلویٹ نے کہا اور پھر سرگوشیانہ لہجے میں اسے اپنا منصوبہ سمجھانے لگا۔ عورت کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہوگئے۔ نک ویلویٹ اس کی اس کیفیت کو تاڑ گیا۔ اس کے خیال میں لوہا گرم ہو چکا تھا اور اسے آخری چوٹ لگانے کی ضرورت تھی۔ اس نے جیب سے ایک لفافہ نکال کر میز پر آگے سرکا دیا اور کرسی چھوڑتے ہوئے بولا۔

''اسے سنبھال لو اور مجھے وقت بتا دو۔ میں گاڑی لے کر پہنچ جاؤں گا۔''

نیگرو عورت چند لمحے سوچ کی کیفیت میں مبتلا رہی پھر اس نے لفافہ اٹھا کر میز کی دراز میں ڈال دیا اور نک کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

''میں رات آٹھ بجے تمہارا انتظار کروں گی۔ لیکن اس معاملے میں میرا نام نہیں آنا چاہیے۔''

''مطمئن رہو۔ کسی کو خبر تک نہ ہوگی۔'' نک کہتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

رات کے ٹھیک آٹھ بجے اسٹیشن ویگن نما ایک گاڑی میڈیکل آرٹ میوزیم کی عقبی گلی میں آ کر رکی۔ اسٹیئرنگ کے سامنے نک ویلویٹ بیٹھا ہوا تھا۔ انجن بند کر کے وہ میوزیم کے عقبی دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ چند سیکنڈ بعد ہی دروازے کے ساتھ والی کھڑکی میں جگنو کی سی روشنی چمک کر معدوم ہوگئی۔ نک گاڑی سے اتر کر محتاط انداز میں چلتا ہوا دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور اندر کی تاریکی کے پس منظر میں ایک عورت کا ہیولا دکھائی دیا۔ وہ نیگرو لائبریرین تھی۔

''تمہارے پاس زیادہ سے زیادہ دس منٹ ہیں۔ گارڈ کو میں نے کافی لینے کے لیے بھیج دیا ہے۔ اگر وہ جلدی واپس آ گیا تو ہم دونوں کے لیے مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔'' وہ نک کو اندر آنے کا راستہ دیتے ہوئے بولی۔

نک فوراً ہی واپس مڑ گیا اور گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر کارڈبورڈ کا ایک بکس نکال لیا۔ یہ بکس تقریباً چھ فٹ لمبا اور چوڑا تھا۔ اونچا اتنا تھا کہ اس میں ایک آدمی آسانی سے لیٹ سکتا تھا۔ بکس زیادہ بھاری نہیں تھا۔ وہ اسے کندھے پر لاد کر دروازے میں داخل ہو گیا اور نیگرو عورت کی رہنمائی میں چلتا ہوا اس ہال میں پہنچ گیا جس میں مختلف ڈھانچے شو کیسوں میں رکھے ہوئے تھے۔ وہ شیشے کی ایک الماری کے قریب رک گیا۔ تالا کھولنے میں اسے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ اس نے ڈھانچہ نکال کر بڑی احتیاط سے بکس میں رکھا اور الماری کا دروازہ بند کر کے بکس کندھے پر لاد لیا۔ اس دوران نیگرو عورت محدود روشنی والی ٹارچ سے روشنی دکھاتی رہی تھی۔

''اتوار کی رات دس بجے اس دروازے کے قریب میرا انتظار کرنا۔ مجھے یقین ہے کہ چھٹیوں کی وجہ سے اس دوران ڈھانچے کی گمشدگی کا پتا نہیں چلے گا۔ اگر اتفاق سے یہ راز کھل بھی گیا تو تم لاعلمی کا اظہار کر دینا۔ مجھے یقین ہے تم پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔'' نک نے دروازے کے قریب رک کر کہا اور باہر نکل گیا۔

بکس کو گاڑی میں رکھ کر اس نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ دوسرے ہی لمحہ انجن اسٹارٹ ہوا اور گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھنے لگی۔ یہ چونکہ کمرشل علاقہ تھا اور یہاں زیادہ تر تجارتی کمپنیوں کے دفاتر تھے جو زیادہ سے زیادہ پانچ چھ بجے تک بند ہو جاتے تھے اس لیے گلی میں کسی اور شخص سے آمنا سامنا نہیں ہوا۔ مگر مین روڈ پر ٹریفک کا ہجوم تھا۔ نک کی اسٹیشن ویگن بھی گلی سے نکل کر ٹریفک کے اس سیلاب میں شامل ہوگئی۔

وہ تقریباً آدھے گھنٹے بعد اپارٹمنٹ ہاؤس کے سامنے پہنچ گیا۔ گاڑی کو پارکنگ پلاٹ پر روک کر بکس کندھے پر لادا اور عمارت میں داخل ہوگیا۔ اوپر جاتے ہوئے اسے زینے پر صرف ایک آدمی ملا تھا لیکن اس نے بھی نک کی طرف توجہ نہیں دی۔ اس قسم کے بکس عام طور پر پیکنگ کے لیے استعمال ہوتے رہتے تھے اس لیے اس پر شبہ کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

فلیٹ کا دروازہ مقفل تھا جس کا یہ مطلب تھا کہ کلارا موجود نہیں تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے بکس کو سنبھالے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے جیب سے چابی نکال کر دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔ بکس رکھنے کے لیے اس نے اس کمرے کا انتخاب کیا تھا جو کلارا کے کہنے کے مطابق اس کی دوست کے استعمال میں تھا اس نے کلارا کو ایک مرتبہ بھی اس کمرے میں آتے جاتے نہیں دیکھا تھا اور اس کے خیال میں دوسرے کمرے میں موجود بکس کلارا کی نظروں سے محفوظ رہ سکتا تھا۔

کمرے کا دروازہ بند کرکے وہ کچن میں آ گیا۔ اسے اس وقت بہت شدت سے کافی کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ کافی بنانے کے دوران ہی بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ وہ کلارا تھی جو اسے پکارتی ہوئی کچن کے دروازے میں آ کر رک گئی۔ اس کے ہاتھ میں کوئی پیکٹ تھا۔ وہ کچھ دیر وہیں باتیں کرتی رہی پھر پیکٹ سنبھالے بیڈ روم کی طرف چلی گئی۔ مگر چند سیکنڈ بعد ہی اس کی خوف ناک چیخ سن کر نک ویلویٹ کچن سے نکل کر بیڈ روم کی طرف دوڑا۔ دوسرے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور کلارا کمرے کے وسط میں کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ خوف کی شدت سے اس کے چہرے کا خون نچڑ کر رہ گیا تھا۔

''کیا ہوا'' نک نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔ ڈھانچے کا خیال اس کے ذہن میں بھی نہیں رہا تھا۔

''یہ۔۔۔ڈ۔۔۔ڈھا۔۔ڈھانچہ'' کلارا نے ہکلاتے ہوئے بیڈ کی طرف اشارہ کیا۔

نک ویلویٹ بے اختیار مسکرا دیا۔ بکس اس نے پلنگ پر رکھ دیا تھا جو اس وقت کھلا ہوا تھا۔ کچھ دیر پہلے کلارا کے ہاتھ میں نظر آنے والا پیکٹ فرش پر پڑا ہوا تھا۔ نک نے آگے بڑھ کر پیکٹ اٹھالیا۔ وہ ڈاک کا پارسل تھا جس پر سیل سروس کی معرفت سیلی کا نام لکھا ہوا تھا۔ نک صورت حال سمجھ گیا۔ کلارا اپنی دوست کے نام آنے والا یہ پیکٹ میل سروس سے لائی تھی اور اسے سیلی کے کمرے میں رکھنے گئی تھی کہ پلنگ پر پڑا ہوا بکس دیکھ کر جذبہ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہوکر اسے کھول ڈالا اور پھر ڈھانچہ دیکھ کر اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ نک نے پیکٹ ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا۔ بکس بند کیا اور کلارا کا ہاتھ پکڑ کر اسے دوسرے کمرے میں لے آیا۔ اس کا خوف دور کرنے کے لیے ڈھانچے کے بارے میں ایک من گھڑت کہانی سنانے لگا۔

نک ویلویٹ دوسرے روز ٹھیک دس بجے شیراٹن پہنچ گیا۔ ایک ویٹر کو بلا کر اس نے گاڑی سے بکس نکال کر ہنڈوجوشی کے کمرے میں پہنچانے کو کہا۔ ہنڈوجوشی سیوا داس اس کا منتظر تھا۔ وہ اس وقت استقبالیہ والے کمرے میں اکیلا ہی بیٹھا ہوا تھا۔ نک کو لے کر وہ اپنے مخصوص کمرے میں چلا گیا۔ کمرے کی دیواروں پر اگرچہ اب بھی سیاہ پردے موجود تھے مگر روشنی کا انتظام بھی معقول تھا۔ نک نے بکس قالین پر رکھ کر اس کا ڈھکنا کھول دیا۔ ڈھانچے کو دیکھ کر سیوا داس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ نک نے بڑی احتیاط سے ڈھانچے کو نکال کر کمرے کے دوسرے کونے میں کھڑا کر دیا۔ اس کے لیے اسے زیادہ جدوجہد نہیں کرنا پڑی تھی کیوں کہ ڈھانچے کے ساتھ اس کی سپورٹنگ اسٹک بھی موجود تھی۔

''کل شام چار بجے تک یہ ڈھانچہ تمہاری تحویل میں رہے گا۔ اس وقت تک اگر تمہیں اطمینان ہوگیا تو ہم سودے کی بات کرلیں گے۔ بصورت دیگر میں ڈھانچہ واپس لے جاؤں گا'' نک نے کہا۔

''میرا خیال ہے تمہیں ڈھانچہ واپس لے

جانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ میں تمہیں رقم ہی اتنی پیش کروں گا کہ تم انکار نہیں کرسکو گے۔''

سیوا داس نے ڈھانچے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ یہ تو کل دیکھا جائے گا۔'' نک نے کہتے ہوئے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

اس وقت سرمئی رنگ کے بزنس سوٹ میں اس کی شخصیت بالکل ہی بدلی ہوئی نظر آرہی تھی

☆☆☆

رات کے کھانے کے بعد کلارا نے بتایا کہ گزشتہ روز اس نے ہندو جوتشی کی ملازمت سے جواب دے دیا تھا۔ سیوا داس نے اس کے واجبات کی ادائیگی کے لیے اتوار کو شام چھ بجے کے قریب بلایا تھا۔ جواب میں نک صرف مسکرا کر رہ گیا۔

وہ رات اور اگلا دن نک ویلویٹ نے کلارا کے فلیٹ میں گزارا تھا۔ سہ پہر پونے چار بجے کے قریب وہ فلیٹ سے نکل گیا اور پھر ٹھیک چار بجے وہ جوتشی سیوا داس کے طلسم کدے میں موجود تھا۔ سیوا داس اس وقت نیلے رنگ کے عمدہ تراش کے سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس نے مسکرا کر نک ویلویٹ کا استقبال کیا اور دونوں رسمی سی باتیں کرنے لگے۔ وہ ہڈی اس وقت بھی میز پر رکھی ہوئی تھی جس کے لیے نک کو اتنے پاپڑ بیلنے پڑ رہے تھے۔ اس نے جیب سے پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ باہر نکالتے ہوئے سیوا داس کی طرف بڑھا دیا اور دوسرا اپنے ہونٹوں میں دبا لیا۔

سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لگاتے ہوئے وہ بار بار سیوا داس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس دوران اس نے سودے کی بات چھیڑ دی۔ سیوا داس اسے دو ہزار ڈالر کی پیش کش کرنا چاہتا تھا جبکہ نک ویلویٹ نے پچیس ہزار کا مطالبہ کر ڈالا۔

''کک۔۔۔ کیا۔۔۔ پپ۔۔۔ پچیس ہزار۔۔۔ نہیں۔۔۔ یہ میری بساط سے زیادہ ہے۔'' سیوا داس نے جواب دیا۔ وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے آگے پیچھے جھولنے لگا۔

''تو پھر بات ختم سمجھو مسٹر سیوا داس! میں ایک سینٹ بھی کم نہیں کرسکتا اور رقم بھی کیش ہوگی۔'' نک نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

لیکن سیوا داس اس کی بات کا جواب دینے کے لیے ہوش میں نہیں رہا تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے جھول گیا۔ نک نے فوراً ہی کرسی چھوڑ دی۔ اس کا دیا ہوا سگریٹ کام کر گیا تھا۔ اس نے جوتشی کی انگلیوں میں دبا ہوا سگریٹ کھینچ کر ایش ٹرے میں مسل دیا اور سیوا داس کو ہلا جلا کر دیکھنے لگا لیکن وہ دنیا و مافیہا سے غافل ہو چکا تھا۔ نک اسے چھوڑ کر فوراً ہی اپنے کام میں مصروف ہوگیا اس نے بڑی مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے والے ڈھانچے کے دائیں بازو کو ہلا کر کہنی سے کندھے تک کی ہڈی نکال لی اور اس کی جگہ میز پر رکھی ہوئی جوتشی والی ہڈی ڈھانچے کے بازو میں فٹ کرنے لگا۔ کثرت استعمال سے اس ہڈی کے دونوں طرف کے جوڑ والے حصے قدرے گھس گئے تھے جس کی وجہ سے نک کو اپنے کام میں قدرے دشواری پیش آرہی تھی۔ لیکن آدھے گھنٹے کی کوشش اور ایک مخصوص سلوشن کے استعمال سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔ ڈھانچے سے نکالی ہوئی ہڈی اس نے میز پر ٹھیک اسی جگہ رکھ دی جہاں سے دوسری ہڈی اٹھائی تھی۔ ہڈیوں کے اس تبادلے کے بعد اس نے مطمئن ہوکر جیب سے ایک چھوٹی سی شیشی نکالی اور اس کا ڈھکنا کھول کر شیشی جوتشی کی ناک سے لگا دی۔ جوتشی کسمسایا، نک ویلویٹ اپنی کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ چند سیکنڈ بعد سیوا داس نے آنکھیں کھول دیں اور دونوں ہاتھوں سے کنپٹیاں مسلتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پھر اس کی نظریں میز پر رکھی ہوئی ہڈی کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کے بعد وہ نک کی طرف دیکھنے لگا۔

''تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا مسٹر سیوا داس! اتنی بڑی رقم کا نام سن کر شاید تم اپنے حواس کھو بیٹھے تھے۔ لیکن میرا خیال ہے یہ سودا طے نہیں ہوسکتا۔ اس لیے مجھے اجازت دو۔'' نک ویلویٹ کہتے ہوئے اٹھ کر ڈھانچے کو بکس میں بند کرنے لگا۔

سیوا داس حسرت آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ مکمل طور پر اپنے حواس میں آچکا

تھا۔ نک ویلویٹ نے بکس کندھے پر لادا تو سیوا داس بیرونی دروازے تک اسے رخصت کرنے آیا تھا۔ اسے خدا حافظ کہتے ہوئے نک کے ہونٹوں پر بڑی دل کش مسکراہٹ تھی۔ اسے یقین تھا کہ جب ہڈی کے بارے میں انکشاف ہوگا تو یہ ہندو جوشی سر پیٹ کر رہ جائے گا۔

کلارا فلیٹ پر موجود نہیں تھی۔ نک ویلویٹ نے دروازہ اندر سے بند کرلیا اور بکس کھول کر ڈھانچے کو باہر نکالے بغیر اس کے بازو کی ہڈی الگ کرنے لگا جس میں اسے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ ہڈی کو ہاتھ میں پکڑے اس کا معائنہ کرنے لگا۔ اس کے خیال میں ہڈی میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس کے لیے مائیکل کارلیون نے اسے پچیس ہزار ڈالر ادا کیے تھے۔ محض جوشی کے جنتر منتر سے خوف زدہ ہوکر تو وہ اتنی بڑی رقم خرچ نہیں کرسکتا تھا۔ دفعتاً اسے احساس ہوا کہ یہ اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ہڈی قدرے وزنی تھی۔ ڈھانچے کی اصل ہڈی نکالتے ہوئے اسے وہ ہڈی اتنی بھاری محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ ہڈی کو ہاتھ میں تولنے لگا۔ اس کا اندازہ درست ثابت ہورہا تھا۔ کوئی ہڈی اتنی بھاری نہیں ہوسکتی تھی وہ گہری نظروں سے ہڈی کا معائنہ کرنے لگا اور پھر دفعتاً اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے ڈریسنگ ٹیبل سے ہیئر پن اٹھائی اور اس کی نوک سے ہڈی کو ایک جگہ سے کھرچنے لگا چند سیکنڈ بعد ہی ہڈی کے نچلے جوڑ والے حصے میں چنے کے برابر سوراخ ہوگیا جسے ایک مخصوص مسالے سے بند کیا گیا تھا۔ اس نے وہ سوراخ والا حصہ نیچے کرکے ہڈی کو ہلایا۔ دوسرے ہی لمحہ وہ بری طرح چونک گیا۔ مٹیالے سے رنگ کا پاؤڈر ہڈی کے سوراخ سے گرنے لگا۔

ہیروئن کی شناخت میں نک ویلویٹ کو کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اس نے سارا پاؤڈر ایک کاغذ پر انڈیل لیا جو اس کے خیال میں نصف کلو کے لگ بھگ ضرور رہا ہوگا اور موجودہ مارکیٹ میں اس کی قیمت نک کے اندازے کے مطابق دس لاکھ ڈالر سے کم نہیں ہوسکتی تھی۔ اب ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ مائیکل کارلیون نے محض ایک بے کار سی ہڈی کے لیے اتنی رقم خرچ نہیں کی تھی۔ سارا چکر اس ہڈی میں پوشیدہ ہیروئن کا تھا۔ اسے کلارا کی باتیں یاد آنے لگیں جس نے بتایا تھا کہ جواخانے میں ملازمت کے دوران اسے معلوم ہوا تھا کہ کوئی اور گروہ منشیات کی تجارت پر قبضہ جمانے کی کوشش کررہا تھا جبکہ پہلے گروہ کو مائیکل کے گروہ پر شبہ تھا جس کے نتیجے میں ان دونوں گروہوں میں خونریزی شروع ہوچکی تھی۔ اب تک ویلویٹ کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ہندو جوشی سیوا داس کا تعلق تیسرے گروہ سے تھا۔ یہ ہیروئن وہ ایک ایشیائی ملک سے لایا تھا۔ ممکن ہے یہاں کی ہنگامہ آرائی کے پیش نظر سیوا داس کے گروہ کے کسی آدمی نے اس سے رابطہ قائم نہ کیا ہو اور اس مقصد کے لیے مناسب وقت کا انتظار کیا جارہا ہو۔

نک ہیروئن لے کر باتھ روم میں گھس گیا۔ چند منٹ بعد جب وہ ہاتھ دھو کر باہر نکلا تو ساری ہیروئن گٹر میں بہہ چکی تھی۔ اب وہ مائیکل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اگر وہ اس ہڈی کا سوراخ اسی طرح بند کرکے اسے مائیکل کے حوالے کردے تو وہ ہڈی کو توڑ کر اس کی حقیقت معلوم کرے گا جس کا مطلب یہ ہوتا کہ مافیا کا یہ پورا گروہ اس کے پیچھے لگ جاتا اور اسے دنیا کے کسی کونے میں پناہ نہ مل پاتی۔ وہ ایک عجیب مشکل سے دوچار ہوگیا تھا۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اسی لمحے دروازہ کھلا اور کلارا اندر داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے لیکن اس کے ہاتھ میں ایک ہڈی دیکھ کر وہ بری طرح چونک گیا۔

''کیا ہوا کلارا! اور یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''ہندو جوشی پاگل ہوگیا ہے۔'' کلارا کرسی پر گرتے ہوئے کہنے لگی۔ ''حسب وعدہ چھ بجے جب اپنے واجبات لینے کے لیے میں اس کے دفتر پہنچی تو وہاں لوگوں کا ایک ہجوم تھا۔ سیوا داس اپنے دفتر کو کباڑ خانے میں بدل چکا تھا۔ وہ ہر چیز کو اٹھا اٹھا کر پھینک

رہا تھا۔ میں نے جب اس سے اپنے واجبات کا مطالبہ کیا تو اس نے غصے میں ہاتھ میں پکڑی ہوئی یہ ہڈی مجھ پر کھینچ ماری۔ میں خوف زدہ ہو کر وہاں سے بھاگی۔ نجانے یہ ہڈی میرے ہاتھ میں کس طرح آ گئی۔ میں اسے ساتھ ہی لے آئی ہوں۔ جب میں ہوٹل سے باہر نکل رہی تھی تو میں نے پولیس کو بھی تیسری منزل پر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

نک ویلویٹ کے ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ آ گئی، کلارا نے اس کی ساری مشکل حل کر دی تھی۔ یہ ہڈی جب مائیکل کے پاس پہنچے گی تو وہ اس پر کسی قسم کا شبہ نہیں کر سکے گا۔

''دیکھو کلارا!'' وہ اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''کل سے لاس ویگاس واقعی جہنم کدہ بننے والا ہے۔ تمہیں شاید ہندو جوتشی کی اصلیت کا علم نہیں۔ اس کا تعلق اس تیسرے گروہ سے ہے جو یہاں منشیات کی تجارت پر قبضہ جمانے کی کوشش کر رہا ہے۔ جوتشی کا راز کھل چکا ہے۔ اب دونوں گروہوں میں قتل و غارت شروع ہو جائے گی۔ تم صبح میرے ساتھ لاس اینجلز چلو، میں تمہیں اپنے دوست کے نام خط لکھ دوں گا وہاں سے ہالی ووڈ چلی جانا۔ امید ہے وہاں تمہیں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔''

کلارا عجیب سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

رات دس بجے ڈھانچہ میڈیکل آرٹ میوزیم میں پہنچانے میں نک ویلویٹ کو کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ واپس آتے ہوئے اس نے اسٹیشن ویگن ایجنسی کو لوٹا دی جہاں سے اسے کرائے پر حاصل کیا تھا پھر گلوریا کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے گلوریا کو اب تک کی صورت حال سے آگاہ کیا اور اسے ٹھیک تین بجے ایئر پورٹ پہنچ جانے کی ہدایت دیتا ہوا فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔

نیویارک میں لانگ آئی لینڈ کی لائن ملنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ کال مائیکل کے سیکریٹری ہیگن نے وصول کی تھی۔ نک ویلویٹ نے جب مائیکل سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی تو ریسیور پر ہیگن کی آواز سنائی دی۔

''ہمیں ہندو جوتشی کے بارے میں اطلاع مل چکی ہے مسٹر ویلویٹ! پولیس نے اسے ذہنی امراض کے اسپتال پہنچا دیا ہے۔ لگتا ہے اسے ہڈی کے چوری ہونے کا بہت زیادہ صدمہ پہنچا ہے۔ ایسا ہونا بھی چاہیے۔ اس کا جادو ٹوٹ چکا ہے۔ بہرحال، مسٹر مائیکل اس وقت بہت مصروف ہیں۔ آپ وہ ہڈی پہلے ہوٹل کے منیجر کو پہنچا دیں۔ اس کے بعد آپ کی ذمہ داری ختم۔ منیجر آپ کو بونس کی رقم بھی دے دے گا۔ ویسے اسے افسوس ہے کہ آپ نے اسے میزبانی کا موقع نہیں دیا۔''

''میرے کچھ اپنے اصول ہیں مسٹر ہیگن۔'' نک ویلویٹ نے جواب دیا۔ ''لیکن میرا خیال ہے بیلے ہوٹل میں قیام کی پیش کش اس وقت تک برقرار رہے گی جب تک میں اس سے فائدہ نہیں اٹھا لیتا۔ میں چند روز بعد منیجر کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہونے کے لیے وہاں ضرور جاؤں گا۔''

نک نے فون بند کر دیا اور گلوریا کو ایک بار پھر ٹھیک تین بجے ایئر پورٹ پہنچنے کی ہدایات دیتا ہوا باہر نکل گیا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ بیلے ہوٹل کے منیجر کے کمرے میں موجود تھا۔ ہڈی لینے کے بعد منیجر نے نوٹوں کی ایک گڈی اس کے حوالے کر دی۔ نک ویلویٹ کے اندازے کے مطابق وہ رقم دس ہزار ڈالر سے کم نہیں تھی۔ وہ نوٹ جیب میں ڈال کر منیجر سے ہاتھ ملا کے رخصت ہو گیا۔ وہ دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا کہ جب ہڈی میں سے کچھ بھی برآمد نہیں ہو گا تو شاید مائیکل کارلیون بھی ہندو جوتشی کی طرح سر پیٹ کر رہ جائے۔

رات تین بجے جب وہ ایئر پورٹ پہنچے تو گلوریا وہاں موجود تھی۔ کلارا کو اس کے ساتھ دیکھ کر گلوریا کی بھنویں سکڑ گئیں۔ نک اسے بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گیا اور سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔

''کچھ دیر اور برداشت کر لو ڈیئر! لاس اینجلز پہنچتے ہی میرا اور کلارا کا بزنس ختم ہو جائے گا۔''

گلوریا نے ایک بار پھر اسے گھور کر دیکھا اور اس کے کچھ دیر بعد وہ تینوں پسنجرز لاؤنج میں داخل ہو رہے تھے۔

برف کا شہر

سیدہ عطیہ زاہراہ

وہ اُس سے ملنے کے لیے بے چین تھی،
بے تاب تھی، اُس نے اُسے ہر جگہ
ڈھونڈا لیکن جب وہ ملا تو.....
پیار اور دھوکے کے رنگوں سے سجی
داستان

عمران کے آخری صفحات پر قارئین کے لیے دلچسپ معاشرتی کہانی

سجو کے ہوش وحواس اڑے جارہے تھے۔ شکورے نے اسے یہ تفصیل تو نہیں بتائی تھی، بس اتنا کہا تھا کہ شہر کچھ اور چیز ہوتی ہے۔ اب یہ ''کچھ اور چیز'' اتنی اور ہوتی ہے اس نے کبھی نہیں سوچا تھا اور اب یہ سب کچھ دیکھ کر اس کا دم نکلا جارہا تھا۔ دنیا ایسی ہوتی ہے اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ اسے تو شہر کی ہر چیز پر تعجب ہورہا تھا۔ چوڑی، چمکیلی، سیاہ سڑکوں پر اور چوڑے شیشوں والی بڑی دکانوں پر اور آسمان کو چھوتی عمارتوں پر، اس نے اتنی خوب صورت اور بلند و بالا عمارتیں کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ اس کے اپنے گاؤں میں سب سے اونچا مکان چوہدری کا تھا، مگر وہ بھی ان عمارتوں کے سامنے مٹی کے ایک بے تکے گھروندے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا اس کے علاوہ اسے کپڑوں اور انسانوں پر بھی تعجب ہورہا تھا۔ طرح طرح کے رنگ برنگے اور عجیب وغریب کپڑے۔ شلوار اور ساڑھی تک تو بات ٹھیک تھی، مگر عورتوں کو چست پتلون پہنے دیکھ کر اسے بڑا عجیب لگا تھا۔ بعض لباس تو ایسے تھے کہ انہیں دیکھ کر وہ خود شرما گئی تھی۔ اتنے تنگ کہ بدن نمایاں ہوا جارہا ہے گلے اتنے کھلے ہوئے کہ بے شرمی بھی شرما جائے۔ اوپر سے کم بختوں نے دوپٹوں کو ایک دھجی کی طرح گردن میں لپیٹ لیا تھا۔ بازو پورے کے پورے کھلے ہوئے، اسے بڑی حیرت ہوئی تھی۔ ایسی عورتیں ہیں کہ ایسا لباس پہن کر بازار میں نکل آئی ہیں۔ کیا ان لوگوں کو بالکل ہی شرم نہیں آتی ہے۔ ساتھ ہی اسے آدمیوں کو دیکھ کر تعجب ہوا تھا۔ اتنے بے شمار آدمی، ہر سڑک پر، ہر گلی میں، جدھر نظر اٹھتی تھی، آدمی بھاگے چلے جارہے تھے۔ اتنے انسان ایک ہی مقام پر اور ایک ہی وقت میں اس نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اس کے اپنے گاؤں کی آبادی تو اتنی تھوڑی تھی کہ وہ ہر فرد کا نام زبانی بتا سکتی تھی، مگر اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ شہروں میں اتنے آدمی ہوتے ہیں کیوں کہ اس نے شہر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بس سن رکھا تھا کہ شہر میں چوڑی چوڑی پکی سڑکیں ہوتی ہیں۔ اونچے اونچے مکان ہوتے ہیں اور بے شمار لوگ ہوتے ہیں مگر یہ اندازہ نہیں تھا کہ آدمی جب سے شمار ہوں تو کتنے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسے اچنبھا بھی ہورہا تھا اور ڈر بھی لگ رہا تھا۔ ڈر اس لیے لگ رہا تھا کہ گاؤں میں سب ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں، آپس میں سلام دعا کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں، آپس میں سلام دعا کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں جبکہ شہر کی سڑکوں پر بھاگتے دوڑتے لوگ دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے سب

اجنبی ہوں، ایک دوسرے کو نہ پہچانتے ہوں اور جب آپس میں جان پہچان نہ ہو تو دوستی اور مروت کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔ ایک دوسرے کا دکھ درد کیسے بانٹا جا سکتا ہے اور اگر کوئی اپنے گھر کا راستہ بھول جائے اور شہروں میں یہ ناممکن نہیں، تو وہ کسی سے اپنے گھر کا راستہ کیسے پوچھ سکتا ہے۔ کیوں کہ شہروں میں سب ہی ایک دوسرے کے لیے اجنبی اور انجان ہیں۔

یکا یک وہ رک گئی۔ گھوم کر پیچھے دیکھا۔ سڑک کے اختتام پر اسٹیشن کی سرخ عمارتیں نظر آ رہی تھیں اور عمارت کے عقب سے سیاہ دھوئیں کے مرغولے اٹھ رہے تھے۔ شاید کوئی گاڑی چھوٹ رہی تھی یا پھر کوئی گاڑی آئی تھی۔ پھر اس نے بائیں طرف نظر دوڑائی۔ ایک بوڑھا ناتواں آدمی فٹ پاتھ پر بیٹھا تھا۔ اس نے سوچا بڑے میاں سے بھی پوچھ دیکھے۔ اسٹیشن پر اس نے ایک قلی سے پوچھا تھا مگر قلی نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ ممکن ہے بڑے میاں کو معلوم ہو یہ سوچ کر وہ بڑے میاں کی طرف بڑھی اور بڑی رسانیت سے بولی۔

''بابا۔۔۔!''

بڑے میاں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور ذرا تعجب سے کہا۔

''کیا بات ہے بیٹی؟''

اس کو بڑا حوصلہ ہوا۔ بڑے میاں کے لہجے میں شہروں والی اجنبیت نہیں بلکہ گاؤں والی مٹھاس اور جان پہچان تھی۔ اس نے مسکرا کر محبت سے کہا۔

''بابا تم یہیں، اسی شہر میں رہتے ہو؟''

''ہاں، کیوں۔

''تمہیں معلوم ہے کہ علی شاہ کا ڈھابہ کہاں ہے؟''

''علی شاہ کا ڈھابہ۔۔۔'' بڑے میاں نے سوچا۔

''نہیں بھئی، مجھے نہیں معلوم علی شاہ کا ڈھابہ کہاں ہے۔ یہ تو بہت بڑا شہر ہے، بہت بڑے بڑے مکان ہیں یہاں اب کون جانے کہ اس نام کا ڈھابہ کہاں ہے۔''

وہ مایوس ہو گئی۔ قلی نے بھی یہی کہا تھا۔

''بہت بڑا شہر ہے، بے شمار ڈھابے ہیں یہاں، علی شاہ کا ڈھابہ شہر کے کس کونے میں ہے، یہ میں کیا بتا سکتا ہوں بہن۔'' وہ تھوڑی دیر سوچتی رہی پھر کہنے لگی۔

''بابا! کیا تم بتا سکتے ہو کہ میں اس ڈھابے کو کس طرح ڈھونڈ سکتی ہوں؟''

بڑے میاں نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔

''تم کہاں سے آئی ہو؟''

''گاؤں سے۔''

''کیوں؟''

وہ یکا یک سٹپٹا گئی۔ کیا کہے، کیسے کہے۔ پھر اس نے ہمت کی اور گردن جھکا کر، ذرا شرما کر بولی۔

''وہاں وہ رہتے ہیں، میرا مطلب ہے، شکورے۔۔۔''

''اچھا۔۔۔ اچھا۔'' بڑے میاں نے اس کا مطلب سمجھ کے مسکرا کر کہا۔

''مگر کیا تمہارے پاس پورا پتا نہیں ہے؟''

''کھو گیا۔'' اس نے جواب دیا۔

''صرف اتنا ہی یاد ہے کہ وہ علی شاہ کے ڈھابے میں رہتے ہیں۔''

''اور تم گاؤں سے اکیلی ہی آئی ہو؟''

''ہاں۔''

بڑے میاں تھوڑی دیر سوچتے رہے۔

''بیٹی! یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔'' آخر کار انہوں نے کہا۔

''یہ شہر ہے اور تم شہر کو نہیں جانتیں، یہاں تو لوگ اپنے ہی گھروں کا راستہ بھول جاتے ہیں۔ تمہیں کون راستہ بتائے گا۔ میری صلاح مانو تو واپس چلی جاؤ۔''

''نہیں بابا! میں واپس نہیں جا سکتی۔''

بڑے میاں چند لمحے اسے غور سے دیکھتے رہے۔

''اچھا تو پھر ایسا کرو کہ کسی تانگے والے یا رکشا والے سے پوچھو۔ ان لوگوں کو سب گلی محلوں کا پتا ہوتا ہے۔ تھوڑے پیسے لے کر وہ تمہیں وہاں پہنچا دیں گے۔''

وہ آگے بڑھ گئی۔

اب دھوپ معدوم ہو چکی تھی۔ شام کا سرمئی دھندلکا رفتہ رفتہ گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ گاؤں میں شام ہوتے ہی تو ایک دم سناٹا ہو جاتا ہے۔ کھیتوں، کھلیانوں اور باغوں میں خاموشی بسیرا کرنے لگتی ہے۔ اس خاموشی کو صرف ان گھنٹیوں کی آواز توڑتی ہے جو مویشیوں کی گردن میں پڑی رہتی ہیں، مگر گھنٹیوں کی ان آوازوں میں شور نہیں ہوتا بلکہ ایک انوکھی مدھر ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ گھنٹیاں آسودگی، سکون اور زندگی کی نوید دے رہی ہوں۔ پھر نیلے آسمان پر چاند طلوع ہوتا ہے اور شفاف سنہری چاندنی سارے گاؤں میں پھیل جاتی ہے اور اس جادو جگاتی چاندنی میں گھروں سے اٹھتا ہوا دھواں دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے وہ پورا منظر حقیقی نہ ہو، بلکہ کسی کی بنائی ہوئی ایک خوب صورت تصویر ہو، لیکن شہروں کی بات تو بالکل ہی الگ ہے۔ جہاں شام ہوتی ہے تو بازاروں کا ہجوم اور بڑھ جاتا ہے۔ دکانیں اور زیادہ آباد ہو جاتی ہیں کہ آسمان سے اترنے والی چاندنی گھبرا کر اور شاید پشیمان ہو کر واپس لوٹ جاتی ہے۔ اس نے اتنی روشنی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بوکھلائی ہوئی اور کچھ سراسیمہ سی، ایک شے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ دکانوں کے اوپر جلتے بجھتے نیون سائن اسے بڑے انوکھے لگ رہے تھے۔ رنگین حروف جو بار بار جل رہے تھے، بجھ رہے تھے، جیسے ہنس رہے ہوں، جیسے آنکھ مچولی کھیل رہے ہوں اسے وہ جلتے بجھتے حروف بے حد اچھے لگے۔

دفعتاً اس کی نظر سامنے سے آتی ہوئی ایک عورت پر پڑی۔ اس نے گلابی رنگ کا بغیر آستین والا بلاؤز اور اسی رنگ کا پاجامہ پہن رکھا تھا شاید وہ پتلون تھی۔ مگر اس کی مہری بہت اونچی اور تنگ تھی، بمشکل آدھی پنڈلی پر پہنچ رہی تھی۔ اس عورت کے بال ایک جوڑے کی شکل میں بندھے تھے۔ گردن میں رومال تھا مگر اس کے بلاؤز کا گلا کشادہ تھا۔ اس عورت کے ساتھ ایک مرد بھی تھا۔ پتلون اور ریشمی بنیان پہنے ہوئے۔ عورت نے مرد کی گردن میں ہاتھ ڈال رکھا تھا اور زور زور سے کسی بات پر ہنس رہی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر اسے بڑا تعجب ہوا، اچھا تو شہر میں ایسا بھی ہوتا ہے، نہ کوئی لحاظ نہ کوئی شرم۔ اس عورت کو یہ بھی پروا نہیں ہے کہ لوگ دیکھ رہے ہیں۔ کس بری طرح پٹی ہوئی ہے۔ توبہ، توبہ، کچھ تو خیال ہونا چاہیے اور پھر لباس تو دیکھو، لگتا ہے، کچھ پہنا ہی نہیں ہے۔ کم از کم ایک دوپٹا ہی اوڑھ لیتی۔ مرد کے ساتھ عورت کی بے باکی، بے تکلفی اور اس کا لباس دیکھ کر اسے اتنی شرم آئی کہ اس نے گھبرا کر گردن جھکالی اور فٹ پاتھ کو گھورنے لگی۔ یوں جیسے وہی بے شرمی کی مرتکب ہوئی ہو اور بازار میں چلتے پھرتے لوگ اسی کو گھور رہے ہوں۔

کچھ دیر میں وہ نکڑ پر پہنچ گئی اور وہیں ایک درخت کے نیچے ٹھہر کر سوچنے لگی کہ اب کیا کروں۔ جیسے جیسے شام گہری ہو رہی تھی، اس کا خوف بڑھ رہا تھا، اور دل میں پچھتاوا ابھر سر ابھار رہا تھا۔ کہیں اس نے کوئی غلطی تو نہیں کی۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وقت کا سرا ہاتھ سے نکل چکا ہے اور کوشش کے باوجود اب یہ سرا اس کے ہاتھ نہیں آئے گا۔ کیا اسے واپس لوٹ جانا چاہیے، مگر جائے گی کہاں۔ گاؤں بہت دور ہے۔ تو پھر وہ کیا کرے، کہاں جائے۔ یکا یک وہ بے حد ڈر گئی۔ پہلی بار، اتنی دیر میں پہلی بار اسے احساس ہوا کہ گھر سے قدم نکال کر شاید اس نے غلطی کی ہے۔ مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا جو قدم اٹھ چکا، سو اٹھ چکا۔ اب وہ پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اب تو اسے آگے ہی دیکھنا ہے، آگے، لیکن آگے تو اندھیرا ہے، اتنا گہرا اندھیرا کہ اسے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا، اس نے یکا یک زور سے تھوک نگلا اور خشک ہونٹوں پر زبان پھیری گردن موڑ کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ شام

دھیرے دھیرے رات میں بدلتی جارہی تھی۔ اس نے سوچا، واپس اسٹیشن ہی لوٹ جاؤں تو اچھا ہے۔ اب اس وقت علی شاہ کے ڈھابے کو کہاں تلاش کروں۔ اسٹیشن پر مسافر خانے میں پڑی رہوں گی۔ وہاں کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ کیوں کہ وہاں اور بھی مسافر ہوں گے۔ صبح پھر علی شاہ کے ڈھابے کی تلاش میں نکلوں گی۔

یہ سوچ کر وہ پلٹی۔ لیکن اسی وقت ایک رکشا اچانک اس کے قریب آ کر رک گیا۔ وہ دفعتاً سہم کر متوحش نگاہوں سے رکشے والوں کو دیکھنے لگی۔ رکشا ڈرائیور ایک پستہ قد اور مدقوق سا آدمی تھا۔ اس کی ناک طوطے کی چونچ کی طرح نوکیلی اور ٹیڑھی تھی۔ ہونٹوں کے اوپر نوک دار باریک مونچھیں تھیں، اس نے سرمئی رنگ کا کرتا پاجامہ اور سیاہ واسکٹ پہن رکھی تھی۔ وہ ذرا سٹپٹا کر پیچھے ہٹنے لگی تو رکشا ڈرائیور نے اونچی آواز میں کہا۔

''اے! تمہیں کہاں جانا ہے؟''

اسے شبہ ہوا کہ اس نے رکشا ڈرائیور کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے، مگر یہ یاد نہ آسکا کہ کہاں! شاید اسٹیشن پر۔ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں ہکلا کر جواب دیا۔

''جی۔۔۔ جی۔۔۔ مجھے علی شاہ کے ڈھابے جانا ہے۔''

''علی شاہ کا ڈھابہ۔'' رکشا ڈرائیور نے چٹکی بجا کر سگریٹ کی راکھ جھاڑی، ایک لمحہ غور کیا۔ پھر چونک کر بولا۔

''ارے ہاں! علی شاہ کا ڈھابہ، مگر وہ تو یہاں سے بہت دور ہے۔''

اس کا دل یکا یک زور سے دھڑکا۔

''تمہیں پتا ہے کہ علی شاہ کا ڈھابہ کہاں ہے؟''

''ہاں۔'' رکشا ڈرائیور نے گھوم کر ادھر ادھر دیکھا۔

''مگر وہ کافی دور ہے۔ تمہیں علی شاہ کے ڈھابے میں کس کے پاس جانا ہے؟''

اس نے فوراً ہی کچھ جواب نہیں دیا۔ لحظہ بھر رکشا ڈرائیور کو دیکھتی رہی، پھر ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔

''شکورے کے پاس۔''

''شکورے۔'' رکشا ڈرائیور نے پرخیال انداز میں دوہرایا۔ ساتھ ہی اس نے ذرا دھیان سے اس کے دیہاتی وضع کے کپڑوں کو دیکھا، پھر سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''کہیں تم اس شکورے کا ذکر تو نہیں کررہی جو گاؤں سے آیا ہے۔''

''ہاں۔۔۔ ہاں۔'' وہ یک لخت خوش ہوکر بولی۔

''کیا تم اسے جانتے ہو؟''

رکشہ ڈرائیور نے بڑی صفائی سے جواب دیا۔

''میری اور شکورے کی واقفیت تو نہیں ہے، لیکن میں نے اسے چاچا نیاز خان کے چائے خانے میں دیکھا ہے۔ ایک دو بار بات چیت بھی کی ہے۔ اب مجھے یاد آیا کہ ایک بار اس نے بتایا تھا کہ وہ علی شاہ کے ڈھابے میں رہتا ہے۔ ارے، بھئی وہ تو بڑا ہنر والا آدمی ہے۔ اب بہت پیسے والا بھی ہوگیا ہے اور شاید اپنا مکان بھی خریدنے والا ہے۔''

وہ خوش ہوگئی۔ بے حد خوش ہوگئی۔ یوں لگا جیسے سارا خوف اور تذبذب اس کے کندھوں سے اتر گیا ہے اور وہ بادلوں کی طرح سبک ہوگئی ہے۔ شکورے نے بھی یہی کہا تھا کہ وہ روپے جمع کررہا ہے جلد ہی اپنا مکان خریدے گا اور پھر گاؤں آ کر اسے بیاہ لے جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ رکشے والا واقعی اسے جانتا ہے، ورنہ اسے یہ کیونکر معلوم ہوتا کہ شکورے گاؤں سے آیا ہے اور عنقریب مکان خریدنے والا ہے۔ اس کے معاً رکشے والے کی جانب ممنونیت سے دیکھا اور آواز میں گنے کے رس جیسی مٹھاس بھر کر بولی۔

''بھیا! تو پھر تم مجھے شکورے کے پاس لے چلو۔''

''آؤ بیٹھ جاؤ۔'' رکشا ڈرائیور انکساری سے بولا۔

رکشا چل پڑا۔ وہ سکڑی سمٹی بیٹھی رہی اور گھبرائی گھبرائی نظروں سے گردو پیش میں دیکھتی رہی۔ رکشا ڈرائیور اس کی طرف سے لاتعلق ہوگیا تھا اور سیٹی پر کوئی دھن بجاتا ہوا بڑے اطمینان سے رکشا چلا رہا تھا۔ کچھ دیر میں بازار کا روشن اور پررونق علاقہ ختم ہوگیا۔ رکشا ایک پتلی سی نیم تاریک سڑک پر مڑ گیا۔ یہاں چھوٹے چھوٹے بے ترتیب مکان تھے۔ کہیں کہیں دو تین منزلہ عمارتیں بھی نظر آرہی تھیں۔ سڑک پر جا بجا پرچون کی دکانیں اور چائے خانے تھے جن میں لوگ بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے یا ریڈیو سن رہے تھے۔ وہ ایک ایک شے کو کچھ ایسی نظروں سے دیکھتی رہی، جیسے خواب دیکھ رہی ہو۔ گم صم، سراسیمہ اور تذبذب میں مبتلا جیسے اسے کسی شے پر یقین نہ ہو۔ جیسے یہ پورا منظر، دکانیں اور مکانات اور سڑک پر چلتے پھرتے لوگ اور زمین اور آسمان، سب کے سب محض ریت پر بنی ہوئی تصویر کے مانند ہوں۔ ابھی ہوا چلے گی اور تصویر مٹ جائے گی، پھر کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ بس ایک خلا رہ جائے گا۔ تاریک اور لاانتہا اور وہ اس بے کار خلا میں ایک ٹوٹے ہوئے تارے کے مانند تا ابد بھٹکتی رہے گی۔

یکا یک وہ بے حد گھبرا گئی اور گھبرا کر رکشا ڈرائیور سے بولی۔

''بھیا! کتنی دیر اور لگے گی؟''

''فکر نہ کرو، بس اب پہنچنے ہی والے ہیں۔'' رکشا ڈرائیور نے جواب دیا۔ پھر وہ بڑے اطمینان سے گنگنانے لگا۔

کچھ دیر بعد رکشا ایک تنگ سی گلی میں مڑ گیا۔ گلی کے دائیں طرف کچھ چھوٹے چھوٹے مکانات تھے جبکہ بائیں جانب ایک تین منزلہ عمارت تھی، بدہیت عمارت کے عقبی حصے میں بھی ایک گلی تھی۔ رکشا ڈرائیور نے اس گلی میں داخل ہوکر ایک دروازے کے سامنے رکشا روک دیا، پھر نیچے اترتا ہوا بڑی لاپروائی سے بولا۔

''لو بھئی، ہم پہنچ گئے ہیں۔''

''کیا یہی ہے علی شاہ کا ڈھابہ؟'' اس نے ذرا جھک کر پوچھا۔

''ہاں یہی ہے، میرا خیال ہے، شکورے اسی عمارت کے ایک کمرے میں رہتا ہے۔''

وہ سہمی ہوئی، لرزتی ٹانگوں کو سنبھالتے ہوئے نیچے اتری اور دیوار کا سہارا لے کر تاریک سیڑھیاں طے کرنے لگی۔ رکشے والا پہلے ہی اوپر چلا گیا تھا اور تیسری منزل پر ایک دروازے کے سامنے کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا جب وہ وہاں پہنچی تو وہ مسکرا کر کہنے لگا۔

''خوش قسمت ہو تم۔ ہم لوگ صحیح جگہ پر پہنچے ہیں۔ میں نے ابھی بڑی بی سے پوچھا ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ شکورے اس کمرے میں رہتا ہے۔''

''بڑی بی کون؟'' اس نے تعجب سے پوچھا۔

''نیچے والے فلیٹ میں رہتی ہیں۔ تم نے آتے ہوئے دیکھا تو ہوگا۔''

اسے یاد آیا کہ اس نے واقعی دوسری منزل پر ایک بوڑھی عورت کو دیکھا تھا جو کمرے کے دروازے میں کھڑی اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ رکشا ڈرائیور کمرے کا تالا کھولتے ہوئے بولا۔

''شکورے کے کمرے کی ایک چابی بڑی بی کے پاس بھی رہتی ہے کیونکہ وہ کمرے کی صفائی وغیرہ بھی کرتی ہیں۔ میں یہ چابی انہی سے لایا ہوں۔ تم آرام سے یہاں بیٹھو، میں شکورے کو دیکھتا ہوں۔ شاید وہ نیاز خان کے چائے خانے میں ہوگا۔''

وہ اندر داخل ہوئی اور وحشت بھری نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی تھی پھر وہ اسے اطمینان سے بیٹھنے اور انتظار کرنے کی تاکید کر کے چلا گیا۔ اس نے دیکھا، سامنے ایک جھلنگا سی چارپائی پڑی ہے، ایک زنگ خوردہ ٹرنک چارپائی کے نیچے رکھا ہے۔ قریب ہی دو کرسیاں پڑی ہیں جن کے بید غائب ہیں۔ بائیں طرف دیوار میں ایک بغیر پٹ والی الماری ہے جس میں ڈبی، شیشیاں اور دوسری اشیا بھری ہوئی

ہیں۔ایک کونے میں مٹی کے تیل کا چولہا اور چند برتن پڑے ہیں۔ پھر اس کی نگاہ دائیں جانب والی دیوار پر پڑی اور وہ یکا یک شرم سے دوہری ہوگئی۔ دیوار پر عورتوں کی بے شمار رنگین عریاں تصاویر چسپاں تھیں جو شاید انگریزی رسالوں سے کاٹی تھیں۔ اسے شرم بھی آئی اور تھوڑا سا غصہ بھی آیا۔ حد ہوگئی یہ شکورے کتنا بدمعاش ہوگیا ہے، کیسی گندی گندی تصویریں لگا رکھی ہیں۔ آنے دو ذرا اس کو، ابھی پوچھوں گی اور یہ تصویریں تو میں ایک منٹ میں نکال کر پھینک دوں گی۔ لو بھلا، یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ کہیں شریفوں کے گھروں میں ایسی تصویریں ہوتی ہیں۔ پھر وہ ہولے سے آگے بڑھی، سینے سے چمٹی ہوئی پوٹلی سرہانے رکھ کر خود بھی چارپائی پر بیٹھ گئی۔

وقت رینگ رینگ کر گزرتا رہا۔ وہ بار بار بے چینی سے دروازے کو دیکھتی رہی۔ ابھی تک تو اس کے اعصاب، دل اور دماغ کافی حد تک قابو میں رہے تھے، مگر ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کا اضطراب بڑھ رہا تھا۔ بے قراری میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس بے قراری میں ایک عجیب سے کشمکش بھی تھی، مسرت بھی تھی اور امید بھی اور ایک سمجھ میں نہ آنے والی بے یقینی بھی، کیا ہوگا۔ ابھی شکورے آئے گا تو کیا ہوگا۔ اسے اپنے کمرے میں موجود پا کر حیرت سے بھونچکا رہ جائے گا۔ اسے شاید یقین ہی نہیں آئے گا کہ میں یہاں آ گئی ہوں اور خود میرے دل پر کیا گزرے گی۔ میں تو شاید مر ہی جاؤں گی۔ وہ لمحہ جب شکورے سے میرا سامنا ہوگا، میری سانسوں کو قتل کر ڈالے گا اور میرا دم نکل جائے گا، مگر نہیں، میں ہمت کروں گی۔ دل کو سنبھالے رہوں گی اور شکورے کے سینے سے لگ کر اور اس کے کندھے پر سر رکھ کر خوب آنسو بہاؤں گی تاکہ دل کا سارا بوجھ، سارا گرد و غبار اور خوف، ناامیدی اور بے بسی دھل کر بہہ جائے۔ اس نے یکا یک زور سے سانس لی اور مضطرب ہو کر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں زور سے پھنسالیں اور گردن گھما کر کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ کتنا اجڑا ہوا کمرا ہے۔ گندہ اور بے ترتیب، مگر کوئی بات نہیں۔ اب میں آ گئی ہوں۔ میں سب کچھ سنبھال لوں گی۔ کمرے کو خوب صاف ستھرا اور سجا کر رکھوں گی۔ ساری بے کار اور گندی چیزیں پھینک دوں گی اور کچھ نئی اور اچھی چیزیں خریدوں گی۔ ایک نئی چارپائی، کچھ نئے برتن اور مٹی کی ہانڈی۔ پتا نہیں شہر میں مٹی کی ہانڈی ملتی ہے یا نہیں، خیر کوئی بات نہیں، گاؤں سے منگوالوں گی اور یہ تصویریں، انہیں تو فی الفور آگ لگادوں گی۔ شکورے نے اب تک جو کیا سو کیا، اب اسے وہی کرنا ہوگا جو میں کہوں گی۔

دفعتاً سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ ابھری۔ قدموں کی یہ مدھم سی آواز ایسی تھی کہ وہ بری طرح گھبرا گئی۔ دل اچھل کر حلق میں آ گیا اور سارے جسم میں ٹھنڈی ٹھنڈی لہریں دوڑتی چلی گئیں۔ ''شکورے آ رہا ہے۔'' اس نے سٹپٹا کر سوچا اور اضطرابی نظروں سے دروازے کو گھورا۔ ''ابھی دروازہ کھلے گا اور شکورے اندر آ جائے گا اور اسے دیکھ کر ہکا بکا رہ جائے گا۔ یا خدا! میں کیا کروں، کیسے شکورے کا سامنا کروں گی۔ کہیں چھپ جاؤں، مگر چھپوں گی کہاں۔ اس کمرے میں تو کوئی ایسی جگہ ہی نہیں ہے۔'' وہ معاً سکڑ سمٹ کر بیٹھ گئی اور اپنے دھڑ دھڑاتے ہوئے دل کو سنبھالنے کی سعی ناکام کرتے ہوئے دروازے کو گھورنے لگی۔

رفتہ رفتہ قریب آتی ہوئی آواز اچانک تھم گئی۔ پھر دروازے کی چرچراہٹ ابھری اور ایک شخص اندر آ گیا۔ وہ نکلتے ہوئے قد کا ایک تندرست و توانا آدمی تھا ہونٹوں کے اوپر گھنی مونچھیں تھیں۔ بھنویں بے حد گھنی اور آپس میں جڑی ہوئی تھیں۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے تیر رہے تھے۔ بائیں جبڑے پر کوئی ڈیڑھ انچ لمبا کسی پرانے زخم کا نشان تھا۔ اس نے سیاہ پتلون اور چارخانے کی ایک میلی سی قمیص پہن رکھی تھی اور جب وہ بولا تو اس نے دیکھا کہ اس کا ایک دانت چاندی کا ہے۔ اس نے

مسکرا کر پوچھا تھا۔
''اے لڑکی، کون ہو تم؟''
''میں۔۔۔ میں۔۔۔ سجو ہوں۔'' وہ سٹپٹا کر کھڑی ہوگئی۔
''مگر تم کون ہو۔۔۔؟''
''میں شکورے ہوں۔'' وہ پھر مسکرایا۔
''نہیں۔۔۔ نہیں، تم شکورے نہیں ہو، میں تمہیں نہیں جانتی۔'' اس کی آواز میں گھبراہٹ واضح طور پر محسوس کی جاسکتی تھی۔
''میں اپنے شکورے کو جانتی ہوں۔ تم یہاں سے چلے جاؤ اور میرے شکورے کو بھیج دو، خدا کے لیے۔
وہ ہاچھیں پھیلا کر ہنسا۔
''ارے تو اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ کچھ دیر کے لیے مجھے ہی اپنا شکورے سمجھ لو۔'' یہ کہہ کر وہ گھوما اور دروازہ بند کر دیا، پھر سجو نے ایک اور کنڈی لگنے کی آواز سنی۔ شاید کوئی باہر کھڑا تھا اور اس نے باہر سے کنڈی لگا دی تھی۔ یکا یک اس کے سارے جسم پر لرزہ طاری ہوگیا۔ یوں سکڑنے لگا جیسے کوئی اسے مٹھی میں لے کر دبا رہا ہو۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوگئے اس نے دم بہ دم خشک ہوتے ہوئے حلق کو تھوک سے تر کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔
''تم کیسی باتیں کر رہے ہو، شکورے کہاں ہے؟''
وہ بے حد سنگ دلی سے مسکرایا۔
''میں نے کہا نا، میں شکورے ہی ہوں۔ ویسے میرا پورا نام گبر خان ہے۔ یار لوگ گبر کہتے ہیں، مگر تو اتنا گھبرا کیوں رہی ہے۔ تیرا شکورے نہ سہی، میں ہی سہی، کیا فرق پڑتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ سفاکانہ انداز میں سجو کی طرف بڑھنے لگا۔ سجو کی سمجھ میں اچانک آ گیا کہ کیا ہو چکا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ وہ کانپتے ہوئے پیچھے ہٹنے لگی، لیکن جاتی کہاں، پیچھے تو دیوار تھی۔ یکا یک اس نے ہاتھ جوڑ دیے اور گھگھیا کر کہنے لگی۔
''نہیں۔۔۔ نہیں، مجھے ہاتھ نہ لگانا، میں ایک شریف لڑکی ہوں، مجھے جانے دو۔'' گبر ہونٹ چبا کر بولا۔
''میں بھی تو بدمعاش نہیں ہوں، پھر تو کیوں ڈر رہی ہے۔''
یہ کہہ کر اس نے ہاتھ بڑھایا۔ سجو جلدی سے

مسکراہٹیں

ایک دن دو چیونٹیاں خوراک تلاش کر رہی تھیں اچانک راستے میں ان کو ایک ہاتھی ملا۔ ایک چیونٹی دوسری سے تیزی سے بولی۔
''وہ دیکھو سامنے سے ہاتھی چلا آ رہا ہے۔ آج اس کو مار گرائیں۔''
یہ سن کر دوسری نخوت سے ناک چڑھا کر بولی۔
''رہنے دو پھر کبھی سہی۔ آج وہ بے چارا اکیلا ہے۔ اور ہم دو ہیں۔''

☆☆☆

ایک چوہیا اپنے تین ننھے منے بچوں کے ساتھ شام کی سیر کو نکلی کہ ایک بلی سامنے سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس سے پہلے کہ بلی ان کی طرف جھپٹتی، چوہیا اپنی پوری طاقت سے چلائی۔
''بھوں بھوں..... بھوں بھاؤں۔''
بلی ہکا بکا رہ گئی اور اپنے قدموں واپس دوڑ گئی۔ چوہیا نے اپنے بچوں سے کہا۔
''اب تم جان گئے ہو گے کہ اپنی مادری زبان سیکھنے کے علاوہ بھی کوئی اور زبان سیکھنا کتنا ضروری ہے۔''

☆☆☆

فرانسیسی ناول نگار کولیٹ بلیوں کی بڑی شیدائی تھی امریکہ کا دورہ کرتے ہوئے اسے بازار میں ایک بلی بیٹھی دکھائی دی۔ وہ اس سے باتیں کرنے کے لیے قریب چلی گئی اور دونوں ایک آدھ منٹ تک سر جوڑے میاؤں میاؤں کرتی رہیں۔
پھر کولیٹ اپنے ساتھی کی طرف مڑی اور کہنے لگی:
''آخر مجھے کوئی ایسا تو ملا جسے فرانسیسی بولنی آتی ہے۔''

دائیں طرف سرک گئی اور ایک بار پھر خوشامد بھرے لہجے میں بولی۔

''دیکھو۔۔۔ورنہ۔۔۔''

''ورنہ کیا۔۔۔؟''

''میں شور مچادوں گی۔''

گبر زور سے ہنسا۔

''مچاؤ شور کیا اس مکان کی دیواروں کے کان نہیں ہیں۔''

جسم میں ایک بار پھر برف جیسی سرد لہریں دوڑ گئیں۔ وہ بجلی کی طرح تڑپ کر ایک طرف ہٹی اور زور زور سے رونے لگی۔ گو کمرے کی دیواریں بہت موٹی تھیں اور دروازہ بند تھا اور باہر ہر طرف موت جیسا سکوت طاری تھا، لیکن شاید کوئی سن لے، شاید کسی کے کانوں تک اس کی آواز پہنچ جائے اور کوئی اس کی مدد کے لیے آجائے۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا، مگر اس کے پاس تنکے کے سوا اور کچھ تھا بھی نہیں اور جب آدمی بالکل بے یارو مددگار ہو اور کمرے کی دیواریں بہت دبیز ہوں اور دروازے بند ہوں تو تنکے کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ چیختی رہی اور مدد کے لیے آوازیں دیتی رہی، مگر گبر نے ٹھیک کہا تھا، اس مکان کی دیواروں کے کان نہیں تھے اور دیواروں کے باہر سناٹا تھا۔ بے انتہا گہرا سناٹا! اس کی آوازیں اس بیکراں سناٹے میں تحلیل ہو کر فنا ہو گئیں۔ اور کوئی اس کی مدد کے لیے نہیں آیا۔

دفعتاً اس کے منہ پر ایک بھرپور تھپڑ پڑا اور اس کی آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا پھیلنے لگا۔ پھر دوسرا تھپڑ پڑا۔ وہ الٹ کر چارپائی پر گر پڑی۔ گبر نے پٹی پر بیٹھ کر اس کے بال پکڑ لیے اور زہریلے لہجے میں بولا۔

''میں نے کہا تھا نا، یہاں کوئی نہیں آئے گا پھر کیوں چیختی ہے؟''

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے رو کر اور ہاتھ جوڑ کر ایک بار پھر خوشامد کی۔

''دیکھو بھائی! میرے ساتھ ایسا مت کرو۔ خدا کے واسطے مجھے جانے دو، میں زندگی بھر تمہارا احسان مانوں گی۔''

''مگر میں احسان کرنا پسند نہیں کرتا۔'' گبر دوسرے ہاتھ کی دو انگلیاں اس کے خشک ہونٹوں پر پھیر کر بولا۔

''اور نہ ہی میں تیرا بھائی ہوں۔ لہٰذا اپنا اور میرا وقت خراب نہ کر، بس اب مان جا۔''

''نہیں۔۔۔نہیں۔۔۔خدا کے واسطے نہیں۔''

اس نے پھر تڑپ کر خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔

''ارے تو اتنا ڈر کیوں رہی ہے۔ میں تجھے کوئی کھا تھوڑا ہی جاؤں گا۔ میں تو بس تجھ سے محبت کروں گا۔'' یہ کہہ کر گبر اس کی جانب جھکا۔

سجو یکا یک زور سے تڑپی، پوری قوت سے چیخی۔ اس کے دونوں ہاتھ آزاد تھے۔ لہٰذا اس نے ایک بھرپور تھپڑ گبر کے منہ پر رسید کر دیا۔ گبر کو شاید اس کی توقع نہیں تھی۔ تھپڑ پڑا تو وہ بوکھلا سا گیا اور اسی بنا کر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ سجو دفعتاً اسے پوری قوت سے دھکا دے کر بجلی کی طرح تڑپتی ہوئی اٹھی اور کسی وحشی ہرنی کی طرح دروازے کی طرف بھاگی۔

مگر بھاگ کر جاتی کہاں۔ دروازہ تو بند تھا۔

☆☆☆

پھر گبر چلا گیا۔ وہ چارپائی پر سکڑی سمٹی پڑی روتی رہی۔ اسے اپنی ذات سے، اپنے وجود سے بڑی کراہیت محسوس ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سر سے پیر تک اس کے بدن کا پور پور غلیظ ہو گیا ہے اور اس سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے ہیں۔ وہ روتی رہے گی، ساری عمر آنسو بہاتی رہے گی، پھر بھی یہ غلاظت نہیں دھلے گی اور اس کا وجود یونہی تا عمر سڑتا رہے گا اور تعفن پھیلاتا رہے گا۔

''خدایا! یہ کیا ہوا۔ میں نے ایسا کیا، کیا تھا کہ یہ سزا ملی۔ میں تو ہتھیلی پر امیدوں کے ان گنت چاند سجا کر گھر سے نکلی تھی، پھر یہ اندھیرا مجھے کیوں ملا۔ میں نے تو محبت اور خوشیوں کے گلابوں سے صحن دل کو

آراستہ کیا تھا، پھر ذلت اور بدنصیبی کا یہ سیاہ داغ میرے حصے میں کیوں آیا۔'' سجو سوچتی رہی اور روتی رہی۔ وقت رینگ رینگ کر گزرتا گیا، پھر اس نے محسوس کیا کہ کوئی کمرے میں آیا ہے اور چارپائی پر اس کے قریب بیٹھ گیا ہے۔ پہلے سجو نے پروا نہیں کی۔ بدستور آنکھیں بند کیے پڑی رہی۔ پھر آنے والے نے اس کے پاؤں پر ہاتھ رکھا تو اس نے آنکھیں کھولیں۔ آنسوؤں کے دو پردے کے دوسری طرف اسے ایک چہرہ نظر آیا۔ یہ وہی بوڑھی عورت تھی جسے اس نے اوپر آتے ہوئے دیکھا تھا اس نے یکا یک غصے اور نفرت سے اپنا پاؤں کھینچ لیا اور پھر آنکھیں بند کرلیں۔

بوڑھی عورت نے نرم لہجے میں کہا۔

''کب تک روتی رہو گی۔ اب آنسو پونچھ ڈالو اور اٹھ کر منہ ہاتھ دھولو۔''

سجو سر سے پاؤں تک شعلے کی طرح دہک گئی۔ اس کا جی چاہا کہ ایسا زناٹے کا تھپڑ بڑھیا کے منہ پر رسید کرے کہ اس کے منہ کے بچے کھچے دانت بھی باہر نکل آئیں۔ کم بخت، ذلیل، کیسی ہمدرد بن رہی ہے۔ گویا کچھ جانتی ہی نہیں ہے مگر اس نے کچھ نہیں کہا۔ بوڑھی عورت تھوڑی دیر انتظار کرتی رہی، پھر اس کے پاؤں پر تھپکی دے کر بولی۔

''اپنے جی کو ہلکان کرنے سے کیا فائدہ۔ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ اب اٹھ کر منہ ہاتھ دھولو اور کھانا کھالو۔ میں دال روٹی لائی ہوں۔''

گو بوڑھی عورت کا لہجہ نرم تھا، مگر سجو کو یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی آواز میں تلوار کی کاٹ ہو۔ وہ یکا یک تڑپ کر اٹھ بیٹھی اور چیخ کر بولی۔

''میں پوچھتی ہوں، تم لوگوں نے میرے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا، کیا بگاڑا تھا میں نے تمہارا؟'' بڑھیا کہنے لگی۔

''تم نے کچھ نہیں بگاڑا تھا، مگر تم یہاں کیوں آئی تھیں اور اب مجھ پر چیخ رہی ہو تو اس سے کیا فائدہ ہوگا۔ یہ بات تو کبریٰ سے پوچھنا کہ تم نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔''

''میں۔۔۔ میں، اس کمینے ذلیل کا خون پی جاؤں گی۔'' وہ چیخ کر بولی۔

''تم کبریٰ کو نہیں جانتیں، ورنہ ایسا نہ کہتی۔'' بڑھیا نے روکھے لہجے میں جواب دیا۔

''اس طرح کی دھمکیاں لوگ اسے دیا ہی کرتے ہیں، لیکن کتنے لوگ ہیں جو اس سے الجھنے کے بعد سکون کا سانس لیتے ہیں۔ تمہیں بھی اگر اپنے ہاتھ پیر تڑوانے ہوں تو ضرور اس کا خون پینے کی کوشش کرنا۔''

سجو ہر چند کہ بے حد غصے میں تھی۔ نفرت اس کے دماغ میں لاوے کی طرح پک رہی تھی، مگر ساتھ ہی ساتھ آنکھوں سے آنسو بھی مسلسل بہے جا رہے تھے اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

''میں کہے دیتی ہوں، تم لوگ بچو گے نہیں۔ میں پولیس کے پاس جاؤں گی اور سارا کچا چٹھا بیان کردوں گی۔ کسی شریف اور بے سہارا عورت کی عزت لوٹنا آسان نہیں۔ تم سب جیل میں میں سڑو گے، دیکھ لینا۔''

بڑھیا کے ہونٹوں پر ایک استہزائی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے دروازے کی طرف اشارہ کرکے بڑی سنگ دلی سے کہا۔

''جاؤ۔۔۔ ضرور جاؤ۔ وہ سامنے دروازہ ہے اور کھلا ہوا ہے، لیکن تم پولیس سے کہو گی کیا! تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ تم اس گھر میں آئی تھیں۔ نہ ہم لوگ تمہیں جانتے ہیں اور نہ تمہیں کسی نے اس گھر میں آتے دیکھا ہے، اس صورت میں پولیس تمہاری کیا مدد کرے گی۔''

''کیوں نہیں مدد کرے گی، کیا تم لوگ سمجھتے ہو کہ اس دنیا میں انصاف نہیں ہے۔''

بڑھیا تمسخر بھرے انداز میں ہنسنے لگی۔ کچھ اس طرح جیسے کوئی عاقل و جہاندیدہ شخص کسی بچے کی بے تکی بات پر ہنستا ہے۔ پھر طنزیہ لہجے میں بولی۔

''اچھا! اس دنیا میں انصاف ہے، کہاں ہے۔

ذرا مجھے بھی تو بتاؤ؟''

سجو پھر رونے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے، کیا کرے۔ بار بار اس کا دل چاہتا کہ بڑھیا کی گردن دبادے یا کم از کم اس کے منہ پر تھوک دے، مگر وہ کچھ بھی نہ کرسکی۔ شاید یہ حد درجہ بے بسی تھی یا پھر انتہائی غصہ کہ اس کے اعصاب مفلوج ہوکر رہ گئے تھے۔ بڑھیا خاموش بیٹھی اسے سرد نظروں سے دیکھتی رہی پھر بولی۔

''بس اب بہت ہو چکا۔ اٹھو اور منہ دھولو۔ اس کے بعد جہاں تمہارا جی چاہے، چلی جانا۔ میں روکوں گی نہیں، لیکن اتنا سوچ لو کہ جاؤ گی کہاں، تم اکیلی ہو اور یہ شہر ہے۔''

سجو نے گردن گھما کر جلتی ہوئی نظروں سے بڑھیا کو دیکھا۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ سجو اکیلی ہے اور یہ شہر ہے۔ شہر۔۔۔ جہاں بے شمار گلیاں اور سڑکیں ہوتی ہیں بے مہر اور بے مروت اور پر پیچ۔ اگر ایک بار آدمی ان گلیوں میں بھٹک جائے تو پھر اسے اپنا راستہ نہیں ملتا اور وہ شہر میں اجنبی اور انجان ہے۔ ناموں سے اور چہروں سے واقف نہیں، تو پھر وہ اپنا راستہ کیسے تلاش کرے گی۔ کہاں جائے گی، کیا کرے گی۔ بڑھیا نے ٹھیک ہی کہا ہے، اگر وہ پولیس کے پاس جائے گی تو بھی کیا حاصل ہوگا۔ صرف ذلت اور رسوائی ملے گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ پولیس اس کا اعتبار ہی نہ کرے اور اگر اعتبار کر بھی لیا تو بھی ضروری نہیں کہ گبرو وغیرہ کو سزا ملے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ لوگ کسی نہ کسی طرح اپنا دامن صاف بچا جائیں۔ کیوں کہ یہ شہر ہے اور شہروں میں کیا کچھ ہوتا ہے، یہ اسے بالکل نہیں معلوم ہے۔ وہ گاؤں کی ایک سیدھی سادی لڑکی ہے۔ باؤلی کے ٹھنڈے پانی کی طرح شفاف، ہوا کی طرح تازہ اور گندم کی خوشبو کی طرح بے لوث، اسے بھول بھلیوں میں اپنا راستہ تلاش کرنے کا فن نہیں آتا۔ لہٰذا اگر باہر گئی تو کیا ہوگا پھر کوئی رکشے والا ملے گا، پھر کوئی گبر ملے گا اور پھر کوئی مکار بڑھیا ملے گی۔ اس نے ذرا توجہ سے بڑھیا کو دیکھا۔ وہ ایک بھاری بدن کی عورت تھی۔ سر کے بال کھچڑی ہو چکے تھے۔ عمر پچپن سال کے آس پاس رہی ہوگی۔ کانوں میں چاندی کے لمبے لمبے بندے پڑے تھے اور اس کے سیدھے ہاتھ کی چار انگلیوں میں موٹی موٹی انگوٹھیاں تھیں۔ اس کے چہرے پر وہ نرمی نہیں تھی جو نسوانیت کا جوہر ہے بلکہ عجیب سی سختی، سرد مہری اور خود غرضی تھی۔ سجو ایک دو لمحے اسے غور سے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔

بڑھیا نے دفعتاً زور سے سانس لے کر کہا۔

''میں کب تک بیٹھی رہوں گی۔ تم کھانا کھالو تو میں برتن لے جاؤں۔''

''میں نہیں کھاؤں گی، لے جاؤ کھانا۔'' سجو نے چیخ کر کہا۔

بڑھیا نے اسے گھور کر دیکھا اور ترش لہجے میں بولی۔

''نہیں کھانا ہے تو مت کھاؤ۔ چلاتی کیوں ہو، جہنم میں جاؤ میری طرف سے۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھی اور بڑبڑاتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ سجو اسے خون آشام نظروں سے گھورتی رہی۔ بڑھیا نے باہر نکل کر دروازہ بند کردیا۔ پھر سجو نے اس کی زہریلی آواز سنی۔

''سور کی بچی، حرافہ! کسی صورت مانتی ہی نہیں۔ ارے نہیں کھانا ہے تو نہ کھائے، مرے مجھے کیا۔''

دروازہ بند ہوگیا۔ سجو خاموش بیٹھی ہونٹ چباتی رہی اور جلتی ہوئی نگاہوں سے دروازے کو گھورتی رہی۔ کمرے میں لالٹین کی زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی جو کمرے کے پرسکوت ماحول کو بڑا ڈراؤنا بنا رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا، جیسے وہ کمرا کمرا نہ ہو، ایک منحوس قبر ہو اور سجو زندہ اس قبر میں دفن ہوگئی ہو۔ کچھ دیر یونہی گزر گئی۔ پھر اس نے اپنے کپڑے درست کیے دوپٹا سر پر ٹھیک کیا اور چارپائی سے نیچے اتری۔ چند لمحے پاس آمیز نظروں سے ادھر اُدھر دیکھتی رہی۔ پھر آگے بڑھ کر عقبی دیوار کی چھوٹی سی کھڑکی میں جا کر کھڑی

ہوگئی۔ باہر حد نظر تک ویرانی مسلط تھی۔ آسمان گو دور تک نظر آرہا تھا، لیکن کہیں کوئی ستارا نہیں تھا، چاند نہیں تھا، صرف دھند تھی، مٹیالی دھند تھی جو آسمان کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک کفن کی طرح تنی ہوئی تھی۔ آسمان کو دیکھتے دیکھتے اچانک پھر سجو کا دل بھر آیا اور وہ ایک بار پھر سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

☆☆☆

''ارے تو روتی کیوں ہے۔'' شکورے نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا تھا۔

''روؤں نہیں، کیا ہنسوں۔ ناچوں، گاؤں اور چراغاں کروں۔'' سجو نے جلے بھنے لہجے میں جواب دیا تھا۔

''ہاں اور کیا، تجھے تو خوش ہونا چاہیے۔'' شکورے بھوسے کے ڈھیر پر پیر پھیلا کر لیٹ گیا۔

''میں شہر ہی تو جارہا ہوں، کوئی چاند پر نہیں جارہا ہوں۔ شہر میں پیسہ بھی بہت ہے اور کام بھی بہت ہے۔ میں نے سنا ہے کہ وہاں فوراً نوکری مل جاتی ہے۔ میں وہاں جا کر نوکری کروں گا اور خوب روپے کماؤں گا۔ پھر واپس آ کر تجھ سے شادی کروں گا اور تجھے بھی اپنے ساتھ شہر لے جاؤں گا۔''

''سچ کہہ رہے ہو؟''

''ہاں۔'' شکورے نے بڑے خلوص سے سر ہلایا۔

''اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں، یہاں رہوں گا تو کیا حاصل ہوگا۔ چوہدری کی چاکری کرتے کرتے عمر بیت جائے گی۔ نہ میرے پاس پیسہ ہوگا نہ اپنا مکان اور نہ تیرے چچا تیرا ہاتھ، میرے ہاتھ میں دیں گے۔''

''اور اگر تم پلٹ کر نہیں آئے تو۔۔۔'' سجو نے اسے شک وشبے سے گھورا۔

''حد ہوگئی۔'' شکورے بھنا گیا۔

''واپس کیوں نہیں آؤں گا۔ ارے یہ گاؤں ہے، میرا گاؤں ہے اور یہاں تو ہے پھر میری خالہ بھی ہیں۔ میں بھلا شہر میں رہ کر کیا کروں گا۔ میں تو صرف پیسہ کمانے جارہا ہوں۔ جیسے ہی میرے پاس چار پیسے جمع ہوئے، فوراً واپس آجاؤں گا۔''

''مگر میں نے سنا ہے شہر میں لوگ کھو جاتے ہیں۔''

شکورے ہنسنے لگا۔

''ارے سجو! تو بالکل بھولی ہے۔ کچھ بھی نہیں جانتی ہے۔ بے شک شہر میں لوگ کھو جاتے ہیں، مگر میں بچہ نہیں ہوں۔ اطمینان رکھ۔ میں اپنا راستہ یاد رکھوں گا بلکہ اپنے راستے پر نشانیاں لگا کر رکھوں گا تاکہ واپس آؤں تو تیرے ہی دروازے تک پہنچوں۔''

''خالہ سے پوچھ لیا ہے۔''

''ہاں۔''

''کب جاؤ گے؟''

''آج پانچ بجے کی بس سے جاؤں گا۔''

''کیا بس شہر تک جاتی ہے؟''

''نہیں شہر تو بہت دور ہے۔'' شکورے بتانے لگا۔

''بس سے جام نگر جاؤں گا۔ وہاں سے ریل گاڑی لوں گا اور پھر ریل گاڑی کوئی رات بھر چلے گی تب کہیں جا کر شہر پہنچوں گا۔''

''خط لکھو گے؟''

''تُو تو بالکل پگلی ہے۔'' شکورے نے جواب دیا۔

''میں تجھے کیسے خط لکھ سکتا ہوں۔ لوگوں کو معلوم ہوجائے گا تو فضول میں باتیں بنائیں گے۔ میں خالہ کے خط میں تجھے بھی سلام لکھ دیا کروں گا۔ خالہ سے تجھے ساری باتیں معلوم ہوجایا کریں گی۔''

سجو کی آنکھوں میں پھر آنسو آگئے۔

''دیکھو۔۔۔ میں کہے دیتی ہوں۔'' اس نے سسکی لے کر کہا۔

''شہر جاؤ یا کہیں بھی جاؤ۔۔۔ لیکن مجھے بھولنا مت، میں نے ساری امیدیں تم سے ہی لگا رکھی

ہیں۔ میرے من میں تمہارے سوا اور کوئی نہیں ہے اور نہ کبھی ہوگا اگر تم پلٹ کر نہیں آئے یا مجھے بھلا دیا تو میں کنویں میں کود کر جان دے دوں گی، اتنا یاد رکھنا۔'' شکورے نے اسے کھینچ کر اپنے اور قریب کرلیا۔ پھر شانے پر تھپکی دے کر کہنے لگا۔

''سجو۔۔۔! میرے من میں بھی تیرے سوا کوئی نہیں ہے اور نہ کبھی ہوگی۔ تو ایسی باتیں نہ سوچ، میں ضرور واپس آؤں گا اور بہت جلد آؤں گا، مگر تجھے بھی ایک وعدہ کرنا ہوگا۔''

''کیا؟''

''جب تک میں نہ آؤں، میرا انتظار کروگی، ایسا نہ ہو کہ تمہارے چاچا تمہاری بات کہیں اور لگا دیں اور تم بھی چپ چاپ شادی کر کے چلی جاؤ۔'' سجو نے گردن اٹھا کر شکورے کو دیکھا۔ بڑے دھیان سے، بڑی محنت سے۔ پھر وہ بولی تو اس کی آواز میں یقین اور جذبے کی فراوانی تھی۔

''میں وعدہ کرتی ہوں شکورے! تمہارے سوا کسی سے شادی نہیں کروں گی۔'' پھر شکورے چلا گیا کیونکہ اس کی بس کا وقت ہوگیا تھا۔ سجو کھیتوں سے ہوتی ہوئی چوہدری کے آموں کے باغ سے گزر کر ایک طویل چکر کاٹنے کے بعد گھر پہنچی۔ منشی خیر بخش مویشیوں کو چرا کر واپس آچکے تھے اور کھپریل کے نیچے اپنی شکستہ کھاٹ پر بیٹھے حسب معمول کھانس رہے تھے۔ دمی اور نبیل آنگن میں کھیل رہے تھے۔ چاچی گوندی کو چارا ڈال رہی تھی۔ سجو کو دیکھا تو محبت بھری خفگی سے بولیں۔

''اے۔۔۔ تم کہاں غائب ہوگئی تھیں۔ کچھ گھر کا بھی خیال رکھا کرو، اتنا کام پڑا ہوا ہے۔ ابھی کھانا بھی نہیں پکا ہے اور شام ہوئی جارہی ہے۔'' سجو نے اداس ہو کر کہا۔

''کہیں نہیں چاچی! میں ذرا نہر کی طرف چلی گئی تھی۔ جانے کیوں آج دل گھبرا رہا ہے۔'' چاچی گھبرا کر بولیں۔

''اے ہے، کیا بات ہے۔ دشمنوں کی خیر ہو، تمہارا جی تو اچھا ہے۔''

''میں ٹھیک ہوں چاچی! تم پریشان نہ ہو۔ ویسے ہی ذرا سستی سی ہے۔'' اتنے میں منشی خیر بخش نے اونچی آواز سے کہا۔

''ارے سجو بیٹا! ذرا چلم تو بھر دے۔ آج تو سارا دن چلم پینے کا موقع ہی نہیں ملا۔'' وہ چلم بھرنے چلی تو چاچی نے کہا۔

''چلم بھرنے کے بعد تم سرسوں کاٹ کر چڑھا دینا۔ آج تو ایک پیسہ بھی نہیں تھا کہ دال یا سبزی خریدتی۔ تمہارے چچا کھیتوں سے سرسوں توڑ لائے تھے۔ مگر ہے بہت اچھی اور تازہ، نرم، بہت مزے دار بنے گی۔ کھانا پک جائے تو میں ذرا چوہدری کے گھر جاؤں، شاید چوہدرائن پانچ سو روپے پیشگی دے دیں، ورنہ کل کا اللہ حافظ ہے۔ آٹا بھی ختم ہونے والا ہے۔

''آٹا بھی ختم ہونے والا ہے۔ دالوں کے ڈبے خالی پڑے ہیں اور پاس اتنے پیسے نہیں کہ آلو، بھنڈی یا لوکی خرید سکیں۔ کیسی زندگی ہے، کیسی لاچاری اور محرومی ہے۔ مہینے میں دس دن کھیتوں میں آپ سے آپ اگی ہوئی سرسوں سے پیٹ بھرنا پڑتا ہے۔ گوشت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مہینے دو مہینے میں ایک دن مل جاتا ہے تو جانو عید ہو جاتی ہے۔ سجو سرسوں کاٹتی رہی اور سوچتی رہی۔ کتنی عجیب بات ہے۔ پھر بھی سب مطمئن رہتے ہیں۔ کسی کو شکایت نہیں، کسی کو محرومی کا احساس نہیں۔ جیسے جو کچھ ہے، بس یہی ٹھیک ہے اور شاید یہی گاؤں کا ایک خوب صورت پہلو ہے کہ لوگوں میں صبر و قناعت کا جذبہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے پاؤں اتنے ہی پھیلاتے ہیں، جتنی ان کی چادر ہوتی ہے۔ وہ زیادہ کی ہوس نہیں کرتے اور کمی کو زندگی کی ایک سچائی کے طور پر قبول کرلیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دیہاتوں میں سچے چہرے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہے کہ ہمیشہ سے ان کے حالات نامساعد رہے ہوں۔ چند سال پہلے تک وہ خاصے آسودہ تھے۔ کچھ زمین تھی، جس

سے اچھی بھلی آمدنی ہو جاتی تھی۔ مگر آنے والے دن کیا رنگ دکھائیں گے اور زندگی کون سی نئی کروٹ بدلے گی۔ یہ کسی اور کو معلوم نہیں ہوتا۔ منشی خیر بخش کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ وہ بیمار پڑے، پھر سجو کے والد جو منشی خیر بخش کے چچازاد بھائی تھے، اچانک انتقال کر گئے۔ کھیتوں کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ رہا۔ منشی خیر بخش کی بیماری نے طول کھینچا، پھر دو، ایک واقعات اور ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جمع پونجی ختم ہو گئی۔ زمین پہلے گروی رکھی گئی، پھر بک گئی اور منشی خیر بخش جو پہلے کافی آسودہ حال تھے۔ اچانک غریب اور تنگ دست ہو گئے۔ آمدنی کا ذریعہ کوئی بھی نہیں تھا۔ اس موقع پر گاؤں کے چوہدری نیک محمد اگر کام نہ آتے تو شاید منشی خیر بخش کو کام چھوڑنا ہی پڑتا، مگر چوہدری نیک محمد نے انہیں اپنے کھیتوں میں مزدور کی حیثیت سے رکھ لیا۔ منشی خیر بخش نے بہت دنوں تک مزدور کی حیثیت سے کام کیا، لیکن بیماری نے انہیں بہت کمزور کر دیا تھا۔ مزدوری ان کے بس کی نہیں تھی۔ دو، تین سال تو انہوں نے نکالے، پھر ان کی خواہش پر ہی چوہدری نے انہیں اپنے مویشی چرانے پر مقرر کر دیا۔ گو آمدنی بہت کم تھی، مگر ایک آسرا ہو گیا اور زندگی جیسے تیسے کر کے گزرنے لگی۔

سجو کی پرورش منشی خیر بخش نے ہی کی تھی کیونکہ باپ کے انتقال سے پہلے ہی اس کی ماں مر چکی تھی اور وہ بالکل بے سہارا ہو گئی تھی۔ مگر انہوں نے یا چاچی نے سجو کو کبھی بوجھ نہیں سمجھا تھا، نہ ہی اسے کبھی یہ احساس ہونے دیا تھا کہ وہ یتیم ہے۔ دونوں میاں، بیوی بہت فراخ دل اور محبت کرنے والے تھے اور سجو کو اپنے بچوں بیلا اور نیل ہی کی طرح عزیز سمجھتے تھے۔ سجو کو واقعی کبھی بھی یتیمی اور کم مائیگی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ اس کے ذہن نے خود بخود چاچا اور چاچی کو اپنے ماں، باپ کے طور پر قبول کر لیا تھا۔ وقت دھیرے دھیرے گزر گیا۔ گاؤں کی گلیوں، کھیتوں اور کھلیانوں میں کھیل کود کر وہ جوان ہوئی۔ اس کی کئی سکھیاں تھیں۔ رضیہ، رقیہ، قدوسیہ اور لاجو

مسکراہٹیں

کسی فرم کے ایک منیجر ریٹائر ہوئے تو ان کے ساتھیوں نے انہیں الوداعی پارٹی دی۔ کھانے کے بعد ان کے جانشین نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ ''آج ہم سے ایک ایسا شخص جدا ہو رہا ہے جسے خوف اور زیادتی کے معنی نہیں آتے اور جو شکست کا مطلب نہیں سمجھتا۔''

پیچھے سے ایک آواز آئی۔ ''تحفے کے طور پر انہیں ڈکشنری دے دی جائے۔''

☆☆☆

ایک پھول فروش نے ایک نوجوان کو روکتے ہوئے کہا۔ ''جناب! اپنی محبوبہ کے لیے پھولوں کا ہار لیتے جائیں۔''

نوجوان نے جواب دیا۔ ''میری کوئی محبوبہ نہیں ہے۔''

پھول والا۔ ''تو پھر اپنی بیوی کے لیے لیتے جاؤ۔''

نوجوان۔ ''افسوس کہ میں شادی شدہ بھی نہیں ہوں۔''

پھول والا یہ سن کر بولا۔ ''اے دنیا کے خوش قسمت انسان یہ ہار میری طرف سے تحفے کے طور پر لے جاؤ۔''

☆☆☆

لڑکا: ''تمہارا نام کیا ہے؟''

لڑکی: ''میں کیوں بتاؤں۔''

لڑکا: ''مت بتاؤ، میں کون سا تمہیں اپنی ہونڈا کار میں بٹھا کے 5 اسٹار ریسٹورنٹ میں لے جانے والا تھا!''

لڑکی: ''نام حنا، بی کام فائنل ایئر، جناح کالج، کالج ٹائمنگ صبح آٹھ سے ایک بجے تک، جمعہ کو صبح آٹھ سے بارہ بجے تک، اتوار کی چھٹی، جاتی ابو کے ساتھ ہوں واپسی پر اکیلی ہوتی ہوں۔''

اور علیا وغیرہ۔ سب کی سب بے حد شرارتی اور پڑ ونگی۔ گاؤں کی بڑی بڑھیوں کے بقول شیطان کے کان کاٹنے والی۔ گاؤں میں اور گاؤں سے باہر کئی ایسے مقامات تھے جہاں وہ جمع ہو کر نت نئی شرارتیں کرتی تھیں۔ مگر باؤلی ان کی سب سے پسندیدہ جگہ تھی۔ جو گاؤں سے کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک اونچی ٹیکری کے دامن میں بہتی تھی۔ اس کا پانی بے حد شفاف اور ٹھنڈا تھا۔ سنسناتی ہوئی ویران دوپہروں میں وہ وہاں جمع ہو جاتیں اور کپڑوں سمیت گھنٹوں نہایا کرتیں۔ ساتھ ہی گاؤں کی گھریلو سیاست اور لڑکیوں کے نجی معاملات پر اظہار خیال ہوتا۔ لاجو کے گھر کون کا ٹتا ہے۔ علیا کی شادی جس شخص سے ہوئی اس کے منہ میں ایک دانت بھی نہیں ہے اور مکھیا کی بیوی جو آج کل رقیہ کے گھر ذرا زیادہ آتی جاتی ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ اپنے بھائی کے لیے اس کی نظر رقیہ پر ہے۔ وغیرہ وغیرہ ایک دن سجو، رضیہ کو تختہ مشق بنائے ہوئے تھی کہ یکا یک اس نے جل کر کہا۔

''اری اور سجو کی بچی! تو اپنی کہہ، یہ آج کل شکورے تیرے گھر کے چکر کیوں کاٹنے لگا ہے؟''

یہ بات رضیہ نے محض سجو کو چڑانے کے لیے کہی تھی اور کوئی مقصد نہیں تھا۔ کیونکہ کسی کو بھی یہ علم نہیں تھا کہ سجو اور شکورے ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ مگر در پردہ یہ بات سچ تھی۔ شکورے کا گھر اسی گلی میں تھا۔ جس میں منشی خیر بخش کا مکان تھا۔ شکورے کی ماں تو بچپن میں ہی مر گئی تھی، جوان ہوا تو باپ کا بھی ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ لے دے کے ایک خالہ رہ گئی تھیں۔ شکورے ان ہی کے ساتھ رہتا تھا اور چوہدری کے پاس کھیت میں مزدور کے طور پر کام کرتا تھا۔ وہ تھوڑا سا پڑھا لکھا بھی تھا، اتنا کہ خط لکھ پڑھ سکتا تھا۔ اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ بس ایک عام سا دیہاتی قسم کا نوجوان تھا، مگر پھر بھی سجو کو اچھا لگنے لگا۔ یہ کب ہوا، کیسے ہوا خود سجو کو بھی اس بات کا پتا نہیں چل سکا۔ بس ایک دن اچانک احساس ہوا کہ وہ شکورے کو پسند کرتی ہے اور شکورے اسے پسند کرتا ہے۔ مگر انہوں نے اس بارے میں اتنی احتیاط۔ برتی کہ کبھی کسی کو ذرا بھی شبہ نہیں ہو سکا۔ ویسے سجو کو اطمینان تھا کہ جب وہ وقت آئے گا تو شکورے کی خالہ، منشی خیر بخش سے اس کا ہاتھ شکورے مانگ لیں گے اور منشی خیر بخش انکار نہیں کریں گے۔ کیونکہ ایک تو برادری اور ذات پات کا کوئی فرق نہیں ہے۔ دوسرے شکورے جوان ہے۔ اس میں کوئی جسمانی عیب نہیں ہے اور پھر یہ بھی ہے کہ چوہدری کے پاس کھیت میں مزدور لگا ہوا ہے۔

مگر ایک اڑچن ضرور تھی۔ وہ یہ کہ شکورے کے پاس نہ تو پیسہ تھا، نہ اپنا ذاتی مکان، خالہ کے ساتھ جس مکان میں رہتا تھا، وہ کرائے کا تھا۔ اب اگرچہ یہ ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی، مگر پھر بھی کبھی کبھی دونوں کو ڈر لگتا، ممکن ہے، منشی خیر بخش انکار کر دیں۔ اگر ایسا ہوا تو کیا ہوگا۔ سجو، شکورے کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتی تھی، لیکن خود وہ بہت ڈر جاتی۔ شکورے کے بغیر زندگی کا تصور بڑا پھیکا لگتا۔ اگر شکورے ساتھ نصیب نہ ہوا اور اس کی ڈولی وداع ہو کر کسی اور دروازے پر گئی تو وہ بے موت مر جائے گی۔ وہ ہول کر سوچتی۔

ایک دن اس نے یہ بات شکورے سے کہی تو وہ کہنے لگا۔

''سجو، سچی بات یہ ہے کہ مجھے بھی کبھی ڈر لگتا ہے۔ لیکن کیا کروں، چوہدری اتنی کم پگار دیتا ہے کہ اس سے بچتا بچاتا کچھ نہیں، بلکہ کبھی کبھی تو چٹنی روٹی سے گزارہ کرنا پڑتا ہے۔ اس صورت میں، میں پیسہ کیونکر جمع کر سکتا ہوں۔''

''تو پھر کچھ کرو۔''

''کیا کروں؟''

''کوئی اور کام، جس میں زیادہ آمدنی ہو۔''

''گاؤں میں کھیت مزدوری کے سوا اور کیا کام ہے۔'' شکورے نے جواب دیا۔

''یہاں کوئی کارخانہ، فیکٹری تو نہیں ہے کہ اس

میں کوئی نوکری کرلوں۔ صرف ایک صورت ہے کہ ... کے ناکے پر کوئی دکان کرلوں۔ اس میں زیادہ آمدنی ہوسکتی ہے، مگر دکان کے لیے پیسہ چاہیے، جو میرے پاس نہیں ہے۔ چوہدری سے قرضہ مانگوں تو وہ مجھے دے گا نہیں۔ کیونکہ میرے پاس نہ تو اپنا مکان ہے اور نہ مویشی ہیں اور اگر منشی خیر بخش سے کہوں چوہدری سے قرضہ لینے کے لیے تو یہ مناسب نہیں ہے۔ وہ پہلے ہی چوہدری نیک محمد کے بہت مقروض ہیں۔

''ہاں یہ تو ہے۔'' سجو کہنے لگی۔

''پچاس ہزار روپے سے اوپر کا قرضہ ہے۔ اس کے علاوہ چاچا کا مکان بھی چوہدری کے پاس گروی پڑا ہوا ہے۔ لہٰذا اور قرض ملنے کی کوئی امید نہیں۔'' دونوں تھوڑی دیر چپ رہے اور مایوسی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر شکورے کہنے لگا۔

''مگر خیر، تو فکر نہ کر، میں کچھ کروں گا، بس تھوڑے دن ٹھہر جا۔ میں تجھے دکھ نہیں پہنچنے دوں گا۔''

پھر کچھ روز بعد شکورے نے سجو کو اطلاع دی کہ وہ شہر جارہا ہے۔

شکورے شہر چلا گیا۔ سجو امیدوں کے دیپک آنکھوں میں جلائے انتظار کرتی رہی۔ ایک دن شکورے آئے گا اور اسے بیاہ کرلے جائے گا۔ وہ بھی شہر میں رہے گی۔ وہاں اس کا ایک چھوٹا سا گھر ہوگا۔ خوب صورت، پرامن، مسرتوں سے بھرا ہوا۔ بس یہ بہت ہے اور کیا چاہیے زندگی میں۔ شکورے زندگی کے سفر میں ہم قدم ہوتو یہ بجائے خود پروردگار کا بہت بڑا انعام ہوگا۔ سجو سوچتی رہی اور سپنوں کے تاج محل تعمیر کرتی رہی۔ وہ سہیلیوں کے ساتھ کھیلتی، باؤلی پر جاتی اور کبھی کبھی منشی خیر بخش کے ساتھ مویشی چرانے بھی چلا جاتی، مگر اس کا دل کہیں نہ لگتا۔ ہر وقت دھیان شکورے میں اٹکا رہتا۔ ہر روز صبح صبح جب چاچا فیضی گلی سے گزرتے تو انہیں نظریں جما کر دیکھتی رہتی۔ چاچا فیضی چٹھی رساں تھے۔ جب بھی وہ شکورے کی خالہ کے دروازے پر رکتے، وہ تھوڑی ہی دیر بعد وہاں پہنچ جاتی اور شکورے کا خط سنتی۔ شکورے قریب قریب ہر خط میں اس کے گھر والوں کو فرداً فرداً سلام لکھتا تھا۔ کبھی کبھی اس کے بارے میں بھی ایک آدھ جملہ ہوتا۔ سجو سنتی تو نہال ہوجاتی۔

شروع میں کچھ عرصے تک شکورے کے خط باقاعدگی سے آتے رہے۔ پھر وقفہ طویل ہونے لگا۔ مضمون بھی کچھ مختصر ہوگیا۔ سجو کا ذکر کبھی ہوتا، کبھی غائب ہوجاتا۔ البتہ ہر خط میں اس بات کا ذکر ضرور کرتا کہ بہت مصروف ہے۔ اس لیے خط مختصر لکھ رہا ہے اور یہی ایک بات ایسی تھی جو سجو کو سہارا دیتی تھی۔ خاص طور پر اس وقت جب اس کا ذکر نہ ہوتا۔ وہ سوچتی، بے چارہ دن رات محنت کرتا ہوگا۔ آخر شہر کا معاملہ ہے۔ شہر میں تو کام کرنا پڑتا ہے اور وہ بھی فیکٹری میں، تھک جاتا ہوگا۔ لہٰذا اگر خطوں میں دیر ہونے لگی ہے تو تعجب کیسا۔ خیر کوئی بات نہیں، جب میں جاؤں گی سب ٹھیک ہوجائے گا۔ میں گھر سنبھال لوں گی اور شکورے کو اتنا آرام پہنچاؤں گی کہ وہ خوش ہوجائے گا۔

وقت پر لگا کر اڑ گیا۔ کوئی سولہ مہینے بعد آخر کار شکورے شہر سے واپس آیا اور جب سجو نے اسے دیکھا تو حیران رہ گئی۔ کیونکہ شکورے شہر جا کر بہت حد تک بدل گیا تھا۔ وہ شکورے جو سولہ مہینے پہلے رخصت ہوا تھا گاؤں سے شہر جانے کے لیے، ایک سیدھا سادہ دیہاتی نوجوان تھا۔ جبکہ یہ شکورے جو واپس آیا تھا، کوئی دوسرا آدمی لگتا تھا۔ اپنے چہرے مہرے سے بھی اور لباس سے بھی۔ اس نے براؤن رنگ کی پتلون پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں چمک دار سیاہ جوتے تھے۔ چارخانے دار قمیص اور گلے میں رومال، بال فلم کے ایکٹروں کے انداز میں سجے ہوئے تھے۔ ہونٹوں پر باریک مونچھیں تھیں۔ جو بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ اب وہ بیڑی کی جگہ سگریٹ پیتا تھا اور چٹکی بجا کر راکھ جھاڑتا تھا اور جب بات کرتا تھا بیچ بیچ میں انگریزی کے الفاظ بول دیتا۔ اس کی یہ سج دھج دیکھ کر سجو بہت مرعوب ہوئی۔

تیسرے دن انہیں تنہائی میں بات کرنے کا موقع ملا۔ وہ نہر کی طرف گاؤں سے بہت دور چلے گئے اور ایک ٹیلے کے دامن میں بیٹھ گئے۔ راستے میں تو سجو کو گھبراہٹ نہیں ہوئی تھی۔ لیکن ٹیلے کے دامن میں بیٹھنے کے بعد اور یہ احساس ہونے کے بعد کہ وہ شکورے کے ساتھ ہے اور چاروں طرف تنہائی ہے۔ وہ یکا یک گھبرانے اور شرمانے لگی۔ اس کا بدن سنسنا رہا تھا اور سانسیں گرم ہونے لگیں تھیں۔ بار بار وہ شکورے کی طرف دیکھتی اور پھر خود ہی شرما کر اور مسکرا کر نظریں جھکا لیتی۔ شکورے کچھ دیر سگریٹ پیتا رہا اور اس کی حالت سے لطف اندوز ہوتا رہا، پھر شرارت بھرے لہجے میں بولا۔

''کمال ہے، تم اتنا شرما کیوں رہی ہو؟''

''پتا نہیں، کیا بات ہے۔'' سجو نے اور شرما کر کہا۔

''آج تم سے بڑی شرم لگ رہی ہے۔'' شکورے ہنسنے لگا۔

''پہلے تو نہیں شرماتی تھی، اب ایسی کیا بات ہوگئی۔''

''مجھے کیا پتا۔'' سجو نے آہستہ سے کہا۔ پھر قدرے ٹھہر کر اس نے اضافہ کیا۔

''اچھا۔۔۔ خیر یہ بتاؤ، تم کیسے ہو، شہر میں تمہارا کام کیسا ہے۔ رہتے کہاں ہو اور تم نے خط لکھنے میں دیر کرنی کیوں شروع کردی ہے۔''

''اتنے سوال ایک ساتھ مت کرو۔'' شکورے بولا۔

''میں ایک ایک سوال کا جواب دیتا ہوں۔ پہلا سوال یہ کہ میں کیسا ہوں، تم خود دیکھ لو، بالکل اچھا ہوں، خوش بھی ہوں اور پہلے سے زیادہ ہٹا کٹا ہوگیا ہوں۔ رہ گیا میرا کام تو اب میں فیکٹری میں مستری ہوگیا ہوں۔ پہلے مزدور تھا اور پگار بھی کم تھی۔ مستری بننے کے بعد پگار بھی بڑھ گئی ہے۔ مگر مصروفیت اور ذمے داری بڑھ گئی ہے۔ میں کہاں رہتا ہوں، تو بھئی وہاں ایک بہت بڑا علی شاہ کا ڈھابہ ہے۔ اسی میں رہتا ہوں۔''

''علی شاہ کا ڈھابہ؟''

''پگلی۔۔۔! ارے۔۔۔ تو۔۔۔ تو کچھ بھی نہیں جانتی ہے۔'' اس نے کہا۔

''دیکھ اس میں بہت سے کنبے آباد ہوسکتے ہیں۔''

''اچھا۔۔۔'' سجو نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔ ''تو کیا ڈھابہ تم نے خرید لیا ہے۔''

''نہیں، لیکن آج کل میں پیسہ جمع کررہا ہوں، تاکہ اپنا مکان خرید سکوں۔ مگر میں ڈھابہ نہیں اپنا علیحدہ مکان خریدوں گا۔'' سجو تھوڑی دیر چپ رہی اور محبت سے شکورے کو دیکھتی رہی، پھر کہنے لگی۔

''اللہ کرے تم جلدی سے اپنا مکان خرید لو۔ مگر ایک بات ہے، فرید خان آج کل کبھی چائے، کبھی پانی اور کبھی پان کے بہانے ہمارے گھر آتا ہے اور ہر بار مجھے کچھ ایسی نظروں سے دیکھتا ہے کہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میرا خیال ہے کہ وہ کسی خاص مقصد سے آج کل ہمارے یہاں آتا جاتا ہے۔'' شکورے نے تعجب سے سجو کو دیکھا۔

''مگر فرید خان تو شادی شدہ ہے۔ اس کے کئی بچے بھی ہیں اور وہ دارالحکومت میں رہتا ہے۔''

''تم تو سولہ مہینے سے باہر ہو، اس لیے تمہیں معلوم نہیں کہ کوئی چھ، سات ماہ ہوئے اس کی بیوی کا انتقال ہوگیا ہے۔ پہلے وہ دارالحکومت سے دو، تین ماہ کے بعد چند دن کے لیے آیا کرتا تھا۔ اب ہر مہینے آتا ہے اور ہفتہ دس دن ٹھہرتا ہے اور قریب قریب ہر روز ہی میرے گھر آتا ہے۔ سب سے زیادہ تشویش ناک یہ ہے کہ اس نے چوہدری سے کہہ کر منشی خیر بخش کی پگار ہزار روپے بڑھوادی ہے۔ اب تم خود ہی سمجھو کہ کوئی بلا سبب تو اتنی مہربانی نہیں کرتا۔''

''یہ تو۔۔۔ ٹھیک کہتی ہے۔'' شکورے نے کہا۔ پھر اس نے سگریٹ نکالی، جلائی اور چند لمحے سوچتا رہا، پھر ذرا فکرمند ہوکر بولا۔

''مگر سجو! ابھی تو میں تجھ سے شادی نہیں

کرسکتا۔''

''کیوں؟'' سجو نے سہم کر اسے دیکھا۔

''دیکھو! ابھی میں نے تم کو بتایا تھا کہ میں پیسہ جمع کررہا ہوں، تاکہ اپنا مکان خرید سکوں۔ اس میں کچھ دن اور لگیں گے۔ اس وقت تو تجھے انتظار کرنا ہی ہوگا۔''

''تو کیا ہوا، مکان تو شادی کے بعد بھی خریدا جاسکتا ہے۔''

''نہیں۔۔۔ تو سمجھتی نہیں ہے۔ اگر شادی کرلوں گا تو خرچ بڑھ جائے گا اور بھی کئی پریشانیاں پیدا ہوجائیں گی۔ پھر اتنے پیسے نہیں بچیں گے کہ مکان خریدا جاسکے۔ اس لیے ضروری ہے کہ پہلے مکان خریدوں، پھر شادی کروں۔'' یہ کہہ کر شکورے مسکرانے لگا۔

''مگر تو فکرمند نہ ہو، بس کچھ مہینے اور ٹھہر جا، پھر میں مکان خرید لوں گا اور شادی کرکے تجھے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔''

''اور اگر فرید خان کی طرف سے کوئی بات ہوئی ہو تو۔۔۔؟''

''اول تو اتنی جلدی اس کی طرف سے کوئی بات نہیں ہوگی۔'' شکورے نے کہا۔

''کیونکہ اس کی بیوی کے انتقال کو زیادہ دن نہیں ہوئے ہیں۔ وہ کم از کم چھ ماہ تو اور انتظار کرے گا اور اگر کوئی بات ہو بھی تو کسی طرح ٹال جانا یا مجھے اطلاع بھجوا دینا، میں فوراً آجاؤں گا۔'' اس نے سجو کا کندھا تھپک کر کہا۔

''میں کہہ رہا ہوں، فکر نہ کر۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ چوہدری بے شک گاؤں کا چوہدری ہے۔ لیکن مالک نہیں ہے۔ وہ زور زبردستی نہیں کرسکتا۔ تم صاف انکار کردینا اور مجھے اطلاع بھجوا دینا۔ پھر میں آکر سب کچھ سنبھال لوں گا۔ کیا تو میرے لیے اتنا بھی نہیں کرسکتی۔''

''تو کیا تم واپس جاؤ گے؟''

''جانا ہی ہوگا۔'' شکورے نے بے فکری سے کہا۔

''میں تو صرف دو ہفتے کی چھٹی پر آیا ہوں۔''

سجو چپ ہوگئی۔ اس کی آنکھوں کی جوت مدھم پڑ گئی اور چہرے پر مایوسی کی دھندلاہٹ پھیلنے لگی۔ اس نے سولہ مہینے انتظار کیا تھا۔ اپنا خون پلا پلا کر امیدوں کے چراغوں کو روشن رکھا تھا۔ صرف اس لیے کہ ایک دن شکورے آئے گا اور اس کی مانگ ستاروں سے بھر دے گا۔ مگر اب وہ آیا تھا تو اس کے پاس ستارے نہیں تھے۔ صرف ایک دلاسا تھا۔ ایک وعدہ تھا۔ شکورے کا منشا بھلے ہی معقول ہو یعنی پہلے مکان پھر شادی۔۔۔ مگر وہ کیا کرے، کب تک انتظار کرے۔ اس کے سر پر تو کالی آندھی مسلط ہے، جو کسی بھی وقت اس کے نشیمن کو خس و خاک کی طرح اڑا لے جائے گی۔ شکورے کے وعدے اگر اس سیاہ آندھی کو نہ روک سکے تو کیا ہوگا۔ یہ سوچتے سوچتے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ شکورے نے پلکوں پر چھلکتے موتی دیکھے تو جلدی سے بول پڑا۔

''ارے۔۔۔ ارے! یہ تم رونے کیوں لگیں۔ بھلا اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے، کیا تمہیں میرا اعتبار نہیں ہے۔'' اس نے نظر بھر کر شکورے کو دیکھا۔

''اعتبار تو ہے، مگر تم ایک لڑکی کی مجبوریوں کو نہیں سمجھتے۔ مجھے یہ سوچ کر ڈر لگتا ہے کہ کہیں دیر نہ ہوجائے۔'' شکورے نے اس کے شانے پر تھپکی دے کر کہا۔

''نہیں۔۔۔ تم گھبراؤ مت، میں وعدہ کرتا ہوں کہ دیر نہیں ہوگی۔'' سجو چپ ہوگئی اور گردن اٹھا کر آنسو بھری آنکھوں سے آسمان کو دیکھنے لگی۔ جو ایک سرے سے دوسرے سرے تک خالی نظر آرہا تھا، بالکل خالی اور ویران، کسی لق و دق صحرا کی طرح، بے کراں اور لامتناہی اور بے آب و گیاہ، بے برگ و بار۔ اس عظیم ویرانے میں وعدے کا ایک ننھا سا کبوتر کتنا اڑے گا۔ کتنی دیر زندہ رہے گا اور کب گھر واپس آئے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ گھر کا راستہ ہی بھول جائے

اور ہمیشہ کے لیے خلا کے ویرانے میں گم ہو جائے۔

دو ہفتے کے بعد شکورے واپس چلا گیا اور کوئی تین ماہ کے بعد سجو کے سینے میں پرورش پانے والا خوف حقیقت بن کر سامنے آ گیا۔

اس روز سارا دن اس کا جی گھبراتا رہا۔ دل پر ایک بوجھ سا تھا۔ اک بے نام سی خلش اسے گھیرے رہی تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آ سکا تھا کہ ایسا کیوں ہے۔ سارا دن یوں ہی گزرا۔ رات میں نیند بھی بے چینی سے آئی۔ مگر ایک ہی گھنٹے بعد پھر آنکھ کھل گئی۔ حلق سوکھا ہوا تھا اور سینے میں جلن سی ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا، اٹھ کر پانی پیئے۔ مگر پھر رک گئی۔ اس کی اپنی چارپائی چھپر کے نیچے تھی جبکہ منشی خیر بخش اور چاچی صحن میں سوتے تھے۔ اس نے چراغ کی مدھم روشنی میں دیکھا کہ وہ دونوں اپنی اپنی چارپائیوں پر بیٹھے ہیں اور منشی خیر بخش کہہ رہے تھے۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں، لوگ تو یہی کہیں گے کہ میں نے پیسے کے لیے لڑکی کو بیچ دیا۔'' چاچی نے کہا

''قدرتی بات ہے۔ یتیم بچی ہے۔ لوگ اس کے سوا اور کیا کہیں گے۔ مگر مجھے چوہدری سے ایسی امید نہیں تھی۔''

''اس میں چوہدری کا کیا قصور، یہ تو ہمارے اپنے نصیبوں کا لکھا ہے۔'' منشی خیر بخش ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولے۔

سجو گم صم بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ ایسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ دونوں کیا بات کر رہے ہیں۔ انجام کار وہ بات ہو ہی گئی تھی۔ جو ایک خوف بن کر کئی مہینوں سے اس کے ذہن میں پل رہی تھی۔ چوہدری نے یقیناً فرید خان کا پیغام دیا تھا اور اب منشی خیر بخش پریشان تھے کہ کیا، کیا جائے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاچا اور چاچی کو دیکھتی رہی، پھر جلدی سے لیٹ گئی۔ مبادا وہ لوگ جان جائیں کہ وہ جاگ رہی ہے۔ مگر اس کے کان اسی طرف لگے رہے۔ منشی خیر بخش افسردہ لہجے میں کہہ رہے تھے۔

''فرید خان کی عمر پچاس سے تو کم نہیں ہوگی۔ اس کے تین بچے ہیں اور اگر اس نے شادی دیر سے نہ کی ہوتی تو اس کے بڑے لڑکے کی عمر سجو سے کئی سال زیادہ ہوتی۔ میرے پس و پیش کی صرف یہی ایک وجہ نہیں، بلکہ ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ اس کی شہرت کچھ اچھی نہیں۔ میں نے سنا ہے کہ شراب وغیرہ پیتا ہے اور اس کے علاوہ بھی کئی بری عادتیں ہیں اس میں۔''

''یہ تو میری سجو کے ساتھ بڑا ظلم ہوگا۔''

''ہاں۔۔۔ اس میں شک نہیں۔'' منشی خیر بخش دکھ بھرے لہجے میں بولے۔

''چوہدری نے مجھے پندرہ دن کی مہلت دی ہے۔ کہا ہے کہ سوچ سمجھ کر اپنا فیصلہ اسے بتا دوں، لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا جواب دوں گا۔''

''اور اگر ہم لوگ انکار کر دیں۔'' چاچی نے پوچھا۔

منشی خیر بخش نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ تھوڑی دیر سوچتے رہے اور مغموم نظروں سے صحن کے باہر خلا میں گھورتے رہے۔ پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔

''انکار تو ہم کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوگا۔ نیک محمد بظاہر تو ہمدرد اور شریف انسان ہے، لیکن تم جانتی ہو کہ وہ کتنا تنگ دل مزاج رکھنے والا آدمی ہے۔ ہمارے اوپر تقریباً اس کا پچاس ہزار روپے قرضہ ہے۔ اس کے علاوہ ہمارا یہ مکان بھی اس کے پاس گروی پڑا ہے۔ اگر ہم انکار کریں گے تو جو کچھ ہوگا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ قرض کی جانب اس نے پہلے ہی اشارہ کر دیا ہے۔''

''اچھا! کیا کہا ہے اس نے۔''

''کہنے لگا کہ اگر میرا جواب اثبات میں ہوگا تو نہ صرف قرضہ چھوڑ دے گا۔ بلکہ مکان کے کاغذات بھی واپس کر دے گا اور یہ کہ وہ مجھے مزید پچاس ہزار روپے دے گا، تاکہ میں اپنے خیالات سنوار سکوں۔''

''مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے۔'' چاچی نے یکا یک تیز لہجے میں کہا۔

''کیا سمجھ رکھا ہے اس نے اپنے آپ کو۔ ہم غریب ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ بے عزت اور بے غیرت ہیں۔ لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ ہر ایک یہی سوچے گا کہ ہم نے پیسے کے لالچ میں لڑکی کو نیچ دیا۔ چوہدری کو کچھ تو سوچنا چاہیے۔ اس کے آگے بھی اولادیں ہیں۔ اگر اس کے ساتھ ایسی ہی بات ہو تو اس کے دل پر کیا گزرے گی۔ چار پیسے کیا مل گئے ہیں اس کے دل سے خوف خدا بالکل ہی نکل گیا ہے، نہیں یہ مجھ سے نہ ہوگا۔''

''ہوگا تو مجھ سے بھی نہیں۔'' منشی خیر بخش نے آزردہ ہوکر کہا۔

''مگر اور کوئی راستہ بھی تو نظر نہیں آتا۔'' منشی خیر بخش نے ٹھیک کہا تھا۔ کوئی بھی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ مجبوری اور بے کسی نے تمام راستوں پر رکاوٹیں کھڑی کر رکھی تھیں، تو پھر سجو کیا کرے، کہاں جائے۔ وہ سارا سارا دن کھیتوں، کھلیانوں اور ویرانوں میں بھٹکتی رہتی ایک زخمی ہرنی کی طرح، کوئی ہمدرد نہیں تھا، کوئی غمگسار نہیں تھا۔ کس سے اپنا درد بیان کرے۔ کس سے زخموں پر مرہم رکھنے کے لیے کہے۔

ایسی بے چارگی تھی کہ کبھی کبھی ایسے خود اپنے آپ پر ترس آنے لگتا۔ وہ انکار کرسکتی تھی۔ لیکن چاچا اور چاچی کیا سوچیں گے۔ انہیں کتنا صدمہ ہوگا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ چپ چاپ شادی کرلے اور یوں بوڑھے اور دکھوں کے مارے چاچا اور چاچی پر احسان کر ڈالے۔ ان کا سارا قرضہ معاف ہوجائے گا۔ مکان بھی چھوٹ جائے گا اور مزید پچاس ہزار روپے بھی ملیں گے جوان کے لیے بہت بڑا سہارا ثابت ہوں گے۔ اسے منشی خیر بخش اور چاچی پر بڑا ترس آتا اور وہ اپنے آپ کو آمادہ کرنے کی کوشش کرتی۔ چاچا اور چاچی نے اس کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ اب وہ اگر ان کے لیے بھی کچھ کر جائے تو بڑی بات ہوگی۔ مگر اس کا من نہ مانتا۔ چاچا اور چاچی تو خود اس شادی کے حق میں نہیں ہیں تو وہ شادی کیسے کرسکتی ہے۔ نہیں، وہ شادی نہیں کرسکتی۔ شکورے کیا کہے گا۔ اس نے شکورے سے وعدہ کیا ہے کہ وہ اس کا انتظار کرے گی۔ وہ اپنا وعدہ کیسے توڑ سکتی ہے۔ سجو سوچتی رہی اور جتنا زیادہ سوچتی اتنا ہی اس کی بے کسی میں اضافہ ہوتا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کرے۔ اس نے چوری چھپے خط لکھوایا اور خود جام نگر جا کر لیٹر بکس میں ڈال کر آئی۔ شکورے کے خط کسی دکان دار کی معرفت جاتے تھے۔ پھر وہ انتظار کرنے لگی۔ ایک ایک دن پہاڑ بن کر گزرتا گیا۔ لیکن نہ شکورے آیا، نہ اس کا خط آیا۔ شاید اسے سجو کا خط ملا ہی نہیں۔ ورنہ وہ جواب ضرور دیتا۔ سجو خود کو تسلی دینے کی کوشش کرتی، مگر دل کو قرار نہ آتا۔ پندرہ دن یوں ہی گزرے۔ پھر منشی خیر بخش نے خود اسے ساری بات بتادی۔ اپنی مجبوریاں، چوہدری کے ممکنہ ادارے، پھر انہوں نے دکھی لہجے میں کہا۔

''بیٹا۔۔۔ میں نے چوہدری سے دو، چار روز کی مہلت اور لے لی ہے۔ لیکن میں وہاں نہیں کرنا چاہتا۔ یہ فیصلہ تم کروگی۔ دو، چار روز سوچ لو، پھر مجھے بتادینا۔''

لیکن وہ فیصلہ کیا کرتی۔ نہ انکار اس کے اختیار میں تھا، نہ اقرار۔ صرف ایک ہی صورت تھی۔ جس پر اس نے عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہر چند وہ جانتی تھی کہ چاچا اور چاچی کا دل بری طرح ٹوٹے گا۔ ذلت کے بوجھ سے ان کی گردن ہمیشہ کے لیے جھک جائے گی۔ لوگ ان پر ہنسیں گے اور برادری والے تو یقیناً حقہ پانی بند کردیں گے مگر اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس نے چپکے چپکے معلومات حاصل کیں۔ جام نگر سے ایک گاڑی صبح پانچ بجے ملتی تھی اور جام نگر تک پیدل جانے میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ لگتا تھا۔ اس نے ایک پوٹلی میں دو جوڑے اور چند چیزیں رکھیں۔ چاچی کے صندوق سے کچھ روپے نکالے اور بے آواز قدموں سے سارے گھر میں گھوم کر ایک ایک شے کو دھیان سے، محبت سے، حسرت سے دیکھا۔ منشی خیر بخش،

چاچی، بیلا اور نیل پر الوداعی نظر ڈالی اور دل ہی دل میں ان سے معافی مانگ کر گھر سے باہر آئی۔ اس وقت رات کے تین بجنے والے تھے۔ ہر طرف گہری تاریکی مسلط تھی۔ کیونکہ آخری تاریخوں کا چاند دیر ہوئی ڈوب چکا تھا۔ وہ لرزتی ٹانگوں کو سنبھالتی ہوئی خوف زدہ ہرنی کی طرح متوحش نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے آگے بڑھتی گئی۔ ہر قدم پر اس کا دل زور سے کانپتا، ہمت ٹوٹنے لگتی اور وہ گھبرا کر سوچتی کہ واپس لوٹ جائے۔ لیکن واپس لوٹتی تو کیسے۔ چوہدری نیک محمد اور فرید خان اور اس کے تینوں بچے اس کا تعاقب کررہے تھے۔ خوف ناک بھوتوں کی طرح اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ اس پر ہنس رہے تھے۔ اسے ڈرا رہے تھے۔ لہٰذا وہ آگے ہی آگے بڑھتی گئی۔ جب جام نگر پہنچی تو گاڑی آچکی تھی۔ اس نے جلدی سے ٹکٹ خریدا اور تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں دبک کر بیٹھ گئی۔

☆☆☆

سجو اس گھر کو چھوڑ کر نہیں گئی۔ اس میں اس کے ارادے یا فیصلے کو دخل نہیں تھا۔ بلکہ ایک بے بسی تھی۔ ایک مجبوری تھی اور ایک بے نام سا خوف تھا۔ اسے ٹھیک ٹھیک یقین نہیں تھا کہ اگر کوشش کرے گی تو واقعی جا سکے گی۔ حالانکہ بڑھیا نے کہا تھا۔ دروازے کھلے ہیں، چاہو تو جا سکتی ہو۔ تاہم اسے یقین نہیں تھا کہ دروازے واقعی کھلے ہیں۔ کبرا ایسا آدمی نظر نہیں آتا تھا کہ سجو جیسے ہیرے کو ہاتھ سے جانے دے، لیکن اگر وہ کسی طرح نکل بھی جاتی تو کہاں جاتی۔ اس کی راہوں کے چراغ بجھ چکے تھے۔ منزل دھندلکوں میں گم ہوگئی تھی۔ لہٰذا وہ کہاں بھٹکتی پھرتی، باہر کی دنیا اجنبی تھی۔ کونے کونے پر رہزن گھات لگائے بیٹھے تھے۔ وہ کس سے پتا پوچھے گی۔ کس سے سہارے کی طلب گار ہوگی۔ شہروں میں لوگ پتا نہیں بتاتے، گمراہ کرتے ہیں۔ یہ مجبوری تھی۔ جس نے اس کے قدم روک لیے اور اس کے حوصلوں کو توڑ ڈالا۔ چنانچہ وہ اس گھر سے نہیں گئی۔ جس طرح دھارے کی زد میں ہوا تنکا اپنی مرضی سے نہیں بہتا، اسی طرح اس نے خود کو حالات کے حوالے کردیا۔ اس نے سوچا تھا، اسی گھر میں رہ کر شکورے کو تلاش کرے گی اور جب وہ مل جائے گا تو اس کے سینے سے لگ کر خوب روئے گی۔ شکورے اس سے محبت کرتا ہے اور چونکہ اس نے شکورے کے لیے ہی گھر چھوڑا تھا۔ اس لیے وہ اسے ضرور معاف کردے گا۔

اس گھر میں تین افراد تھے۔ ایک تو وہی رکشے والا تھا۔ اس کا نام تو کچھ اور تھا، لیکن عرف عام میں دلبر کہلاتا تھا۔ دوسری بڑھیا تھی۔ اس کا نام حسینہ تھا۔ وہ دلبر کی ماں تھی۔ اس کے شوہر کا مدت ہوئی انتقال ہو چکا تھا۔ لیکن اس نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ کبرا تو موجود ہی تھا لہٰذا شوہر کی علت پالنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ تیسری عورت دلبر کی بیوی تھی۔ وہ ایک بیمار اور مدقوق سی عورت تھی۔ سب سے الگ تھلگ اور خاموش رہنے والی۔ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ اس سے اسے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس کا زیادہ وقت اپنے کمرے میں گزرتا تھا۔ جب تک اس کی صحت نے ساتھ دیا تھا۔ اس نے خاصی کمائی کرکے دی تھی۔ لیکن اب اس کا جسم، جوانی اور شباب سب ہی کچھ دھوکا دے چکے تھے۔ لہٰذا اس نے کونوں میں پناہ ڈھونڈلی تھی۔

وہ کمرا جس میں سجو کو لے جایا گیا تھا۔ دراصل کبرا کا تھا۔ کبرا کی کوئی قرابت داری ان لوگوں سے نہیں تھی، نہ ہی اسے سجو کا بار سنبھالنے میں دلچسپی تھی۔ اسے تو صرف سجو کا حوصلہ توڑنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے دن سجو کو حسینہ نیچے اپنے مکان میں لے گئی اور ایک کمرا اسے دے دیا۔ پاس والے کمرے میں خود حسینہ رہتی تھی۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی جس میں دلبر اور اس کی بیوی رہتے تھے۔ چند روز گزر گئے، مگر چند روز آسان نہیں تھے۔ سجو کو بڑی ذلتیں اور بڑے عذاب سہنے پڑے۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے برہنہ کرکے بیچ چوراہے پر لٹکا دیا گیا ہے اور ہزاروں ہاتھ مسلسل اس پر سنگ

باری کررہے ہیں، وہ بیشتر وقت روتی رہتی، اپنے آپ کو اور اپنے نصیب کو کوستی رہتی۔ مگر اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ رونے سے داغ نہیں دھلتے اور کوسنے سے نصیب نہیں بدلتا۔ اسے منشی خیر بخش یاد آتے۔ چاچی، بیلا اور نیل کا دھیان آتا اور وہ دل مسوس کر رہ جاتی۔ جی چاہتا کہ اڑ کر گاؤں واپس چلی جائے، مگر یہ بھی ممکن نہ تھا۔ گاؤں کا راستہ اس کے لیے بند ہو چکا تھا۔

دلبر ہر دوسرے دن کسی نہ کسی کو پکڑ لاتا تھا۔ لیکن سجو ہر بار سختی سے انکار کر دیتی۔ کہتی، جان دے دوں گی، لیکن اس راستے پر نہیں چلوں گی۔ حسینہ نے کہا بھی ''کماؤ گی نہیں تو کھاؤ گی کہاں سے اور یہ کمرا جو تمہارے قبضے میں ہے اس کا کرایہ کون بھرے گا؟''

سجو کے پاس چاندی کے بندے تھے۔ دو، تین چوڑیاں تھیں اور ایک کڑا تھا۔ اس نے تینوں زیور حسینہ کو دے دیے۔

حسینہ نے کہا۔

''انہیں بیچنے سے بھلا کیا ملے گا۔ چند روپے! اس کے بعد کیا کرو گی؟''

''دیکھا جائے گا۔'' سجو نے مغموم ہو کے کہا۔

حسینہ جہاں دیدہ اور تجربہ کار عورت تھی۔ اس نے سجو پر زیادہ دباؤ نہیں ڈالا۔ اس کا خیال تھا کہ کچھ دن گزریں گے، سجو کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا تو اس کی گردنِ خم خود بخود ختم ہو جائے گا اور وہ خود ہی لائن پر لگ جائے گی اور زبردستی کرنا ٹھیک نہیں۔ اس نے گبر کو بھی منع کر دیا تھا۔ چنانچہ گبر نے بھی اسے پریشان نہیں کیا۔ کچھ دن اور گزرے تو اس کا حوصلہ قدرے بحال ہو گیا۔ وہ کبھی کبھی باہر جانے لگی۔ کبھی دلبر کے ساتھ، کبھی تنہا، حسینہ اور گبر اس پر اعتبار کرنے لگے تھے۔ باہر جانے کا اصل مقصد شکورے کو تلاش کرنا تھا۔ اتنی ذلتوں اور دکھوں سے گزرنے کے بعد بھی اسے یقین تھا کہ شکورے اسے ضرور معاف کر دے گا۔ کیونکہ جس ذلت سے وہ دوچار ہوئی ہے۔ اس میں بہرحال اس کا قصور نہیں تھا اور یہ کہ اس نے شکورے ہی کے لیے گھر چھوڑا ہے۔ لہٰذا شکورے اسے ضرور گلے لگا لے گا اور وہ ہمیشہ کے لیے شکورے کے گھر چلی جائے گی۔

لیکن جب اس نے شکورے کو تلاش کرنا شروع کیا تو ایک ایک کر کے کئی پردے اس کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹ گئے۔ گھر سے چلتے وقت وہ عجلت میں شکورے کی خالہ سے اس کا پورا پتا لینا بھول گئی تھی۔ صرف اتنا ہی پتا تھا کہ وہ علی شاہ کے ڈھابے میں رہتا ہے۔ چند روز بعد سجو نے علی شاہ کا ڈھابہ تلاش کر لیا۔ یہ اسٹیشن کے دوسری طرف ہی تھا۔ مگر اس میں ایک بھی مکان نہیں تھا۔ اس کے بعد سجو نے اسے غریبوں اور مزدوروں کے محلے میں تلاش کرنا شروع کیا۔ شہر میں ان گنت کارخانے تھے۔ لہٰذا ایسے بہت محلے تھے جہاں صرف مل مزدور اور نچلے طبقے کے لوگ رہتے تھے۔ سجو اکثر ان محلوں میں جاتی اور لوگوں سے پوچھتی، مگر شکورے کا کوئی پتا نہیں چلا۔ اس کام میں دلبر نے بھی سجو کی مدد کی۔ وہ بے شک برا آدمی تھا مگر اس کے دل کے کسی کونے میں شرافت بھی اتفاق سے باقی تھی۔ جس نے اسے سجو کی مدد پر اکسایا۔ وہ کئی کارخانوں میں گیا اور شکورے نام کے مستری کو تلاش کرنے کی کوشش کی، لیکن مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں لگا۔ چند ایک مستری ملے، جن کے نام کا پہلا جز شکورے تھا۔ مگر وہ سجو کا شکورے نہیں تھا۔

سجو نے اگرچہ اپنے خوف اور کم ہمتی پر کافی حد تک قابو پا لیا تھا اور حالت کو دھیرے دھیرے سے قبول کرنے لگی تھی۔ مگر اس کے ذہن سے منشی خیر بخش اور چاچی کا دھیان کبھی نہیں نکلتا تھا۔ اس کے گھر چھوڑنے کے بعد نہ جانے ان بے چاروں پر کیا گزری ہوگی۔ لوگوں نے تو خیر انگلیاں اٹھائی ہی ہوں گی۔ ساتھ ہی ساتھ چوہدری نے بھی انہیں ذلیل کیا ہوگا۔ ممکن ہے، نوکری سے نکال دیا ہو۔ یہ سوچ کر وہ بہت دکھی ہو جاتی۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کرے۔ خط لکھنے کے لیے جی بے قرار ہوتا، مگر خوف دامن گیر ہو جاتا، خط پہنچے گا تو سب کو پتا چل

جائے گا۔ چاچا اور چاچی کی زندگی ہی اجیرن ہو جائے گی۔ کوئی ایسی ترکیب نہیں تھی کہ خط بھی پہنچ جائے اور کسی کو پتا بھی نہ چلے۔ لیکن پھر ایک ایسا راستہ سوجھ ہی گیا۔ بسوں کے اڈے پر بوڑھے غفور کاکا تھے۔ بہت نیک اور شریف ہمیشہ سے الگ تھلگ رہنے والے۔ سجو کو یقین تھا کہ وہ سجو کا خط چاچا کو پہنچا دیں گے اور کسی سے بھی اس کا تذکرہ نہیں کریں گے۔ چنانچہ ایک دن اس نے دلبر کی بیوی سے دو خط لکھوائے، ایک غفور کاکا کے نام اور ایک منشی خیر بخش کے لیے اور پھر دونوں خط ایک ہی لفافے میں رکھ کر پوسٹ کر دیے۔

چھٹے دن چاچی کا خط آیا جیسا کہ سجو کا خیال تھا۔ چاچی نے سجو کے گھر چھوڑ جانے پر گہرے رنج کا اظہار کیا تھا۔ مگر کوئی سخت بات نہیں لکھی تھی۔ البتہ یہ ذکر ذرا تفصیل سے کیا تھا کہ اس کے جانے کے بعد ان لوگوں پر کیا گزری۔

”بیٹا! میں سمجھتی ہوں کہ تم نے جو کچھ کیا اپنے لیے، شاید اچھا ہی کیا تھا۔ تمہاری زندگی کا فیصلہ کرنے کا حق ویسے بھی ہم لوگوں کو نہیں تھا۔ تم جہاں بھی رہو، خدا کرے خوش رہو۔ ہو سکے تو کبھی ملاقات کی کوئی سبیل ضرور نکالنا۔ ہمیں تم سے کوئی شکایت نہیں۔ صرف فکر اور دکھ ہے۔ تم لڑکی ذات ہو اور یہ دنیا شیطانوں سے بھری پڑی ہے۔ تم شکورے کو ڈھونڈنے کی کوشش ضرور کرو۔ خدا نے چاہا، تو وہ مل جائے گا۔ پھر تم اس کے ساتھ ہی چلی جانا اور اس سے شادی کر کے اپنا گھر بسا لینا۔ ہم لوگوں کا کیا ہے۔ جیسے تیسے زندگی گزار ہی لیں گے۔ تمہارے جانے کے بعد لوگوں نے تو خیر ذلیل کیا ہی، چوہدری نے سب سے زیادہ ستم ڈھایا۔ اس نے تمہارے گھر چھوڑنے کی ذمہ داری ہم پر ڈال دی۔ اتنا غصہ ہوا کہ تمہارے چاچا کو نوکری سے نکال دیا۔ پھر گاؤں کے دوسرے ذی حیثیت لوگوں کو منع کر دیا کہ وہ تمہارے چاچا کو نوکری نہ دیں۔ اب میں روزانہ کچھ پکوڑے اور بھاجی ترکاری وغیرہ بنا دیتی ہوں۔ جو تمہارے چاچا بسوں کے اڈے پر جا کر سارا دن بیچتے ہیں۔ مگر اس سے بڑی مشکل سے سو، تین سو کی آمدنی ہوتی ہے۔ چوہدری نے اپنا سارا روپیہ مانگ لیا ہے اور صرف پندرہ دن کی مہلت دی ہے۔ اگر اتنے دن میں قرض کی رقم ادا نہ کی جا سکی تو وہ عدالت کے ذریعے ہمارا مکان قرق کرا لے گا۔ سوچ سوچ کر پریشان ہو جاتی ہوں کہ اگر مکان بھی چھن گیا تو کہاں جائیں گے ہم لوگ۔ تمہارے چاچا کہتے ہیں کہ بسوں کے اڈے پر جھونپڑی ڈال لیں گے۔ یہ بات اپنی جگہ تو ٹھیک نظر آتی ہے، لیکن اگر چوہدری نے وہاں بھی ہمیں نہ رہنے دیا تو کیا کریں گے۔“ سجو نے خط سنا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اس روز شام ڈھلے سجو نے پھر باہر جانے کا ارادہ کیا۔ مقصد شکورے کی تلاش کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایک، دو بستیاں ایسی تھیں جہاں اس نے اچھی طرح کوشش نہیں کی تھی۔ اس نے سوچا وہاں دو، تین گھنٹے گزارے گی اور کافی لوگوں سے پوچھ گچھ کرے گی، ممکن ہے، قسمت یاوری کر جائے، مگر ابھی وہ بالوں کو سنوار ہی رہی تھی کہ معاً کانوں میں کچھ آوازیں آئیں۔ حسینہ اور دلبر کی آوازیں تو اس نے پہچان لیں، مگر تیسری آواز نے اسے الجھن میں مبتلا کر دیا۔ وہ آواز کچھ جانی پہچانی سی لگتی تھی۔ اس کے اور حسینہ کے کمرے کے درمیان ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی جس میں کوئی پٹ نہیں تھا۔ صرف ایک پردہ پڑا رہتا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر کھڑکی کا پردہ ذرا سا ہٹا کر حسینہ کے کمرے میں جھانکا اور دوسرے لمحے اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ سر سے پیر تک سارا جسم یوں ساکت ہو کر رہ گیا جیسے ایک ایک عضو منجمد ہو گیا ہو۔ پلک تک نہیں جھپک رہی تھی اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس شخص کو دیکھ رہی تھی جو حسینہ اور دلبر کے درمیان کھڑا تھا اور وہ شخص کوئی اور نہیں شکورے تھا۔

ہکا بکا، ساکت صامت اور سراسیمہ کھڑی ہوئی وہ شکورے کو اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے قیامت کو دیکھ رہی ہو۔ اس کے ذہن میں ہلچل تھی۔ دل زور،

زور سے دھڑک رہا تھا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ شکورے واقعی اس کی آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ خدایا، یہ کیا ہوا۔ کیسے ہوا؟ یہ قسمت کا کیا ستم ہے۔ اگر شکورے اس کے کمرے میں آیا اور وہ ضرور آئے گا تو وہ کیا کرے گی۔ کیسے اس کا سامنا کرے گی۔ کیسے اپنا دل سنبھالے گی؟ ارے وہ تو مر ہی جائے گی اس نے ہاتھ اٹھا کر پیشانی کو چھوا جہاں پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے۔ پھر زور سے سانس لے کر متوحش ہو کر شکورے کو دیکھا۔ وہ حسینہ سے کچھ کہہ رہا تھا۔ دلبر کو یقیناً یہ علم نہیں تھا کہ وہ شخص سجو کا شکورے ہے۔ وہ تو اسے بھی دوسرے آدمیوں کی طرح پکڑ لایا تھا۔ شاید اس امید میں کہ ممکن ہے۔ اس بار سجو مان جائے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ شکورے نے خود ہی دلبر سے پوچھا ہو۔ سجو کو یکا یک رنج نے گھیر لیا۔ تو شکورے شہر میں آ کر شوقین ہو گیا ہے۔ یہ سب حرکتیں کرنے لگا ہے اور دیکھو تو، کتنا خوش نظر آ رہا ہے۔ سجو نے دکھ سے سوچا، گلے میں سرخ رومال ہے، ہاتھ میں سگریٹ ہے، ہونٹوں پر پان کی سرخی ہے، ترچھی مانگ نکلی ہوئی ہے جیسے فلم کا کوئی ایکٹر ہو۔ سجو سوچتی رہی اور شکورے کو دیکھتی رہی۔ وہ لوگ کسی بات پر بحث کر رہے تھے۔ لیکن آواز اونچی نہیں تھی۔ سجو کو کچھ سنائی نہیں دیا۔ صرف ایک جملہ پلے پڑا جو حسینہ نے اونچی آواز میں کہا تھا۔

''ارے وہ نہیں مانے گی۔'' دلبر نے کہا۔

''دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔''

''تو میں جاؤں۔'' شکورے نے پوچھا۔ حسینہ نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''لیکن زیادتی، زبردستی مت کرنا، ساری بات لڑکی کی مرضی پر ہے۔ اگر خوشی سے مان جائے تو ٹھیک ہے، ورنہ واپس آ جانا۔'' ایک منٹ کے بعد اس کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ شکورے اندر داخل ہوا اور تب یکا یک وقت تھم گیا۔

شکورے سنگی بت کی طرح کھڑا تھا۔ خاموش، گم صم اور بے یقینی کی نظروں سے سجو کو دیکھ رہا تھا۔ خود تو سجو کی یہ حالت تھی کہ اس کی سانسوں میں آگ لگ گئی تھی۔ جسم کا سارا خون گویا جل گیا تھا۔ ٹانگیں بری طرح کانپ رہی تھیں۔ اسے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں گر نہ پڑے۔ کئی منٹ یوں ہی گزر گئے۔ جس شدید صدمے سے وہ دوچار ہوئے تھے۔ اس سے سنبھلنے کے لیے چند منٹ تو درکار ہی تھے۔ پھر شکورے نے یکا یک سنبھالا لیا اور حیرت سے بولا۔

''تم۔۔۔؟''

سجو کے پیروں میں جنبش ہوئی۔ وہ ''شکورے'' کہہ کر ایک دم دوڑی اور شکورے کے سینے سے لگ کر سسک سسک کر رونے لگی۔ ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ ہمت جواب دے گئی اور وہ ایک ننھی سی معصوم بچی کی طرح شکورے سے لپٹ کر رونے لگی۔ شکورے اسے سینے سے لگائے ہوئے تھا اور مسلسل بھینچے جا رہا تھا اور کچھ کہہ بھی رہا تھا جو سجو کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں تو ہیجان سا تھا۔ ایک لاوا پک رہا تھا۔ ایک آگ جل رہی تھی اور اس کا وجود آگ میں خاکستر ہو رہا تھا۔ اس کے ذہن میں بے شمار خیالات، بے شمار باتیں ایک دھوئیں کی طرح چکرا رہی تھیں۔

''شکورے۔۔۔ شکورے۔۔۔ تم اب تک کہاں تھے، تم اب تک کیوں نہیں ملے؟ دیکھو۔۔۔ یہ میں ہوں، سجو، تمہاری سجو، دیکھو، میرا کیا حال ہو گیا ہے۔ کیسی قیامتیں مجھ پر گزر چکی ہیں۔ کیسی اذیتیں میں سہہ چکی ہوں۔ تم نہیں جانتے، میں تمہارے لیے گھر چھوڑ کر آئی تھی۔ چاچا اور چاچی کا دل دکھایا، ذلت اور رسوائی مول لی۔ صرف تمہارے لیے۔۔۔ میں نے تمہیں کتنا ڈھونڈا، ہر گلی میں، ہر محلے میں تمہارا پتا پوچھتی پھری، مگر تم پتا نہیں کہاں تھے۔ کس جہاں میں کھو گئے تھے کہ مجھے نہیں ملے۔ لیکن خیر، اب تم مل گئے ہو تو مجھے لے چلو اس گھر سے۔ اس جہنم سے لے چلو۔ ابھی اور اسی وقت لے چلو۔ میں یہ ذلت اور رسوائی نہیں سہہ سکتی۔ میں تمہاری بن کر تمہارے گھر میں رہوں گی اور ساری عمر تمہاری خدمت کروں گی۔

شکورے، شکورے، میرے شکورے۔۔۔!'' مگر وہ یہ ساری باتیں نہیں کہہ سکی۔ جذبات اتنے تیز و تند ہو رہے تھے کہ اس کی زبان سے کچھ نہ نکل سکا۔ چند منٹ بعد شکورے نے ہی مہر سکوت توڑی۔ اس نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''سجو۔۔۔تم یہاں کب آئیں؟''

''بہت دن ہو گئے ہیں، میں تو۔۔۔'' اس نے کہنا چاہا۔ لیکن شکورے نے بات پوری کرنے کا موقع نہیں دیا۔ اس نے تعجب سے کہا۔

''مگر کیوں۔۔۔؟ میں نے تو سنا تھا تمہاری شادی فرید خان سے ہونے والی تھی، پھر تم یہاں کیوں آ گئیں۔'' سجو نے پھر لب کھولے۔ وہ شکورے کو بتانا چاہتی تھی کہ وہ شہر کیوں آئی تھی۔ مگر شکورے نے موقع نہیں دیا، کہنے لگا۔

''مجھے تو پتا ہی نہیں تھا کہ تم یہاں آ گئی ہو۔ ورنہ پہلے ہی تمہارے پاس آتا۔''

سجو۔۔۔شکورے سے کچھ کہنا چاہتی تھی، بے شمار باتیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے دل کے سارے زخم دکھانا چاہتی تھی۔ مگر شکورے کی زبان سے یہ سن کر کہ تمہاری شادی فرید خان سے ہونے والی تھی۔ اس کے دل پر گھونسا لگا۔ اس نے عجیب نظروں سے شکورے کو دیکھا اور ایک جھٹکے سے الگ ہٹ گئی اور اپنے آنسو پونچھنے لگی۔ شکورے پھر اس کی طرف بڑھا تو وہ یکا یک بے حد سرد اور سنگین لہجے میں بولی۔

''نہیں۔۔۔نہیں۔۔۔ مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔''

''کیوں؟'' شکورے نے حیرت سے کہا۔

''میں تمہیں ہاتھ نہ لگاؤں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آؤ سجو! میرے سینے سے لگ جاؤ۔ اب اتنے دن بعد ملی ہو تو اس طرح تنگ نہ کرو۔''

''پہلے پیسے ادا کرو، پھر مجھے چھونا۔'' سجو نے اس کی طرف دیکھے بغیر بڑی سنگ دلی اور بے مروتی سے جواب دیا۔

''کیا کہا۔۔۔ پیسے۔۔۔ کیا تم مجھ سے بھی پیسے لو گی؟'' شکورے کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

''کیوں نہیں۔۔۔'' سجو نے اسی سنگ دلی سے کہا۔

''دھندے میں اپنا پرایا نہیں دیکھا جاتا۔''

شکورے چند لمحے خاموش رہا اور عجیب سی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر زور سے سانس لے کر کہا۔

''اچھی بات ہے۔ اگر تم یہی چاہتی ہو تو یہی سہی۔'' یہ کہہ کر اس نے جیب سے ہزار روپے نکالے اور پاس پڑی ہوئی میز پر رکھ دیے۔ سجو کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے سارے جسم میں باریک باریک سوئیاں چبھ رہی ہوں۔ حلق خشک ہو گیا تھا۔ ہونٹ پل رہے تھے اور اس کا دل گویا کسی دلدل میں دھنستا چلا جا رہا تھا۔ وہ زور، زور سے اپنے ہونٹوں کو کاٹ رہی تھی اور اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب شکورے نے روپے میز پر رکھے تو اس نے گھوم کر دیکھا۔ وہ ہزار روپے کا ایک نوٹ تھا۔ اس نے یکا یک زور سے سانس لی اور آتشیں لہجے میں بولی۔

''ہزار روپے نہیں، دو ہزار روپے ادا کرو۔''

شکورے حیرت سے بولا۔

''مگر دلبر نے تو ہزار روپے کہے تھے۔'' سجو نے نظریں گھما کر سنگھار میز پر پڑے چاچی کے خط کو دیکھا۔

''میں نے اپنا ریٹ اب بڑھا دیا ہے۔ دو ہزار روپے سے ایک پیسہ کم نہیں۔'' اس نے کہا۔

''ورنہ تم جا سکتے ہو۔''

شکورے چند لمحے چپ رہا اور اسے عجیب سی نظروں سے گھورتا رہا، پھر کھوکھلی ہنسی ہنس کر بولا۔

''اچھی بات ہے، دو ہزار ہی سہی۔'' اتنا کہہ کر اس نے جیب سے ایک ہزار روپے کا ایک اور نوٹ نکالا اور میز پر رکھ دیا۔

سجو نے بڑے سکون سے وہ نوٹ اٹھائے، سنگھار میز کی دراز میں رکھے اور بتی بجھا دی۔

Pakistanipoint
Waqar Azeem